
سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
دسمبر 2014
نگران اعلیٰ
معراج رسول
DEC 2014
سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں اور سفرنامے
Rs 60/=
PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 25 ❖ شمارہ 01 ❖ دسمبر 2014ء

ماہنامہ
سرگزشت
کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمد سلمان خان 0333-2168391
رانا محمد حمید 0323-2895528
نمائندہ لاہور افراز علی ناصر 0300-4214400

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER
APNS
CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

اس وقت پاکستان میں جس طرح سیاسی بحران پیدا کرنے کی کوشش عروج پر ہے اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ ہر روز یہ سیاسی وڈیرے ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھار کر رہے ہیں۔ حکومت اور حزبِ اختلاف زبانی طور پر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں۔ کہیں کہیں سے جلسے جلوسوں پر فائرنگ کی بھی اطلاعات آجاتی ہیں۔ اقتدار پر حق کس کا ہے دونوں اسی بات پر لڑ رہے ہیں اور عوام دہشت گردی، مہنگائی، بے روزگاری کے بوجھ تلے دبے چلے جا رہے ہیں مگر ان کو ذرا بھی پروا نہیں۔ تھر میں لوگ قحط سے مر رہے ہیں ان کی امداد کے نام پر ٹرکوں پر بوریاں لاد کر بھیجی جا رہی ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ بہت سی بوریوں میں گندم کی بجائے بجری نکل رہی ہے مگر ان سیاست دانوں کو شرم نہیں آ رہی ہے۔ عوام کی خدمت کا عہد کر کے سامنے آنے والے رٹ لگائے ہوئے ہیں کہ ایسا غلطی سے ہو گیا یعنی 160 بوریاں گندم کی غائب ہو کر بجری کی بن گئیں۔ قحط زدہ عوام سے ایسا مذاق ......! لیکن سب خاموش۔ نہ حزبِ اختلاف کو ہوش ہے نہ حکمران زبان کھول رہے ہیں آخر عوام سے یہ سیاست داں کب تک کھیلتے رہیں گے!

معراج رسول

میر کارواں

سرگزشت

دہلی کے محلہ سیدواڑہ میں ہجل کی مسجد سے ملحق گھر میں سید غلام حسن، حسن دہلوی رہا کرتے تھے جو اپنے دور کے مستند ادب پرور گردانے جاتے تھے۔ دہلی کی ادبی دنیا ماند پڑ رہی تھی اور اودھ ادب پروری کے لیے شہرت حاصل کرتا جارہا تھا۔ انہوں نے بھی ترک وطن کی ٹھانی اور 1177ھ میں فیض آباد آگئے۔ اس وقت وہی اودھ کا دارالخلافہ تھا۔ یہاں آکر دو روپیا ماہوار پر ایک حویلی کرائے پر لی۔ 1189ھ تک وہ اسی حویلی میں رہے۔ پھر محلہ گلاب باڑی میں ذاتی مکان تعمیر کرالیا۔ یہاں بھی ان کا سکہ جم گیا تھا اور وہ میر حسن دہلوی کے نام سے مشہور ہوگئے تھے۔ ان کی سرپرستی کے لیے میر حسن سالار جنگ (نواب محمد علی شوستری) کے صاحبزادے مرزا نوازش علی سالار جنگ نے انہیں ملازمت دے دی تھی۔ نواب آصف الدولہ نے دارالحکومت فیض آباد سے لکھنو منتقل کردیا تو سالار جنگ بھی لکھنو چلے آئے۔ ان کی وجہ سے میر حسن دہلوی کو بھی لکھنو منتقل ہونا پڑا۔ وہ تو لکھنو آگئے مگر ان کے گھر والے وہیں رہے۔ اسی گلاب باڑی کی حویلی میں 1182ھ میں جنم لینے والا بچہ پروان چڑھتا رہا۔ اس کی ابتدائی تعلیم میر غلام حسین ضاحک کی نگرانی میں شروع ہوئی۔ دادا خود ہی پوتے کو تعلیم دیتے تھے پھر اس بچے کو حافظ غلام ہمدانی مصحفی کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ انہوں نے بچے کی ادبی تعلیم پر خصوصی توجہ دینی شروع کردی۔ میر حسن خود بھی مصحفی کی بہت قدر کرتے تھے اسی لیے تو مشہور زمانہ مثنوی ''سحر البیان'' پر ان کی رائے اشاعت سے پہلے لے لی تھی۔ اب اس بچے کی عمر 18 سال ہوئی تھی کہ اس پر ایک افتاد آپڑی۔ پہلے دادا میر ضاحک کا انتقال ہوا پھر والد میر حسن انتقال کرگئے۔ اب تک وہ فیض آباد میں سودا، مصدر، ضاحک جیسے قابل فن شعرے اکتساب کررہے تھے مگر والد کے انتقال کے بعد مستقلاً لکھنو آنا پڑ گیا جب کہ باقی بڑے چھوٹے بھائی وہیں فیض آباد میں رہ گئے۔ اس نے لشکر میں بزمرۂ سپاہی کی نوکری کرلی مگر شاعری میں بھی نام پیدا کرتا رہا۔ فیض آباد میں مرزا تقی ترقی نے فیض آباد میں مشاعرہ رکھا خواجہ حیدر علی آتش کو لکھنو سے بلوایا۔ اس مشاعرے میں اسے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس نے جیسے ہی یہ شعر پڑھا ''رشک آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو۔ صاف ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو'' شعر سنتے ہی آتش نے اپنی غزل پھاڑ دی کہ جب ایسا شاعر وہ بھی اتنا کمسن یہاں موجود ہے تو میری کیا ضرورت ہے۔

1231 میں ملکہ عالیہ امۃ الزہرا بہو بیگم کے انتقال ہوتے ہی لکھنو ریشہ دوانیوں کا مرکز بن گیا۔ نواب غازی الدین حیدر (1223-1229) تخت نشینی کے منتظر تھے جو انگریزوں کے ہمنوا تھے۔ ان کی نیابت نواب سید محمد ترکمان آغا میر معتمد الدولہ انجام دے رہے تھے۔ مگر انگریزوں کی وجہ سے برخاش رکھتے تھے کیوں کہ آغا میر انگریزوں کے خلاف تھے۔ دونوں میں رسہ کشی ہونے لگی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا سربراہ ارل آف مائرہ مارکوس ہسٹنگو فرخ آباد آیا تو اس سے ملاقات کے لیے نواب غازی الدین حیدر کا بیٹا مرزا نصیر الدین حیدر ایک جماعت کے ساتھ ملاقات کے لیے فرخ آباد روانہ ہوا۔ اس جماعت میں مولوی محمد بخش صدیقی شہید سندیلوی بھی تھے جو محمد علی آغا حیدر دلیر الدولہ دلاور الملک کے منشی تھے۔ وہ نوجوان شاعری کے ساتھ سپاہ گری بھی کرنے لگا تھا اور صمصام الدولہ کے ساتھ ہوگیا تھا۔ اس لیے وہ بھی اس جماعت کے ساتھ تھا۔ فرخ آباد سے واپسی پر فیض آباد نہ جاکر لکھنو آگیا اور تقریباً آٹھ سال تک یہیں رہا۔ 1216ھ میں جس خاتون سے شادی ہوئی تھی وہ اس دور کے لحاظ سے عالمہ تھی۔ انتہائی پرہیزگار، فارسی اور عربی پر دسترس رکھتی تھی جو اس زمانے میں بہت ہی بڑی بات تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی وضع، لباس، رفتار و گفتار شہر بھر کی بی بیوں کے لیے شریفانہ وضع کا مستند نمونہ تھی۔ بڑی بڑی امیر زادیاں اور بیگمات ان سے استفادہ کرتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے بچے بھی خالصتاً مذہبی رجحان کے حامل بنے۔ اس وقت جب لکھنو شعر و شاعری، کبوتر بازی و دیگر لہو لعب کے ماحول میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس ماحول سے اس خاتون نے اپنے بچوں کو بچائے رکھا اور بڑے بیٹے نے شاعری میں مذہبی رجحان کو پروکر ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ شوہر کا بھی بیوی کے بارے میں یہی کہنا تھا کہ ''میرے گھر کو سنوارنے میں میری بیوی کا اہم کردار ہے۔ کیوں کہ میں تو کاروبار زندگی میں ہی الجھا رہا۔'' اس کا کاروبار زندگی کیا تھا؟ شعر و شاعری مگر شاعری میں اس نے اپنا ایک الگ مقام بنایا تھا۔ اس سے پہلے مرثیہ نگاری عربی طرز پر ہوتی تھی مگر اس نے عربی و فارسی انداز کو تبدیل کیا اور اس میں رندانہ و حرب نامہ شامل کرکے ایک نئی شکل واضع کی اور مرثیہ نگاری کو اس اوج پر پہنچا دیا کہ اسے بھی ادب کا حصہ قرار دے دیا گیا۔ اسی لیے انہیں میر کاروانِ رثائی ادب کہا جاتا ہے۔ اس شخص کا پورا نام میر مستحسن خلیق تھا جو دنیائے ادب میں میر خلیق کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ میر انیس انہی کے بڑے بیٹے تھے۔

☆☆☆

شہرِ خیال



☆شاہد جہانگیر شاہد کا تبصرہ پشاور سے۔ ''اس بے حسی پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہوگا کہ محترم عبدالستار ایدھی جیسے حقیقی خادمِ قوم کو لوٹ لیا جائے جن کی بے لوث خدمات کو نہ صرف اہلیانِ پاکستان بلکہ عالمِ انسانیت قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ہر آزمائش کی گھڑی میں جب ایدھی صاحب اور ان کا عملہ حکومت کے کارندوں سے پہلے امداد دینے کے لیے موجود ہوتا ہے۔ ابھی ایدھی صاحب کے ادارے کو لوٹے ہوئے مہینا بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک اور فلاحی ادارے چھیپا کو لوٹ لیا گیا۔ یہ کون لوگ ہیں جن کے اعمال دیکھ اور سن کر انسانیت پر سے ایمان اٹھتا جا رہا ہے۔ ایسے واقعات دیکھ کر کیا آئندہ کوئی خدمتِ وطن کے جذبے سے میدان میں آئے گا؟ بقول درویش شاعر ساغر صدیقی (مرحوم)۔ ''جس دور میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی۔ اُس عہد کے حاکم سے کوئی بھول ہوئی ہے۔'' نہ جانے کراچی جیسے خوب صورت شہر کو کس کی نظر لگ گئی ہے کہ کسی روز بھی کوئی خوشی کی خبر نہیں آتی اور کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب کئی کئی لاشیں نہ گرتی ہوں۔ باغی شاعر حبیب جالب مرحوم نے غالباً کراچی کے لیے ہی کہا تھا کہ ''اس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے۔ زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے''۔ ''مقتولِ آزادی'' مصر کے ہر دل عزیز نوبل انعام یافتہ صدر اور وہاں کی تحریکِ آزادی کے ایک نڈر کارکن اور لیڈر انور سادات مرحوم کا زندگی نامہ بہت پسند آیا۔ عالمی سربراہ کانفرنس کو متحرک رکھنے میں انور سادات نے بے حد محنت کی تھی۔ پاکستان میں جب اسلامی سربراہ کانفرنس کے انعقاد کے موقع پر اس وقت کے روس نواز افغان مندوب نے ایک اختلافی موضوع کو چھیڑا تو اسے منہ توڑ جواب دے کر خاموش کر دیا کہ اس وقت ہم امتِ مسلمہ کی یک جہتی کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں نہ کہ اختلافات کو ہوا دینے کے لیے۔ ہماری بدقسمتی کہ جو جو لیڈر امتِ مسلمہ کو خلوصِ دل سے اکٹھا رکھنا چاہتے تھے، ایک ایک کر کے انہیں سازشوں کے ذریعے یا تو قتل کروا دیا گیا یا اقتدار سے محروم کر کے جلاوطنی کی اور گمنامی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا۔ انور سادات بھی ایک ایسی ہی شخصیت تھے۔ جس وقت قاتل نے انہیں اپنا نشانہ بنایا تو مصری ڈکٹیٹر حسنی مبارک، صدر سادات کے پہلو میں بیٹھا تھا، جس نے فوری اقتدار پر قبضہ کر لیا اور پھر تیس سال سے زیادہ عرصہ مصر کے آسمان پر ڈکٹیٹر شپ کے سیاہ بادل چھائے رہے۔ ''نوبل انعام یافتہ'' ایک نہایت معلوماتی مضمون تھا۔ خوشی ہوئی کہ پاکستان کا بھی نوبل انعام یافتہ ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ تمام نوبل انعام یافتگان کی فہرست اور مختصر مختصر تعارف بھی دلکش اور اچھے انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ ہماری ملالہ سب سے کم عمر نوبل انعام یافتہ شخصیت ہیں۔ ''تلاش'' ایک اچھی پُراسرار کہانی ہے۔ پس منظر عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ دلچسپی کے اور بھی سامان ہیں لیکن سرگزشت کا انداز چونکہ سرگزشتوں پر یا تاریخی واقعات اور کارناموں پر مبنی ہوتا ہے۔ وہاں اس قسم کی ماورائی کہانی کی جگہ بنتی تو نہیں لیکن منہ کا ذائقہ بدلنے اور وقت گزاری کے لیے اچھی ہے۔ ''الوداع'' ہلکے پھلکے اور دلچسپ اندازِ بیان کی وجہ سے بہت سی کام کی باتیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں جن سے دیارِ غیر میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ''بگرام'' ایک معلوماتی مضمون ہے۔ مزید بہتری کی گنجائش موجود ہے۔ تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے ماخذات کا ذکر کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ اگر کوئی قاری زیادہ تفصیل جاننا چاہے تو ان کتابوں سے استفادہ کر سکے۔ ''احسان'' سرورق کی کہانی ایک خوب صورت سچ بیانی ہے لیکن سرورق کہانی سے مطابقت نہیں ہے۔ ویسے سرورق خوب صورت بنایا گیا ہے۔ ''سراب'' وہی بار بار کی دہرائی ہوئی باتیں ایک جیسے فرار اور پھر گرفتاری پر مبنی واقعات اب اپنی دلچسپی کھو رہے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ کہانی کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا کر کوئی نیا اور خوب صورت سلسلہ شروع کیا جائے (کہانی اختتام کی طرف گامزن ہے)۔ ''عالمِ علم و ادب'' یک صفحی سرگزشت میں عظیم محقق، تاریخ داں و ادیب محترم محمد حسین آزاد کے حالاتِ زندگی کا خوب صورتی سے احاطہ کیا گیا ہے۔ ان کے علمی اور ادبی کارنامے بے شمار ہیں خاص کر ''خندانِ پارس'' اور ''دربارِ اکبری'' ان کی یادگار تحریریں ہیں۔ ''شہرِ خیال'' میں اعجاز حسین سٹھار صاحب کو کرسیٔ صدارت مبارک ہو۔ بشریٰ افضل، سدرہ بانو ناگوری، منشی محمد عزیز مے،

عمران جونانی، رانا شاہد ہوے والا آپ سب کا بے حد شکریہ تبصرہ پسند کرنے کا۔ طاہرہ گلزار بی بی آپ کے کالج آنا تو مشکل ہے، میری مصروفیات ایسی ہیں کہ کہیں آنا جانا مشکل ہے۔ البتہ آپ کے کالج کی یونیورسٹی میں کبھی کبھار اپنی بھانجی سے ملنے جاتا ہوں۔ اب کہ آیا تو آپ کے دیدار حاصل کروں گا۔''

☆ محمد عامر ساحل ڈیرہ اسماعیل خان سے لکھتے ہیں۔ ''تمام دوستوں کے تبصرے تعریف کے قابل تھے۔ منشی محمد عزیز نے بھی ہماری کمی کو محسوس کیا، بہت شکریہ بھائی۔ اس ماہ ''تلاش'' کی دوسری اور آخری کڑی بہت اچھی لگی۔ ایک حیرت انگیز داستان تھی۔ حادثات کے موضوع پر ''جہنمی آگ'' زبردست کہانی تھی۔ آگ بجھانے کے نظام نہ ہونے کی وجہ سے سینکڑوں جانیں متاثر ہوئیں۔ ''گلگرام'' پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ''احسان'' نظر سے گزری۔ واقعی یہ ایک حیران کن سچی بیانی تھی۔ ایک طوائف کو بھی پورا حق ہے باعزت زندگی گزارنے کا اور جو انسان ایک مرتبہ اپنے گناہوں کی سچی توبہ کرلے تو پلیز دنیا والو اس انسان کے ماضی کو مت کریدو جس سے اس کو بھی تکلیف ملے اور انسان خود بھی گناہ گار ہو۔ شادو نے بالکل ٹھیک وقت پر درست فیصلہ کیا۔ اس نے اللہ پر توکل کر کے گناہوں کی دلدل سے قدم باہر نکالا تو اس پر آزمائشیں ضرور آئیں پر اس کا اجر بہت بہترین ہے، یہاں بھی اور اگلے جہاں بھی (انشاء اللہ)۔ اس کے بعد بنتی پڑھی۔ آج کل انسان کو بے حیائی کہاں سے کہاں لیے جارہی ہے۔ اسی لیے اسلام میں حکم ہے کہ ایک لڑکا اور لڑکی جیسے ہی بالغ ہوں فوراً ان کا نکاح کر دو تا کہ وہ برائیوں سے بچ نکلیں لیکن آج کل تو شادی ہونے سے پہلے ہی سب کچھ ہو جاتا ہے یہ بھی والدین کو سوچنا چاہیے ورنہ بچوں کے ساتھ خود بھی گناہ گار ہوں گے اور عظمیٰ جیسا حال ہوگا۔ خدا کی قدرت۔ ''ہلاوا'' پڑھی یہ بھی اپنی نوعیت کی ایک حیران کردینے والی آپ بیتی تھی۔ ''چڑیل'' ایک زبردست کہانی تھی۔ احمد حسن اور حنزیلہ کی۔ کبھی کبھی ایسا مذاق مہنگا بھی پڑ جاتا ہے لہٰذا احتیاط ضروری ہے۔ ''جھوٹی'' الگ قسم کی داستان تھی۔ اس میں جو بھی ہوا وہ گلزار کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ دونوں کے قصور کی سزا صرف ایک کو ہی ملی۔ فیض الدین انصاری کا سفرنامہ ''ریس'' دلچسپ لگا لیکن انہوں نے اپنا سفر تو مکمل کیا ہوگا پر ہم کو تو لگا یہ بہت تنگ جانے سے پہلے ہی سفر میں ادھورا چھوڑ دیا اور رئیس الدین جتنی مشکلات سے دوچار ہوا یہ اس کا پھل تھا جو اب تک وہ بھوگتا آیا تھا۔ اس لیے خدا کے لیے آپ کے ذمے جو بھی کام اور فرض ہو اس کو پوری ایمانداری اور خلوص نیت سے ادا کریں تا کہ یہ زندگی بھی اور وہ زندگی بھی آسان رہے۔ جو انسان اپنی بیوی بچوں کو حرام کا رزق کھلائے گا اور حرام کی زندگی اور عیش دے گا تو اس کی بیوی بچے اس کے وفادار نہیں رہیں گے۔''

☆ سید انور عباس شاہ کی آمد دریا خان بھکر سے۔ ''شہر خیال میں اعجاز حسین سٹھار اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر تھے۔ سید عظیم شاہ بخاری بھی ایک دلچسپ اور مسحور کن تبصرے کے ساتھ شامل محفل تھے۔ خوش مزاج بہن عظمیٰ شکور کنجوہی سے کام لیتی آرہی ہیں۔ اتنا مختصر خط بھی سونے پر سہاگا تھا۔ محمد عامر ساحل طویل غیر حاضری کے بعد اپنے بھرپور شاندار تبصرے کے ساتھ شہر خیال کی زینت بنے خوش آمدید بھائی ہم سب کی ہر دلعزیز بہن طاہرہ گلزار اور شاہد جہانگیر شاہد ایک بات بتاؤں اکتوبر کے پہلے ہفتے کی ایک تاریخ کو محکمہ ڈاک کا عالمی دن منایا گیا۔ اسی سلسلے میں ریڈیو پاکستان سے ایک پروگرام بھی پیش کیا گیا جس میں محکمہ ڈاک کے ایک اعلیٰ افسر کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ موصوف محکمہ ڈاک کی کارکردگی اور اس کے اوصاف خوب بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے جب کہ اس کی زندہ مثال آپ کے سامنے ہے۔ شاہد جہانگیر شاہد کا جگمگاتا خط سبق آموز اور خاصا معلومات افزا تھا، پڑھ کر بہت کچھ حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ قیصر عباس خان، منشی محمد عزیز مے، محمد عمران جونانی، رانا محمد شاہد اور خالد محمود کے تبصرے بھی شاندار تھے۔ باقی آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ سلور جوبلی نمبر کی آپ تیاری کر رہے ہیں یا نہیں اپنے مقررہ وقت پر سلور جوبلی نمبر ضرور ہونا چاہیے اور سلور جوبلی نمبر میں ایک مفصل مضمون سرگزشت کے بارے میں بھی ہونا چاہیے جس میں اس کے کارکنان کے بارے میں مختصر تعارف مع ان کی حالیہ تصاویر کے ساتھ شامل ہونا چاہیے اور سرگزشت سے وابستہ جو عظیم ہستیاں ہم سے بچھڑ گئیں۔ ان کو شامل کرنا نہ بھولیں جیسے عظیم مصور شاہد حسین اور ہاں آپ خود یعنی انکل معراج رسول صاحب تو اس کا لازمی جز ہوں گے۔ ''باکمال بہنیں'' ایک لاجواب تحریر تھی۔ اس کہانی کا تذکرہ تو آپ نے ماہ اکتوبر کے سرورق پر کردیا تھا۔ فلمی الف لیلہ میں موسیقار سہیل رعنا کے بارے میں تفصیلات پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ ارمان فلم واقعی ایک لاجواب اور سپرہٹ فلم تھی۔ اس فلم کو امر بنانے میں دلکش موسیقی کا بڑا عمل دخل تھا۔ اس فلم کے رس بھرے گانے مالا اور احمد رشدی نے گائے تھے جو آج بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ ''احسان'' ایک خاصی دردناک کہانی تھی۔ جب شادو نے تہہ دل سے گناہ کی زندگی چھوڑ کر پاکیزہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلیا تو قدرت کی طرف سے راہیں خود بخود ہموار ہوتی چلی گئیں۔ عمران قریشی کی کہانی ''سمجھوتا'' بھی ایک باکمال تحریر تھی۔ لیکن سیرت احمد کے ساتھ دھوکے بہت ہوتے رہے۔ چراغ تلے اندھیرا والی بات تھی ان کا قریبی دوست عدیل ان کو دستار ہا اور احمد کو خبر تک نہ ہوگی۔ ''جذبہ'' جیسی مسحور کن تحریر پڑھتے وقت تو ہم پر سکتہ جیسی کیفیت طاری ہوگئی ہوش میں اس وقت آئے

جب کہانی ختم ہو چکی تھی۔ کہانی کے مرکزی کردار راجو کسی ہیرو سے کم نہیں لگے۔ بہر حال اس دفعہ خاص طور پر دو کہانیوں کے مصنف عمران قریشی اور محمد حنیف قادری مبارک باد کے مستحق ہیں۔''

☆ اویس شیخ کا خلوص نامہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ ''اداریہ پڑھا، ایدھی صاحب کے ساتھ جو افسوسناک واقعہ ہوا، ثابت ہوا ہم اپنی اخلاقی قدریں بھی کھو بیٹھے ہیں۔ محمد حسین آزاد کا تذکرہ اچھا تھا۔ شہر خیال میں قدم رکھا۔ طاہرہ گلزار کا خط بہت بھایا۔ عزیز مئے بھائی! وہ معقولہ تو سنا ہوگا کہ ''دنیا مسکرانے والوں کے ساتھ مسکراتی ہے اور رونے والوں کے ساتھ بالکل نہیں روتی'' لیکن پاکستانی معاشرے میں یہ فقرہ بے معنی ہے، برعکس اس کے معاشرہ ہمارا مسکرانے والوں کو رلاتا ہے اور رونے والوں کو اور بھی رلا دیتا ہے۔ آپ کی چھ بیٹیاں ماشاء اللہ، یقین کیجیے یہی اصل دھن ہیں۔ رہی بات طعنہ ملنے کی تو یقین کریں میرے والد صاحب کا یہ فقرہ پورے خاندان میں مشہور ہے کہ میں ایوارڈ یافتہ ''زن مرید'' ہوں۔ جن دوستوں نے میرے نامے پسند کیے، شکریہ۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر ''مقتول آزادی'' میرے لیے برتھ ڈے گفٹ تھا۔ ''نوبل انعام'' نہیں پڑھی۔ امریکا اور مغرب نے ایک عرصے سے اس انعام کے ذریعے پوری دنیا کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔ ''جہنمی آگ'' پڑھی تو اپنے شہر میں لگنے والی آگ کا منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ شاید بہت کم دوست اس واقعے سے واقف ہوں۔ ''تباہ کن''، ''ہلکرام'' اور ''کائنات'' خاصی معلوماتی تحریریں تھیں۔ ''نومبر'' میں نواب کالا باغ کے بارے میں پڑھا۔ یہ کون تھے؟ ''بیت بازی'' سلسلہ تو اچھا ہے مگر شاعر کا نام شائع نہ ہونے کی وجہ سے نہیں پڑھتا۔ سچ بیانیوں میں ''احسان'' پڑھی۔ تو ایسے لگا کہ جیسے یہ ایک طوائف کی کہانی نہیں تھی بلکہ یہ ایک پختہ ایمان، متقی اور خدا کی محبت میں ڈوبی ایک سچی مسلمان عورت کی داستان تھی۔ ''بیٹی'' خدا نے اپنے رب ہونے کا زندہ معجزہ دکھایا۔ ''بلاوا'' کچھ خاص نہیں تھی۔''

☆ احمد خان توحیدی نے کراچی سے رقم کیا ہے۔ ''معراج رسول صاحب! حادثات و قدرتی آفات حضرت انسان کو سنبھل جانے کی قدرتی وارننگ ہوتی ہے۔ زندگی بھر ملیشیا کے کپڑے پہننے والے ایدھی اور چھیپا جیسے فرشتہ صفت اشخاص کے ہاں ڈکیتی! گرفتار ہونے والوں کو روزگار فراہم کرنا ہی جرم بن گیا۔ آج 8 نومبر جون ایلیا کی 12 ویں برسی بھی آ گئی۔ عظیم لوگ سدا زندہ رہتے ہیں۔ ادھر واہگہ بارڈر پریڈ میں انڈیا کی جانب نہ بندہ نہ بندے کی ذات ویرانی اور ادھر قوم و ملک سلطنت پائندہ تابندہ باد۔ مجاہدین کی حوصلہ افزائی اپنی معروفیات چھوڑ کر جانے والے بے گناہ معصوم، بے ضمیر خودکش دہشت گرد کی بھینٹ چڑھ گئے۔ (حکمران لوگوں کو شرم نہیں آتی جو ان دہشت گردوں کے حامی ہیں)۔ دوسری جانب کراچی حکومت نے ایک روپیا ٹرانسپورٹ کرایہ کم کر کے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری ہے۔ جب کہ کنڈیکٹر کا نعرہ ہے کہ کرایہ حکومت نے کم کیا ہم نے نہیں۔ کھڑے ہوں یا چھت پر ایک روپے کا سکہ نہیں ہے۔ برادر عظیم شاہ بخاری! دنیا بھر میں لاولد جوڑوں کو بچوں کی رونق دینے والے ایدھی کو یرغمال بنا کر لوٹ مار کرنے والے بھی کبھی اپنے گریبان میں جھانکتے ہیں؟ بھائی قیصر خان بنگر، فیصل آباد کی ٹیکسٹائل صنعت، پاکستان اسٹیل دیگر قومی ادارے تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ کالا باغ ڈیم کی تعمیر سے لوڈ شیڈنگ ختم ہونے تک ایدھی اور معراج رسول جیسی قیادت ہی قومی ادارے چلا سکتی ہے۔ خالد ملتان، شاہد جہانگیر، سدرہ بانو نا گوری، ڈاکٹر قرۃ العین حیدر، رعنا محمد سجاد، انور عباس، بشریٰ افضل، منشی عزیز مئے گڈ تبصرے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، اللہ نفیس صاحب کو صحت اور آپ کو خوشیاں دیں، (آمین ثم آمین)۔''

☆ ڈاکٹر قرۃ العین کا تجزیہ اسلام آباد سے۔ ''نومبر کا خوب صورت شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ تقریباً تمام مضامین اور کہانیاں اچھی ہیں۔ مسلمان نوبل انعام یافتہ لوگوں میں آپ نے ڈاکٹر عبدالسلام کو بھی شامل کیا ہے۔ حالانکہ وہ پاکستانی ضرور تھے مگر مسلمان نہیں بلکہ کٹر احمدی تھے (غالباً آپ نے مضمون غور سے پڑھا نہیں، صاف لکھا ہے کہ اسلامی ممالک کے گیارہ افراد نے سو سال میں انعام حاصل کیا ان میں دس مسلمان اور ایک احمدی ہے) ''تباہ کن'' ایک بہت اچھا مضمون ہے۔ مریم کے خان نے بڑی خوبی سے اس موضوع کے سیاسی پہلو کو بھی اجاگر کیا۔ میں نے اسکول جانے والے اپنے دونوں بیٹوں کو بھی پڑھنے کو دیا۔ انہوں نے انتہائی دلچسپی سے پڑھا اور دیر تک اس پر بحث کرتے رہے۔ مضمون میں لاس آلموس لیبارٹری کا تذکرہ ہوا ہے۔ میرا چھوٹا بھائی بھی یہاں دو سال تک کام کرتا رہا ہے۔ رازداری کا اب بھی وہی حال ہے۔ محدود پیمانے پر پاکستانیوں یا دیگر غیر ملکیوں کو کام کرنے کی اجازت دیتے ہیں مگر ان حصوں میں جہاں زیادہ رازداری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ''جہنمی آگ'' بھی بہت دلچسپ مضمون تھا اور ''تلاش'' کی تو کیا بات ہے۔ جناب اس کہانی کو ہم نے ایک اسٹرانگ سی کپ چائے کے ساتھ مزے لے لے کر پڑھا۔ ہر شمارے میں ایسی ایک کہانی لازمی دیں۔ پُراسراریت نمبر کے لیے ہماری التجاؤں کا معراج صاحب پر کوئی اثر تو ہوتا نہیں۔ ویسے کوئی روح نمبر، مافوق الفطرت نمبر وغیرہ بھی نکال سکتے ہیں۔ ''روحانیت'' بھی ایک اچھا موضوع ہے۔ اس بارے میں بھی کچھ سوچیں۔ ''احسان'' سب سے بہترین کہانی تھی۔ شادو یقیناً

ایک پاکیزہ روح تھی تبھی اس نے برائی کی دلدل سے چھٹکارا حاصل کیا اور اس کو توبۃ النصوح نصیب ہوئی۔ شادو اور عبدالصمد دونوں نے بے مثال استقامت کا مظاہرہ کیا۔"

☆ ناصر حسین رند کا مکتوب بہاولپور سے۔ "اس دفعہ کا سرگزشت عجیب و غریب نمبر لگ رہا تھا۔ جیسے ہی سرگزشت ملا سب سے پہلے "تلاش" کو تلاش کیا۔ کیا عجیب و غریب اور پُراسرار کہانی تھی جس نے شروع سے آخر تک اپنی گرفت میں رکھا۔ مصنف کا دنیا کے آخری کونے میں انتہائی سرد اور پُراسرار مقام پر اذان کا سننا ورطۂ حیرت میں ڈال گیا اور ہم خود بخود اس کہانی کا حصہ بن گئے۔ یہ سرگزشت کا خاصہ ہے کہ ایک محیر العقول داستان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذہن پر نقش ہوگئی اور بے ساختہ ہمیں چاند پر جانے والے نیل آرم اسٹرانگ کی وہ بات یاد آگئی جب وہ اپنے قریبی دوست کے ساتھ کہیں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک اس کو ایک آواز سنائی دی اور اس نے اپنے دوست سے دریافت کیا کہ یہ آواز کیسی ہے۔ تو اس نے جواب دیا یہ مسلمانوں کی مسجد سے اذان کی آواز ہے۔ تو نیل آرم اسٹرانگ نے حیرانگی سے کہا کہ جب میں نے چاند پر قدم رکھا تو جو سب سے پہلی آواز سنائی دی وہ یہی آواز تھی۔ دوسرا اس کہانی میں حضرت داتا گنج بخشؒ کی مشہور و معروف تصنیف "کشف المحجوب" کا ذکر دل کو بھلا لگا۔ تصوف پر ایک انمول کتاب ہے۔ دوسری کہانی جس نے اس کے بعد متاثر کیا وہ "چڑیل" تھی۔ سنسنی خیز جس کی شروعات زبردست تھی لیکن اختتام ذرا جلدی میں کر دیا گیا۔ موصوف احمد حسن صاحب کہانی نویس بھی تھے۔ وہ پُراسرار گاؤں میں پندرہ دن کے لیے رہنے گئے لیکن کہانی کو دو راتوں میں سمیٹ دیا۔ اگر مصنف کہانی کو تھوڑا سا طویل کر دیتے اور نمک مصالحہ شامل کر دیتے۔ تھوڑا سراغ رسانی سے کام لیتے تو قتل کی تہ تک بھی پہنچ سکتے تھے۔ "بلاوا" شروع میں تو عاشقانہ رنگ لیے ہوئے تھی لیکن آخر میں حیرت میں مبتلا کر گئی۔ "سوال یہ ہے" واقعی عجیب کہانی تھی اگر اس کہانی کا نام ممی ڈیڈی رکھ دیتے تو کیا خوب ہوتا۔ احمد جہانگیر صاحب ہم دعا کرتے ہیں آپ کے ممی ڈیڈی کا جوڑا سلامت رہے اور جس طرح آپ کے ڈیڈی ممی بن چکے ہیں اس طرح قدرت آپ کی ممی کو ڈیڈی بنا دے۔ "احسان" جیسی کہانی پڑھ کر کسی دانا کا قول یاد آگیا کہ کسی کو برا مت کہو ہو سکتا ہے کہ اللہ کی نظر میں وہ تم سے بہتر ہو۔ "بیٹی" بھی عجیب و غریب رنگ لیے ہوئی تھی۔ "جہنمی آگ" ابن کبیر ہمیشہ کی طرح ایک الگ تحریر لیے حاضر تھے۔ "نومبر" میں محترم منظر امام دو واقعات بھول گئے۔ 26 نومبر ایک بمبئی بم حملے جس کی وجہ سے پاک ہند کی ایٹمی جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ دوسرا ناصر حسین رند کا برتھ ڈے، 26 نومبر (ہاہاہا) اعجاز حسین سٹھار ڈھیروں مبارک ہمیشہ کی طرح آپ کی تحریر دل میں اتر گئی (اللہ تعالیٰ) ہمیشہ آپ کو خوش رکھے (آمین)۔ بشریٰ افضل، مجال ہے کہ کبھی بھول کر بھی ہمیں یاد کریں۔ آپ کی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ سدرہ بانو ناگوری کے خیال سے ہم بھی ہم خیال ہوگئے۔ منشی محمد عزیز میئے کی محبت قابل تعریف ہے۔ محمد عمران جونانی، رانا محمد شاہد اور شاہد جہانگیر شاہد کے تبصرے قابلِ غور اور قابلِ تعریف تھے۔ خالد محمود، ترجمے کے ساتھ الرجک لگ رہے تھے برادر اگر ترجمہ کسی بہترین تحریر کا ہے وہ انگریزی ہو فارسی یا عربی ہو اس میں چڑنے والی کون سی بات ہے دنیا کا ادب ویسے ہے بھی ان تین زبانوں میں۔ ایسی تحریر کا ترجمہ نہ کرنا اردو کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ قارئین کو یاد ہوگا پچھلے سال ہم نے سالانہ جائزہ نہیں بلکہ پُراسرار تحریروں کی لسٹ فراہم کی تھی تین چار دوستوں کا ذکر کر دیا جسے چند دوست احباب سالانہ رپورٹ سمجھ بیٹھے حالانکہ ہمارے سرگزشت کے پرانے دوست اور ساتھی خالد کبیر سال میں ایک بار سالانہ رپورٹ کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں ان کا حق سب سے زیادہ ہے۔ وہ سال میں ایک بار آتے ہیں اور خوب آتے ہیں۔ وحید ریاست بھٹی کی غیر حاضری دل کو ناگوار گزری۔ ملک جاوید خان سرکانی ورانی، آفتاب احمد نصیر، تفسیر عباس بابر اور سہیل احمد عباسی کو بہت شدت سے یاد کر رہے ہیں۔ بھی۔ "کہاں گم ہو آ بھی جاؤ۔"

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا تبصرہ لاہور سے۔ "معراج رسول صاحب آپ کی طرح ہم بھی اپنے مسیحا سے شرمندہ ہیں کہ ہم ان کے شایانِ شان ان کی توقیر نہیں کر پائے۔ عوام کی جان و مال کے تحفظ کا حلف اٹھا کر اشرافیہ کے ذاتی ملازم بن جانے والے ہمارے محافظ اگر فقیر منش عبدالستار ایدھی کے علم میں لائے بغیر ان کی جان و مال کی حفاظت کا بندوبست کر دیتے تو کوئی قیامت نہ آجاتی۔ "مقتولِ آزادی" مصر کے انور سادات کی اپنی قوم کے لیے کی گئی جدوجہد آزادی کی متاثر کن داستان تھی جس کی تعریف اس کا حق ہے۔ اسرائیل سے دوستی کی خواہش ان کا کمزور فیصلہ تھا جس کی سزا قوم نے انہیں دے دی۔ امت مسلمہ کے اکثر حکمران بھی اسرائیل کی وقتی کامیابی سے خوف زدہ ہو کر اس کی کٹھ پتلی بننے پر اس لیے مجبور ہیں کہ کمزور عقیدہ اور کمزور کردار نے انہیں ایسا بنا رکھا ہے ورنہ متحد مسلمان یہودیوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا سکتے ہیں اگر اسرائیل کی طرف منہ کر کے صرف تھوک ہی دیں تو وہ بہہ جائے۔ مسلمانوں کو ملنے والے نوبل انعام اور انعام یافتہ مسلمانوں کی اکثریت متنازعہ ہے۔ یہ ایوارڈ یا انعام ہرگز شفاف و غیر جانبدار نہیں کہلایا جا سکتا۔ نوبل انعام میں مصر کے مسلمانوں کو فوقیت دی گئی ہے اور مصر کی سیاسی و جغرافیائی اہمیت اسرائیل و امریکا کے لیے کیا

ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ مصر کے انور سادات کو نوبل انعام کا حق دار اس وقت قرار دیا گیا جب وہ اسرائیل سے نہ صرف دوستی کے لیے تیار ہو گئے بلکہ اسرائیل جا بھی پہنچے۔ مصر کے نجیب محفوظ کی شخصیت متنازعہ ہے۔ مسلمانوں کے خلاف اپنی تصنیف پر وہ فتویٰ واجب القتل کے حق دار قرار پائے۔ مصر کے ہی محمد البرادعی کو یہ انعام اس لیے دیا گیا کہ وہ دنیا بھر میں ایٹمی اسلحے کی تخفیف کے مشن پر تھے برائے نام تخفیف کے بدلے یہود و نصاریٰ نے کتنا ایٹمی اسلحہ نیا بنایا اس کی طرف انہوں نے دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی۔ مسلم کش ایٹمی ہوس پر وہ کوئی قدغن نہ لگا سکے۔ مصر کو اور یرموک کو اس لیے انعام سے نوازا گیا کہ وہ اسلام کے نام پر ہونے والے معرکوں کے سب سے بڑے نکتہ چیں تھے۔ احمد حسن زویل وہ واحد مصری تھے جنہیں کیمیا کا نوبل انعام میرٹ پر دیا گیا اسی صف میں بنگلہ دیش کے محمد یونس بھی شامل ہیں جن کی قابلیت کو تسلیم کرنا نوبل انعام کے لیے خود اعزاز کی بات تھی۔ فلسطین کے یاسر عرفات بھی فلسطین کے مسلح جدوجہد سے دست بردار ہونے کے بعد اس عزت کے حق دار ٹھہرے۔ ترکی کی توکل کرمان اس بات پر حق دار ٹھہریں کہ وہ مسلمان لڑکیوں کے حقوق کی جدوجہد میں اس قدر پُرجوش ہو گئیں کہ ان پر سترہ سال سے پہلے شادی پر پابندی کا مطالبہ کر دیا جو مذہب اسلام سے ہم آہنگ نہ تھا کیوں کہ ہمارا مذہب لڑکے لڑکیوں کی شادی کے لیے بالغ ہونے کو بنیاد بناتا ہے۔ ایران کی شیریں عبادی کو ملنے والی نوبل عزت بھی ان کی عوام نے سیاسی فیصلہ قرار دے دی۔ مندرجہ بالا شخصیات کی انتہائی اعلیٰ درجہ کی ذہانت و قابلیت وانتھک جدوجہد اور قابل قدر کوششوں کو بھی نوبل انعام نے متنازعہ بنا ڈالا۔ اسی طرح پاکستان کے ڈاکٹر عبدالسلام کے کارناموں کی تفصیل اتنی زیادہ ہے کہ اگر وہ نوبل انعام کے حق دار نہ ٹھہرتے تو بھی ان کی ذہنی و شخصی دلکشی برقرار رہتی، ربوہ میں ان کی تدفین عام حالات میں ایک عام سی بات ہے لیکن اس متنازعہ ایوارڈ نے ان کی اعلیٰ کارکردگی کو دھندلانے کی کوشش کی۔ اب ذکر ہو جائے ملالہ یوسف زئی کا کہ چند عاقبت نااندیشوں کے ذاتی فعل نے ملالہ یوسف زئی کو بین الاقوامی شہرت تو عطا کر دی لیکن ملک و قوم و مذہب نے کیا کھویا کیا پایا اس کا ادراک نہ تو ان پر حملہ کرنے والے مذہب کے خودساختہ ترجمانوں کو ہے اور نہ اس کی حساسیت کا اندازہ ملالہ کر پا رہی ہے۔ اسلام دشمن غیر ملکی جانبدار میڈیا کے سامنے ان کی غیر محتاط گفتگو ان سے محبت کرنے والوں اور حب الوطنی کا درد رکھنے والوں کی دل آزاری کا باعث بن رہی ہے۔ شہرِ خیال کے دوستوں سے گریز بے وفائی نہ سمجھا جائے اس لیے سب سے پہلے ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری صاحبہ معہ نفیس صاحب کی خیریت کے مجلس میں حاضر ہوں۔ بشریٰ افضل صاحبہ کی ایک تحریر دوبارہ لکھوا کر ضرور شائع کی جائے تاکہ انہیں یہ اندازہ ہو جائے کہ ان سے لکھنے میں کہاں کوتاہی ہو رہی ہے۔ اعجاز حسین سٹھار کو مبارک باد حضرت سلیمان فارسیؓ کے مزار مبارک پر فاتحہ خوانی کی اور مسند صدارت پر بیٹھنے کی۔ سید انور عباس شاہ، طاہر گلزار صاحب اور رانا محمد شاہد ہمارے تبصرے پر تعریف کا شکریہ اور شکریہ منشی محمد عزیز مے صاحب کا بھی کہ انہوں نے ہمارے شعر کا جواب دیا۔ ہم سیاستدانوں کا سرگزشت میں چھپنے پر مخالفت کا ووٹ دیتے ہیں کہ یہ تجربہ ماضی میں ناکام ہو چکا ہے کوئی سیاستدان سچ نہیں بولتا ہر کوئی پارٹی پالیسی اور رہنماؤں کی مداح سرائی کرتا ہے اور جب وہ نئی پارٹی جوائن کرتا ہے تو سابقہ تعریفیں تنقید اور خوبیاں خامیاں بن جاتی ہیں اور نئی پارٹی کی سابقہ خرابیاں اور خامیاں خوبیاں بن جاتی ہیں یہ ہے وہ جھوٹ جو ہمارے رہبر و رہنما روزانہ مختلف چینلو پر دھڑلے کے ساتھ بولتے نظر آتے ہیں خدارا سرگزشت کو اس سے پاک ہی رکھیے۔"

☆ منشی محمد عزیز مے لڈن ضلع وہاڑی سے لکھتے ہیں۔ "اداریے میں محترم معراج رسول، جناب عبدالستار ایدھی کے لٹنے کی داستان سنا رہے تھے۔ محترم انکل! پاکستان میں اب یہی ہو رہا ہے۔ محرم الحرام میں گلاب کے پھولوں کے ساتھ ساتھ پھلوں اور متعلقہ چیزوں کے ریٹ عام دنوں کی نسبت ڈبل ہو چکے تھے کیوں کہ یہ بھی لوٹ مار کرنے والوں کے لیے ایک بہترین موقع ہے۔ اعجاز حسین سٹھار صاحب ابڑے عرصے بعد آئے۔ دیر آید درست آید۔ کرسیٔ صدارت کے لیے مبارک باد۔ بشریٰ افضل! ایک خط کی اشاعت سے ایک سیر خون بڑھتا ہے تو سال بھر میں......؟ خالد محمود کا خط پڑھ کر حیرت ہوئی کہ محترم نہ جانے کیسا سرگزشت پڑھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ سرگزشت از آل ان ون۔ اس میں فلم، مذہب، سیاست، کھیل، معاشرت، سچ بیانیاں سب کچھ ہی تو ہے۔ شہر خیال کے دوستوں کی آپس میں گپ شپ خلوص اور محبت کو بڑھاوا دیتی ہے اور ہم سب کا تو مشن ہی یہی ہونا چاہیے کہ نفرتوں اور منافقت کے اس دور میں خلوص اور بے لوث محبت کو بڑھاوا دیا جائے اور کسی بھی روتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ لائی جائے۔ آپ یقیناً میری اس بات کی تائید کریں گے۔ سب سے پہلے "تلاش" مکمل کی۔ سچ مجھے بہت مزہ دیا اس تحریر نے۔ اسے پُراسرار ہی کہا جا سکتا ہے۔ بہر کیف حماد صاحب کو ان کی محبت وریشا مبارک ہو۔ "فلمی الف لیلہ" میں جاوید پاشا کے خط کا تذکرہ تھا۔ جاوید صاحب! اب آپ بھی غصہ جانے دیں اور سرگزشت کے لیے جلد از جلد اچھی اچھی تحریریں بھیجیں۔ اس کے بعد پہلی سچ بیانی "احسان" پڑھی۔ سچ پوچھیں تو یہ کہانی پڑھتے ہوئے بار بار آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ "بیٹی" ایک سبق آموز تحریر تھی جس میں شاہینہ کو اس کے گناہ کی سزا اللہ تعالیٰ نے یوں دی کہ وہ اپنی سگی بیٹی کو ایک لے پالک کی طرح رکھ سکتی ہے۔ سگی بیٹی نہیں کہہ سکتی۔ "بلاوا" محبت اور رقابت کے مابین گھومتی حیرت

انگیز کہانی تھی۔ ''چڑیل'' کو احمد حسن صاحب نے بہت خوب قابو کیا۔ محترم سلیم اختر ''جھوٹی'' کے عنوان سے ایک بے وفا لڑکی کی داستان حیات لائے جس نے اپنے محبوب کو ڈاکو بننے پر مجبور کر دیا۔ ''ریس'' میں سرکاری دفاتر میں ہونے والے کارناموں کی جھلک خوب دکھائی اور ساتھ میں شمالی علاقہ جات کی سیر بھی کروا دی۔ محترم فیض الدین انصاری نے احمد جہانگیر کا ''سوال یہ ہے'' انتہائی افسوس ناک اور درد بھری کہانی ہے۔ ہمارے قریب کے گاؤں میں ایک زندہ مثال اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ ہمارے گھر سے سات کلومیٹر دور ایک شخص کی پانچ بیٹیاں اور بیٹا ایک ہی تھا۔ اس کی مجھلی لڑکی جس کی عمر چودہ پندرہ سال تھی تبدیلی جنس کے کامیاب آپریشن کے بعد لڑکا بن گئی اور بہت سے لوگ اسے دیکھنے گئے۔ ''جذبہ'' ایک مجاہد کی دلیری اور وطن پرستی کی داستان تھی۔ ''سمجھوتا'' میں کومل ماشی پہلے تو مظلوم لگی مگر حقیقت کھلنے پر پتا چلا کہ وہ تو ظالم تھی۔ مظلوم تو بے چارہ احمد تھا۔ بٹ گرام میں ایاز راہی صاحب نے معلومات میں اضافہ کیا۔ عقیل عباس جعفری صاحب بہت بڑے محقق ہیں اور اس بار بھی وہ بہت زبردست مواد لائے ہیں۔ نوبل انعام کے حوالے سے۔ مقتول آزادی ڈاکٹر ساجد امجد کا ایک اور شاہکار تھا۔ ''باکمال بہنیں'' واقعی باکمال تھیں۔ ''الوداع'' میں سفر کہانی کے ساتھ جہاز بیتی سے متعلق معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ ''شہر خیال'' میں اعجاز حسین سٹھار کے علاوہ سید محمد عظیم شاہ بخاری، طاہرہ گلزار، سدرہ بانو اور عمران جونانی کے خطوط بہترین تھے۔ روبینہ نفیس انصاری، ڈاکٹر قرۃ العین زینب، آفتاب احمد نصیر اشرفی، وحید ریاست بھٹی، انجم فاروق ساحلی، شہناز ندیم جونیجو، ملک عبدالوحید، طلعت جبیں نیاز اور ناصر حسین۔ ہمایوں دین پوری۔ آج آپ لوگ بہت یاد آرہے ہیں۔ میرے اقتباسات کا کیا بنا؟ (اقتباسات طویل اور الجھے ہوئے ہیں)۔''

☆ قیصر خان کی آمد بھکر سے۔ ''شہر خیال کے باسیو کو سلام۔ اداریہ میں انکل جی نے عبدالستار ایدھی کے واقعہ کو بیان کیا ہے جس کی مذمت جتنی کی جائے کم ہے۔ وہ اللہ لوک آدمی، دکھی انسانیت کی بہت خدمت کر رہا ہے۔ ہمارے معاشرے کے ناسور ہیں ایسے لوگ جو ایسے برے کام کرتے ہیں۔ میرا مشورہ ہے اگر آئی جی سندھ ذوالفقار چیمہ کو لگا دیا جائے تو حالات بہت حد تک ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ کام کی جگہ پر ہمارے ملک میں نااہل لوگ ہوتے ہیں اور فضول جگہ پر اہل لوگ۔ اللہ پاک کے حکم سے جلد ہی کوئی راہ نکلے گی۔ اب ضرورت ہے کہ پرانا نظام پرانے لوگوں کے ساتھ دفن ہو جائے۔ ''شہر خیال'' میں حاجی اعجاز صاحب کرسیٔ صدارت پر تھے، مبارک باد۔ تبصرہ اچھا تھا۔ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ کا تبصرہ شامل تھا۔ پڑھ کر خوشی ملی کہ پیشہ وارانہ ذمہ داریوں میں مصروف تھیں۔ مہربانی ہے جو ٹائم نکال لیتی ہیں اللہ کرم رکھے آپ پر (آمین)۔ خوش آمدید محمد عامر ساحل جی بہت انتظار کے بعد حاضر ہوئے۔ لگاؤ ہے آپ سے جناب سید انور عباس شاہ میرے ضلع کے ہیں اور مجھ سے بیس کلومیٹر کی دوری پر ہیں ان سے ملاقات کو دل کرتا ہے۔ آپا طاہرہ گلزار حاضر تھیں۔ بہت خوشی ہوئی پڑھ کر آپا جان بہنیں ہوتی ہیں پیار کا رشتہ۔ محمد سجاد صاحب غیر حاضری سب کی محسوس ہوئی ہے۔ سدرہ بانو آپا، منشی محمد عزیز، محمد عمران جونانی، شاہد جہانگیر شاہد صاحب کے تبصرے پسند آئے۔ رانا محمد شاہد نے زیادہ تفصیل سے نہیں لکھا، مصروف تھے غالباً لیکن حاضر تھے۔ خالد محمود صاحب غالباً پہلی بار حاضر تھے لیکن بہت کرارے انداز میں تبصرہ لکھا، پڑھ کر نیا لگا۔ قاری بہت پرانے ہیں لیکن بہت زیادہ مطالعہ بھی رکھتے ہیں۔ سرگزشت کی روش کو ٹھیک نہیں جان سکے۔ پسندیدگی کی وجہ سے ہی ترجمہ لگتا ہے۔ اب جواب پا کر مطمئن ہوں گے آپ سے اپیل ہے خالد محمود ملتان تبصرے میں اپنی رائے پیش کیا کریں۔ آپ کا تبصرہ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ''احسان'' عبدالصمد جیسے باکردار لوگ اس معاشرے میں ختم نہیں ہوئے لیکن خاموش ہیں۔ گناہ سے نفرت کا حکم ہے۔ گناہ گار سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ خوشیاں دے شاہ اور صمد صاحب کو۔ واقعی دین حقیقی میں آزمائشوں کا ہونا ثابت ہے۔ ''بیٹی'' مکافات عمل کہوں گا ناجائز خود کیا ہے جب کہ انتظار کر کے جائز ہو جاتی ہے۔ شاہینہ صاحبہ اللہ تعالیٰ نے آزمائش دی ہے اور ساتھ معافی بھی دی ہے کہ اولاد تو اپنی ہے۔ ''بلاوا'' ایسے واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں سننے کو ملتے ہیں لیکن حقیقت سے ان کا کتنا تعلق ہے پتا نہیں۔ ''چڑیل'' احمد حسن کی اپنی محبت کی خوب صورت کہانی۔ بہت خوب صورتی سے اپنی کہانی کو سرگزشت کا حصہ بنایا۔ ''جھوٹی'' گلزار کو اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہوں کی معافی دے دی۔ نرگس کی مجبوری تھی اگر وہ اقرار کرتی تو غالباً گلزار کے ساتھ پورا خاندان قتل کر دیا جاتا۔ نرگس بھی ماردی جاتی لیکن گلوڈکیت محبت میں ناکامی کی وجہ میں نہ تھی محبوبہ کے چھوڑنے کی وجہ سے بنا وہ اس کی ذاتی فطرت تھی۔''

☆ بشریٰ افضل بہاولپور سے لکھتی ہیں۔ ''29 اکتوبر کو سرگزشت ملا تاکیل گرل کی بے ساختہ ہنسی نے تو دل ہی موہ لیا۔ گجروں کا ماہیر بینڈ اور بھنگ کان میں تو پس اپنی ہی چھب دکھا رہے ہیں یہ کیا مسجد میں لوگ نماز کے لیے کھڑے ہیں (جی نہیں گلی میں بھیڑ جمع ہے) یہ کون سی شخصیت کار پر براجمان ہے اور سگار سے لطف اندوز ہو رہے ہیں (انور سادات) انکل کی باتیں سنیں۔ دراصل لوگوں کے پاس روزگار نہیں ہے تو وہ شارٹ کٹ استعمال کرتے ہیں۔ کم از کم لوگوں کو لوٹنے کا کام تو نہ اپنائیں۔ عزت والا کام کر کے عزت بھی کمائیں۔ اتنی اہم شخصیت کو بھی نہ بخشا افسوس ہوا۔ اپنی محفل میں حاضری دی۔ اعجاز حسین سٹھار کرسیٔ صدارت مبارک ہو۔ رانا شاہد صاحب بیٹے کی

پیدائش مبارک ہو۔ ڈاکٹر قرۃ العین دشمن تو مسلسل میرے پیچھے ہے۔ میں نے بھی خدا کی رسی پکڑلی ہے جب ہم ان کو معاف کردیتے ہیں تو خدا خود ہی مجھے مشکلوں سے نجات دلا دیتا ہے۔ طاہر گلزار خیر ہے کون لوگ ہیں جو آپ کے دشمن ہیں۔ خدا ہی ان کو نیک ہدایت دے۔ ہمیں دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔‘‘

☆ سیدہ بانو ناگوری کا مراسلہ کراچی سے۔ ’’شہر خیال کے ساتھیوں نے میرا تبصرہ پسند کیا اس کا شکریہ۔ شاہد جہانگیر شاہد کے تبصرے نے ایک بار پھر ’’شہاب نامہ‘‘ کھولنے پر مجبور کردیا۔ محترم قدرت اللہ شہاب نے سلسلہ شہابیہ نہیں بلکہ سلسلہ اویسیہ جاری کیا تھا جس کی تفصیل شہاب نامے کے آخری باب میں موجود ہے۔ حماد خان کی ’’تلاش‘‘ پڑھی، انتہائی دلچسپ، حیرت انگیز اور ماورائی ماضی سے لبریز اس ماڈرن دور میں اختتام پذیر ہونے والی کہانی بہت پسند آئی۔ خاص طور پر وہ منظر جب سب چراغ بجھا دیے گئے۔ صرف دیے جلتے رہ گئے کسی نے کیا خوب کہا ہے جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا۔ بہت اچھی اور دل کو چھو لینے والی انجام سے بھرپور روداد محبت تھی۔ ابن کبیر حسب معمول دہشت سے بھرپور ’’جہنمی آگ‘‘ لے کر آئے اور خوف و دہشت نے لپیٹ میں لے لیا۔ بہت اچھے۔ قدم بقدم آگے بڑھتی اس آتشی روداد نے ہلا کر رکھ دیا اب تو ابن کبیر کا نام پڑھتے ہی کسی المناک روداد کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ نہ جانے کہاں سے خون کے آنسو رلا دینے والی کہانیاں لے کر آتے ہیں اور چھا جاتے ہیں۔ باجی طاہرہ گلزار نے ’’سراب‘‘ پر تبصرہ کیا ہے گویا پہلا پتھر ایک وقفے کے بعد پھینکا ہے تو ہم اسے آگے بڑھاتے ہیں۔ اب تو سراب مسلسل اغوا، رہائی کا مرقع بن گئی ہے ادھر وہ برف والا ہاتھ والے کے انتظار میں کہیں پگھل نہ جائے۔ بیتو کے بغیر پھیکا سالن اچھی مثال دی ہے باجی طاہرہ نے مزہ آیا۔ اس بار مسلمان نوبل انعام یافتہ لوگوں کا ذکر خیر ہوا۔ اس میں خیر سے دو پاکستانی بھی شامل تھے۔ ایک ڈاکٹر عبدالسلام جو اپنے مخصوص فرقے سے تعلق رکھنے کی بنا پر راندہ درگاہ ٹھہرے اور دوسری ملالہ یوسف زئی وہ بھی متنازع ہی رہیں۔ ہم پاکستانیوں کو شاید اپنے لوگوں پر بھروسا نہیں ہے شاید ہم اپنے لوگوں کی کامیابیوں سے جلتے ہیں ہمیں اپنا رویہ ترک کرنا ہوگا۔ ’’قلمی الف لیلہ‘‘ میں آفاقی انکل تنقید پر شکوہ کرتے نظر آئے۔ یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ انکل ’’شہر خیال‘‘ کے خطوط بھی پڑھتے ہیں۔ اس دفعہ ہالی ووڈ کا تذکرہ کرتے انکل اچھے لگے۔ خاص طور پر گزرے وقتوں میں ہالی ووڈ کے شریف ہونے کا تذکرہ اچھا تھا۔ زینت امان اپنے بچوں کے ساتھ نظر آئیں۔ ماں تو ماں ہوتی ہے چاہے جیسی بھی ہو۔ انجلینا جولی کے بارے میں چند جملے اچھے نہیں لگے۔ انکل کچھ نمبر تو انہیں اس خدمت خلق کے ملنے چاہئیں کیوں کہ انہوں نے اپنا امیج اب بہتر بنالیا ہے۔ پہلی سچ بیانی میں عبدالصمد کے صبر و استقامت پڑھ کر آنکھیں بھر آئیں۔ ’’رلیس‘‘ پسند نہیں آئی جس میں دو بیوروکریٹ افسروں کا ٹکراؤ تھا۔ جس میں ہمارا شیر جیت گیا۔ ’’سوال یہ ہے‘‘ ایک ہلکی پھلکی تفریح کہانی تھی اور اس کے آخر میں اٹھائے گئے سوالات نے ذہن ہلکا پھلکا کردیا اور یہی اس کے مصنف کا مقصد بھی تھا جو پورا ہو گیا۔ ’’احسان‘‘ صبر اور بھروسے پر ایمان تازہ کر دینے والی داستان ہے جو عرصے تک یاد رہے گی۔‘‘

☆ محمد عمران جونانی کراچی سے رقمطراز ہیں۔ ’’نومبر کے شمارے کے لیے خط جلدی پوسٹ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اکتوبر والے ڈائجسٹ میں کچھ ایسی چونکا دینے والی تحریریں نظر سے گزریں جن کے بارے میں کچھ نہ لکھنا زیادتی ہوگی اس ضمن میں پہلی منیر نیازی صاحب کے بارے میں انور فرہاد صاحب کی تحریر ہے نہایت خوبی و اختصار کے ساتھ اس عظیم شاعر کو چند صفحات میں سمیٹنا آسان کام نہیں۔ کچھ نمونہ کلام بھی شامل کلام ہوتا تو مزا دو آتشہ ہو جاتا۔ اس کے بعد ذکر کرنا چاہوں گا ابن کبیر کی ’’خطائے ہواباز‘‘ کا۔ حسب معمول ابن کبیر کا قلم آخر تک اپنے سحر میں جکڑنے میں پوری طرح کامیاب رہا۔ ابواب کی صورت میں درسین کہانی بیان کرنا ابن کبیر کا خاصہ ہے۔ کاش ہمارے ملک میں بھی کچھ معاملات میں اسی طرح بال کی کھال نکال کر تفتیش کرلی جاتی۔ ایک اور تحریر ’’تلاش‘‘ کا ذکر کرنے کی اجازت دیں جو کہ ہمارے لیے خوب صورت تحفہ ثابت ہوئی۔ منظر نگاری عمدہ اور پلاٹ شاندار تھا۔ محیر العقل ہونے کے باوجود کہیں جھول نظر نہیں آیا جن لوگوں نے اب تک سرگزشت نہیں پڑھا انہیں مندرجہ بالا تحریریں پڑھا دیں، باقاعدہ قاری بن جائیں گے۔ نومبر کا اداریہ پڑھ کر ایک بات کا اضافہ کرنا چاہوں گا واردات کے بعد ایدھی صاحب نے رپورٹر سے بات کرتے ہوئے کہا کہ ’’مجھے مال سے زیادہ افسوس وقار کے مجروح ہونے کا ہے‘‘ خود سوچیں جس نے ساری زندگی قوم کی خدمت میں گزار دی۔ اس سے چند سر پھرے نوجوان یہ کہیں کہ ’’چل بڈھے تیرا وقت آگیا ہے‘‘ تو اس کے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ ابن کبیر نے اپنے مخصوص انداز میں ’’آگ‘‘ کہانی سنائی۔ انسان عجیب مخلوق ہے نہ چاہتے ہوئے بھی ایسی غفلتیں کر جاتا ہے کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے والی بات ہو جاتی ہے۔ ’’قلمی الف لیلہ‘‘ کی ابتدا آفاقی صاحب نے ’’شہر خیال‘‘ کے تذکرے سے کی یہ جان کر خوشی ہوئی کہ محترم ان تبصروں پر نظر رکھتے ہیں۔ حسن رزاقی صاحب کی ’’الوداع‘‘ مجھ جیسے نوکری پیشہ کے لیے تحفہ ثابت ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے علم کا دریا ہولے ہولے بہہ رہا ہے۔ مانسہرہ، ایبٹ آباد، بٹگرام وغیرہ کا نام آتے ہی ٹھنڈی ہواؤں اور پر کیف نظاروں کا احساس گھیرے میں لے لیتا ہے۔ مختصر تحریر میں ایاز راہی نے خوب

سیر کروائی۔ ڈاکٹر بھٹی کی ”کمسن جنگجو“ پڑھ کر اپنی عافیت والی زندگی پر شکر مزید بڑھ گیا۔ آخر وہ بھی تو کسی کی اولاد ہیں جو آٹھ سال کی عمر میں بندوق اٹھائے دھکے کھا رہے ہیں۔ بشریٰ افضل نے اپنے خط میں سچ کہا کہ ہلکی پھلکی نوک جھوک مزا دیتی ہے۔ سچ بیانوں پر آپ کا تبصرہ اچھا لگا۔ اس کے بعد ڈاکٹر قرۃ العین کا پُرخلوص نامہ ہے۔ ساتھیوں سے فرداً فرداً علیک سلیک پسند آئی۔ نیٹ اور کھیل کے بارے میں آپ کے خیالات اور گھر کے اندر رائج طریقہ قابلِ تقلید ہے۔ سید محمد عظیم کا تبصرہ اس مرتبہ بھی بازی لے جا رہا ہے۔ عظمیٰ شکور! اکتوبر کا موسم اور خوشگوار؟ کراچی میں تو کافی گرمی رہی۔“

☆ سلطان مسعود بہاولپور سے لکھتے ہیں۔ ”نومبر کے ”عمیرِ خیال“ میں خط نہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ حالانکہ وہ خط میں نے 13 اکتوبر کو ڈاک کے سپرد کیا تھا۔ خط تو چلیے شاید دیر سے ملا ہو یا محکمہ ڈاک کو پسند آ گیا ہو مگر بذریعہ ای میل بھیجا گیا خط بھی کیا آپ تک نہیں پہنچا؟ (وہ ای میل میری فیملی پر پرچہ جانے کے بعد آیا)۔ نومبر کے سرگزشت میں شامل نہ ہو سکنے والا خط میرے نزدیک اس لیے بھی اہم تھا کہ میں اکتوبر کے شمارے کے ٹائٹل پر چھپنے والی ”باکمال بہنیں“ کا ذکر تھا مگر شمارے میں اس نام کا کوئی مضمون نہیں تھا۔ میں نے اپنے خط میں پیش گوئی کی تھی کہ یہ ”باکمال بہنیں“ برونٹے سسٹرز ہوں گی کیوں کہ ایک تو میں انہیں پڑھ چکا تھا۔ دوسرا ان کا تعلق میرے شہر بریڈ فورڈ سے تھا مجھے ان کا گھر جواب میوزیم ہے دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا ہے۔ نومبر کے شمارے میں ان بہنوں کے بارے میں پڑھ کر خوشی ہوئی کہ میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ حالیہ شمارے میں کہانی ”ریس“ کی ایک بات سمجھ نہیں آئی جس میں مصنف نے جن تین بچوں کا ذکر کیا ہے ان میں بڑا لڑکا او لیول پاس کر چکا ہے۔ جب کہ منجھلے لڑکے نے اے لیول پاس کیا اور سب سے چھوٹی بیٹی اے لیول میں ہے جب کہ اے لیول او لیول کے بعد پاس کیا جاتا ہے تو گویا بڑے صاحبزادے شاید فیل ہوتے رہے۔ جب ہی تو چھوٹے بھائی اور بہن سے پچھلی کلاس میں تھے (یہ اندازہ بھی درست ہے) ”الوداع“ بہترین جا رہا ہے۔ اسے دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ ایک تو ایوی ایشن میرا پسندیدہ مضمون ہے دوسرا میرا چھوٹا بھائی بھی قومی ائیر لائن میں ائیر کرافٹ انجینئر ہے۔ ہمیشہ کی طرح یہ شمارہ بھی لاجواب ہے۔“

☆ طاہرہ گلزار کی آمد بالکل آخروقت پر پشاور سے۔ ”میں ہمیشہ ایک خواب دیکھتی ہوں کہ یہ ملک ایک پُرامن اور خوش حال ملک بن جائے۔ ہر انسان کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔ گھر کی چھت مہیا ہو۔ صحیح تعلیم اور روزگار مہیا ہو۔ بہن بیٹی کی عزت و احترام ہو جہیز کی لعنت نہ ہو۔ ہر لڑکا اپنے لیے صرف ایسی لڑکی چنے جو بااخلاق، نیک اور صالح ہو۔ ایک آدم اور ایک حوا کی طرح عزت و احترام کے ساتھ میاں بیوی رہیں۔ چار بیویوں کا شوشا اپنی ہوس اور عیاشی کے لیے نہ ہو۔ اسلام کو موم کی ناک نہ بنائیں کہ جہاں چاہا اپنے مطلب کے لیے موڑ لیا۔ غیرت کے نام پر بہن اور بیٹی قتل نہ ہو۔ جہاں چولہے صرف بہو پر نہ پھٹے۔ بیٹے کی خواہش پوری نہ کرنے پر بیوی کو طلاق نہ ملے۔ جہاں پر بیٹے کو نعمت اور بیٹی کو رحمت سمجھا جائے۔ جہاں کھلاڑیوں کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ اس بار پھر میرے پسندیدہ کھلاڑی شعیب ملک کے ساتھ ناانصافی کی گئی۔ غیر ممالک میں ان کو عزت دی جاتی ہے جبھی تو وہ Tenstion Free ہو کر کھیلتے ہیں۔ کاش کبھی میرا یہ خواب پورا ہو۔ بہت مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اللہ ہم سب پر اور تمام مسلمانوں پر رحم کرے (آمین ثم آمین)۔ چلتے ہیں اب ذرا شہرِ خیال کی طرف۔ لیکن ان سے پہلے یک مُشتی پر محمد حسین آزاد کے بارے میں پڑھ کے اپنا F.A کا دور یاد آ گیا۔ اردو ادب کے شمس العلما کو لوگ تاقیامت یاد کرتے رہیں گے۔ ویلڈن معراج انکل لیکن میں اقلم علیم صاحب سے سخت ناراض ہوں۔ تقریباً سات آٹھ مہینے پہلے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں سوداگر کی طرح ایک اور شاہکار دوں گا لیکن اب تک وعدہ پورا نہیں کیا۔ تین دن پہلے بھائی عمران جونانی نے خط شائع ہونے کی خوش خبری دی تو دل گارڈن گارڈن ہو گیا۔ بھاگی بھاگی گئی اور اپنا سویٹ سویٹ سرگزشت لے آئی لیکن خط تو 5 یا 6 تاریخ کو پوسٹ کر سکوں گی۔ محرم کی چھٹی کی وجہ سے پتا نہیں شائع بھی ہو سکے گا کہ نہیں۔ پہلے نمبر پر بھائی اعجاز حسین سٹھار کا خط آیا بہت شاندار اور دلچسپ اور دل کو چھونے والی تحریر تھی۔ آپ کتنے خوش نصیب ہیں کہ آپ نے حضرت سلیمان فارسیؓ کی مزار شریف کی زیارت کی۔ آپ نے میرے لیے دعا کی۔ بشریٰ افضل جی! آپ بھول رہی ہیں نوک جھوک کی پابندی سسپنس اور جاسوسی میں لگائی گئی ہے۔ یہاں سرگزشت تو میرے تمام بھائی دماغی طور پر خود کو بوڑھا سمجھتے ہیں جی چاہتا ہے سب کے کان کھینچ لوں اور ادارے والے ان سے زیادہ بوڑھے ہیں۔ دنیا میں ہر طرف غم ہی غم تو ہے تھوڑا ہنسنا بھی چاہیے دوستو آپ مجھ سے اس بات پر متفق ہو نا؟ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ میں تو ہر وقت ہنستی ہی رہتی ہوں۔ ورنہ زندگی کی یہ تلخیاں مجھے پاگل بنا دیتیں۔“

☆ بصد افسوس مندرجہ ذیل قارئین کے خطوط تاخیر سے موصول ہوئے۔

رانا محمد شاہد، بورے والا۔ سعید احمد چاند، کراچی۔ خالد قریشی، کوئٹہ۔ زویا اعجاز، لاہور۔ عظمیٰ شکور، سرگودھا۔ خرم علی راؤ، کراچی۔ محمد خواجہ، کراچی۔ نزاہت افشالی مہوہ فتح جنگ۔ اصغر تمنا، شیخوپورہ۔ نادر علی، ڈی آئی خان۔ زاہد شیخ، چنیوٹ۔ فتح باری، جھنگ صدر۔ ابرار الحق، ملتان۔ آغا گل، پشاور۔ ناہید شیرازی، گجرات۔

مردِ صالح

ڈاکٹر ساجد امجد

رحمت جوش میں آئے تو گناہوں کا سمندر بھی بھاپ بن جائے۔ انسان کتنا ہی بڑا گناہ گار کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ اسے معافی ہی نہیں دیتا، بلند مقام بھی عطا کردیتا ہے۔ انہیں بھی بارگاہِ نبویؐ کے توسط سے وہ مقام ملا جس کے خواب دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس منزل پر کوئی اور پہنچ ہی نہیں سکتا۔ گناہوں کی گٹھری سے ان کی کمر دوہری تھی۔ مگر جیسے ہی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے بس ایک معجزہ سا رونما ہوا اور ایام جاہلیت کے سارے داغ دھل گئے اور وہ صحابہ کرامؓ کے جھرمٹ میں روشن ستارہ بن کر چمکنے لگے۔ ان کی زندگی مشعلِ راہ ہے۔ اندھیری راہوں پر بھٹکنے والوں کے لیے تحفہ خاص ہے۔ سبق حاصل کرنے کے لیے اس تحریر خاص کو ضرور پڑھیں۔

ایک مردِ صالح کا تذکرۂ خاص۔ سبق آموز سرگزشت

مکے کی گلیاں اندھیرے کی چادر اوڑھے سو رہی تھیں۔ کعبے کی دیوار سے ٹیک لگائے چند من چلے گپ شپ میں مشغول تھے۔ وہ ادھر سے گزرا تو اس کے دل میں ذرا سا بھی خوف نہیں تھا کیونکہ نہ وہ سب اس کے لیے اجنبی تھے نہ وہ ان کے لیے نیا تھا۔ بلکہ کچھ دن پہلے تک وہ بھی ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا رہا تھا۔ یہاں اس نے وہ مخالفانہ باتیں بھی سنی تھیں جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہوتی رہی تھیں لیکن اسے یہ باتیں کبھی اچھی نہیں لگی تھیں۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی رشتے داری تھی لیکن یہ ایسا کوئی مضبوط سبب نہیں تھا۔ ان باتوں میں تو رشتے دار اور غیر رشتے دار سب ہی برابر کے شریک تھے۔ بس کوئی جذبہ تھا جس کی وجہ سے وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔

وہ ان لوگوں کے سامنے سے گزرا تو کسی نے اسے پہچان کر آواز بھی دی تھی لیکن وہ یوں آگے بڑھ گیا جیسے اسے کسی نے پکارا ہی نہ ہو۔ کچھ آگے جا کر جب وہ ایک گلی میں مڑ گیا تو کسی انجانے خوف نے اس کے دل پر دستک دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا کہ کوئی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے مگر اندھیرے کے سوا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ اس نے رفتار بڑھا دی۔ اس سے پہلے کہ کوئی یہاں تک پہنچے مجھے حضرت ابو بکرؓ کے گھر تک پہنچ جانا چاہیے جہاں اس کی اطلاع کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو موجود ہونا چاہیے تھا۔

اعلانِ نبوت کو ابھی چند روز ہی گزرے تھے اور اہلِ قریش ہر اس شخص کے دشمن بنے ہوئے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کے لیے ان سے ملاقات کر رہا تھا۔ جہاں کوئی ایسا شخص دیکھتے ہذا صابی کہہ کر اس پر ٹوٹ پڑتے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ملاقات سے پہلے وہ کسی ایسی حرکت کا نشانہ بنے۔

یہ گلیاں اس کے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ یہاں اس کا بچپن گزرا تھا اور اب عہدِ شباب آگیا تھا۔ انیس بیس سال عمر

تھی کہ صالح طبیعت نے جوش مارا۔ بہت دیر اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا تھا اور پھر سب کو سوتا چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ میرا پورا خاندان مشرک ہے۔ بتوں کی پرستش کرتا ہے۔ خدا کی ذات میں غیر خداؤں کو شریک کرتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتوں سے یقین آتا ہے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں۔ جو لوگ انہیں جھٹلا رہے ہیں سخت غلطی پر ہیں۔ مجھے سبقت کرنی چاہیے اور ان کے دست حق پرست پر بیعت کر لینی چاہیے۔ ایک مرتبہ دل کے کسی گوشے سے یہ آواز بھی آئی تھی کہ کچھ انتظار کر لو۔ ابھی تو صرف بی بی خدیجہ، حضرت ابوبکرؓ و حضرت علیؓ ایمان لائے ہیں۔ کچھ اور لوگ بھی سبقت کریں تو پھر مجھ پر کوئی انگلی نہیں اٹھائے گا۔ یہ شیطان کی آواز تھی جسے انہوں نے فوراً رد کر دیا۔ کیا میرے لیے یہ اعزاز نہیں ہوگا کہ میں تیسرا بالغ مرد ہوں جو مسلمان کہلائے گا۔ اس کی معلومات کے مطابق اب تک صرف حضرت ابوبکرؓ اور زید بن حارثہ ہی بالغ مردوں میں ایسے ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ اب تیسرا میں ہوں جسے خوش نصیبی آواز دے رہی ہے۔

خیالوں نے ایسے پاؤں پھیلائے کہ پتا ہی نہ چلا اور وہ اس بابرکت دروازے تک پہنچ گیا۔ یہ حضرت ابوبکرؓ کا مکان تھا۔ اسے یہی معلوم ہوا تھا کہ حضور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آج کی رات یہیں تشریف فرما ہیں۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ادھر ادھر دیکھا اور دروازے پر دستک دے دی۔ دل کا عجیب حال تھا۔ دل سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب تھا۔ اب خوف کہیں گم ہو گیا تھا۔ عقیدت تھی جو آنکھوں میں آنسو بننے کے لیے بے چین تھی۔ دستک کے جواب کے لیے سماعت کے دروازے کھلے ہوئے تھے کہ دروازہ کھلا۔ حضرت ابوبکرؓ خود دروازے پر موجود تھے۔

''سعد تم۔''

''جی میں۔''

''کس ارادے سے آئے ہو؟''

''اپنے حصے کے وہ پھول سمیٹنے جن سے آپ اپنا دامن پہلے ہی لبریز کر چکے۔''

''سلام ہو تم پر، آؤ اندر آجاؤ۔''

وہ اندر گئے تو ایک ٹمٹماتے چراغ کے برابر چودھویں کا چاند فروزاں تھا۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیدار کئی مرتبہ کر چکے تھے لیکن اس وقت عالم ہی دوسرا تھا۔ دل کی آنکھیں رخِ انور کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ دل کی بے قراری نے موقع غنیمت جانا۔ لب ہائے مبارک سے جھڑنے والے پھول بھی تو سمیٹوں۔

''آپ کس چیز کی طرف بلاتے ہیں؟''

''اللہ کریم کی طرف جس کا کوئی شریک نہیں۔ بتوں سے نفرت اور اس کی طرف کہ تو گواہی دے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔''

دل تو پہلے ہی گواہی دے چکا تھا۔ طول کلام تو محض بہانہ تھا کہ چند باتیں کر لی جائیں۔ باتیں تو ابھی بہت تھیں لیکن اقرارِ محبت کو جلدی تھی۔ پاس ادب نے آواز بلند نہ ہونے دی۔ نرمی سے فرمایا۔

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ گواہی دیتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ کے رسول ہیں۔''

آغوش محبت وا ہوئی اور سعد بن ابی وقاص نے کائنات فتح کر لی۔ پلکوں کی چھت سے آنسو اترے اور دامن کے آنگن کو مہکانے لگے۔

''ابوبکر، تم نے اس لڑکے کو پہچانا؟''

''یا رسول اللہ! میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ مالک کے بیٹے سعد بن ابی وقاص ہیں۔''

''شاید تم یہ نہ جانتے ہو کہ ان سے میرا دہرا رشتہ ہے۔ ان کا شجرہ نسب پانچویں پشت میں میرے سلسلہ نسب سے مل جاتا ہے۔ میری والدہ ماجدہ کے بھی قریبی رشتے دار ہیں۔ رشتے میں ان کے بھائی ہیں اس لیے یہ میرے ماموں ہوئے۔''

حضرت سعدؓ کے والد کا نام مالک اور کنیت ابی وقاص تھی۔ وہ اپنی کنیت ہی سے مشہور تھے اسی لیے حضرت سعد بھی سعد بن ابی وقاص کے نام سے مشہور ہوئے۔ حضرت آمنہ کے رشتے دار تھے اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ازراہ محبت آپ کو ماموں کہا کرتے تھے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ سعد آئے اور رسول اللہ تشریف فرما تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''یہ میرے ماموں ہیں۔ چاہیے کہ ایک شخص اپنے ماموں کی تعظیم و تکریم کرے (یعنی جس طرح میں اپنے ماموں کی تکریم کرتا ہوں)

جوانی کا جوش تھا۔ دریائے محبت طغیانی پر تھا۔ ایمان لاتے ہی سرشاری کے عالم میں فرمایا۔

''اب مجھے کسی کا ڈر نہیں۔ باہر نکلتے ہی اعلان کروں

گا کہ میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آیا تم بھی اللہ سے ڈرو اور بتوں سے نفرت کرو۔"

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشارے سے انہیں سرزنش کی اور پھر فرمایا۔" حالات کا تقاضا ہے کہ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جری باپ کے شجاع بیٹے ہو لیکن اس وقت تک خاموش رہو جب تک ہمیں غلبہ حاصل نہیں ہو جاتا۔"

"مجھے اپنی تلوار پر بھروسا ہے۔ جب ہم سچے ہیں تو... کیوں کسی سے ڈریں۔ میں اپنے اسلام کا اظہار کر کے رہوں گا۔"

"اہلِ مکہ نادان ہیں۔ یہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ تم کس کس سے لڑو گے۔ اس وقت خاموش رہو انشاءاللہ بہت جلد ہمیں غلبہ ملنے والا ہے۔ بہت مواقع آئیں گے خوب جی بھر کے تلوار چلا لینا۔"

حضرت سعدؓ خاموش ہو گئے اس لیے بھی کہ یہ مصلحت ان کی سمجھ میں آ گئی تھی اور اس لیے بھی کہ یہ ان کے رسول کا حکم تھا اس حکم کی پیروی ان کا فرض تھا۔

☆☆☆

صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق حضرت سعدؓ نے اپنے آپ کو تیسرا مسلمان بتایا ہے۔ جس دن حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اسلام قبول کیا اس دن حضرت سعدؓ بھی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ امام بخاری نے حضرت سعد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جس دن میں نے اسلام قبول کیا اسی دن اور لوگ بھی مسلمان ہوئے اور سات روز تک میں ثلث اسلام تھا۔

بخاری کے شارحین نے اس ضمن میں مختلف روایتیں بیان کی ہیں۔ بعض کے خیال میں بالغ مردوں میں اسلام لانے والوں میں حضرت سعدؓ کا تیسرا نمبر تھا۔ ان سے پہلے بالغ مردوں میں حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت زید بن حارثؓ ایمان لا چکے تھے اور چونکہ سات روز تک کوئی بالغ مرد دائرہ اسلام میں داخل نہ ہوا اس لیے حضرت سعدؓ نے ان ایام میں اپنے آپ کو ثلث اسلام قرار دیا۔ بعض دوسرے احباب کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت سعدؓ سے پہلے چھ سات بزرگ اسلام قبول کر چکے تھے مگر حضرت سعدؓ کو ان کے ایمان لانے کا علم نہیں تھا۔

تحقیق کوئی بھی درست ہو یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سعدؓ ان چند نفوس قدسی میں سے ہیں۔ جن کو دعوت حق کے ابتدائی سات دنوں میں یہ شرف حاصل ہوا، یہ اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس وقت ان کا عہد شباب تھا۔ مشکل سے بیس سال عمر تھی اور اپنے خاندان کے واحد مرد تھے جو اس نعمت سے فیض یاب ہوئے تھے۔ گھرانے کے تمام لوگ مشرک تھے۔ گویا ایسے ماحول میں پرورش پا رہے تھے جہاں دین حق کا نام لینا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔

☆☆☆

وصال محبوب کی گھڑیاں مختصر تھیں۔ جدائی کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ اصرار محبوب تھا کہ اب وہ گھر جائیں۔ کسی کو شک ہو گیا تو ان کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔

دریائے محبت جوش پر آیا ہوا تھا۔ ہر موج کا تقاضا تھا کہ کنارے توڑ کر باہر نکل جائے لیکن محبوب کی رضا سامنے تھی۔ اٹھے اور با دل نخواستہ یہ پاکیزہ مجلس چھوڑ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

پورا گھر خواب غفلت کے مزے لوٹ رہا تھا۔ دبے قدموں داخل ہوئے اور بدن بستر کے سپرد کر دیا۔ تکیے پر سر رکھتے ہی خیال کہاں سے کہاں چلا گیا۔ چند لمحوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔ جب میں یہاں سے روانہ ہوا تھا تو ایک عام بت پرست کی طرح کافر تھا۔ واپس آیا ہوں تو وہ نصیب لے آیا ہوں جس پر فرشتے ناز کریں۔ مجھے وہ نعمت مل گئی جس سے پورا گھر محروم ہے۔ کاش! مجھے اجازت مل جائے۔ میں سب کو بتاؤں کہ مجھے کیا مل گیا۔ کم از کم والدہ کو راضی کر سکوں کہ وہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں۔ والد تو خیر پیغام حق سننے سے قبل ہی دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے گا لیکن والدہ تو اپنی آخرت سنوار لیں۔

کچھ دیر میں انہیں نیند آ گئی۔ صبح اٹھے تو مشرک گھرانا ان کے سامنے تھا۔ وہ یہ سوچ کر گھر سے باہر نکل گئے کہ کہیں راز دل زبان پر نہ آ جائے۔ وہ جان بوجھ کر کسی دوست سے نہیں ملے کہ کہیں راز افشا نہ کر بیٹھیں۔ کئی مرتبہ خیال آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کریں لیکن یہ سوچ کر عمل نہ کر سکے کہ دن کا وقت ہے کسی کی نظر پڑ گئی تو راز کھلتے دیر نہیں لگے گی بس ادھر ادھر گھوم پھر کر واپس آ گئے۔

رات ہوئی تو پھر مجلس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پہنچ گیا کہ نصیحت کے موتیوں سے دامن بھر سکیں۔

اب یہ ان کا معمول ہو گیا کہ دن بھر اِدھر اُدھر گھومتے

اور اندھیرا ہوتے ہی شمع رسالت کے طواف کے لیے پروانہ وار گھر سے نکل جاتے۔

ان کے معمولات بدلے تو ان کی والدہ کو شک ہوگیا۔ وہ پریشان ہوگئیں کہ بیٹے کو ایسا کیا روگ لگ گیا ہے کہ چپ سادھ لی ہے۔ انہوں نے خاموشی سے ان کی نگرانی شروع کردی۔ انہیں اتنا تو معلوم ہوگیا کہ وہ رات کو اٹھ کر کہیں جاتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ جاتا کہاں ہے۔ انہوں نے کوشش کی تو بہت جلد انہیں یہ معلوم ہوگیا کہ وہ اپنے باپ دادا کے دین سے پھر گیا ہے اور دین اسلام قبول کرلیا ہے۔ انہوں نے تو اپنا سر پیٹ لیا۔ حضرت سعدؓ سے معلوم کیا تو انہیں قبول کرنا پڑا۔ انہوں نے والدہ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔

''اگر تو نے نیا دین ترک نہیں کیا تو میں کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی۔ اگر میری جان چلی گئی تو میرا خون تیری گردن پر ہوگا۔''

یہ ایسی دھمکی تھی جسے سن کر حضرت سعدؓ کے ہوش اڑ گئے۔ وہ والدہ سے بہت محبت کرتے تھے لیکن اللہ کی محبت اس سے بھی بڑھ کر تھی۔ توحید کا جو جام پیا تھا اس کا نشہ ایسا نہیں تھا کہ جسے ماں کی محبت اتار دیتی۔ آپؓ نے فرمایا۔ ''ماں، تم مجھے بہت عزیز ہو لیکن تمہارے قالب میں خواہ ہزار جانیں ہوں اور ایک ایک کرکے ہر جان نکل جائے تب بھی میں اسلام کو نہیں چھوڑوں گا۔''

بارگاہ الٰہی میں ان کی شانِ استقلال ایسی مقبول ہوئی کہ عامتہ المسلمین کے لیے یہ فرمانِ خداوندی نازل ہوگیا۔

''اور اگر ماں باپ تجھے میرے ساتھ شرک پر مجبور کریں جس کی تجھ کو خبر نہیں تو اس میں ان کا کہنا مت مان۔''

صحیح مسلم میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

سعدؓ کی ماں نے قسم کھائی کہ جب تک سعد دین اسلام ترک نہیں کریں گے وہ ان سے نہ کلام کریں گی اور نہ کچھ کھائے پیئں گی۔ انہوں نے کہا۔ تمہارا خیال ہے کہ اللہ نے تم کو ماں باپ کی اطاعت کا حکم دیا ہے تو میں تمہاری ماں ہوں اور تم کو دین اسلام چھوڑنے کا حکم دیتی ہوں۔ کہتے ہیں کہ تین دن تک ان کی یہی حالت رہی۔ جب بھوک پیاس سے بے حال ہوگئیں تو ان کے دوسرے لڑکے عمارہ نے پانی پلایا۔ انہوں نے سعدؓ کو بددعا دی۔ اس پر اللہ عزوجل نے قرآن میں یہ آیت نازل فرمائی۔

''اور ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کی ہے اور اگر وہ تجھ کو میرے ساتھ شرک پر مجبور کریں تو ان کی اطاعت نہ کر اور دنیا میں اچھی چیزوں میں ان کا ساتھ دے۔''

گھر میں یہ جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تو قبیلے کے دوسرے لوگوں کو بھی علم ہوگیا۔ اب حضرت سعدؓ کا گھر سے نکلنا دوبھر ہوگیا۔ جس طرف سے گزرتے گالیوں اور طعنوں سے ان کا استقبال ہوتا۔ کل کے دوست آج کے دشمن بن گئے۔ اب ان پر دو الزامات تھے۔ ماں کی نافرمانی اور باپ دادا کے دین سے پھر جانا۔ اس کی سزا انہیں مل رہی تھی لیکن ان کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی۔ اذیتیں سہتے تھے لیکن جادۂ حق سے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔

ایک ان ہی پر کیا منحصر جتنے عاشقانِ رسول تھے ان سب کا احوال یہی تھا۔ جگر چاک کرنے والے مصائب تھے اور شمع رسالت کے یہ پروانے تھے۔

آہستہ آہستہ قبول حق سے فیض یاب ہونے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی لیکن ابھی قوت و غلبہ اتنا نہیں ہوا تھا کہ اعلانیہ عبادت کرسکیں۔ خدائے واحد کی عبادت ہجوم کفارہ میں رہ کر نہیں کی جاسکتی تھی۔ ان صحابہ اکرام نے کفار کی شر انگیزی سے بچنے کے لیے طے کیا کہ پہاڑوں کی سنسان گھاٹیوں میں جا کر عبادت کرلیا کریں گے۔ اس طرح آپس میں ملاقاتیں بھی ہو جایا کریں گی اور عبادت کا حق بھی ادا ہو جائے گا۔

شہر مکہ کا محل وقوع ایسا ہے کہ چاروں طرف پہاڑ ہیں۔ صحابہ کرام ایک پہاڑی منتخب کرکے وادی میں اتر گئے۔ یہ پہاڑی کچھ ایسے رخ پر تھی کہ کسی دوسرے پہاڑ سے دیکھو تو نظر نہیں آتی تھی۔ شہر کے ہنگاموں سے بے خبر یہاں عبادت کرنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ ویران دوپہریں، ٹھنڈی شامیں اس وادی میں گزرنے لگیں۔

ایک دن صحابہ کرام اسی ویران گھاٹی میں عبادت کررہے تھے۔ حضرت سعدؓ بن وقاص بھی ان صحابہ میں شامل تھے کہ چند مشرکین ادھر آنکلے۔ انہوں نے جو یہ منظر دیکھا تو مذاق اڑانے کا اچھا موقع مل گیا۔ انہوں نے مسلمانوں پر آوازیں کسنا شروع کردیں۔ ان بدبختوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بھی برے کلمات کہنا شروع کیے تو حضرت سعدؓ برداشت نہ کرسکے۔ غیرت دینی نے جوش مارا۔ قریب ہی اونٹ کی ایک ہڈی

بڑی تھی۔ اس ہڈی کو اٹھایا اور مشرکین پر پل پڑے۔ ایک مشرک کا سر پھٹ گیا۔ شاید دوسروں کا بھی یہی حال ہوتا کہ سب بھاگ گئے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ حضرت سعدؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے راہ حق میں جہاد کیا۔

☆☆☆

"یہاں ایک شخص محمد بن عبداللہ نے ایک نیا دین نکالا ہے۔ دین کیا نکالا ہے بھائی کو بھائی سے جدا کرنے کا کام سنبھالا ہے۔ وہ کوئی ایسا جادو کرتا ہے کہ جو اس کے پاس اٹھنے بیٹھنے لگتا ہے، اپنے باپ دادا کے دین سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ قبیلوں میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ باپ کا منہ ایک طرف ہے تو بیٹے کا منہ دوسری طرف۔ اب یہ مکہ پہلے والا مکہ نہیں رہا۔" اہل مکہ میں سے ایک شخص، شہر میں وارد ہونے والے ایک تاجر کو آگاہ کر رہا تھا۔

"مجھے بھی یہ سن کر تعجب ہوا۔" تاجر نے کہا۔ "لیکن مجھے کیا میں تو اپنے کام سے یہاں آیا ہوں۔ آج ہوں کل چلا جاؤں گا۔"

"تم مہمان ہو اس لیے اس مصیبت سے تمہیں آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ تمہاری میزبانی کا شرف مجھے نصیب ہوا ہے تو مجھ پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ بس اپنے مہمان کو خطرات سے آگاہ کروں۔ جب تک یہاں ہو اس شخص سے ملنے اور اس کی باتیں سننے سے گریز کرنا۔ وہ ایک کلام پڑھتا ہے اور سننے والے پر جادو کر دیتا ہے۔"

"میرے مہربان میزبان، مجھے وہ کہاں ملے گا جو میں اس کی باتیں سنوں گا تم بے فکر رہو۔"

"ارے تم اسے جانتے نہیں ہو، وہ گلی کوچوں میں لوگوں کو روک کر ورغلاتا ہے۔"

"جب وہ ایسا خطرناک جادوگر ہے تو تم لوگوں نے اسے زندہ کیسے رکھا ہوا ہے؟" تاجر نے پوچھا۔

"بس کیا بتائیں، ایک تو وہ خود بااثر خاندان سے ہے دوسرے چند ایسے بااثر افراد اس کے ساتھ مل گئے ہیں کہ ہم اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اگر وہ اب بھی باز نہیں آیا تو ہم لوگ اس کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔"

مہمان، میزبان کی باتیں سن رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ اس سے زیادہ حیران وہ اس وقت ہوا جب آئندہ دو تین روز میں جو بھی اس کے پاس آتا یہی کہہ کر ڈراتا کہ محمد بن عبداللہ سے بچ کر رہنا۔ اس کا کلام کانوں تک نہ پہنچنے پائے۔

مہمان نے یہ باتیں اتنی کثرت سے سنیں کہ اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملنے کا شوق ہو گیا۔ قاعدہ ہے کہ جس جذبے کو جتنی شدت سے روکا جائے اتنا ہی وہ بڑھتا ہے۔

ایک دن وہ بازار سے گزر رہا تھا کہ کسی نے اسے بتایا کہ وہ جو جا رہے ہیں وہی ہیں محمد بن عبداللہ۔ اس نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ مجھے ان سے کیا لیکن کچھ فاصلہ چھوڑ کر وہ ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا یہاں تک کہ وہ آپؐ کے گھر پہنچ گیا۔

"مجھے وہ کلام سنائیے جس کے لیے لوگ مجھے آپ سے بدگمان کرتے ہیں۔"

"کیا کہتے ہیں آپ کے دوست؟"

"وہ کہتے ہیں کہ آپؐ جو کلام سناتے ہیں اس میں جادو ہوتا ہے۔"

"ہر اچھا کلام جادو ہی تو ہوتا ہے۔"

"مجھے وہ کلام سنائیے، میں خود شاعر ہوں کلام کے عیب و ہنر کو پرکھ سکتا ہوں۔"

حضور پُرنورؐ نے کسی سورۃ کی چند آیات تلاوت فرمائیں۔ اس تاجر نے محسوس کیا کہ وہ جو کچھ فرما رہے ہیں اس کے دل میں اترتا چلا جا رہا ہے۔ اس نے ایسا فصیح و بلیغ کلام اس سے پہلے نہیں سنا تھا۔

"آپ تو بہت اچھے شاعر ہیں۔ میرے دوستوں نے مجھے خوامخواہ بدگمان کر دیا تھا۔"

"میں شاعر نہیں ہوں۔" حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت تلخ بات کا بہت نرمی سے جواب دیا۔ "جو کچھ تم نے سنا وہ اللہ کا کلام ہے اور اللہ ہی اس کلام کو میری زبان پر جاری کرتا ہے۔"

"اللہ یہ کلام آپ ہی کی زبان پر کیوں جاری کرتا ہے؟"

"کیا تو نے نہیں دیکھا کہ ہر دور میں اللہ کے نبی آتے رہے ہیں۔ میں بھی اللہ کا نبی ہوں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں نیکی کی تبلیغ کروں اور برائی سے روکوں۔"

اللہ مہربان ہو چکا تھا اس تاجر کی قسمت جاگ چکی تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"میں آپ کا دین قبول کرتا ہوں۔" حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے حلقہ اسلام میں قبول کر لیا۔

اب اس کا مکے میں رہنا خطرناک ہو گیا تھا۔ اس نے

فوراً مکہ چھوڑ دیا اور یہ سوچ کر مکہ سے لوٹ گیا کہ اپنے علاقے میں پہنچ کر اسلام کی تبلیغ کرتا رہے گا۔

اس نے مکہ چھوڑ دیا لیکن اس کے اسلام قبول کرنے کی خبر مکہ میں پھیل گئی۔ مشرکین مکہ کا جوش غضب عروج کو پہنچ گیا۔ اب تک تو بات صرف مکہ تک محدود تھی اب انہوں نے سوچا کہ اسلام کی روشنی مکہ سے باہر تک پھیلنے لگی ہے۔ وہ تاجر مال دار بھی ہے اور اپنے وطن میں بااثر بھی ہوگا۔ اس کی تبلیغ سے دوسرے لوگ بھی ایمان لائیں گے اور مکہ کا رخ کریں گے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طاقت میں مزید اضافہ ہوگا۔

وہ سب ظلم وستم کے پہاڑ توڑتے توڑتے تھک گئے تھے لیکن اب تو ان کا پیمانہ صبر بالکل ہی لبریز ہوگیا۔ سردارانِ مکہ نے فوراً ایک اجلاس طلب کیا اور مشرکین کے سامنے تمام صورتِ حال رکھی۔

"اگر تم نے اب بھی محمد بن عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کا کوئی علاج تلاش نہیں کیا تو ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔"

"ساتھیوں کی تو ہمیں پروا نہیں۔ یہ سب محمدؐ اور ان کے خاندانی اثر ورسوخ پر اچھل رہے ہیں۔ اگر کسی طرح محمدؐ کو خاموش کردیا جائے تو ان کے صحابہ خود دبک کر بیٹھ جائیں گے۔"

"کہیں تمہارا مطلب یہ تو نہیں کہ محمدؐ اور ان کے خاندان کو قتل کردیا جائے۔ اگر ایسا ہے تو اس ارادے سے باز آجاؤ۔ وہ بنو ہاشم جو ان کے دین سے متفق نہیں ان کے قتل کی صورت میں ان کا بدلہ لینے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ترکیب ایسی ہو کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"پھر کیا ترکیب کی جائے، آپ ہی بتایئے۔"

اکابر قریش سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور کئی نشستوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا۔

"جب تک بنو ہاشم محمدؐ کو ان کے حوالے نہ کریں گے کوئی شخص ان سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھے گا نہ ان کے پاس کوئی چیز فروخت کی جائے گی نہ ان سے رشتہ ناتا کیا جائے گا اور نہ انہیں کھلے بندوں پھرنے دیا جائے گا۔"

ان نکات کو ایک معاہدے کی شکل دی گئی اور ہر قبیلے کے نمائندے نے اس پر اپنے دستخط کردیے بعدازاں اس معاہدے کو درِ کعبہ پر آویزاں کردیا گیا تاکہ تمام لوگ اسے پڑھ لیں۔

اس معاہدے کی بازگشت بنو ہاشم تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ یہ ایسا خطرناک معاہدہ تھا کہ سب کے ہوش اڑ گئے۔ اس معاہدے کا مقصد معاشرتی مقاطعہ تھا یعنی مسلمانوں کو مالی تنگدستی کا شکار کردیا جائے۔

ایسا نہیں تھا کہ بنو ہاشم کے تمام لوگ ایمان لے آئے ہوں۔ بہت تھوڑے لوگ تھے، زیادہ لوگ تو اب بھی مخالفت ہی کر رہے تھے لیکن اس مخالفت کے باوجود قبائلی عصبیت یہ گوارا نہیں کر رہی تھی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفار قریش کے حوالے کردیں۔ انہوں نے مقابلے کی تیاریاں شروع کردیں۔ خاندان کے بزرگ حضرت ابو طالب نے خطرے کو بھانپ لیا۔ وہ خون خرابہ نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے مقاطعہ قبول کرلیا اور اپنی، اپنے بھائی حضرت مطلب کی اولادوں کو ساتھ لے کر شعیب ابی طالب میں پناہ گزیں ہوگئے۔ یہ گھاٹی کوہ ابوقبیس کی گھاٹیوں میں سے ایک گھاٹی تھی جو جناب ابو طالب کی موروثی تھی۔

یہ پابندی صرف بنو ہاشم کے لیے تھی تاکہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفار قریش کے حوالے کردیں۔ حضرت سعدؓ نے سنا تو بے چین ہوگئے۔ بنو ہاشم کے بچے بھوک سے نڈھال ہوں اور میں شکم سیر ہوکر کھاتا رہوں۔ ان کا تعلق بنو ہاشم سے نہیں تھا اس کے باوجود وہ صرف محمدؐ و آل محمد کی محبت میں شعیب ابی طالب پہنچ گئے اور معاہدے کی تمام پابندیاں اپنے اوپر عائد کرلیں۔

بنو ہاشم کے وہاں پہنچتے ہی مشرکین مکہ نے گھاٹی کا محاصرہ کرلیا اور اس میں اتنی سختی برتی کہ کھانے پینے کی کوئی چیز محصورین تک پہنچنے نہ پائے۔ اگر کوئی سوداگر غلہ فروخت کرنے کے لیے لاتا تو اس سے ایک ایک دانہ خرید لیتے کہ محصورین اس سے اپنے لیے نہ خرید لیں۔ اگر کوئی ہمدرد انہیں کھانے پینے کی کوئی چیز پہنچانا چاہتا تو اسے راستے ہی میں روک لیتے۔ بھوک سے بے تاب ہوکر جب بنو ہاشم کے بچے روتے تھے تو ان کی آوازیں سن کر مشرکین تالیاں بجاتے تھے اور آپس میں کہتے تھے کہ بس اب کچھ دن جاتے ہیں کہ بھوک سے بے حال ہوکر یہ لوگ محمد کو ہمارے حوالے کرنے پر تیار ہوجائیں گے۔

محاصرہ طول پکڑتا جارہا تھا۔ محصورین درختوں اور جھاڑیوں کے پتے کھانے پر مجبور ہوگئے تھے مگر ان کے پائے استقلال میں کوئی فرق نہیں آرہا تھا۔

حضرت سعدؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو انہیں سوکھے ہوئے چمڑے کا ایک ٹکڑا مل گیا۔ انہوں نے اسے پانی سے دھویا پھر آگ پر بھونا اور کوٹ کر پانی میں گھولا اور اسے پی کر پیٹ کی آگ بجھائی۔

حج کا زمانہ آیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مردانہ وار نکلے اور لوگوں کو خدائے واحد کی طرف بلانے لگے۔ حج کا زمانہ امان کا زمانہ ہوتا تھا اس لیے کوئی آپ کو گزند نہیں پہنچا سکتا تھا۔

لوگوں نے دیکھا کہ آپؐ کے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لہٰذا جب یہ دن گزر گئے محاصرہ پھر شروع ہو گیا تو سختی پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔

آلام و مصائب کا یہ تکلیف دہ دور تین سال برقرار رہا۔

مشرکین میں بعض رحم دل بھی تھے۔ بنوہاشم کی مصیبت پر ان کا دل کڑھتا تھا لیکن اعلانیہ ہمدردی کرتے ہوئے یا ان کی مدد کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ کرنا بھی چاہتے تھے تو حوصلہ نہیں پڑتا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس جذبے کو زبانیں بھی مل گئیں۔ ایک دن کئی خیر خواہان بنوہاشم کعبہ میں پہنچے اور انہیں لعنت ملامت کرنے لگے۔

''کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ ہم شکم سیر ہو کر کھاتے ہیں لیکن بنی ہاشم جو ہمارے ہی بھائی بند ہیں اناج کے ایک ایک دانے کو ترس رہے ہیں۔ ان کے بچے اور عورتیں بھوک سے ہلکان ہو گئے ہیں۔ جب تک اس معاہدے کو چاک نہیں کیا جائے گا ہمیں آرام نہیں آئے گا۔''

ابوجہل جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ستانے میں پیش پیش رہتا تھا فوراً آگے بڑھا۔ ''خبردار جو کسی نے معاہدے کو ہاتھ لگایا اور اسے چاک کرنے کی کوشش کی یہ معاہدہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک بنوہاشم کے لوگ محمدؐ کو ہمارے حوالے نہیں کر دیتے یہی معاہدہ ہوا تھا اور اسی پر سب قائم ہوئے تھے۔''

اس سے پہلے کہ دونوں طرف سے تلواریں نکل آتیں اور کشت و خون ہوتا، حضرت ابو طالب صحن کعبہ میں داخل ہوئے۔

''اچھا تو تم سب ملے ہوئے تھے۔ تم لوگوں نے اپنی مدد کے لیے ابو طالب کو بھی بلا لیا تاکہ تم سب مل کر معاہدے کے کاغذ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دو لیکن ہم ایسا نہیں کرنے دیں گے۔'' ابوجہل اور دوسرے اکابر قریش سامنے آ گئے۔

''کیسا معاہدہ، اب معاہدہ باقی ہی نہیں رہا۔'' حضرت ابو طالب نے کہا۔ ''میرے بھتیجے کو وحی کے ذریعے خبر ملی ہے کہ معاہدے کو دیمک چاٹ گئی۔ میرا بھتیجا کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ جا کر دیکھو ایسا ہی ہوا ہوگا۔''

تمام لوگ اس جگہ پہنچے جہاں معاہدہ چسپاں کیا گیا تھا۔ معاہدے کو دیمک چاٹ گئی تھی اور اب اللہ کے نام کے سوا وہاں کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

''اب کون کہہ سکتا ہے کہ معاہدے میں کیا تھا۔ ہماری روایت کے مطابق ایسے معاہدے کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی جسے دیمک چاٹ جائے یا کسی اور طرح الفاظ مٹ جائیں۔''

محصورین کے حامیوں کے ہاتھ مضبوط ہو گئے اور انہوں نے اس معاہدے کو پرزے پرزے کر دیا۔

یہ معاہدہ ختم ہو گیا تھا لیکن مشرکین کے مظالم ختم نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے ظلم و تعدی کا بازار گرم کیا ہوا تھا۔ صحابہ کرام کی جانیں خطرے میں پڑی ہوئی تھیں۔

مکہ سے زیادہ اسلام کی پزیرائی مدینہ میں ہو رہی تھی۔ مدینے کے اکثر لوگ مکہ آ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست حق پرست پر بیعت کر چکے تھے۔ ان کی طرف سے تقاضے بڑھتے جا رہے تھے کہ آپ مدینہ آ جائیں تو ہم اپنی جانوں پر کھیل کر آپ کی حفاظت کریں گے۔

ان تقاضوں کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کو مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی۔

دوسرے صحابہ کے ساتھ حضرت سعدؓ نے بھی ہجرت کی۔ ان کے بڑے بھائی عتبہ بن ابی وقاص پہلے ہی سے مدینہ میں فروکش تھے۔ دراصل مکہ میں ان کے ہاتھوں ایک قتل ہو گیا تھا اور وہ بھاگ کر مدینہ آ گئے تھے۔ حضرت سعدؓ نے مدینہ پہنچ کر انہی کے گھر قیام کیا۔

کچھ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے۔

جب کفار مکہ نے دیکھا کہ ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔ مکہ خالی ہو گیا تو وہ اہلِ مدینہ کی طرف سے سخت بدظن ہوئے۔ اہلِ مدینہ کو اس کا مزہ چکھانے کے لیے مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے منصوبہ بندی کرنے لگے۔

مدینہ میں رہنے والے مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کی حفاظت کے لیے ہر وقت مسلح رہتے تھے حتیٰ کہ راتوں کو بھی ہتھیار بند ہو کر سویا کرتے تھے۔

ایک شب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیند اچاٹ ہوگئی۔ آپؐ نے فرمایا، کاش کوئی نیک مرد آج پہرے پر ہوتا۔ اتنے میں ہتھیاروں کی جھنکار سنائی دی۔ آپؐ نے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟'' جواب ملا ''سعد ہوں۔''

''کس لیے آئے ہو؟''

''میرے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت خوف پیدا ہوا۔ اس لیے میں پہرا دینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

''میں نے پہرے کے لیے نیک مرد کی خواہش کی تھی۔ خدا نے تمہیں بھیج دیا۔ تم ہی ہو مرد صالح۔'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے حق میں دعائے خیر فرمائی اور بے فکر ہو کر سو گئے۔

اب مدینہ کا عالم یہ تھا کہ مشرکین کی ایذا رسانیوں سے تو نجات مل گئی تھی لیکن ان کی طرف سے حملوں کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔ آئے دن خبریں آتی رہتی تھیں کہ کسی بڑے حملے کی نیت سے کوئی بڑا قافلہ مکہ سے نکلا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کافر کی نقل وحرکت کو دیکھنے کے لیے چھوٹی چھوٹی مسلح جماعتیں بھیجنا شروع کیں۔ ان مہمات کو سرایا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پہلی مہم میں ساٹھ سواروں پر مشتمل ایک گروہ حضرت عبیدہ بن حارث کی سربراہی میں بھیجا گیا۔ حضرت سعدؓ بھی ان مجاہدین میں شامل تھے۔

حجاز کے ساحلی علاقے میں مسلمانوں کی مڈبھیڑ قریش کے ایک بڑے قافلے سے ہوئی لیکن کشت وخون کی نوبت نہ آئی۔ قریش بچ کر نکل گئے تاہم حضرت سعدؓ نے راہِ خدا میں ایک تیر چلا ہی دیا۔

محدثین کا قول ہے وہ پہلے عرب ہیں جنھوں نے راہ خدا میں تیر چلایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کی اس دل داری سے اتنے خوش ہوئے کہ اگلے سرایا میں ان کی معیت میں آٹھ اور بعض کے نزدیک اسّی مجاہدین کو روانہ کیا۔ یہ جماعت خرار کے مقام تک گئی لیکن مشرکین سے سامنا نہیں ہوا۔

ایک موقع یہ بھی آیا کہ حضرت سعدؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسلسل رفاقت نصیب ہوئی۔ خلوت وجلوت میں کیسے کیسے راز آشکار نہ ہوئے ہوں گے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساٹھ مہاجرین کی معیت میں مدینہ اور مکہ کے درمیان ایک مقام ابواء تشریف لے گئے اور مہاجرین بھی ساتھ تھے لیکن حضرت سعدؓ کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ راز و نیاز میں ہر وقت ساتھ رہتے۔ اسی مقام پر بنو ضمرہ سے آپ نے معاہدہ کیا جس کے تحت مسلمان اور بنو ضمرہ ایک دوسرے کے حلیف بن گئے۔

ربیع الاول میں غزوہ بواط پیش آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مہم کا علم بردار حضرت سعدؓ کو بنایا وہ دو سو صحابہ کے ہمراہ قریش کے ایک بڑے قافلے سے مزاحم ہونے کے لیے مدینہ سے نکلے۔ اس قافلے میں دو سو آدمی اور ڈھائی ہزار اونٹ تھے۔ امیہ بن خلف اس کی قیادت کر رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بواط تک گئے لیکن قافلہ نہ مل سکا۔ کسی جنگ کے بغیر واپس آنا پڑا۔ حضرت سعدؓ کف افسوس ملتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں شجاعت دکھانے کا موقع نہ مل سکا۔

یہ موقع انہیں جلد ہی مل گیا۔ غزوہ بدر میں ان کا مقابلہ قریش کے نامی بہادر سعید بن عاص سے ہوا۔ حضرت سعدؓ اس جوش اور وارفتگی سے لڑے کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس بہادر کو خاک وخون میں نہلا دیا اور اس کی مشہور تلوار ذوالکتیفہ اپنے قبضے میں کر لی اور تلوار لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے، ایک تو اتنے بڑے بہادر کو ڈھیر کیا دوسرے یہ تلوار ہاتھ آئی تھی۔ بڑے ادب سے فرمایا۔

''یارسول اللہ! آج خدا نے دشمن کے خون سے میرا کلیجہ ٹھنڈا کیا ہے۔ اس کی تلوار مجھے مرحمت فرمائیے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طلب پر خوش نہیں ہوئے اور فرمایا۔

''یہ تلوار نہ میری ہے نہ تمہاری۔ اسے جہاں سے اٹھایا ہے وہیں رکھ دو۔''

اس وقت تک مال غنیمت سے متعلق کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔

حضرت سعدؓ نے یہ حکم سنا تو بڑا ملال ہوا۔ دل میں یہ کہتے ہوئے چلے کہ شاید یہ تلوار اسے ملے جس نے میری طرح کارنامہ انجام نہ دیا ہو۔ اس معرکے میں ان کے نوعمر بھائی عمیر بھی قتل ہو گئے تھے۔ کچھ اس کا ملال بھی تھا۔

حکم کی بجا آوری کرتے ہوئے حضرت سعدؓ کچھ ہی دور گئے تھے کہ سورۂ انفال نازل ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ و

آلہ وسلم نے حضرت سعدؓ کو بلا بھیجا۔
سورۃ انفال میں یہ حکم بھی تھا۔
”تو جو تم نے لوٹا ہے اب کھاؤ کہ حلال طیب ہے۔“
سعدؓ دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ابو داؤد کے مطابق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت پڑھ کر سنائی۔
”لوگ آپؐ سے مال غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دیجیے کہ مال غنیمت تو اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔“
پھر فرمایا۔”اے سعدؓ خدا نے یہ تلوار مجھے دی ہے لیکن میں یہ تجھے دیتا ہوں۔“
ایسی عظیم الشان ہزیمت کی خبر مکہ پہنچی تو ہر گھر ماتم کدہ بن گیا۔ اہل مکہ نے قسم کھائی کہ جب تک بدر کی شکست کا بدلہ نہیں لے لیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ ایک سال کی تیاری کے بعد وہ پھر مدینہ پر چڑھ دوڑے اور کوہ احد کے دامن میں پڑاؤ ڈال دیا۔
حضرت سعدؓ اپنی شجاعت کا لوہا منوا چکے تھے لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مقدمتہ الجیش کا افسر مقرر کیا۔ حضرت سعدؓ نے مقابلے سے ایک دن قبل دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے۔

”اے زمین و آسمان کے مالک! کل جو دشمن میرے مقابلے پر آئے وہ نہایت تند اور شجاع ہو اور میں تیری راہ میں اسے قتل کروں۔“
اس دعا کی قبولیت میدان کارزار میں ظاہر ہوگئی۔ مشرکین کے ایک نامور بہادر طلحہ بن ابی طلحہ کے حلق میں حضرت سعدؓ نے ایسا تیر پیوست کیا کہ اس کی زبان باہر آگئی اور اس نے وہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔
اس جنگ میں ایک اتفاقی غلطی سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا تھا۔ فتح، شکست میں تبدیل ہوگئی تھی۔ اسی جنگ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک دانت شہید ہوا۔ کسی نے یہ خبر اڑا دی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہوگئے۔ بہت سے مسلمانوں نے ہتھیار پھینک کر جنگ کا ارادہ ہی ملتوی کردیا تھا۔
ایسے نازک وقت میں حضرت سعدؓ اور حضرت علیؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سپر بن گئے۔ مشرکین بار بار نرغہ کرکے آتے تھے لیکن ان کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی۔
پھر چشم فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ حضور صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم اپنے ترکش سے تیر نکال نکال کر انہیں دیتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔

"اے سعدؓ تیر چلا میرے ماں باپ تجھ پر فدا ہوں۔" ایک دوسری روایت کے مطابق اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ یہ تھے۔

"اے زور آور نوجوان تیر چلا۔" یہ عظیم شرف تھا جو حضرت سعدؓ کو حاصل ہوا۔

حضرت علی مرتضیٰؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سعدؓ کے سوا کسی اور کے حق میں "میرے باپ اور ماں قربان ہوں۔" کے الفاظ سرور کائنات کی زبان مبارک سے نہیں سنے تھے۔"

سبحان اللہ! ایسے صحابہ بھی کس رسول کو ملے ہوں گے اور ایسا قدر دان رسول بھی کسے میسر آیا ہوگا۔

حضرت سعدؓ ایک ماہر تیر انداز تھے۔ وہ بارش کی طرح تیر برسا رہے تھے کہ ان کے بھائی جو ابھی تک مشرک تھے عتبہ بن ابی وقاص نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک پتھر پھینکا جس سے آپ کا چہرہ مبارک زخمی ہوگیا۔ اس کی اس ناپاک حرکت کے بارے میں حضرت سعدؓ فرمایا کرتے تھے کہ واللہ میں عتبہ سے زیادہ کسی شخص کے خون کا پیاسا نہیں ہوا۔

اس کے بعد ابن قمیہ آگے بڑھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک بھرپور وار کیا۔ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے "خود" کی کڑیاں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رخسار مبارک میں پیوست ہوگئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خون پونچھتے جاتے اور فرماتے جاتے تھے۔

"وہ لوگ کیسے فلاح پائیں گے جنہوں نے اپنے نبی کے چہرے کو خون آلود کیا حالانکہ وہ ان کو خدا کی طرف بلاتا تھا۔"

جب حضورؐ کے صحابہ کرام نے جنگ پر پوری طرح قابو پالیا تو ابوسفیان اپنی فوج کو لے کر مکہ کی طرف بھاگا۔ مسلمانوں نے آٹھ میل تک اس کا تعاقب کیا لیکن اس نے مکہ پہنچ کر ہی دم لیا۔

حضرت سعدؓ نے بدر اور احد میں جس جانبازی کا مظاہرہ کیا اس کے بعد ان کا نام دلاوروں کی صف میں شامل ہوگیا۔ اب یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی غزوہ ہو اور حضرت سعدؓ پیش پیش نہ ہوں۔

غزوہ احد کے فوراً بعد غزوہ احزاب یا خندق کا مرحلہ پیش آیا۔ ابوسفیان ابھی تک اپنی شکست کے زخم چاٹ رہا تھا کہ یہودیوں کے بھڑکانے پر وہ ایک مرتبہ پھر مکہ سے نکلا۔ راستے میں کچھ بدوی قبائل بھی اس کے ہمراہ ہوگئے۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کی تعداد دس ہزار تک ہوگئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہر سے باہر جا کر لڑنا خلافِ مصلحت سمجھا اور حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے سے مدینہ کے گرد خندق کھود کر مورچے باندھ لیے۔ دس ہزار کے مقابلے میں فرزندانِ اسلام کی تعداد تین ہزار تھی۔

جب مسلمان مورچے لگائے ہوئے تھے اور مشرکوں نے مدینہ کا محاصرہ کرلیا تھا۔ صحابہ کرام دشمن کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اسی دیکھ بھال میں حضرت سعدؓ کی نظر ایک مشرک پر پڑی۔ وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ کسی ممکنہ تیر سے بچنے کے لیے اپنی ڈھال کو مسلسل حرکت دے رہا تھا۔ کبھی ناک کے اوپر کبھی نیچے لے جاتا تھا۔ حضرت سعدؓ نے اپنے ترکش سے تیر نکالا اور کمان میں جوڑ کر اسے نشانے پر لے لیا اور جیسے ہی اس نے اپنی ڈھال کو نیچے کیا حضرت سعدؓ نے تیر چلا دیا۔ وہ شخص بدحواس ہوکر گر پڑا اور اس کی ازار کھل گئی۔ رسول اللہؐ نے یہ منظر دیکھا تو آپ کو بے اختیار ہنسی آگئی یہاں تک کہ آپؐ کے دندانِ مبارک نظر آنے لگے۔ حضرت سعدؓ نے فرمایا۔

"یا رسول اللہ آپ کو کس بات پر ہنسی آئی؟"

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "اس شخص کی بدحواسی پر۔"

کفار نے ایک ماہ تک محاصرہ کیے رکھا اور پھر کفار میں پھوٹ پڑ گئی اور پھر یہ بھی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہولناک آندھی عذاب الٰہی کی صورت میں ان کی طرف بھیج دی۔ کفار خوف زدہ ہوکر بھاگ کھڑے ہوئے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فضیلتوں کے مراحل درجہ بہ درجہ طے کرتے جا رہے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر قدم وحی کی روشنی میں اٹھا رہے تھے۔ حکم ہوا کہ عمرے کی سعادت کے لیے گھر سے نکلو۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چودہ سو صحابہ کے ہمراہ مکہ کی طرف چلے۔ حضرت سعدؓ بھی اس پاکیزہ قافلے میں شامل تھے۔

مکہ سے ایک پڑاؤ کے مقام پر حدیبیہ نام کا ایک گاؤں تھا۔ قافلہ اسلام نے اس مقام پر پڑاؤ کیا۔ ادھر قریش کو معلوم ہوا تو انہیں یہ شک ہوا کہ مسلمان جنگ کے ارادے سے آئے ہیں۔ انہوں نے جنگ کی تیاریاں شروع

کردیں اور اعلان کر دیا کہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے اپنا ایک نمائندہ مکہ روانہ کیا۔
ہم جنگ کے ارادے سے نہیں آئے۔ ہمارا مقصد صرف عمرہ ادا کرنا ہے۔ اس کے بعد امن وسلامتی کے ساتھ ہم مدینہ واپس چلے جائیں گے۔"
قریش کی تشفی نہیں ہوئی اور انہوں نے اپنا ایک نمائندہ مزید تفتیش کے لیے بھیجا۔
اس نمائندے کی واپسی کے بعد بھی اہلِ قریش اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔ وہ کسی قیمت پر بھی مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔
حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی اور حضرت عثمانؓ کو صلح کی گفتگو کے لیے مکہ بھیجا۔ قریش نے انہیں روک لیا لیکن لوگوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا۔ یہ خبر سن کر آپ کو بے حد رنج پہنچا۔ اسی صدمے کے عالم میں آپ کیکر کے ایک درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔ صحابہ کرام اپنے چاند کے گرد ستاروں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا۔
"عثمان کا قصاص لینا ہم پر فرض ہے، کون ہے جو اس قصاص کے لیے میرے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے۔" صحابہ کرام نے اپنی جانیں راہ حق پر قربان کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی۔
ان بیعت کرنے والوں میں حضرت سعدؓ بھی شامل تھے۔
اس بیعت میں شریک ہونے والوں کی فضیلت قرآن حکیم میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔
"(اے نبی) اللہ مسلمانوں سے راضی تھا جبکہ وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے سو اللہ نے جان لیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا اور ان کو اطمینان قلب عطا کیا اور عاجلانہ فتح دی۔ یہ بیعت تاریخ میں بیعت رضوان کہلائی۔"
بیعت رضوان کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر غلط تھی بالآخر اسی مقام حدیبیہ پر مسلمانوں اور مکہ والوں کے درمیان چند شرائط پر مبنی معاہدۂ صلح طے پا گیا۔
صلح نامہ پر مسلمانوں کی طرف سے جن چند اصحاب نے دستخط فرمائے ان میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص بھی شامل تھے۔ یہ سعادت بھی آپ کو حاصل ہوئی۔
8 ہجری میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ فتح کیا تو حضرت سعد بن ابی وقاص بھی ان دس ہزار قدسیوں میں شامل تھے جو مکہ میں داخل ہوتے وقت سرور کائنات کے ہمرکاب تھے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ اس موقع پر مہاجرین کے تین علموں میں سے ایک علم حضرت سعدؓ کے پاس تھا۔
فتح مکہ کے بعد حنین کا خونیں معرکہ درپیش ہوا۔ حضرت سعدؓ اس میں بھی پیش پیش تھے۔ مکہ کی فتح سے عرب کے دو جنگجو قبائل غضب میں آ گئے۔ مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام حنین ہے۔ ان دو قبائل کا تعلق اسی وادی سے تھا۔ انہوں نے زور شور سے جنگ کی تیاری کی اور مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کی تعداد چار ہزار تھی۔ ان کے شوق جنگ کا یہ عالم تھا کہ اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی ساتھ لائے تھے تاکہ لڑتے وقت بھاگنے کا خیال بھی دل میں نہ آئے۔
فتح مکہ کی سرشاری ابھی تک دلوں پر طاری تھی لہٰذا بعض مسلمانوں کی زبانوں سے یہ کلمہ ادا ہو گیا کہ آج ہم پر کون غالب آ سکتا ہے شاید یہ غرور اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا اور حالات وہی ہو گئے جن کا سامنا جنگ احد میں مسلمانوں کو کرنا پڑا تھا۔
مشرکین وادی حنین کے دروں اور گھاٹیوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ مسلمانوں کا مقدمتہ الجیش (اگلے چلنے والا دستہ) جونہی ایک گھاٹی میں داخل ہوا مشرکین نے تیروں اور پتھروں کی بارش کر دی۔ اس دستے میں زیادہ تعداد مکہ کے نومسلموں کی تھی۔ وہ اس حملے کی تاب نہ لا سکے اور سراسیمہ ہو کر پیچھے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے اس طرح بھاگنے سے باقی فوج میں بھی بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جس طرف منہ اٹھا بھاگنے لگا۔ صحابہ کرامؓ کی ایک مختصر سی جماعت رہ گئی جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے حصار میں لے کر ان کی حفاظت کرنے لگی۔
ان محافظوں میں حضرت سعدؓ نمایاں نظر آتے تھے جو کمان میں تیر رکھ رکھ کر وادیوں اور گھاٹیوں کی طرف پھینک رہے تھے۔ ساتھ ہی بھاگنے والوں کو آوازیں دیتے جا رہے تھے۔
"اے گروہ انصار، اے اصحاب الشجرہ، واپس آؤ

رسول اللہ تم کو بلاتے ہیں۔"

اس آواز نے ایسا اثر دکھایا کہ بھاگی ہوئی جمعیت واپس آگئی اور پھر اس جوش سے لڑے کہ مشرکین کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

بنو ثقیف بھاگ کر قلعہ طائف میں پناہ گزیں ہو گئے تھے لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف کی طرف کوچ کیا اور قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بھی آپ کے ہمرکاب تھے۔

بیس دن بعد آپؐ نے محاصرہ اٹھالیا اور مال غنیمت کی تقسیم کے بعد مدینہ تشریف لے آئے۔

9 ہجری میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین سو مسلمانوں کا قافلہ مدینہ منورہ سے حج کے لیے روانہ کیا۔ اس قافلے میں حضرت سعدؓ بھی شامل تھے اور ان کے ذمے معلمی کی خدمت تھی جبکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس قافلے کے امیر اور حضرت علیؓ نقیب اسلام تھے۔

اس حج کے ساتھ ہی حج کے جاہلانہ رسوم کا خاتمہ ہوگیا اور اسلامی احکام کے مطابق حج کرنا لازمی قرار دے دیا گیا۔ اس حج میں حضرت علیؓ نے بطور نقیب اسلام اعلان کردیا کہ آئندہ کسی بھی مشرک کو خانہ کعبہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوگی اور نہ کوئی پوری طرح ستر ڈھانپے بغیر حج کرسکے گا اور مشرکین مکہ سے کیے گئے تمام معاہدے چار ماہ کے بعد منسوخ ہوجائیں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم 10 ہجری میں اپنی حیاتِ اقدس کا آخری حج ادا فرمانے مدینہ سے نکلے۔ صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد آپ کے ہمراہ تھی۔ سعد بن ابی وقاصؓ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ یہ حج چونکہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ کا آخری حج ثابت ہوا اس لیے تاریخ میں حجتہ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ مکہ پہنچ کر سخت علیل ہوگئے۔ بیماری اتنی بڑھی کہ خود انہیں اپنے بچنے کی اُمید نہ رہی۔ اتنی نااُمیدی میں آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عیادت کے لیے تشریف لائے۔

"حضورؐ، اب میں شاید ہی جانبر ہوسکوں۔"

"موت اور زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تم کون ہوتے ہو اندازے لگانے والے۔"

"حضورؐ، یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں مالدار آدمی ہوں اور میری صرف ایک بیٹی ہے تو کیا میں اپنے دو تہائی مال صدقہ کردینے کی وصیت اور ایک تہائی بیٹی کے لیے چھوڑ سکتا ہوں۔"

"نہیں۔"

"پھر ایک تہائی صدقہ کرنے کے لیے اجازت فرمائیں۔"

"ہاں حالانکہ ایک تہائی بھی بہت ہے۔ اگر تم اپنے وارثوں کو مال دار اور تونگر چھوڑو تو یہ ان کے مفلسی چھوڑے جانے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاتے پھریں۔ تم رضائے الٰہی کے لیے جو کچھ بھی خرچ کروگے تمہیں اس کا اجر ملے گا۔"

حضرت سعدؓ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے پھر آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور رندھی ہوئی آواز میں فرمایا۔

"یارسول اللہ! میں دیکھ رہا ہوں کہ مجھے مکہ میں موت آرہی ہے حالانکہ میں راہ حق میں اس سرزمین کو چھوڑ چکا ہوں۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعدؓ کو دلاسا دیا اور ان کی پیشانی چہرے اور شکم پر دست مبارک پھیر کر دعا فرمائی۔

"اے اللہ! سعدؓ کو شفا دے اور اس کی ہجرت کو کامل کر۔"

"یارسول اللہ! کیا میں اپنے ساتھیوں کے بعد تک زندہ رہوں گا؟" حضرت سعدؓ نے پوچھا۔

"شاید تم زندہ رہو یہاں تک کہ بعض لوگوں کو تم سے نفع اور بعض کو ضرر پہنچے۔ تم اگر زندہ رہے اور نیک عمل کیا تو تمہارا درجہ اور شان زیادہ ہوگی۔"

حضرت سعدؓ کے حق میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ دعا آب حیات ثابت ہوئی اور آپ کی طبیعت تیزی سے بحال ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بالکل تندرست ہوکر مدینہ واپس آگئے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی حجتہ الوداع سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ تشریف لے آئے۔ خطبہ حجتہ الوداع میں آپؐ نے کچھ ایسی باتیں بیان کی تھیں کہ صحابہ کرام میں سے بہت سوں کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ اب رسول خدا زیادہ دیر تک ہمارے درمیان نہیں رہیں گے۔ یہ خدشہ اس وقت پورا ہوگیا جب چند ماہ بعد ہی حضور پاک کا وصال ہوگیا۔ یہ موقع مسلمانوں کے لیے بہت نازک تھا۔ ایک

طرف آپ کی وفات کا صدمہ تھا دوسری طرف خلافت کا مسئلہ تھا جس میں نزاع پیدا ہو گیا۔ انصار، مہاجرین اور بنو ہاشم تینوں خلافت کے دعویدار تھے اور اپنے اپنے نام پیش کر رہے تھے۔ یہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ بعض لوگوں نے تلواروں پر ہاتھ ڈال لیے۔ بعض اکابر صحابہ کی دور اندیشی نے اس جھگڑے کو بڑھنے نہ دیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنا ہاتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوف اور حضرت ابو عبیدہ بن جراح جیسے اکابر صحابہ نے بیعت کر لی پھر چاروں طرف سے لوگ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔

حضرت سعد بھی ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے بلا توقف حضرت صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے انہیں بنو ہوازن کے عامل کے طور پر حنین روانہ کیا۔ حضرت سعدؓ اب تک ایک نامور سپاہی کی حیثیت سے مشہور تھے۔ ان کی بہادری میں کسی کو شک نہیں رہا تھا۔ اب انہیں خود کو بہترین منتظم ثابت کرنا تھا۔ وہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتقال بہت جلد ہو گیا۔ ان کے دور ہی میں مسلمانوں اور حکومت کسریٰ کے درمیان جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا لیکن ان کی مدت حیات نے اتنا وقت نہیں دیا کہ وہ ان سلاسل کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ان کے بعد جب حضرت عمر فاروقؓ کا دور آیا تو ان مہمات میں تیزی آ گئی۔

انہوں نے صدیق اکبرؓ کی وصیت کے مطابق سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع منعقد کیا اور اس میں لوگوں کو عراق جانے اور جہاد کرنے کی ترغیب دی۔

یزدگرد تخت نشین ہو چکا تھا۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی حکومتِ کسریٰ کے تن مردہ میں جان سی پڑ گئی۔ خواص وعوام متحد ہو کر مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

جب حضرت عمر فاروقؓ کو ان حالات کا علم ہوا تو آپ بے اختیار پکار اٹھے۔

''خدا کی قسم اگر ملوک عجم نے اتحاد کر لیا ہے تو میں ان کے لیے ملوک عرب کو بھیجوں گا۔'' اس کے بعد آپؓ نے تمام عرب میں منادی کرادی۔

''لوگ جہاد کے لیے تیار ہو کر آئیں یہاں تک کہ اگر کسی قبیلے میں ایک شخص بھی لڑنے کے قابل ہے یا کوئی اور ہنر جانتا ہے تو وہ بھی آ جائے۔''

اس اپیل نے ایسا اثر دکھایا کہ چاروں طرف سے مدینہ منورہ میں مجاہدین کا تانتا بندھ گیا۔ حد نظر تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے اور دشت وجبل نعرہ تکبیر کی آوازوں سے گونج رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان مجاہدین کو ساتھ لیا اور مدینہ منورہ سے باہر چشمہ صوار پر قیام فرمایا۔ یہاں آپؓ نے اکابر صحابہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

''میرا ارادہ ہے کہ اس لشکر کے ساتھ میں خود جاؤں۔ میری غیر حاضری میں علیؓ نظم ونسق خلافت چلائیں گے۔ طلحہ، زبیر اور عبدالرحمن بن عوف میرے ساتھ ہوں گے۔''

عام صحابہ کے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ یہ مہم خلیفہ وقت کی ہمراہی میں طے ہو لیکن اہل الرائے صحابہ اس اعلان پر سوچ میں پڑ گئے پھر بصد ادب گزارش کی۔

''آپؓ کا مرکز خلافت سے باہر رہنا بہت سے خطرات کا باعث بن سکتا ہے اس لیے کہ اگر خدانخواستہ آپؓ کے قائد لشکر ہوتے ہوئے لشکر اسلام کو ہزیمت ہو گئی تو اس کے نتائج نہایت بھیانک ہوں گے۔ اگر آپ مرکز خلافت میں ہوئے تو حالات سے بہتر طور پر نمٹ سکیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ لشکر کی قیادت کسی اور کے سپرد کر دیں اور آپؓ خود مدینہ میں بیٹھ کر اس لشکر کی نگرانی کریں اور جیسے حالات ہوں اس کے مطابق فیصلے کرتے رہیں۔ ہم آپؓ کو حالات سے باخبر کرتے رہیں گے۔''

حضرت عمرؓ نے اس صائب رائے کو تسلیم کیا اور مرکز خلافت میں رہنے کو ترجیح دی لیکن اب سوال یہ تھا کہ لشکر کی قیادت کس کے سپرد کی جائے۔ صحابہ کرام سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور آپس میں مشورے کرنے لگے۔ مہم ایسی عظیم الشان تھی کہ اس کا قائد بھی ایسا ہی عظیم الشان ہونا چاہیے تھا۔ کئی نام سامنے آئے مگر رد ہو گئے۔ نام ایسا ہونا چاہیے تھا جس پر سب سے اتفاق ہو۔ یہ مشکل ابھی حل نہیں ہوئی تھی کہ عبدالرحمن بن عوفؓ اچانک بول اٹھے۔ ''میں نے پا لیا، میں نے پا لیا۔''

''وہ کون؟ تم کس کے نام پر پہنچے؟'' حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

''سعد بن ابی وقاص کہ ان کی ذہانت اور شجاعت کے سب قائل ہیں۔ بدر واحد اور دوسرے غزوات میں ہم

نے ان کی جانبازی کو دیکھا ہے اور اب بطور عامل ان کی انتظامی صلاحیت کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ صرف صحابی ہی نہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی رشتے داری بھی تھی۔ اسلام کے لیے ان کا خلوص ڈھکا چھپا نہیں۔"

حضرت عوف کا شمار خود بھی عشرہ مبشرہ میں ہوتا تھا اور اسلام لانے والے ابتدائی لوگوں میں سے تھے۔ ان کی رائے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سب نے ان کی رائے سے اتفاق کیا بلکہ بیشتر لوگ یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ کمال ہے یہ نام اب تک ہمارے ذہنوں میں آیا کیوں نہیں۔

حضرت عمرؓ نے فوراً انہیں خط لکھ کر بلا بھیجا۔ جب یہ خط حضرت سعدؓ کو موصول ہوا اور اس کی غایت معلوم ہوئی تو انہیں بے اختیار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کہنا یاد آ گیا۔ جب وہ حجتہ الوداع کے موقع پر مکہ میں بیمار پڑے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں یہ بشارت دی تھی۔

"اے سعدؓ! تم اس وقت تک زندہ رہو گے جب تک کہ تم سے ایک قوم کو نقصان اور دوسری کو نفع نہ پہنچ جائے۔"

کیا اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا وقت آ گیا؟ حضرت سعدؓ نے سوچا شاید میرے ہاتھوں سے ایرانی قوم کو نقصان اور عربوں کو نفع پہنچنے والا ہے۔

وہ اس وقت نجد میں تھے اور بنو ہوازن سے صدقات کی وصولی کی مہم پر مامور تھے۔ سوچنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ چند دن بعد حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچ گئے اور اپنی خدمات سپرد کر دیں۔

اس وقت اسلامی لشکر کا جوش و جذبہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ نعرۂ تکبیر کی آوازیں در و دیوار کو ہلا رہی تھیں۔ قصر خلافت میں حضرت عمرؓ علم امارت ان کے سپرد کر رہے تھے۔

جب یہ ہو چکا تو حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا۔

"اے سعدؓ! اس پر مغرور نہ ہونا کہ لوگ تمہیں رسول اللہ کا ماموں اور جلیل القدر صحابی کہتے ہیں اللہ اور اس کے بندوں میں قرابت کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ہاں رشتہ ہے تو اطاعت کا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعلیٰ اور ادنیٰ سب برابر ہیں۔ ان میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ اس کا محاسبہ کرنے اور گناہوں سے بچنے میں ہے۔ تم اس طریقے کو مضبوطی سے اختیار کرو جس پر رسول اللہ بعثت سے رحلت تک قائم رہے۔ اگر تم نے اسے نظر انداز کر دیا تو تم اپنے اعمال بھی ضائع کرو گے اور تم گھاٹا پانے والوں میں ہو گے۔"

اس کے بعد آپؓ نے چند ہدایات حضرت سعدؓ کو دیں۔ مدینہ منورہ سے روانہ ہونے کے بعد ہر وقت اور ہر حال میں مرکز خلافت سے رابطہ رکھنا۔

جس جگہ پڑاؤ ڈالو وہاں کا نقشہ اور دوسرے حالات اس طرح لکھ بھیجنا گویا سب کچھ خلیفۃ المسلمین اور مجلس شوریٰ کی نظروں کے سامنے ہے۔

حضرت عمرؓ نے مدینہ سے عراق تک تمام منزلیں متعین کر کے حضرت سعدؓ کو روانگی کا اذن دے دیا۔ حضرت سعدؓ نے لشکر کا نشان چڑھایا اور چار ہزار سرفروشوں کے ساتھ مدینہ منورہ سے کوچ کیا۔

منزلیں پہلے ہی طے ہو چکی تھیں کہ کس کس مقام پر پڑاؤ ڈالنا ہے۔ اس نقشے کے مطابق حضرت سعدؓ مدینہ منورہ سے اٹھارہ منزلیں طے کرنے کے بعد ثعلبہ پہنچے۔ یہاں پانی کی افراط تھی چنانچہ یہ جگہ فوج کے قیام کے لیے نہایت موزوں تھی۔ حضرت سعدؓ چار ہزار کے لشکر کے ساتھ مدینہ منورہ سے نکلے تھے۔ وہ ثعلبہ پہنچے تھے کہ چار ہزار مجاہدین ان کے پاس مدینہ پہنچ گئے اس طرح ان کے لشکر کی تعداد آٹھ ہزار ہو گئی۔ اس کے بعد بھی حضرت عمرؓ فوج کے مزید دستے ثعلبہ بھیجتے رہے۔ اب حضرت سعدؓ کے پاس ثعلبہ میں بیس ہزار فوج جمع ہو گئی۔

تین مہینے کے قیام کے بعد انہوں نے ثعلبہ سے کوچ کیا اور شراف میں خیمہ زن ہوئے۔ حضرت عمرؓ سے خط و کتابت برابر جاری تھی۔ وہاں سے جو ہدایات آ رہی تھیں حضرت سعدؓ انہی کے مطابق قدم اٹھا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کا خط پہنچا۔

شراف سے آگے بڑھ کر قادسیہ میں قیام کرو کیونکہ قادسیہ ایران کا دروازہ ہے اور نہایت سرسبز و شاداب مقام ہے۔ یہاں کے اہم راستوں پر تم اپنی فوج کے کچھ دستے متعین کر دو اور باقی لشکر پیچھے کسی محفوظ مقام پر رکھو اس طرح کہ سامنے عجم کی سرزمین ہو اور پشت پر عرب کے پہاڑ۔

قادسیہ پہنچ کر وہاں کے حالات مجھے اس تفصیل سے لکھنا گویا میں لشکر اسلام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے دشمن کی نقل و حرکت کی اطلاع دو اور ان کے سپہ سالار کا نام لکھ کر بھیجو۔

حضرت عمرؓ کی ہدایت کے مطابق حضرت سعدؓ قادسیہ پہنچے اور فوج کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے مناسب مقامات

پر متعین کر دیا۔

جنگی حکمتِ عملی کے مطابق حضرت سعدؓ نے اپنے مخبر ایران کے طول و عرض میں پھیلا دیے۔ ان مخبروں نے جو معلومات فراہم کیں حضرت سعدؓ نے انہیں ایک خط میں بیان کر کے حضرت عمرؓ کے پاس روانہ کر دیں تاکہ ان معلومات کی روشنی میں مزید ہدایات حاصل کی جا سکیں۔

''سارے ایران میں اس وقت جنگ کا شور مچا ہوا ہے۔ یزدگرد نہایت زور و شور سے جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ایران کا نامور سورما رستم کو فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا ہے۔ وہ اس وقت ایک لاکھ سے اوپر فوج کے ساتھ ساباط میں مقیم ہے۔ رستم کی موجودگی اور یزدگرد کی ہر دل عزیزی نے لوگوں کے جوش و جذبہ میں بے حد اضافہ کر دیا ہے۔ نواحی علاقوں کے لوگ دل و جان سے دربار ایران کی حمایت پر کمربستہ ہو گئے ہیں۔''

اس خط کے جواب میں حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کے نام مکتوب لکھا۔

''تم ایرانی فوجوں کی کثرت اور ان کے ساز و سامان کی فراوانی سے مت گھبراؤ۔ کارسازِ حقیقی پر بھروسا رکھو اور اسی سے مدد مانگو شاہ ایران کے پاس چند ذی رائے لوگوں کو سفیر بنا کر بھیجو جو اس کو دعوتِ اسلام دیں۔ انشااللہ اس دعوت سے ایرانیوں کے ارادوں میں سستی پیدا ہو گی اور اگر شاہ ایران اسلام کو رد کرے گا تو اس کا وبال بھی اسی کی گردن پر پڑے گا۔''

حضرت عمرؓ کا حکم ملتے ہی حضرت سعدؓ نے چودہ آدمیوں کا ایک وفد ترتیب دیا اور انہیں ضروری ہدایات دے کر مدائن کی طرف روانہ کر دیا۔

یہ لوگ رستم کے لشکر کو نظر انداز کرتے ہوئے مدائن پہنچ گئے جو ان کا دارالخلافہ تھا۔

عرب کے سادہ روایتی لباس میں ملبوس یہ لوگ مدائن میں داخل ہوئے تو حیرت کے سوا ان لوگوں کو دیکھ کر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وفد کے بیشتر ارکان گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر سوار تھے۔ معمولی کوڑوں کے سوا ان پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ یہ قیمتی لوگ تھے لیکن اپنی حفاظت کی طرف سے غافل، بے کھٹک مدائن میں گھسے چلے آئے تھے۔ یزدگرد کو اطلاع ملی تو اس نے دربار آراستہ کیا اور وفد کو اذن ملاقات دیا۔

''تم لوگ فارس پر کیوں حملہ آور ہوئے۔''

یزدگرد کے اس سوال کا جواب دینے کے لیے رئیس وفد حضرت نعمان بن مقرن اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے۔

''ہمارا مقصد نہ جنگ ہے نہ لوٹ مار ہم تو اسلام کی دعوت دینے نکلے ہیں۔ اگر تم شرک کو ترک کر دو۔ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آؤ تو ہمارا تمہارے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں۔ ہم کتاب اللہ تمہارے پاس چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے۔''

''اچھا بہت خوب۔'' یزدگرد نے بیہودگی سے قہقہہ لگایا۔ ''میں تو تمہارے رسول کو نہیں جانتا اور نہ ہی اس پر ایمان لانے کا پابند ہوں۔''

''ہمارے دین میں جبر نہیں ہے۔ ہم بھی تمہیں مجبور نہیں کریں گے۔ اگر تمہیں منظور نہیں تو جزیہ دینا قبول کرو۔''

''تم مجھے اتنا کمزور سمجھتے ہو۔ کیا تم نے راستے میں میرا لشکر نہیں دیکھا۔ تم میں سے ایک مسلمان کو بھی زندہ بچ کر نہیں جانے دوں گا۔''

''اگر تمہیں جزیہ دینا بھی قبول نہیں تو پھر ہماری تلوار تمہارا فیصلہ کرے گی۔ ہم نے اپنی حجت پوری کر دی۔ اب جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

یزدگرد اس جواب پر غضب ناک ہو گیا اور چیخ اٹھا۔

''تم بھوکے اور ننگے لوگ کہ سانپ اور چھپکلی تمہاری غذا ہے۔ ذرا میرے دربار کی آرائش پر نظر ڈالو اور اپنے کپڑوں کی حالت دیکھو۔ میرے ملک کو لوٹنے آئے ہو۔ میں اتنا تو ضرور کر سکتا ہوں کہ تم غریبوں کی مدد کروں۔ تمہارے اونٹوں پر غلہ لاد کر تمہیں اپنے ملک سے نکال دوں۔ اس سے زیادہ اگر کچھ اور چاہتے ہو تو نامرادی کی موت ہے جو میں تم میں تقسیم کر دوں گا۔''

اب قیس بن زرارہ نے سلسلہ کلام آگے بڑھایا۔

''یزدگرد تو نے ٹھیک کہا، ہم واقعی بدترین مخلوق تھے لیکن خدا نے ہم پر اپنا فضل کیا اور ہمارے درمیان ایک پیغمبر بھیجا جس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا۔ اب ہم ادنیٰ مخلوق نہیں شرفائے عرب ہیں۔ تم بھی اس ہدایت سے اپنا سینہ منور کر لو۔ ہم نے تمہارے سامنے تین راستے رکھ دیے ہیں کوئی ایک قبول کر لو۔''

اب تو یزدگرد کے غضب کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔

''اگر ایلچیوں کو قتل کرنا جائز ہوتا تو تم میں سے کوئی بھی زندہ بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ تم یہاں سے ایک تنکا بھی نہیں لے جا سکتے۔ اپنے سردار سے کہہ دینا کہ اسے یہاں کی

خاک دھول ہی ملے گی۔"

یزدگرد نے خاک دھول منگا کر مسلمانوں کے آگے ڈال دی۔ چند صحابہ آگے بڑھے اور یہ مٹی اپنی چادروں میں ڈالی اور اجازت لیے بغیر وہاں سے نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی درباری نجومیوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟ مسلمانوں کا یہاں کی مٹی خوشی خوشی لے جانا بدشگونی ہے۔ نہ جانے ہم پر کیا آفت آئے۔"

"تم نے مجھے اس وقت کیوں نہیں روکا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ مٹی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔" یزدگرد نے کہا اور آدمی دوڑا دیے کہ وہ مٹی ان سے چھین کر لے آئیں۔

اس کے آدمی جب تک پہنچے مسلمانوں کا وفد بہت دور نکل چکا تھا۔

مسلمانوں کا وفد لشکرگاہ سے واپس آیا اور حضرت سعدؓ کے خیمے میں پہنچ گیا۔

"اے امیر! مبارک ہو دشمن نے اپنی زمین خود ہمیں دے دی۔ انشاءاللہ اب ہم ضرور سرزمین فارس پر قابض ہو جائیں گے۔"

یزدگرد نے رستم کو حکم بھیجا کہ مساباط سے چل کر قادسیہ پہنچو اور مسلمانوں کو پیس کر رکھ دو۔

رستم نے علم اٹھایا اور اپنے لشکر کو لے کر قادسیہ کی طرف کوچ کیا۔ کہتے ہیں اس کے ساتھ تین لاکھ فوج اور تین سو جنگی ہاتھی تھے۔

رستم کا لشکر مختلف جگہوں پر قیام کرتا ہوا نجف پہنچ گیا اور عتیق کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ اس نے یہاں تک پہنچنے میں چھ ماہ لگا دیے تھے جبکہ مدائن سے قادسیہ تک پہنچنے میں چند دن لگتے تھے۔ اس سست رفتاری کے پیچھے بھی اس کی ایک چال تھی۔ اسے مسلمانوں کی قوت اور جوش جہاد کا اندازہ ہو گیا تھا اور وہ اس جنگ کو ٹالنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس عرصے میں مسلمانوں میں غذائی قلت پیدا ہو جائے گی۔ رسد کے سب دروازے بند دیکھ کر مسلمان خود ہی واپس چلے جائیں گے۔

حضرت سعدؓ کی تجربہ کار آنکھوں نے اس کے ارادے کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے روزے رکھنے کی تلقین کی اور ایک وقت کا کھانا بچاتے رہے اور غذا کی قلت پیدا نہ ہونے دی۔

رستم کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ دربار ایران کی طرف سے بھی مسلسل تقاضے ہو رہے تھے کہ جلدی جنگ چھیڑ دو۔

اسے مجبور ہو کر مسلمانوں کے سامنے آنا پڑا لیکن ڈرا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ پھر چاہا کہ صلح کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس نے حضرت سعدؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ اپنا کوئی آدمی صلح کی گفتگو کے لیے میرے پاس بھیجو۔ حضرت سعدؓ نے ربعی بن عامرؓ کو رستم کے پاس بھیجا۔

شان و شوکت ابھی مسلمانوں میں رائج نہیں ہوئی تھی۔ ربعی بن عامر بھی اس انداز میں چلے کہ معمولی کپڑے زیب تن تھے۔ کمر میں پیٹی کی جگہ رسی بندھی ہوئی تھی۔ سر پر صافہ تھا وہ بھی معمولی۔ تلوار میان کی بجائے کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں نیزا تھا۔

وہ رستم سے ملنے کے لیے پہنچے تو دیکھا دور دور تک بیش بہا قالینوں کا فرش بچھا ہوا ہے۔ اعلیٰ وردیوں میں ملبوس فوجی دستے کھڑے ہیں اور رستم سونے کے فرش پر براجمان ہے۔ وہ رستم کے قریب پہنچے تو نیزا زمین پر گاڑ دیا اور فرش کا ایک کونا اٹھا کر زمین پر بیٹھ گئے۔

"آپ اپنے ہتھیار رکھ دیں کہ یہی ہمارا قاعدہ ہے۔" درباریوں نے کہا۔

"میں ہتھیار ہرگز تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔ اگر تمہیں اس حالت میں گفتگو کرنا منظور ہے تو ٹھیک ورنہ میں چلا۔"

رستم نے ہاتھ کے اشارے سے درباریوں کو منع کر دیا کہ ہتھیار نہ رکھوائے جائیں اور پھر ترجمان کے ذریعے اس نے گفتگو شروع کی۔ "تم قالین پر کیوں نہیں بیٹھے؟"

"ہم پرتکلف فرش پر نہیں بیٹھتے۔ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ نے زمین کا فرش بچھا دیا ہے۔"

"تم ہمارے ملک میں کیوں آئے ہو؟"

"ہم خود نہیں آئے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ تمہیں گمراہی سے نکال کر ہدایت یافتہ کرنے۔ اب تم اسلام قبول کر لو یا جزیہ دینا منظور کرو ورنہ یہ تلوار فیصلہ کرے گی۔"

رستم نے تلوار کی طرف دیکھا اسے ہنسی آ گئی۔

"تمہاری تلوار بوسیدہ کپڑے میں لپٹی ہوئی ہے۔ تلوار بھی ایسی ہی ہوگی۔ لڑائی میں کیا کام دیتی ہوگی۔"

اب رستم مذاق پر اتر آیا تھا۔ حضرت سعد ربعی بن عامر کو یہ مذاق پسند نہ آیا تلوار کپڑے سے باہر نکال لی۔

"اس کی کاٹ بہت تیز ہے اور چلانے والے کے ہاتھ مضبوط ہیں۔ ابھی آزما کر دیکھ لو۔"

ایرانیوں نے کچھ مضبوط ڈھالیں ان کے سامنے رکھ دیں۔ حضرت ربعیؓ نے اپنی تلوار سے ان سب کے ٹکڑے اڑا دیے۔ مصالحت کی گفتگو تو کیا ہوتی کچھ دیر نوک جھونک ہوتی رہی پھر رستم نے انہیں رخصت کر دیا کہ ہم تمہاری باتوں پر غور کر کے جواب دیں گے۔

دوسرے دن رستم نے حضرت سعدؓ کو پھر پیغام بھیجا کہ ایک اور ایلچی بھیجا جائے۔ حضرت سعدؓ نے اس مرتبہ حضرت حذیفہ بن محض کو بھیجا۔

وہ حضرت ربعیؓ سے بھی زیادہ بے نیاز نکلے۔ انہوں نے رستم کے سامنے پہنچ کر گھوڑے سے اترنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے گفتگو کا آغاز کر دیا۔

رستم نے وہی سوالات کیے جو وہ ایک روز قبل حضرت ربعیؓ سے کر چکا تھا اور اسے جوابات ملے جو حضرت ربعیؓ اسے دے چکے تھے۔ رستم نے انہیں بھی کسی نتیجے پر پہنچے بغیر رخصت کر دیا۔

رستم نہ جانے کیا چاہتا تھا کہ اگلے دن ایک اور سفیر طلب کر لیا۔ اس مرتبہ حضرت مغیرہ بن شعبہ گئے۔ اس سے بھی وہی باتیں ہوئیں رستم کا پیمانہ صبر بھی اب لبریز ہو چکا تھا۔

مسلمان تین شرائط اس کے سامنے رکھ رہے تھے۔ اسلام قبول کر لو، جزیہ دو یا تلوار فیصلہ کرے گی۔ ایرانی ان میں سے کوئی بھی شرط پوری کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ وہ تو یہ چاہ رہے تھے کہ مسلمانوں کو کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا جائے اور جنگ ٹل جائے۔ جب وہ تین سفارتوں کے بعد مایوس ہو گیا تو وہ برس پڑا۔

”آفتاب کی قسم اب ہرگز تم سے صلح نہیں ہوگی۔ کل میں تم سب کو کچل ڈالوں گا۔“

حضرت مغیرہ نے واپس آ کر حضرت سعدؓ کو رستم کے عزائم سے آگاہ کر دیا۔ حضرت سعدؓ نے ایک کوشش اور کرتے ہوئے ایک سفارت اور بھیجی لیکن وہ بھی ناکام رہی۔ اب جنگ کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ دونوں لشکروں کے درمیان ایک دریا حائل تھا۔ رستم نے اپنی طاقت پر گھمنڈ کرتے ہوئے حضرت سعدؓ کے پاس پیغام بھیجا۔

”تم دریا عبور کر کے ادھر آؤ گے یا ہم تمہیں کچلنے کے لیے اس طرف آئیں کس طرف مرنا پسند کرو گے۔“

”تم ادھر آ جاؤ، جس کی موت جس طرف ہوگی ادھر آ جائے گی۔“

رستم نے دریا پر پل بنوایا اور اس کی فوج نے راتوں رات دریا عبور کر لیا۔ رستم نے اپنے لشکر کی صفیں درست کیں اور مناسب جگہوں پر ہاتھیوں کے پرے جما دیے۔

مسلمان بھی کئی گنا لشکر کے سامنے صف آرا ہو گئے۔

یہ جنگ نہایت اہمیت کی حامل تھی۔ دونوں قوموں کی زندگی اور موت کا دارومدار اس جنگ کی ناکامی اور کامیابی پر تھا اس لیے دونوں فریق مکمل تیاری کر رہے تھے۔

دل میں کیا کیا ارمان تھے، کیسے کیسے منصوبے تھے لیکن جب لڑائی کا وقت آیا تو سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ رات ہی سے طبیعت کہتی تھی کہ صبح تک نہ جانے کیا ہو۔ صبح ہوتے ہی تکلیف اتنی بڑھ گئی کہ گھوڑے پر بیٹھنا دوبھر ہو گیا۔ زیادہ پیدل چلنا بھی دشوار ہو گیا۔

ان کی ساری زندگی شجاعت اور استقامت کا نمونہ تھی۔ یہ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر جنگ سے پہلو تہی کر رہے ہوں گے۔ بعض لوگوں کو یہ گمان ہوا ضرور تھا لیکن حقیقت حال جاننے کے بعد یہ غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔

ان کو کیا مرض لاحق ہو گیا تھا اس بارے میں تین مشہور روایات ہیں۔

(1) عرق النسا میں مبتلا تھے۔ (2) رانوں میں دنبل کے پھوڑے نکلے ہوئے تھے۔ (3) ایک جنگ میں گہرے زخم آئے تھے۔ یہ زخم اس وقت پھر سے ہرے ہو گئے تھے۔

چلنے پھرنے سے معذور ہو چکے تھے۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی ایسی مناسب جگہ مقیم ہو جائیں جہاں سے لڑائی کا منظر صاف نظر آتا ہو۔ وہ وہاں بیٹھے بیٹھے ہدایات دے سکیں اور اپنی فوجوں کو لڑا سکیں۔

میدان جنگ کے قریب زمانہ قدیم کا ایک محل تھا۔ حضرت سعدؓ اس کی دوسری منزل پر چلے گئے۔ یہاں ان کے لیے تخت بچھوا دیا گیا جس پر وہ تکیہ لگا کر بیٹھ گئے۔ میدانِ جنگ کا منظر سامنے تھا۔ انہوں نے خالد بن عرفطہؓ کو اپنے پاس بلایا۔

”خالد، تم میری حالت دیکھ رہے ہو۔ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہوں۔ نہ جانے کب تک یہ حال رہے۔ دشمن سر پر آ چکا ہے جنگ کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ میں میدان جنگ میں تمہیں اپنا نائب مقرر کرتا ہوں۔ اللہ کا نام لے کر مجاہدین کی قیادت سنبھالو۔ میں تمہیں احکام بھیجتا رہوں گا۔ تم ان ہدایت پر عمل کرنا، انشاءاللہ فتح مسلمانوں کی ہوگی۔“

فوج کے علم برداروں کو بھی پیغام بھجوا دیا گیا کہ خالد بن عرفطہ کو میں نے اپنا نائب مقرر کیا ہے۔ اس کے حکم کو میرا حکم سمجھو۔

حضرت سعدؓ نے دستور کے مطابق تین تکبیریں کہیں جس پر مجاہدین نے تلواریں بے نیام کرلیں اور نیزے دشمن کی طرف سیدھے کرلیے اور چوتھی تکبیر پر لڑائی کا آغاز ہوگیا۔

دستور کے مطابق انفرادی مقابلوں سے جنگ کا آغاز ہوا اور پھر باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔ رستم کے جنگی ہاتھیوں نے تباہی مچادی۔ بہت سے مجاہدین ہاتھیوں کے پاؤں تلے کچلے گئے۔ حضرت سعدؓ بڑی تشویش کے ساتھ یہ مناظر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے فوراً ایک پرچے پر ہدایات لکھیں اور اس پرچے کی گولی بنا کر بالا خانے سے نیچے پھینک دیا۔

حضرت خالد بن عرفطہؓ وہاں موجود تھے انہوں نے پرچا پڑھا اور جنگ میں شامل بنوتمیم کے پاس پہنچ گئے۔ یہ قبیلہ تیراندازی اور تلوار بازی میں مشہور تھا۔ حضرت خالد کو یہی ہدایت دی گئی تھی کہ کھڑے منہ کیا تک رہے ہو بنوتمیم کے لوگوں سے کہو اپنا خاندانی ہنر آزمائیں۔ کمال فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہاتھیوں کا منہ پھیر دیں۔

حضرت خالد نے بنوتمیم کو حکم دیا کہ ہاتھیوں پر تیر برسائیں۔ حکم ملتے ہی اس زور کا حملہ کیا کہ ہاتھیوں کے سامنے تیروں کی دیوار کھڑی کردی۔ اپنے تیروں اور نیزوں سے سواروں کو نیچے گرادیا۔ ہاتھیوں کو ایسے زخم لگے کہ چیختے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

اب دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی۔

صبح سے شام تک ہولناک جنگ ہوتی رہی۔ رات جب تاریک ہوگئی تو دونوں لشکر زخمیوں سے چور ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔

حضرت سعدؓ کو جنگ میں حصہ نہ لینے کا ایسا افسوس تھا کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

''اے اللہ! میں اگر جنگ میں شامل ہوتا تو جنگ کا انداز ہی دوسرا ہوتا۔ ابھی تو جنگ کا پہلا دن ہے اور چھ سو کے قریب مسلمان شہید ہوچکے ہیں۔ مجھے صحت یاب کرتا کہ کل جب جنگ دوبارہ شروع ہو تو میں ہدایات بھیجنے کی بجائے خود اس میں شریک ہوسکوں۔''

دوسرا دن طلوع ہوا تو جنگ کا دوبارہ آغاز ہوا۔ ابھی دن آدھا ہوا تھا کہ حضرت قعقاع بن عمرو کی زیر قیادت ایک ہزار فوجیوں پر مشتمل تازہ کمک پہنچ گئی۔ یہ کمک حضرت عمر فاروقؓ کی ہدایت کے مطابق آئی تھی۔

جنگ کا یہ دن بھی کسی فیصلے کے بغیر گزر گیا۔

تیسرے دن علی الصباح دونوں فوجیں ایک دوسرے سے گتھ گئیں۔ حضرت سعدؓ نے فیصلہ کرلیا تھا کہ آج ہر حال میں لڑائی کو فیصلہ کن بنائیں گے۔ ان کی طرف سے ہدایات میں تیزی آگئی تھی۔ بھی ایک ترکیب آزماتے کبھی دوسری۔ مسلمانوں کا پلہ بھاری تھا لیکن فیصلے کے آثار آج بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور خیال یہی تھا کہ اب لڑائی کا فیصلہ کل پر ٹلے گا۔

میدانِ جنگ میں حضرت قعقاع کی آواز گونجی۔ وہ اپنے قبیلے کو پکار رہے تھے۔

''ایرانیوں کے قلب لشکر پر زوردار حملہ کرو اور ان کے سپہ سالار کو گرفتار کرلو۔'' یہ آواز سنتے ہی صرف اس کے قبیلے ہی نے نہیں بلکہ عام مسلمانوں نے بھی ایسا زبردست حملہ کیا کہ ایرانیوں کے قدم اکھڑ گئے اور بدحواس ہوکر پیچھے کی طرف ہٹے ہی نہیں بلکہ بھاگے۔ مسلمان لڑتے لڑتے رستم کے تخت تک پہنچ گئے۔ رستم بھی معمولی درجے کا دلاور نہیں تھا۔ وہ بھی جنگ پر تیار ہوگیا۔ اس کے حفاظتی دستے نے اس کا حصار کرلیا۔ سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق۔ حفاظتی دستہ اس کی حفاظت کررہا تھا لیکن مسلمانوں نے ان آہن پوشوں کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے۔ ایک مجاہد کی تلوار نے رستم کو زخمی کردیا۔ وہ جان بچانے کے لیے بھاگا۔

ہلال بن علقمہ نامی ایک مجاہد اس کا تعاقب کررہا تھا۔ اسے بہت قریب دیکھ کر رستم نے چاہا کہ نہر میں چھلانگ لگادے۔ حضرت ہلال نے اس کی ٹانگ پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا اور پلک جھپکتے میں اس کا سر کاٹ لیا۔ گھوڑا دوڑاتے ہوئے دوبارہ میدان میں آئے اور بلند آواز میں پکارے۔

''میں نے رستم کو قتل کردیا ہے۔'' اس کی گونج ہر طرف سنائی دی۔ اسے سنتے ہی ایرانیوں کے ہوش وحواس جاتے رہے۔ رستم کا خون آلود سر نیزے پر بلند ہوا۔ ایرانیوں کے ہاتھوں سے تلواریں گر گئیں۔ ایسی عبرت ناک شکست ہوئی کہ تختِ کسریٰ کی بنیادیں ہل گئیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگِ خندق کے موقع پر کسریٰ کی فتح کی پیش گوئی کی تھی۔ آج یہ پیش گوئی

پوری ہو رہی تھی، اللہ کے رسولؐ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ "اے سعد! تم اس وقت تک زندہ رہو گے جب تک ایک قوم کو نقصان دوسرے کو فائدہ نہ پہنچا لو۔" حضرت سعدؓ کے سامنے مال غنیمت کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ کی ہدایت کے مطابق وہ اسے مجاہدین میں تقسیم کر رہے تھے اور اس مالی فائدے پر غور کر رہے تھے لیکن اصل فائدہ وہ تھا جو اس جنگ سے مسلمانوں کو پہنچا اور اسلام کے فروغ کے لیے راہ ہموار ہوئی۔

قادسیہ کی فتح نے تمام ایران کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھول دیے۔

اس فتح کے بعد حضرت سعدؓ دو ماہ تک قادسیہ میں مقیم رہے۔ بالآخر آپ نے اطراف واکناف کے لوگوں کے لیے عام معافی کا اعلان کیا اور حکم دیا کہ وہ بے فکر ہو کر اپنے گھروں میں آباد ہو جائیں۔ ہزار ہا افراد مسلمانوں کے اخلاق حسنہ سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے۔

کسریٰ کا پایہ تخت مدائن تھا۔ یہ عظیم الشان شہر دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پر آباد تھا۔ مشرقی کنارے پر دفاتر حکومت تھے۔ مغربی کنارے کی آبادی کو بہرہ شیر کہتے تھے۔ یہاں کے قلعے میں ایرانی جانبازوں پر مشتمل شاہی رسالہ رہتا تھا۔ یزدگرد نے اپنا ایک پالتو شیر بھی اس رسالے کے سپرد کر رکھا تھا کہ ضرورت پڑے تو اسے دشمن پر چھوڑ دیا جائے۔

حضرت سعدؓ یہاں پہنچے تو ایرانی فوج قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئی۔ ایرانی دو تین مہینوں سے زیادہ سختی برداشت نہ کر سکے اور قلعے سے باہر نکل کر لڑنے پر مجبور ہو گئے۔ دروازہ کھلتے ہی کسریٰ کا شیر مسلمانوں پر جھپٹا۔ حضرت سعدؓ کے بھتیجے ہاشم بن عتبہ نے آگے بڑھ کر اس صفائی سے تلوار کا ہاتھ مارا کہ شیر دو ٹکڑے ہو کر گر پڑا۔ کسریٰ کی فوجوں نے جم کر مقابلہ کیا لیکن مسلمانوں نے انہیں روند ڈالا اور فاتحانہ شہر میں داخل ہو گئے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے دیکھا کہ دجلہ کے دوسرے کنارے پر ایک رفیع الشان سفید عمارت کھڑی ہے۔

"مسلمانو! یہ کسریٰ قصر ابیض ہے جس کی فتح کا وعدہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے کیا ہے۔" حضرت ضرار بن خطاب نے مسلمانوں سے فرمایا۔ یہ فرمان سنتے ہی یہ عمارت اور بھی زیادہ خوب صورت نظر آنے لگی۔

عرب اس قصر کی داستانیں سنا کرتے تھے آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہی قصر کسریٰ کی تخت گاہ تھا۔ وہی کسریٰ جس نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نامہ مبارک کو چاک کر ڈالا تھا۔ آج اسی محمد عربیؐ کے نام لیوا اس قصر کی دیواروں کے نیچے آپہنچے تھے۔

حضرت سعدؓ اس محل تک پہنچنے کے لیے دریا کو پار کرنا چاہتے تھے لیکن دریائے دجلہ میں طغیانی تھی۔ کسریٰ کی فوجوں نے حفاظت کی غرض سے تمام پل توڑ ڈالے تھے۔ دوسری طرف ان کے تیر انداز متعین تھے۔

کسریٰ کی فوجوں کو یقین تھا کہ مسلمان دریا پار کرنے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ کم از کم اس وقت تک جب دریا میں طغیانی ہے اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو ایک بھی مسلمان زندہ نہیں بچے گا۔ خود مسلمانوں میں یہ خیال عام تھا کہ دریا پار کرنا ممکن نہیں لیکن یہ بھی درست ہے کہ حوصلے آگ کو گلزار بنا دیتے ہیں۔

حضرت سعدؓ نے مسلمان کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہوئے۔

"میں تہیہ کر چکا ہوں کہ اللہ کے بھروسے پر گھوڑے کو دریا میں ڈال دوں۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے میرے ساتھ چلے۔"

"ہم سب آپ کا ساتھ دیں گے۔ جو سودا آپؓ نے خدا سے کیا ہوا ہے وہی ہم نے بھی کیا ہوا ہے۔"

حضرت سعدؓ کے گھوڑے نے دریا میں قدم رکھا تھا کہ پورا لشکر دریا میں داخل ہو گیا۔ پانی نے اس طرح وزن سنبھال لیا جیسے پانی پر گھوڑے نہیں پھول تیر رہے ہوں۔ دشمن تیر برسا رہا تھا لیکن ان کے تیر پانی کا منہ چوم کر رہ جاتے تھے۔ دشمنوں کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں کہ یہ آدمی ہیں یا جنات۔

مسلمانوں کو اس شان سے آتا ہوا دیکھ کر ایرانیوں پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ لڑے بغیر بھاگ کھڑے ہوئے۔

یزدگرد بھی ایسا بدحواس ہوا کہ اپنا خزانہ سمیٹ کر ایک دوسرے شہر حلوان کی طرف بھاگ گیا۔

حضرت سعدؓ نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ قصر ابیض (قصر سعید) میں داخل ہو کر نماز شکرانہ ادا کی۔ اتفاق یہ ہوا کہ یہ جمعے کا دن تھا۔

محل کے ایک حصے میں حضرت سعدؓ نے قیام فرمایا اور قصر خاص کو مسجد کی شکل میں تبدیل کر کے نماز جمعہ ادا کی گئی یہ پہلی نماز جمعہ تھی جو عراق (ایران) میں ادا کی جا رہی تھی۔

کسریٰ سے جمع ہونے والا مال غنیمت مدینہ پہنچا تو زر و جواہر کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ کہتے ہیں صرف کسریٰ کے خزانے جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے تیس کھرب دینار کے تھے۔ دوسری نادر و نایاب چیزیں اس کے علاوہ تھیں۔

حضرت عمرؓ نے یہ تمام مال و اشیا ایک بڑے میدان میں سجا دیے تاکہ دیکھنے والوں کو عبرت ہو۔ ایک مشہور صحابی سراقہ بن جعشم بھی موجود تھے جنہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خوش خبری دی تھی کہ تم کسریٰ کے کنگن پہنو گے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں کسریٰ کے کنگن اور مرصع تاج پہنایا تو مدینہ کے در و دیوار تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھے۔ حضرت عمرؓ کا اس موقع پر خطاب سن کر تو لوگوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

"لوگو! رب ذوالجلال کا شکر ادا کرو جس نے کسریٰ جیسے فرماں رواں سے سلطنت چھین لی۔ اس نے کہا تھا میں ہی لوگوں کا رب اور آقا ہوں۔ آج خدائے حقیقی نے عرب کے ایک بار یہ نشین کو اس کے کنگن اور تاج پہنا کر اپنی قدرت تمہیں دکھا دی۔ جان لو کہ عزت اور ذلت سب خدائے بزرگ و برتر کے ہاتھ میں ہے۔"

☆☆☆☆

مدائن کی فتح کا مطلب یہ تھا کہ تمام عرب پر مسلمانوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ حضرت سعدؓ دوسرے مجاہدین کے ساتھ مستقل طور پر مدائن ہی میں مقیم ہو گئے۔ علاقے کے روؤسا اور عام باشندوں نے اطاعت قبول کر کے اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ ارتباط اتنا بڑھا کہ آپس میں رشتے داریاں قائم ہو گئیں لیکن ایرانیوں کا بادشاہ جو مدائن سے بھاگ گیا تھا اور اب حلوال میں مقیم تھا مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھا۔ حضرت سعدؓ نے اس کی طرف توجہ کی۔ وہ ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف بھاگتا رہا اور سعدؓ اس کا پیچھا کرتے رہے۔ "جلولا، حلوان، تکرت" اس کا پیچھا کرتے رہے۔ غرض ایرانیوں اور رومیوں کے تمام علاقے فتح کرنے کے بعد انہوں نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں تحریر کیا۔

"عراق کی آخری حد تک مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو آگے بڑھ کر خاص فارس کے اندر داخل ہو جاؤں اور یزدگرد کا تعاقب کروں۔"

حضرت عمر فاروقؓ نے جواب میں لکھا۔ "کاش ہمارے اور ایرانیوں کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل ہوتی کہ وہ نہ ہماری طرف آ سکتے اور نہ ہم ان کی طرف جا سکتے۔ جو علاقہ فتح ہو چکا ہے وہی ہمارے لیے کافی ہے اس علاقے کے انتظام کی طرف توجہ دو۔ آگے بڑھنے میں بہرحال مسلمانوں کا خون بہے گا اور میرے نزدیک ایک ایک مسلمان کا خون بڑی سے بڑی سلطنت سے زیادہ قیمتی ہے۔ ہم نے ایرانیوں کو عرب کی حدود سے پیچھے دھکیل دیا ہے ان کے ملک (فارس) پر ہم بلاوجہ حملہ نہیں کریں گے۔"

ایوان کسریٰ پر اسلامی پرچم لہرا رہا تھا لیکن بادشاہ یزدگرد بچ کر نکل گیا تھا۔ حضرت سعدؓ کو معلوم تھا کہ وہ جہاں بھی رہے گا مسلمانوں کے لیے خطرہ بنا رہے گا لیکن حضرت عمر فاروقؓ کا خط ملتے ہی حضرت سعدؓ کی جنگی مہم کا خاتمہ ہو گیا۔

اب ان کے سامنے دوسرا امتحان تھا۔ وہ بہترین عسکری صلاحیت رکھتے ہیں اس پر تو سب متفق تھے اب انہیں خلیفہ وقت کے حکم مطابق مفتوحہ علاقے کا نظم و نسق سنبھالنا تھا۔ انہیں ثابت کرنا تھا کہ وہ صرف بہترین سپہ سالار ہی نہیں بہترین منتظم بھی ہیں۔

اس فریضے کو انہوں نے خوب نبھایا اور نہایت قلیل عرصہ میں رفاہ عام کے ایسے بے شمار کام کروائے اور ایسے منصفانہ قوانین وضع کیے کہ تمام ملک میں امن و خوش حالی کا دور دورہ ہو گیا۔ انہوں نے عراقیوں کے دل موہ لیے اور بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

جب انہیں مدائن میں رہتے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تو انہیں محسوس ہوا کہ یہاں کی آب و ہوا مسلمانوں کو راس نہیں آ رہی ہے۔ ان کے جسم کمزور پڑتے جا رہے ہیں اور ان کے رنگ سیاہ پڑ گئے ہیں۔ انہوں نے تمام احوال حضرت عمرؓ کو لکھ بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے خط کے جواب میں لکھا۔

"عرب کی سرحد کے اندر کوئی مناسب جگہ تلاش کر کے ایک نیا شہر آباد کرو جہاں پانی کی بہتات ہو اور میرے اور اس کے درمیان کوئی پل یا دریا حائل نہ ہو تاکہ مرکز سے لوگوں کی امداد بھیجی جائے تو کوئی رکاوٹ نہ ہو۔"

حضرت سعدؓ نے اس حکم کی تعمیل کے لیے حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت حذیفہؓ کو روانہ کیا کہ وہ کوئی مناسب

مقام تلاش کر کے انہیں آگاہ کریں۔

یہ دونوں حضرات مختلف علاقوں میں کسی موزوں جگہ کی تلاش میں گھومتے رہے اور بالآخر اس مقام پر پہنچ گئے جہاں اب کوفہ آباد ہے۔ یہاں اعلیٰ قسم کے پھولوں کی بہتات ہے۔

دونوں حضرات نے حضرت سعدؓ کو آگاہ کر دیا۔

حضرت سعدؓ نے 17ھ میں شہر کوفہ کی بنیاد رکھی۔ سب سے پہلے انہوں نے وسط شہر میں ایک شاندار مسجد تعمیر کروائی۔ یہ مسجد اتنی بڑی تھی کہ چالیس ہزار آدمی بہ آسانی نماز ادا کر سکتے تھے۔ مسجد کے ارد گرد دور دور تک بہت سے محلے بنائے گئے اور ان میں جدا جدا قبیلوں کو آباد کیا۔ مسجد کے قریب ایوانِ حکومت قائم ہوا جو قصر سعد کے نام سے مشہور ہوا۔ بیت المال کی عمارت تعمیر ہوئی اور اس سے متصل فوج نے اپنے مکانات بنا لیے۔

ایک عظیم الشان شہر (کوفہ) وجود میں آ گیا جو فوجی چھاؤنی کی حیثیت اختیار کر گیا۔

کوفہ کی امارت حضرت سعدؓ کے پاس تھی اور اپنا کام بہ حسن وخوبی انجام دے رہے تھے۔ رفاع عام کے کاموں کے ساتھ ساتھ انہوں نے فوج کی تنظیم میں بے مثال کارنامے انجام دیے۔ ایک لاکھ سپاہیوں میں تنظیم قائم رکھنا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ حضرت سعدؓ کے حسن انتظام نے فوج کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ یہ ان کا حسن انتظام ہی تھا کہ جب یزدگرد نے ایک مرتبہ پھر سر اٹھایا اور ایرانیوں کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کیا تو حضرت سعدؓ نے اس مقابلے کے لیے تیس ہزار فوج روانہ کی۔

اس کے علاوہ بھی کوفے میں موجود فوج نے کئی نازک مواقع پر گرانقدر خدمات انجام دیں۔ حضرت عمرؓ ان سے بہت خوش تھے لیکن ایک موقع وہ بھی آیا کہ انہیں معزول ہونا پڑا۔ حضرت سعدؓ کی قیام گاہ قصر سعد کے نام سے مشہور تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس نام کو ناپسند فرمایا لیکن کوئی احکام صادر نہیں فرمائے پھر بعض لوگوں نے حضرت عمرؓ کو لکھ بھیجا کہ حضرت سعدؓ نے اپنے محل کے سامنے ڈیوڑھی بنائی ہے اور اس کے آگے پھاٹک لگوا دیا ہے جس کی وجہ سے اہلِ حاجت بلا روک ٹوک ان تک نہیں پہنچ سکتے۔ حضرت عمرؓ کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ انہوں نے محمد بن مسلمہ کو حضرت سعدؓ کے نام ایک خط لکھ کر کوفہ روانہ کیا اور یہ ہدایت بھی کی کہ ڈیوڑھی کو آگ لگا دی جائے۔

حضرت محمدؓ بن مسلمہ کوفہ گئے اور تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ڈیوڑھی محض شور وشغب سے بچنے کے لیے بنوائی گئی ہے اس پر کوئی دربان مقرر نہیں لوگ بلا روک ٹوک آتے جاتے ہیں۔

حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے تمام حالات مدینہ جا کر حضرت عمرؓ کے گوش گزار کر دیے۔ حضرت عمرؓ نے یہ عذر قبول کیا اور انہیں امارت پر قائم رکھا۔

حضرت سعدؓ کے مخالفین برابر حرکت میں تھے۔ ایک مرتبہ ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ نماز صحیح طریقے سے نہیں پڑھاتے۔ اس الزام کی بھی تحقیق ہوئی یہ الزام بھی غلط ثابت ہوا۔

اس سے بھی کام نہیں چلا تو ان پر یہ الزامات عائد کیے گئے کہ حضرت سعدؓ فوج کے ساتھ نہیں جاتے، تقسیم میں مساوات نہیں کرتے، مقدمے میں عدل نہیں کرتے۔

حضرت عمرؓ کو معلوم تھا کہ حضرت سعدؓ کی ذات سے یہ ممکن نہیں۔ تحقیق سے ثابت بھی ہو گیا کہ یہ الزامات غلط ہیں لیکن یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان کے مخالفین بہت ہیں جو مسلمانوں میں انتشار کا باعث بنیں گے لہٰذا انہیں منصب امارت سے ہٹا دیا گیا۔

ان کا منصب سے ہٹایا جانا کسی الزام کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ ملکی مصالح پر مبنی تھا۔ اس کا اظہار اس وقت وضاحت سے ہو گیا جب حضرت عمرؓ کی وفات کا وقت قریب آیا اور آپ نے وصیت کے طور پر جو کچھ فرمایا اس میں یہ بھی تھا۔

"میں نے ان (سعدؓ) کو کوتاہی یا خیانت کی بنا پر معزول نہیں کیا۔ اگر سعد خلافت کے لیے منتخب ہو جائیں تو وہ اس کے اہل ہیں اور اگر وہ منتخب نہ ہوں تو جو خلیفہ بنایا جائے وہ ان سے مدد لے۔"

وہ خلیفہ تو منتخب نہیں ہوئے لیکن حضرت عثمانؓ نے خلیفہ منتخب ہوتے ہی انہیں کوفے کی امارت پر بحال کر دیا وہ تین سال تک والی کوفہ رہے۔

☆☆☆

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نہایت جلیل القدر صحابی تھے۔ حضرت سعدؓ جن دنوں والی کوفہ تھے تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ان کی ماتحتی میں مہتمم بیت المال کے عہدے پر فائز تھے اور منصب قضا بھی ان کے پاس تھا۔

حضرت سعدؓ نے اپنی کسی ضرورت کے پیشِ نظر بیت

المال سے کچھ قرض لیا لیکن بعض ایسے اسباب پیش آئے کہ آپ مدت تک یہ قرض واپس نہ کر سکے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ان معاملات میں بے حد سخت تھے۔ وصولی کے معاملے میں کسی نرمی کے روادار نہیں تھے۔ انہوں نے حضرت سعدؓ کے منصب و اعزاز کا پاس کیے بغیر تقاضے شروع کر دیے۔ ایک روز دونوں میں ملاقات ہوئی۔ حضرت مسعودؓ نے پھر تقاضا کیا۔ حضرت سعدؓ کچھ مہلت چاہتے تھے لیکن ابن مسعودؓ فوراً وصول کرنے پر مصر تھے۔ حضرت سعدؓ کو ان کے شدید اصرار پر غصہ آ گیا۔ انہوں نے اپنی چھڑی زمین پر دے ماریں اور آسمان کی طرف نظر اٹھا کر خالق کائنات کو آواز دی۔

''اے زمین و آسمان کے خالق.....'' خدا جانے کیا کہنا چاہتے تھے کہ ابن مسعودؓ بلند آواز میں بول پڑے۔ ''دیکھو میرے لیے بددعا نہ کرنا۔''

''واللہ اگر خوف خدا نہ ہوتا تو میں تمہارے لیے سخت بددعا کرتا۔'' حضرت سعدؓ نے فرمایا۔ حضرت عبداللہ نے اب وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور اس کی اقامت گاہ سے نکل آئے۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا مستجاب الدعوات ہونا مسلم تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار حضرت سعدؓ کے حق میں دعا فرمائی تھی۔ ''الٰہی اس کی دعا قبول فرمایا کر۔''

اسی لیے ابن مسعودؓ ڈر گئے اور چیخ کر کہا۔ ''میرے حق میں بددعا نہ کرنا۔''

یہ بات اس وقت تو ٹل گئی لیکن جب حضرت عثمانؓ کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو وہ حضرت سعدؓ کے اظہارِ غضب سے ناراض ہوئے اور انہیں منصب امارت سے الگ کر دیا۔

اس معزولی کا انہیں اس قدر صدمہ ہوا کہ انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ملکی سیاست سے قطعی لاتعلق ہو گئے حالانکہ بڑا پرآشوب دور تھا۔ عالمِ اسلام میں بڑے بڑے اتار چڑھاؤ آئے لیکن وہ ان سے بے نیاز رہے۔ مدینہ سے دس میل کے فاصلے پر مقام عقیق میں رہ رہے تھے۔ وہ یہاں زاہدانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ خیال تک نہ آتا تھا کہ وہ کبھی اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ نہ شکایت تھی نہ بحالی کی اُمید اونٹ اور بکریاں چرانے سے بھی گریز نہیں تھا البتہ حضرت عثمانؓ ابتلا میں گھرے ہوئے تھے اور مفسدین نے مدینہ میں داخل ہو کر حضرت عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کر لیا تھا تو حضرت سعدؓ اپنے گوشۂ عزلت سے نکل کر مدینہ پہنچے اور مفسدین کو سمجھانے کی بھرپور کوشش کی لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت کا واقعہ رونما ہو گیا۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ مسند آرائے خلافت ہوئے تو حضرت سعدؓ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے بلا توقف خلافت مرتضوی کو تسلیم کیا اور بیعت کر لی لیکن ملکی معاملات سے بے تعلق رہے۔ اب چونکہ مسلمان کی تلوار مسلمان پر اٹھ رہی تھی اس لیے وہ اس سیاست کے قائل نہیں تھے۔ جب جنگ جمل کا واقعہ سامنے آیا جس میں ایک طرف حضرت علیؓ اور دوسری طرف حضرت عائشہؓ تھیں۔ اگر حضرت علیؓ کے ساتھ حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت عمار بن یاسر جیسے جلیل القدر بزرگ تھے تو دوسری طرف حضرت عائشہؓ کے ساتھ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر بن عوام اور عبداللہ بن زبیر جیسی ہستیاں تھیں۔ یہ سب مسلمان تھے اور مسلمانوں کے خلاف صف آرا تھے۔

حضرت سعدؓ کو حضرت علیؓ کی فوج میں شامل ہونے کی ترغیب دی گئی لیکن حضرت سعدؓ نے معذرت کر لی۔

''میں اس وقت تک نہیں لڑوں گا جب تک مجھے ایسی تیغ کا پتا نہ بتاؤ جس کی آنکھیں، زبان اور ہونٹ ہوں اور وہ یہ کہے کہ فلاں کافر ہے فلاں مومن۔''

اس واقعے کا انہیں اتنا صدمہ ہوا تھا کہ انہوں نے سب سے کہہ دیا تھا کہ مسلمانوں کے باہمی اختلاف اور جنگ کی بات مجھے نہ سنایا کریں۔

جب حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان معرکہ آرائیاں شروع ہوئیں تو حضرت علیؓ سے بے حد عقیدت رکھنے کے باوجود آپ نے دونوں میں سے کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ اپنی روش برقرار رکھی اور گوشہ نشینی اختیار کیے رکھی۔ اس زمانہ ناسازگار میں ان کا دم غنیمت تھا لہٰذا اکثر لوگ آپ کو سیاست میں حصہ لینے کی ترغیب دے رہے تھے لیکن آپ کو کسی عہدے سے اب کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔

اسی زمانے فتنہ میں ایک دفعہ حضرت سعدؓ کے بھتیجے ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص نے کہا اگر آپ اس وقت خلافت کا دعویٰ کریں تو ایک لاکھ تلواریں آپ کی حمایت کے لیے تیار ہیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ ''بھتیجے ان ایک لاکھ تلواروں میں سے صرف ایک ایسی تلوار چاہتا ہوں جو کافر

تو چلے لیکن کسی مسلمان پر نہ چلے۔"

وہ حضرت علیؓ کے فضائل کے معترف تھے اور دل سے ان کے عقیدت مند تھے۔ اسی لیے بلا تامل ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی لیکن اس عقیدت کے باوجود وہ کسی ایسے تنازع میں شمولیت سے بچے رہے جس میں مسلمانوں کا مقابلہ مسلمانوں سے ہوتا۔

انہوں نے اپنی گوشہ نشینی ترک نہیں کی تھی۔ گوشہ نشینی سے مراد یہ نہیں تھا کہ انہوں نے رہبانیت اختیار کرلی تھی۔ ان کی بیویاں بھی تھیں، اولادیں بھی، وہ حسب ضرورت کما بھی رہے تھے اور جمع بھی کر رہے تھے۔ گوشہ نشینی فقط اتنی تھی کہ مسلمانوں کی باہمی آمیزش سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ مدینہ سے کچھ فاصلے پر (دس میل) عقیق کے مقام پر اقامت گزیں ہوگئے تھے۔ مدینہ چونکہ دارالخلافہ تھا اس لیے وہاں سے دور رہنے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔

آپ کو عقیق میں رہتے ہوئے تیس سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا تھا۔ عمر بھی اسی سال سے زیادہ ہوگئی تھی۔ زندگی جفاکشی میں گزری تھی اس لیے صحت اچھی تھی لیکن ضعف پیری غالب ہوا تو قوائے بدنی مضمحل ہونے لگے۔ بینائی کمزور ہوتے ہوتے بالکل ہی ختم ہوگئی۔

اب وہ منتظر رہنے لگے تھے کہ کب خالق حقیقی کا بلاوا آئے۔ مرنے سے کچھ دیر پہلے آپ نے وصیت فرمائی۔

"غزوہ بدر میں جو اونی کپڑا میں پہنے ہوئے تھا اس میں لپیٹ کر دفن کرنا۔ میرے لیے لحد کھودنا اور قبر پر کچی اینٹ نصب کردینا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیا گیا تھا۔"

سال وفات کے بارے میں کئی روایات ہیں لیکن 55ھ کی روایت پر زیادہ لوگوں کا اتفاق ہے۔

حضرت سعدؓ کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق بدر والے اونی کپڑے کا کفن دیا گیا۔ اس کے بعد ان کا جنازہ مدینہ منورہ لایا گیا۔

وفات کی خبر نے کیا کم کہرام برپا کیا تھا کہ جب جنازہ مدینہ پہنچا تو لوگ جنازے میں شرکت کے لیے امڈ پڑے۔ ہر طرف ان کے فضائل بیان ہونے لگے۔ وہ تھے بھی تعریف کے لائق۔ وہ حضورؐ کے ماموں ہوتے تھے یہ ان کا ذاتی وصف تھا۔ ابتدائی ایمان لانے والوں میں تھے۔ غیرت دینی میں بے مثال تھے۔ حضورؐ نے مرد صالح کے لقب سے یاد کیا تھا۔ ان کے علاوہ کسی کے لیے حضورؐ نے یہ نہ کہا ہوگا کہ میرے باپ اور ماں تم پر فدا ہوں۔ اوّلین اسلام لانے والوں میں تھے اس لیے مشرکین کے ظلم و ستم کا براہ راست نشانہ بنے اور تمام شدائد تحمل سے برداشت کیے۔ شجاعت وارے خوفی ان کا نمایاں وصف تھا۔ انہی کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا تھا۔ "اللہ اس کی دعا قبول کیا کر۔"

انتہائی منکسرالمزاج تھے نہایت فیاض تھے۔

جب جنازہ نماز کے لیے مسجد نبوی کے باہر رکھا گیا تو حضرت عائشہؓ نے حکم دیا کہ جنازہ مسجد کے اندر لایا جائے تاکہ وہ بھی نماز جنازہ پڑھ سکیں۔

بعض لوگوں نے اس پر اعتراض کیا اور کہا جنازہ مسجد میں پڑھنا صحیح نہیں ہے۔

حضرت عائشہؓ نے یہ اعتراض سنا تو فرمایا۔ "لوگ جس چیز کو نہیں جانتے اس پر کس قدر جلد اعتراض کرنے لگتے ہیں۔ کیا رسول اللہ نے سہیل بن بیضا کی نماز جنازہ مسجد میں نہیں پڑھائی تھی؟"

اس پر لوگ خاموش ہوگئے اور جنازہ مسجد میں لاکر حجروں کے قریب رکھ دیا گیا۔ والی مدینہ مروان بن الحکم نے نماز پڑھائی، امہات المومنین نے اپنے حجروں میں نماز ادا کی۔

نماز ادا ہوجانے کے بعد حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو جنت البقیع میں دفن کردیا گیا۔

چین کے مشہور شہر کینٹن میں ایک قدیم مزار ہے جس کے متعلق وہاں کے مسلمانوں میں یہ مشہور ہے کہ یہ حضرت سعدؓ کا مزار ہے اس کے قریب ہی ایک مسجد ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اسے سعدؓ بن ابی وقاص نے تعمیر کروایا تھا۔ یہاں یہ روایات مشہور ہیں کہ مسلمانوں کا ایک وفد حضرت سعدؓ کی سربراہی میں شہنشاہ چین کے دربار میں آیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت سعدؓ کبھی چین نہیں گئے اس لیے یہ مزار کسی اور سعد کا ہوگا۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا مدفن بلاشبہ مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع میں ہے۔

ماخذات

سیرت حضرت سعدؓ ابی وقاص
طالب الہاشمی
طبقات ابن سعد

زرد صحافت

مریم کے خان

اس نے جھوٹی صحافت کی بنیاد رکھ کر رائے عامہ کو گمراہ کرنے کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ اس نے صحیح خبر کو ایک ایسے انداز سے پیش کرنے کا طریقۂ کار واضح کیا کہ وہ داخلِ دشنام ہو گیا۔



یلو جرنلزم کے بانی کی زندگی پر ایک نظر

گولیاں سنسناتی ہوئی گزر رہی تھیں اور توپوں سے نکلے گولے چاروں طرف پھٹ رہے تھے۔ مرتے سپاہیوں اور زخمیوں کی چیخ و پکار الگ قیامت برپا کر رہی تھی۔ اس کا گھوڑا گولی لگنے سے مر چکا تھا اور وہ ایک مورچے کے ساتھ دبکا ہوا پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی، وہ ابھی سترہ سال کا ہوا تھا۔ اسے امریکا آئے ہوئے ابھی سال بھی نہیں ہوا تھا کہ امریکن سول وار میں جان دینے کے لیے میدانِ جنگ میں آ گیا تھا۔ کم سے کم

اس وقت اسے یہی لگ رہا تھا کہ اس کا آخری وقت آگیا ہے۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک سنہری بالوں والا جوان آدمی آخری سسکیاں لے رہا تھا۔ اس کے سینے میں سوراخ سے رہ رہ کر خون ابل رہا تھا۔ میدانِ جنگ ایک سرسبز پہاڑی کے دامن میں تھا۔ وفاق کی فوج جنوبی فیڈریشن کی فوج سے نبرد آزما تھی۔ وہ لنکن کیولری کا ایک سپاہی تھا۔ چھ مہینے پہلے وہ فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ اس وقت اسے لگ رہا تھا کہ اسے موت کھینچ کر اس میدان میں لائی تھی جہاں ہر طرف موت بکھری ہوئی تھی۔ بے پناہ گولہ باری اور رائفلوں سے فائرنگ کی وجہ سے چاروں طرف بارود کا زہریلا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ یہ دھواں اٹھ کر آسمان کی طرف جا رہا تھا۔

تب اس نے آسمان پر اس سیاہ ہیولے کو دیکھا۔ وہ جب تک زندہ رہا اس یقین کے ساتھ زندہ رہا کہ اس روز اس نے جو دیکھا تھا وہ سچ تھا۔ وہ کسی بہت بڑے پرندے کی طرح بازو پھیلائے اس کی طرف جھپٹ رہا تھا۔ وہ ٹھیک سے نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ اس کی نظر بچپن سے کمزور تھی۔ پانچ سال کی عمر میں وہ بیس فٹ دور کھڑے انسان کا چہرہ شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ جیسے جیسے اس کی عمر بڑھی اس کی نظر کی کمزوری بھی بڑھتی رہی۔ سترہ سال کی عمر میں نظر اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ عینک کے بغیر وہ تقریباً نابینا ہو جاتا تھا۔ دھوئیں کی وجہ سے بھی صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس ہیولے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے خدوخال واضح نہیں تھے۔ اس کے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ موت کا فرشتہ ہے جو اسے لے جانے کے لیے آرہا ہے۔ اسے کوئی زخم نہیں آیا تھا سوائے چند معمولی خراشوں کے جو گھوڑے سے گرنے کے دوران میں آئی تھیں۔ پھر موت کا فرشتہ کیوں اس کی طرف جھپٹ رہا تھا؟

جب وہ نزدیک آیا تو اس نے دیکھا کہ سیاہ ہیولے کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ قریب آکر اس نے غوطہ لگایا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اپنی موت کو کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے کان پروں کی پھڑپھڑاہٹ سن رہے تھے۔ پھر یہ پھڑپھڑاہٹ تھم گئی۔ جب چند لمحوں تک کچھ نہیں ہوا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور تب اس نے سیاہ ہیولے کو سنہری بالوں والے جوان آدمی کے پاس دیکھا۔ وہ نوجوان پر جھکا ہوا تھا۔ پھر سیاہ ہیولے نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک چیخ ماری اور اپنے لمبے پر مارتا ہوا دوبارہ ہوا میں بلند ہوا اور آسمان کی طرف جانے لگا۔ دھوئیں سے گزرتے ہوئے اس کا سیاہ رنگ اس میں مکمل مل گیا اور پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تب اس نے جوان آدمی کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور سینہ ساکت تھا، وہ مر چکا تھا۔ موت کا فرشتہ اس کے لیے نہیں بلکہ اُس جوان آدمی کے لیے آیا تھا۔

☆☆☆

انیسویں صدی کا وسط یورپ کے لیے سازگار نہیں تھا۔ ایک طرف روس ابھرتی اقتصادی طاقت بن گیا تھا اور پورے یورپ سے دوگنا بڑا روس یقیناً کالونیوں کی مدد سے ترقی کرنے والے یورپی ممالک کے لیے خطرہ تھا۔ وسطی اور مشرقی یورپ میں ریاستوں کا اکھاڑ پچھاڑ عروج پر تھا۔ جرمنی مغربی یورپ میں اپنا مقام بنا چکا تھا مگر آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ جرمن قومیت رکھنے کے باوجود جرمنی سے اتحاد کو تیار نہیں تھے۔ پھر جرمنی میں خانہ جنگی بھی جاری تھی۔ وسط اور مشرقی یورپ میں آسٹریا اور ہنگری اتحاد کر کے ایک سلطنت کی صورت اختیار کر چکے تھے اور ترکی سے مقابلے کے لیے یہ فرنٹ لائن پر تھے۔ دارالحکومت بوڈاپسٹ سے دو سو کلو میٹرز دور جنوب مشرق میں ایک چھوٹا سا شہر ماکو ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں یہاں کئی یہودی خاندان آباد تھے۔ روایتی طور پر یہ سب تجارت پیشہ اور کاروباری تھے۔ ان میں ایک خاندان فولوپ پلٹزر کا تھا۔ یہ خاندان موراویا سے ترکِ وطن کر کے ہنگری میں آباد ہوا تھا۔

مغربی یورپ میں آباد یہودی اب سکون اور امن سے رہ رہے تھے۔ وہاں انہوں نے بینکاری، تجارت اور معیشت میں اپنی حیثیت مستحکم کر لی تھی لیکن مشرقی یورپ میں ان کی حالت اچھی نہیں تھی۔ روس میں برسوں سے آباد یہودی مظالم کا شکار تھے اس لیے وہ روس کے سرحدی علاقوں میں سمٹ آئے تھے۔ بہت سے یہودی خاندان روس سے نکل کر مشرقی یورپ میں بھی آباد ہو گئے تھے۔ پلٹزر خاندان بھی کسی زمانے میں روس میں ہی آباد تھا۔ یہ روایتی تاجر ہوتے تھے۔

فولوپ پلٹزر بھی اجناس کا تاجر تھا اور مختصر عرصے میں اس نے اس کام میں خاصی دولت کما لی تھی۔ یہاں اس کا بہت بڑا فارم اور گودام تھا۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ اس کے بچوں کا مستقبل یہاں اتنا روشن نہیں تھا۔ ماکو چھوٹا شہر تھا اور یہاں تعلیمی مواقع زیادہ نہیں تھے۔ خاص طور سے یہودی

بچوں کی الگ سے تعلیم کے لیے کوئی اسکول نہیں تھا جب کہ فولوپ اپنے بچوں کو روایتی یہودی اسکول میں تعلیم دلانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے بوڈاپسٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ بوڈاپسٹ نہ صرف دارالحکومت تھا بلکہ یہاں یہودی کمیونٹی وسیع پیمانے پر آباد تھی۔ وہاں فولوپ کے بچے تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ ابھی وہ ماکو میں تھے کہ 10 اپریل 1847ء میں اس خاندان میں ایک بچے نے جنم لیا۔ ماں باپ نے اس کا نام جوزف پلٹزر رکھا۔ یہ ان کا تیسرا بچہ تھا۔ جوزف کی ماں مارتھا جرمن نژاد کیتھولک تھی اور اس کا خاندان جرمنی چھوڑ کر ہنگری میں آباد ہوا تھا۔ گویا بچہ تارکین وطن کے خاندان میں پیدا ہوا تھا اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ترک وطن کرنا اس کے خون میں شامل تھا۔ کئی نسلوں سے ہنگری میں رہنے کی وجہ سے وہ بالکل ہنگرین رسم ورواج میں رنگ گئے تھے۔

ابھی جوزف چار سال کا تھا کہ خاندان کے ہمراہ بوڈاپسٹ چلا آیا۔ دریا کے دو طرف آباد یہ شہر ایک زمانے میں دو الگ الگ شہروں بوڈا اور پسٹ پر مشتمل تھا پھر اسے ایک کر دیا گیا اور نام ملا کر بوڈاپسٹ کہا جانے لگا۔ ایک زمانے میں یہ شاہان ہنگری کا دارالحکومت تھا۔ ترکوں نے اس پر قبضے کی بھرپور کوشش کی لیکن انہیں کامیابی نہیں مل سکی تھی۔ جوزف اور اس کے بھائی البرٹ کو پہلے ایک اسکول میں داخل کرایا گیا مگر فولوپ اس کے معیار سے مطمئن نہیں تھا اس لیے اس نے اپنے بچوں کے لیے نجی اساتذہ کا انتظام کیا اور ایک طرح سے اس نے الگ اسکول قائم کر دیا۔ یہاں جوزف اور اس کے بہن بھائیوں نے مروجہ تعلیم کے ساتھ یہودیت کی مبادیات کی تعلیم بھی حاصل کی۔ البرٹ جو جوزف سے بڑا تھا اس نے بعد میں یہودی مذہبی رہنما...... بننے کی تربیت بھی حاصل کی یعنی وہ ربی بن سکتا تھا لیکن اس نے کبھی ربی بننے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا رجحان اس طرف نہیں تھا۔

فولوپ کے نزدیک بچوں کی تعلیم اتنی اہم تھی کہ اس نے اپنی دولت کا بیشتر حصہ اس پر خرچ کر دیا۔ اس نے ہنگری بھر سے مہنگے ترین استاد بلوا کر اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے مخصوص کر لیے۔ جرمن اور ہنگرین زبانیں سکھانے کے الگ سے استاد مقرر کیے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فولوپ مالی بحران میں مبتلا ہو گیا۔ ماکو سے وہ جس دولت کو بہت کافی سمجھ کر ساتھ لایا تھا بوڈاپسٹ میں وہ ناکافی ثابت ہوئی۔ مالی بحران کے بعد وہ صحت بھی گنوا بیٹھا تھا۔ ماکو میں اسے سب جانتے تھے اور وہاں اس کی ایک ایماندار اور راست رو تاجر کی حیثیت سے عزت تھی۔ یہاں بوڈاپسٹ میں اسے کوئی نہیں جانتا تھا حد یہ کہ یہودی کمیونٹی نے بھی اس پر توجہ نہیں دی۔ مالی مشکلات کے دور میں اس نے دوبارہ کاروبار کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ اس کی صحت خراب ہوتی چلی گئی اور 1858ء میں اچانک ہی فولوپ دنیا سے رخصت ہوا تو اس کے خاندان والے خالی ہاتھ رہ گئے تھے کیونکہ اس کی کمپنی دیوالیہ قرار پائی تھی اور اس کی ساری وراثت قرض خواہوں میں تقسیم کر دی گئی تھی اور بیوی بچے خالی ہاتھ رہ گئے۔

صرف گیارہ سال کی عمر میں یتیم ہونے کے بعد جوزف کے پاس مزید تعلیم کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے ذہین تھا کیونکہ نو سال کی عمر میں اس نے جرمن اور ہنگرین جیسی مشکل زبانوں پر مکمل عبور حاصل کر لیا تھا۔ ان دنوں اس کا واحد شوق مطالعہ تھا اور صبح آنکھ کھلنے سے لے کر رات بستر پر جانے تک کتاب اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ دس برس کی عمر میں وہ ان دونوں زبانوں کے سنجیدہ ادب کا مطالعہ کرنے لگا تھا اور جب اس نے ہنگری کی سرزمین چھوڑی تو وہ بیشتر ادب چاٹ چکا تھا۔ باپ کی زندگی میں تو اسے کسی مسئلے کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا لیکن باپ کے مرتے ہی چاروں طرف سے مسائل منہ پھاڑ کر سامنے آگئے تھے۔ تب اسے معلوم ہوا کہ دنیا میں جینا کتنا مشکل کام ہے اور خاص طور سے ایک گیارہ سال کے بچے کے لیے جس کا باپ اس کے سر پر نہ رہا ہو۔ البرٹ نے ماں کی ذمے داری سنبھال لی تھی لیکن اس نے دوسرے بہن بھائیوں کے لیے کچھ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

جوزف کو زندہ رہنے کے لیے رقم کی ضرورت تھی اور رقم کام کرنے سے ملتی۔ وہ روزگار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ پہلی ملازمت اسے ایک کیفے میں ویٹر کی ملی۔ کام سخت تھا۔ اسے آٹھ سے بارہ گھنٹے ڈیوٹی دینا پڑتی تھی اور تنخواہ بس اتنی تھی کہ وہ مشکل سے اپنا گزارہ کر پاتا تھا۔ کتابوں کا شوق فاقوں کی وجہ بنا ہوا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اس کے پاس بس اتنی رقم ہوتی جس سے وہ کتاب یا ایک وقت کا کھانا خرید لے تو وہ کتاب خرید لیتا تھا۔ خود وہ کیفے کے کچن میں بچا کچا کھا لیتا تھا۔ اگرچہ مالک اور سپروائزر کی طرف سے سخت نگرانی کی جاتی تھی مگر وہ گاہکوں کی پلیٹیں واپس لے جاتے

ہوئے ایک دو لقمے کھا ہی لیتا تھا۔ یوں اس کا گزارا ہو جاتا تھا۔ اس نے یہاں ایک سال ملازمت کی اور ایک سال میں اس کی صحت اتنی گر گئی کہ وہ بارہ سال کی بجائے دس سال کا لگنے لگا تھا۔ آنے والی سردیوں میں اس نے یہ ملازمت ترک کر دی اور بوڈاپسٹ کے طویل سرما میں گھروں اور دکانوں کے سامنے سے برف ہٹانے کا کام کرتا رہا۔ یہاں بھی اکثر و بیشتر اسے کچھ نہیں ملتا تھا اور بعض اوقات وہ خود معاوضے میں کتاب مانگ لیتا تھا۔

بارہ برس کی عمر میں اس کے پاس چار سو سے زیادہ کتابیں تھیں جو اس کے بیڈ کے نیچے اس طرح بچھی تھیں کہ اگر بیڈ نہ ہوتا تو وہ صرف ان پر بھی گدا ڈال کر سو سکتا تھا۔ ان میں سے بیشتر تاریخ، فلسفے اور یہودی مذہب کے بارے میں تھیں۔

برف صاف کرنے کا کام بہتر ثابت ہوا اور اس کے پاس کچھ رقم جمع ہو گئی۔ مگر سرما رخصت ہوا اور وہ بے روزگار ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے کہ ان ہی دنوں ایک فارم کے مالک نے بیلوں کی دیکھ بھال کے لیے ملازم کا اشتہار دیا۔ وہ بھی انٹرویو کے لیے پہنچ گیا۔ ماکو میں اس نے دیکھا تھا کہ اس کے باپ کے ملازم ان کے جانوروں کی کس طرح دیکھ بھال کرتے تھے۔ فارم کے مالک نے اسے دیکھ کر قہقہہ لگایا تھا کیونکہ وہ بہت دبلا سا اور کمزور لڑکا تھا۔ اس نے جوزف سے کہا۔

''بیٹے تم بھیڑ بھی نہیں سنبھال سکتے ہو میرے بیلوں کو کیسے سنبھالو گے۔''

''آپ مجھے آزمائشی طور پر رکھ لیں۔'' جوزف نے تجویز پیش کی۔ ''اگر میں آپ کو مطمئن نہ کر سکا تو بے شک مجھے ملازم مت رکھیے گا۔''

مالک نے شاید ازراہِ تفریح اسے ملازمت دے دی لیکن ساتھ ہی ایک ہٹے کٹے دیہاتی کو بھی ملازم رکھ لیا۔ مگر ایک ہفتے بعد اس نے دیہاتی کو ملازمت سے فارغ کر دیا اور جوزف کو مستقل ملازم رکھ لیا۔ حیرت انگیز طور پر اپنے جثے سے قطع نظر جوزف نے بہت آسانی سے بیلوں کی دیکھ بھال کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ وہ ایک درجن بیلوں کے درمیان گھومتا پھرتا نظر بھی نہیں آتا تھا۔ شروع میں مالک کو خوف رہا کہ کسی دن کوئی بیل بپھر گیا تو اس کی لحوں میں چٹنی بن جائے گی۔ مگر جب ایسا نہیں ہوا اور جوزف نے کئی بار اس کے سامنے بپھرے بیلوں کو بھی آسانی سے قابو کر لیا تو وہ مطمئن ہو گیا۔ اس نے جوزف کی تنخواہ بڑھا دی اور اسے رہائش کے لیے ایک کوٹھری بھی دے دی۔ اس سے پہلے وہ کھلی جگہ پر سوتا تھا۔ فارم پر کام کرنے سے جوزف کی صحت بھی بہتر ہوئی تھی یہاں کھانا پینا اچھا ملتا تھا پھر وہ رقم بھی بچا رہا تھا۔ اس کے پاس موٹے کپڑے کے دو جوڑے تھے ایک پہنتا تو دوسرا دھو کر ڈال دیتا تھا۔ اس کے جوتوں پر اتنے پیوند لگے تھے کہ اب اصل چمڑہ باقی ہی نہیں رہا تھا۔ وہ صرف کتاب کے لیے رقم خرچ کرتا تھا۔ اس کی کتابیں دو بڑی لکڑی کی پیٹیوں میں اس کے ساتھ تھیں اور وہ ان پر ہی کمبل بچھا کر سوتا تھا۔ ایک دن مالک نے اس سے پوچھا۔ ''تم خود پر کیوں خرچ نہیں کرتے ہو؟''

مالک کا خیال تھا کہ جوزف اپنی یہودی فطرت کی وجہ سے کنجوس واقع ہوا تھا اور شاید رقم جمع کر کے کوئی کاروبار کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کا جواب مالک کے لیے حیران کن تھا۔ اس نے کہا۔ ''جناب میں سپاہی بننا چاہتا ہوں اور اس کے لیے رقم جمع کر رہا ہوں۔''

اٹھارویں صدی میں سپاہی پیشہ یورپ بھر میں نہایت نفع بخش بن گیا تھا۔ آپس کی جنگوں کے علاوہ دنیا میں نت نئی کالونیوں کے لیے بھی یورپی ممالک کو سپاہ کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو مدِنظر رکھتے ہوئے پورے یورپ میں آزاد فوجی اکیڈمیاں وجود میں آ گئی تھیں جہاں نوجوان فوجی تربیت حاصل کر سکتے تھے اور اس کے بعد وہ سب سے زیادہ تنخواہ دینے والی فوج میں بھرتی ہو جاتے۔ جو نوجوان سرکاری اکیڈمیوں میں تربیت حاصل کرتے تھے انہیں انہی ممالک کی فوج میں بھرتی ہونا پڑتا تھا اور عام طور سے انہیں تنخواہ بھی زیادہ نہیں دی جاتی تھی۔ فارم کا مالک ایک تیرہ سالہ لڑکے کا یہ عزم سن کر خوش ہوا تھا اس نے جوزف سے کہا۔

''سپاہی بننے کے لیے ضروری ہے کہ تمہیں گھڑسواری میں مہارت ہو۔ اس لیے اب تمہیں اجازت ہے کہ تم میرے اصطبل کا کوئی گھوڑا استعمال کر سکتے ہو۔''

اچھی خوراک کے ساتھ یہ پیشکش بھی جوزف کے لیے نعمت غیر متوقع ثابت ہوئی تھی۔ جلد اس نے گھڑسواری میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ ان دنوں وہ چوبیس میں سے سولہ گھنٹے مصروف رہتا تھا۔ اپنا کام نمٹا کر وہ دو سے تین گھنٹے گھڑسواری کی مشق کرتا اور پھر دوسرے معاملات نمٹا کر اس کے پاس جو آٹھ گھنٹے بچتے تھے اس میں اسے مطالعہ بھی کرنا

ہوتا تھا اس لیے سونے کا وقت صرف چار پانچ گھنٹے رہ جاتا تھا۔ اس کی بچپن کی یہ کم خوابی ساری عمر اس کے ساتھ رہی تھی۔ فارم کا مالک حیران تھا کہ ایک طرف جوزف سپاہی بننا چاہتا تھا اور وہ سخت جان بھی تھا جیسا کہ ایک سپاہی کو ہونا چاہیے اگرچہ اس کی صحت اچھی نہیں تھی لیکن وہ بہت سخت کام بھی آسانی سے کرلیتا تھا۔ دوسری طرف وہ کتابوں کا دیوانہ تھا۔ اگر اسے سپاہی بننا تھا تو کتاب سے محبت سمجھ سے بالاتر تھی۔ ایک بار آسمانی بجلی گرنے سے جوزف کی کوٹھری میں آگ لگ گئی اور وہ جان خطرے میں ڈال کر اپنی کتابیں بچاتا رہا تھا۔

ڈیڑھ سال میں اس نے اتنی رقم جمع کرلی کہ فوجی اکیڈمی میں داخلہ لے سکے۔ اسے معلوم تھا کہ سرکاری اکیڈمی میں اسے صحت اور کمزور بینائی کی وجہ سے مسترد کردیا جائے لیکن نجی فوجی اکیڈمی میں صرف یہ دیکھا جاتا تھا کہ داخلہ لینے والا فیس دے سکتا ہے یا نہیں اس کے بعد پروا نہیں ہوتی تھی کہ وہ نو سال کا ہے یا نوّے سال کا۔ البتہ قواعد وضوابط اور جسمانی مشقوں کی پوری پابندی لازمی تھی۔ جوزف کو بھی آسانی سے ایک ہنگرین نجی فوجی اکیڈمی میں داخلہ مل گیا۔ اس اکیڈمی سے فارغ ہونے والے سپاہیوں کو ہنگری اور دوسرے ممالک کی فوج میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ ان ممالک کے فوجی اتاشی باقاعدگی سے اکیڈمی کے چکر لگاتے تھے اور زیر تربیت نوجوانوں پر نظر رکھتے۔ جو انہیں کام کا نظر آتا اسے پہلے ہی ملازمت کی پیشکش کردی جاتی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ اکیڈمی میں تربیت کے دوران میں جوزف کو کسی نے بھی ملازمت کی پیشکش نہیں کی۔ وہ کسی قدر طویل قامت ہوگیا تھا مگر جسم دبلا تھا اور پھر آنکھوں پر عینک تھی۔

ایک سال بعد جب آخری امتحان ہوا تو جوزف اپنے گروپ میں پہلے نمبر پر آیا تھا صرف تعلیمی امتحان میں کامیاب نہیں ہوا تھا بلکہ جسمانی کارکردگی میں بھی وہ سب سے آگے تھا۔ جب یہ نتیجہ سامنے آیا تو اکیڈمی کا چکر لگانے والے فوجی اتاشی بھی حیران ہوئے تھے کہ انہوں نے جس نوجوان کو نظر انداز کیا تھا وہی سب سے آگے رہا تھا۔ سب سے پہلے جوزف سے ہنگرین فوج کے نمائندے نے رابطہ کیا اور اس نے ملازمت کی پیشکش قبول کرلی مگر وہ یہاں صرف چند مہینے رہا۔ ڈسپلن کی خلاف ورزی پر اسے فوج سے نکال دیا گیا۔ وہ جرمنی چلا گیا کیونکہ اسے جرمن زبان آتی تھی۔ جرمن فوج میں اس کا قیام سال بھر رہا لیکن یہاں بھی وہی ڈسپلن کا معاملہ آڑے آیا تھا۔ اس کے بعد اس نے دو مختلف ممالک کی فوج میں نوکری کی اور ہر جگہ سے اسے نکالا گیا یا اسے نکلنا پڑا۔

کم عمری سے مصائب دیکھتے ہوئے جوزف ان کا عادی ہوگیا تھا۔ مشکلات کے باوجود اس نے کوئی منفی راستہ اختیار نہیں کیا۔ محنت و صبر سے اپنا مستقبل بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی سوچ مثبت تھی اس لیے وہ نہ تو کوئی غلط کام کرتا تھا اور نہ ہی کسی کو غلط کام کرتے دیکھ کر خاموش رہتا تھا۔ پھر اسے یہودیوں کی ذرا سی توہین بھی گوارہ نہیں تھی۔

اگر وہ کسی کو یہودیوں کی تحقیر کرتے دیکھتا تو اس سے بھڑ جاتا تھا۔ اس عادت اور فطرت کی وجہ سے ہر جگہ تنازعات پیدا ہوتے تھے۔ فریق عام طور سے زیادہ ہوتے تھے۔ پھر یورپی ممالک جمہوریت کی راہ پر گامزن تھے اس لیے اسے ہی موردِ الزام ٹھہرایا جاتا اور اس کا یہودی پس منظر بھی آڑے آتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ جرمنی میں یہودیوں سے نفرت بہت زیادہ ہے۔ حالانکہ جرمنوں کی اکثریت پروٹسٹنٹ مذہب سے تعلق رکھتی تھی جس میں یہودیوں کو قریبی درجہ دیا جاتا تھا۔ مگر جرمنوں میں قوم پرستی اور آریائی ہونے کا جذبہ ابھر رہا تھا اور یہودیوں کو سامی ہونے کی وجہ سے حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ آخری بار اسے فوج سے نکالا گیا تو اس نے عہد کرلیا کہ اب وہ یورپ میں نہیں رہے گا۔ ان ہی دنوں اس کی ملاقات اپنے ایک کزن کوہن پلٹزر سے ہوئی جو امریکا جارہا تھا۔ اس نے جوزف سے کہا۔ ”تم امریکا کیوں نہیں چلتے ہو۔ وہاں مواقع کہیں زیادہ ہیں اور یہودیوں سے تعصب بھی نہیں ہے۔“

جوزف کے لیے یہ خبر حیرت انگیز تھی کہ کوئی ایسی سرزمین بھی تھی جہاں عیسائی اکثریت میں تھے اور وہاں یہودیوں سے تعصب نہیں برتا جاتا ہے۔ مغربی یورپ میں یہودیوں پر کوئی پابندی نہیں تھی مگر یہاں انہیں سیاست میں آگے آنے نہیں دیا جاتا تھا۔ وہ دل برداشتہ ہوکر ترکی جانے کا سوچ رہا تھا جہاں اس کے ہم مذہب یہودی پوری آزادی اور سکون سے رہ رہے تھے۔ یہی نہیں وہ وہاں بڑے سرکاری عہدوں پر بھی کام کررہے تھے اور مذہبی لحاظ سے ان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ جوزف مسلمانوں سے نفرت نہیں کرتا تھا لیکن وہ انہیں پسند بھی نہیں کرتا تھا اس لیے جب اسے ترکی کی بجائے ایک ملک اور نظر آیا جہاں وہ آزادی سے رہ سکتا

تھا تو اس نے اسے ترجیح دی۔ سب سے اہم بات تھی کہ یورپ کے برعکس امریکا میں مکمل جمہوری نظام تھا۔ وہاں بادشاہت اور جاگیرداری کا کوئی سلسلہ نہیں تھا جس نے اس وقت یورپ کو اپنے شکنجے میں بری طرح جکڑ رکھا تھا۔

مگر جب جوزف پلٹزر امریکی سرزمین پر اترا تو اسے صورتِ حال یہاں بھی مثالی نظر نہیں آئی تھی۔ خانہ جنگی کی وجہ سے پورا امریکا دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک وفاق یا شمالی ریاستیں تھیں جن میں واشنگٹن بھی آتا تھا اور دوسری طرف جنوبی ریاستیں تھیں جو کنفیڈریشن کے نام پر جمع تھیں اور یہ جنگ غلامی کے خاتمے اور اسے برقرار رکھنے کے نام پر لڑی جا رہی تھی۔ سیاہ فام غلاموں کی آزادی لنکن کا منشور تھی۔ خود جوزف بھی نسلی اور مذہبی امتیاز کے خلاف تھا۔ اس لیے اس نے وفاق میں رہنے کا فیصلہ کیا اور اپنے اندر کے حریت پسند کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے وہ وفاق کی فوج میں شامل ہو گیا۔ وہ پہلے سے تربیت یافتہ سپاہی تھا اس لیے معمولی تربیت کے بعد اسے فرسٹ نیویارک لنکن کیولری میں شامل کر لیا گیا۔ یہاں اس کی گھڑ سواری کی مشق خوب کام آئی تھی۔ ایک وقت میں جنگ نیویارک تک چلی آئی تھی لیکن اب محاذ پسپا ہو کر جنوب میں میری لینڈ ریاست کی طرف چلا گیا تھا۔ 1864ء میں جب جوزف امریکا پہنچا تو وفاق کی فتح اور کنفیڈریشن کی شکست نمایاں ہو گئی تھی۔

فرسٹ نیویارک لنکن کیولری میں زیادہ تر یورپ سے آنے والے تارکِ وطن شامل تھے اور ان میں جرمنوں کی اکثریت تھی اس لیے جوزف کو آغاز میں ہی ہم زبان مل گئے۔ میری لینڈ کے ایک محاذِ جنگ پر اس نے آخری خونریز لڑائی دیکھی اور اس کے بعد اس کی کمپنی کو واپس بھیج دیا گیا۔ پھر پوری کمپنی کو فارغ کر دیا گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جوزف اور دوسرے سپاہیوں کو کوئی معاوضہ نہیں ملا کیونکہ وہ رضا کار کی حیثیت سے بھرتی کیے گئے تھے یہ اور بات تھی کہ انگریزی سے عدم واقفیت کی وجہ سے ان میں سے اکثر کو اس بارے میں علم ہی نہیں تھا اور وہ خود کو باقاعدہ تنخواہ دار سپاہی سمجھ رہے تھے۔ جوزف اور دوسرے افراد نے کیولری میں شامل ہونے کے لیے دو سو ڈالرز کی بھاری فیس ادا کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جنگ کے دوران میں انہیں تنخواہوں اور مالِ غنیمت سے بہت کچھ مل سکے گا۔ مگر ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔ اس ادائیگی کے بعد جوزف کنگال ہو گیا تھا کیونکہ اس کی کل جمع پونجی اتنی ہی تھی اور جب اسے فوج سے خالی ہاتھ فارغ کیا گیا تو اس کی جیب میں ایک ڈالر بھی نہیں تھا۔

نیویارک آنے کے بعد اس نے سب سے پہلے ایک فلیٹ کرائے پر لے کر وہاں اپنی کتابیں محفوظ کی تھیں۔ اس ایک کمرے کے فلیٹ میں بس اتنی گنجائش تھی کہ اس کی کتابوں کے ٹرنک آنے کے بعد کچھ اور رکھنے کی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ ویسے اس کے پاس اس کے سوا اور کچھ تھا بھی نہیں۔ جنگ سے واپسی پر وہ اسی فلیٹ میں واپس آیا۔ خوش قسمتی سے وہ ایک سال کا کرایہ دے چکا تھا ورنہ اس کے پاس کھانے کے لیے بھی رقم نہیں تھی۔ کرایہ کہاں سے دیتا۔ اب اسے روزگار کی فکر تھی۔ وہ صبح سویرے فلیٹ سے نکلتا اور نزدیکی نیوز اسٹینڈ پر جا کر اخبارات کی سرخیاں اور ان میں ملازمتوں کے اشتہار دیکھتا تھا۔ ایک دن اسے کام کا اشتہار دکھائی دیا۔ نیویارک سے کوئی ڈھائی سو کلومیٹرز شمال میں نیو بیڈفورڈ میں وہیلنگ انڈسٹری میں ملازمتیں تھیں۔ طاقتور اسٹیم بوٹس آنے کے بعد شمالی بحر اوقیانوس میں وہیل مچھلیوں کا شکار آسان ہو گیا تھا اور نیو بیڈفورڈ اس کا مرکز بن گیا تھا۔ وہیل مچھلی سے گوشت، کھال اور چربی حاصل کی جاتی ہے۔ یہ تینوں چیزیں اچھی قیمت پر بک جاتی تھیں اس لیے اس کام میں مواقع زیادہ تھے۔

جوزف نے اپنا فوجی کمبل فروخت کیا اور نیو بیڈفورڈ روانہ ہو گیا۔ وہاں اسے ملازمت مل گئی۔ ایک فیکٹری میں جہاں وہیل مچھلی پروسیس کے لیے لائی جاتی تھی اسے آئل مین کی ملازمت ملی۔ اس سے پہلے بھی جوزف نے کئی بدبودار جگہوں پر کام کیا تھا بوڈاپسٹ فارم میں مویشی خانے میں بیلوں کی بدبو ہوتی تھی اور پھر دورانِ جنگ بھی اس نے بہت بدبودار لمحات گزارے تھے لیکن اس وہیل فیکٹری میں جیسی بدبو تھی اس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یہ بو ایسی تھی کہ برسوں بعد بھی وہ جب اس فیکٹری کا تصور کرتا تو اسے وہاں کی بدبو واضح محسوس ہوتی تھی۔ بہرحال یہاں کام کرنے کا معاوضہ اتنا اچھا تھا کہ اس نے سال گزار لیا اور کچھ رقم جمع کر لی۔ وہ واپس نیویارک آیا تو یہ جان کر اس کا صدمے سے برا حال ہو گیا کہ وہ عمارت گرا دی گئی تھی جس میں اس کا فلیٹ تھا اور اس کی کتابوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ذاتی طور پر باپ کی موت کے بعد یہ اس کے لیے سب سے بڑا صدمہ تھا۔ اس نے کئی مہینے تک کوشش کی کہ شاید اس کی کتابیں کہیں محفوظ ہوں مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ایسا

لگ رہا تھا کہ وہ بھی عمارت کے ملبے میں کہیں دب گئی تھیں اور اب اس کی جگہ دوسری عمارت کی تعمیر کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔

نیویارک میں قیام کے دوران میں اسے مطالعے کا موقع کم ملا تھا۔ وہ جس علاقے میں تھا وہاں غریبوں کی اکثریت تھی اور یہاں ایک بھی لائبریری نہیں تھی۔ نیویارک کثیر القومی شہر تھا اور یہاں بے شمار جرمن اور ہنگرین تارکِ وطن موجود تھے۔ اس کے باوجود جوزف یہاں اجنبیت محسوس کرتا تھا۔ فلیٹ ہاتھ سے جانے کے بعد وہ ایک ناکارہ ویگن میں قیام پذیر تھا۔ پھر وہ یہاں سے ایک مضافاتی متروک ریل لائن پر کھڑے پرانے ڈبے میں اٹھ آیا۔ ان دونوں جگہوں کی خاص بات یہ تھی کہ اسے کرایہ یا کسی قسم کا بل ادا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ دونوں وقت کا کھانا وہ عام طور سے کسی سستے ریستوران میں کھاتا تھا۔ اس نے امریکی سرزمین پر وارد ہونے کے باوجود ایک گرم کوٹ اور ایک جوڑی جوتے کی لی تھی اور یہ دونوں استعمال شدہ تھے۔ اپنی کتابیں گم ہونے کے بعد اس نے کتابیں خریدنا بھی ترک کر دی تھیں۔ اس کی بجائے وہ کسی لائبریری میں جا کر مطالعے کا شوق پورا کر لیتا تھا۔ لائبریری جانے سے یہ فائدہ ہوا کہ اسے بے شمار کتابیں ملتی تھیں اور وہاں اس کی ملاقات پڑھے لکھے لوگوں سے ہو جاتی تھی۔ ابھی تک اس کے ذہن میں واضح نہیں ہوا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے؟

انیسویں صدی کے پہلے نصف میں یورپ سے جرمن تارکِ وطن کا ایک سیلاب امریکا آ رہا تھا کیونکہ جرمنی میں خانہ جنگی جاری تھی اور حالات اچھے نہیں تھے۔ اکثر جرمن تارکِ وطن سینٹ لوئیس میسوری کا رخ کر رہے تھے۔ سینٹ لوئیس نیویارک سے چار سو میل دور مشرق میں ہے۔ یہ شمالی اور جنوبی امریکا کے عین وسط میں اور ریاست میسوری کے سرے پر دریائے مسس سپی کے کنارے واقع چھوٹا سا ابھرتا ہوا شہر تھا۔ جوزف نے سوچا کہ اسے بھی سینٹ لوئیس کا رخ کرنا چاہیے اور یہی فیصلہ تھا جس نے اس کا نام آج تاریخ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ وہیل فیکٹری سے جو کما کر لایا تھا وہ اس دوران میں ٹھکانے لگ گیا اور وہ ایک بار پھر خالی ہاتھ تھا۔ سینٹ لوئیس تک ریل کا ٹکٹ لینے کے لیے اسے اپنے چند رومال فروخت کرنا پڑے تھے۔ مگر سینٹ لوئیس پہنچتے ہی اسے لگا جیسے وہ خدا کی طرف سے وعدہ شدہ سرزمین پر پہنچ گیا ہے۔

جرمن نژاد باشندوں کی اکثریت اور ماحول کی وجہ سے اس کا دل فوراً یہاں لگ گیا۔ اسے یہ شہر میونخ جیسا لگا تھا اور پھر وہ ساری عمر یہیں رہا تھا۔ یہاں ایک جرمن زبان کا اخبار ویسلی چی پوسٹ شائع ہوتا تھا۔ روزگار کے متلاشی جوزف نے اس میں ایک اشتہار دیکھا۔ ایک کیٹل فارم میں بیلوں کی دیکھ بھال کے لیے ملازم کی ضرورت تھی۔ اگلے دن وہ پیدل چار میل دور اس فارم تک پہنچا اور یہ ملازمت حاصل کر لی لیکن صرف دو دن بعد بدترین خوراک اور کم تنخواہ ...کی وجہ سے اس نے استعفا دے دیا۔ جوزف کا کہنا تھا ”اگر آپ سولہ بیلوں کی دیکھ بھال کرنا نہیں جانتے ہیں تو آپ کو معلوم ہی نہیں ہے کہ مشکل اصل میں کہتے کسے ہیں۔ سینٹ لوئیس بے شک میرے لیے وعدہ شدہ مقدس سرزمین کی طرح تھا لیکن یہاں حالات اچھے نہیں تھے۔ روزگار کی قلت تھی اور بے شمار تارکِ وطن ملازمت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔“

بڑی مشکل سے اسے پانچویں شاہراہ پر واقع مشہور جرمن کیفے ٹونی فاوسٹ میں ویٹر کی ملازمت مل گئی۔ تنخواہ معمولی تھی لیکن یہاں جوزف کو ایسے لوگوں کے آس پاس پھرنے کا اتفاق ہوا جو اپنی مثال آپ تھے۔ یہ ریستوران سینٹ لوئیس فلاسفی سوسائٹی کے ارکان کی بیٹھک تھا۔ ان میں تھومس ڈیوڈسن تھا۔ جرمن ہنری سی بروک میئر تھا جو اوٹو وان بسمارک کا بھتیجا تھا۔ ان میں مشہور مصنف ولیم ٹوری ہیرس بھی تھا۔ یہ جب ریستوران میں آتے تو جوزف ہی انہیں سرو کرتا تھا۔ اس دوران میں اسے ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا تھا۔ خاص طور سے بروک میئر کا وہ شیدائی تھا۔ اس نے ہیگل کا انگریزی میں لاجواب ترجمہ کیا تھا۔ ایک دن بدقسمتی سے اس سے بیئر کی ٹرے گر گئی۔ گلاس اور ٹرے کا بیڑا غرق ہوا تھا ساتھ ہی لکڑی کے پالش شدہ فرش پر دھبا آ گیا اور نتیجے میں اسے ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔

اسے امریکا آئے ہوئے کئی سال ہونے کو آئے تھے لیکن اس کی انگریزی واجبی تھی۔ شروع میں اس کا خیال تھا کہ اسے اپنی مادری زبان ترک نہیں کرنا پڑیں گی اور امریکا میں وہ جرمن اور ہنگرین سے کام چلا سکے گا۔ مگر جلد اسے احساس ہوا کہ امریکا میں انگریزی سے واقفیت کے بغیر آگے بڑھنا اور ترقی کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہ قومی، تعلیمی اور دفتری زبان تھی۔ کسی دوسری زبان کی انگریزی کے مقابلے

میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس لیے وہ سنجیدگی سے اپنی انگریزی بہتر بنانے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے سینٹ لوئیس مرکنٹائل لائبریری میں وقت گزارنا شروع کر دیا۔ یہاں وہ انگریزی ادب کا مطالعہ کر کے اپنی انگریزی بہتر بنانے لگا۔ اس کی توجہ الفاظ اور گرامر پر تھی۔ ان دنوں وہ لائبریری کھلنے سے لے کر بند ہونے تک کا تمام وقت یہیں گزارتا تھا۔

روزگار کا مسئلہ شروع سے تھا اور اس کی تمام تر مصروفیات کے باوجود اسے زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ رقم کی ضرورت تو پڑتی تھی۔ معلوم ہوا کہ سینٹ لوئیس سے تیس میل دور لوزیانا میں شوگر پلانٹیشن میں ملازمتیں مل رہی ہیں۔ پروموٹر نے جوزف اور دوسرے افراد سے پانچ پانچ ڈالرز فی کس فیس لی اور انہیں لوزیانا جانے والی اسٹیم بوٹ میں سوار کرا دیا۔ جب وہ لوزیانا میں دریائی بندرگاہ پر اترے تو انہیں پتا چلا کہ وہاں نہ تو شوگر پلانٹیشن ہو رہی تھی اور نہ ہی کوئی ملازمت تھی۔ ان میں سے اکثر کے پاس واپسی کے لیے کرائے کی رقم بھی نہیں تھی اور انہیں یہ تیس میل کا فاصلہ دریا کے ساتھ ساتھ طے کرنا پڑا تھا۔ جوزف پیدل واپس آنے والوں میں سے ایک تھا۔ اس کا غصے سے برا حال تھا اس نے واپس آتے ہی اس فراڈ کے بارے میں ایک مضمون لکھ کر جرمن زبان کے اخبار ویسلی چی پوسٹ میں شائع کرانے کے لیے بھیجا۔ جوزف کو امید نہیں تھی کہ اس کا لکھا ہوا مضمون اخبار میں شائع ہوگا۔ یہ اخبار میں اس کی پہلی نیوز اسٹوری تھی۔

اس مضمون کے توسط سے وہ اخبار انتظامیہ سے متعارف ہوا۔ اتفاق سے اخبار کے وکلا ولیم پیٹرک اور چارلس فلپس جانسن سے اس کی واقفیت تھی اور انہوں نے اسے اخبار میں اس کی بہترین انگریزی کی وجہ سے اسے شیکسپیئر کہہ کر متعارف کرایا۔ اگرچہ اس وقت بھی جوزف کی انگریزی اتنی اچھی نہیں تھی۔ مگر باقی سب کے مقابلے میں یقیناً بہت اچھی تھی۔ اخبار کے مدیروں ڈاکٹر ایمل پریٹورس اور کارل شورز کو اس سے ہمدردی تھی۔ پھر اخبار کا ایک مالک سرجن ڈاکٹر جوزف ناش میکڈول بھی اس کا طرف دار تھا مگر اخبار کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ایک نئے ملازم کا بوجھ برداشت کر سکتا اس لیے ان سب نے مل کر کوشش کی اور جوزف کو امریکا کی سب سے بڑی ریل کمپنی اٹلانٹک پیسفک ریل روڈ میں ملازمت مل گئی۔ اس کا کام سروے کرنا تھا۔ جنوب مغربی میسوری کی درجن سے زیادہ کاؤنٹیز میں ریل لائن گزارنے کے لیے زمینوں کا سروے کرنا تھا۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ اس نے نہایت محنت اور جانفشانی سے یہ کام مکمل کیا اور جب کام مکمل ہو گیا تو اسے ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ حالانکہ اسے یہ کام بہت پسند آیا تھا کیونکہ یہاں وہ اپنا باس خود تھا اور اس کی سروے رپورٹ، کمپنی کے لیے حتمی تصور کی جاتی۔

اب تک جوزف نے باقاعدہ امریکا کی شہریت حاصل نہیں کی تھی۔ وہ بدستور ہنگرین آسٹرین سلطنت کا شہری تھا۔ وہ امریکی شہری بننے سے پہلے یہاں کے حالات کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہتا تھا اگرچہ اسے خاص کامیابی نہیں ملی تھی مگر اسے امریکا پسند آ گیا تھا خاص طور سے یہاں کی آزادی اور جمہوری ماحول اسے اچھا لگا تھا۔ پھر غلامی ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہاں اینٹی سامیزم نہیں تھا۔ یہودیوں کو برابر کا شہری سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انیسویں صدی میں امریکی آنے والے تارکِ وطن کا بڑا حصہ یورپی یہودیوں پر مشتمل تھا۔ اس نے فیصلہ کیا اور 1867ء میں وہ امریکن شہری بن گیا۔ مالی حالات اچھے نہیں تھے اور اس کا بیشتر وقت مرکنٹائل لائبریری میں گزرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے تعلقات لائبریرین اوڈو بریچوودگل سے استوار ہو گئے اور یہ تعلق ہمیشہ برقرار رہا۔ اوڈو بھی یہودی تھا۔ بلکہ جوزف کے بیشتر رفقا اور احباب یہودی تھے۔

انگریزی زبان پر عبور کے بعد اب جوزف انگریزی ادب پڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ اوڈو کے مشورے پر قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس نے مرکنٹائل لائبریری میں انگریزی کے ساتھ قانون کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ 1868ء میں اس نے بار کونسل میں داخلہ لیا مگر بدقسمتی سے اس کی بولنے میں کمزور انگریزی اور ہنگرین لہجہ آڑے آیا اور اسے بہت کم کیس ملے تھے، جو ملے ان میں بھی اس کی کارکردگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کی گزر اوقات ڈاکومنٹس کی تیاری اور ڈوبے قرضوں کی واپسی سے ہو رہی تھی۔ مزے کی بات ہے اس کا تقریباً سارا حلقہ احباب صحافت اور پبلشنگ کے کاروبار سے منسلک تھا اور ابھی تک اسے صحافت کا خیال نہیں آیا تھا۔ ان ہی دنوں ویسلی چی پوسٹ میں ایک رپورٹر کی آسامی نکلی اور مدیر کارل شورز نے اسے پیشکش کی۔

"میں نے دنیا کا ہر کام کیا ہے۔" جوزف نے اسے جواب دیا۔ "لیکن یہ واحد کام ہے جو نہ میں نے کیا ہے اور نہ کرنے کا سوچا ہے۔"

"تم یہ کام کر سکتے ہو۔" کارل شورز نے اصرار کیا۔ "بات یہ نہیں ہے کہ تم نے یہ کام نہیں کیا یا کرنے کا سوچا نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم ایک محنتی اور پڑھے لکھے شخص ہو۔ سب سے بڑھ کر تمہارے اندر حوصلہ اور کچھ کرنے کی توانائی ہے۔ صحافت ایسے لوگوں کا کام ہے۔"

جوزف تیار نہیں تھا۔ وہ رپورٹر بننے کی بجائے ایک بار پھر وہیلنگ انڈسٹری میں کام کرنے کا سوچ رہا تھا کیونکہ اس میں آمدنی بہت اچھی تھی اور وہ کچھ رقم بچا لیتا تو اپنا کام بھی شروع کر سکتا تھا مگر ساتھ ہی وہ سینٹ لوئیس بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور پھر اس شہر کی چاہت نے اسے کارل شورز کی پیشکش قبول کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس شعبے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ رپورٹنگ ایک مشکل کام ہے خاص طور سے جب وہ ایک نئے ملک میں تھا اور یہاں کے لوگوں اور حالات کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتا تھا۔ وہ اس بارے میں کہتا ہے۔

"امریکا میرے لیے نیا ہی نہیں ایک بہت بڑا ملک بھی تھا۔ بڑا اور بکھرا ہوا۔ اس میں بے شمار اقوام آباد تھیں اور آباد ہو رہی تھیں۔ شہروں کا رنگ ڈھنگ بالکل الگ تھا۔ قانون اور جمہوریت مضبوط تھی لیکن ساتھ ہی کھلے نظام کی وجہ سے جرائم اور بدعنوانی بھی عروج پر تھی۔ عوام، مجرم اور سیاست داں اس کھلے پن سے فائدہ اٹھاتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ چاہتے تھے کہ ان کے راز فاش نہ ہوں۔ ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ اور سب سے بڑا دشمن پریس تھا۔"

اس وقت رپورٹرز کو سخت ناپسند کیا جاتا تھا۔ انہیں گند کریدنے والا کہا جاتا تھا اور معاشرے میں صحافی حضرات کی عزت بہت کم تھی۔ ان سے معاشرتی میل جول کم رکھا جاتا تھا۔ پھر انہیں جرائم پیشہ افراد اور بدعنوان سیاست دانوں سے بھی خطرہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رپورٹنگ کرنے والے صحافی اپنے اصل نام سے کام نہیں کرتے تھے۔ جوزف بھی اپنے اصل نام سے کام نہیں کر سکتا تھا۔ کارل شورز نے اس کے لیے دو قلمی نام تجویز کیے۔ "جوائے دی جرمن" اور "جوائے دی جیو"۔ جیو سے مراد یہودی تھے۔ جوزف کے بیشتر رفقا یہودی تھے اور امریکا میں یہودیت کو برا نہیں سمجھا جاتا تھا اس لیے وہ یہاں کھل کر یہودی کا نام استعمال کر سکتے تھے جب کہ یورپ میں اس وقت یہودیوں کو ایک الگ مخلوق سمجھا جاتا تھا اور وہاں وہ کھل کر لفظ یہودی استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ جوزف کو یہ آزادی بھی اچھی لگی اور اسے اپنے کام میں بھی مزہ آنے لگا۔

وہ جانتا تھا کسی بھی شعبے میں کامیابی کا حصول دس فیصد صلاحیت اور نوّے فیصد محنت سے ممکن ہوتا ہے۔ اس نے بے دلی سے رپورٹر بننے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جب ایک بار فیصلہ کر لیا تو وہ دل و جان سے اس شعبے میں کامیابی کے لیے کوشاں ہو گیا۔ عام صحافیوں کی نسبت وہ دن میں سولہ گھنٹے کام کرتا تھا۔ عام صحافی کی صبح شام تین چار بجے ہوتی تھی اور وہ صبح دس بجے کام کے لیے نکل جاتا تھا۔ پہلے وہ پریس جاتا اور وہاں دیکھتا کہ اخبار کیسے چھپتا ہے۔ گزشتہ دن کے اخبارات دیکھتا اور پھر ایک جرمن لٹریچر اسٹور چلا جاتا۔ یہ دکان ان دنوں پڑھے لکھے جرمنوں کا مرکز ہوتی تھی اور اسے یہاں سے بہت سی خبریں مل جاتی تھیں۔ شام میں وہ سینٹ لوئیس فلاسفی سوسائٹی کلب میں پایا جاتا تھا اور یہاں بھی اس کا بنیادی مقصد خبریں جمع کرنا تھا۔ اس محنت نے جلد صحافت کے اسرار و رموز اس پر کھول دیے۔ وہ جان گیا کہ خبر کیسے حاصل کی جاتی ہے۔

اس کے مالی حالات میں بس اتنی تبدیلی آئی تھی کہ اسے آنے والے مہینے کے اخراجات کے لیے پریشان نہیں ہونا پڑتا تھا۔ تنخواہ باقاعدگی سے نہ سہی لیکن مل جاتی تھی۔ البتہ اسے دوسرے انداز میں بہت فائدہ ہوا۔ وہ اوپری سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے لگا اور اس کی ملاقات سیاست دانوں سے ہونے لگی۔ جوزف فطری طور پر آزادی پسند اور جدت کا حامی تھا اس لیے اس نے ری پبلکن پارٹی کو پسند کیا اور 1869ء میں اس نے ری پبلکن پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس کے بعد وہ دسویں شاہراہ پر واقع ٹرن ہال میں ہونے والی پارٹی میٹنگز میں باقاعدگی سے شریک ہونے لگا تھا۔ پہلی شرکت کے بعد وہ بحث و مباحثے میں بھی شریک ہونے لگا اور اس کی پُرجوش شخصیت نے پارٹی ممبران کی توجہ حاصل کر لی تھی۔ ابھی اسے پارٹی میں شامل ہوئے چند مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ مقامی پارٹی نے اسے ریاستی قانون ساز کونسل کے لیے اپنا امیدوار منتخب کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ حیران کن تھا کیونکہ وہ ابھی بائیس سال کا تھا اور قانون ساز کونسل کا ممبر بننے کے لیے کم سے کم عمر پچیس برس تھی۔ مگر

پارٹی نے اپنا فیصلہ برقرار رکھا اور جوزف کو یوں چھوٹ مل گئی کہ وہ فوج میں رضا کار کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکا تھا۔

جوزف ایک بار پھر ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ صحافت کی طرح سیاست کے بارے میں بھی اسے شبہ تھا کہ وہ اس میں کامیاب ہو سکے گا یا نہیں۔ یہاں بھی اسے اصرار کر کے آگے لانا پڑا تھا۔ جب چیف ڈیموکریٹک کی طرف سے اسے عمر کے معاملے میں رعایت دی گئی تب اس نے یہ فیصلہ قبول کر لیا۔ پھر اس کی فطرت سامنے آئی۔ ایک بار کوئی کام ہاتھ میں لینے کے بعد وہ اسے سو فیصد دلچسپی سے کرتا تھا۔ اُمیدوار نامزد ہوتے ہی اس نے اپنی الیکشن مہم کا خاکہ تیار کیا اور اس کے مطابق کام کرنے لگا۔ اس نے روایتی انداز میں الیکشن مہم چلانے کی بجائے کچھ نئے طریقے متعارف کرائے۔ وہ بڑے اجتماعات کرنے کی بجائے (جیسا کہ اس وقت رواج تھا) محلوں کی سطح پر کارنر میٹنگ کرنے لگا۔ یہاں وہ ووٹرز سے ذاتی سطح پر ملتا تھا اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ اسے ووٹ دیں۔ اس کی محنت کرنے کی عادت اور بے پناہ توانائی کام آئی۔

دن رات ایک کر کے اس نے اپنی الیکشن مہم چلائی اور نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مخالف کے 147 کے مقابلے میں 207 الیکٹرول سے کامیاب ہوا۔ اسے اٹھاون فیصد ووٹ ملے تھے جب کہ اس کے مخالف ڈیموکریٹ اُمیدوار کو بیالیس فیصد ووٹوں پر اکتفا کرنا پڑا تھا۔ وہ پرانا اور دولت مند سیاست داں تھا جب کہ جوزف نیا اور مالی لحاظ سے تہی دست تھا۔ اس کی ساری الیکشن مہم چندے کی مدد سے چلائی گئی تھی۔ مخالف اُمیدوار نے اس کی عمر پر اعتراض کیا اور الیکشن دوبارہ کرانے کی درخواست کی لیکن اس کی درخواست مسترد کر دی گئی اور جوزف کو قانون ساز کونسل کا رکن بننے کی اجازت مل گئی۔ وہ دو سال کے لیے سینٹ لوئیس سے میسوری کے دارالحکومت جیفرسن سٹی چلا آیا۔ وہ دو سال یہاں رہا اور اس دوران میں اس نے سیاسی نظام اور سیاست دانوں کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ جلد اس نے محسوس کر لیا کہ سیاست اس کا میدان نہیں ہے کیونکہ یہاں سمجھوتے بہت کرنا پڑتے ہیں اور انسان بے پناہ جھوٹ بولتا ہے تب وہ کامیاب سیاست داں بنتا ہے۔

بائیس سال کی عمر میں ریاستی اسمبلی کا ممبر بن جانا ایسی کامیابی تھی جس کے خواب جدی پشتی اور دولت مند سیاسی گھرانوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان سیاست دانوں نے بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔ اس سے آگے جوزف کا راستہ کھلا ہوا تھا اسے کانگریس یا سینٹ میں جانے سے کون روک سکتا تھا۔ وہ اس سے بھی آگے سوچ سکتا تھا۔ وہ وفاقی یا ریاستی کابینہ میں کوئی بڑا عہدہ حاصل کر سکتا تھا۔ وہ ریاست کا گورنر بن سکتا تھا۔ سیاست میں شہرت اور دولت بونس کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھی حاصل کر سکتا تھا۔ وہ ذہین تھا جوڑتوڑ اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا لیکن ان سب باتوں سے قطع نظر وہ ایک بے لچک شخص تھا اور اس نے محسوس کیا کہ یا تو اسے اپنی فطرت پر سمجھوتا کرنا پڑے گا اور وہ اس کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا یا دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ سیاست کا میدان عارضی ترک کر دے اور پہلے صحافت میں اپنے قدم جمائے۔ اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ دو سال بعد اس نے استعفا دے دیا۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ اسے ڈسپیچ پوسٹ کی طرف سے مینیجنگ ایڈیٹر کے اہم ترین عہدے کی پیشکش ہوئی تھی اور اس کے لیے یہ ایک بڑا موقع تھا۔

امریکی سیاست کو قریب سے دیکھنے کے بعد جوزف نے محسوس کیا کہ اس میں بدعنوانی اور اپنی من مانی کرنے کے مواقع زیادہ تھے۔ سینٹ، کانگریس اور ریاستی اسمبلیوں کے اراکین ایسے قوانین منظور کرا لیتے تھے جن سے براہِ راست انہیں یا ان کے منظورِ نظر افراد کو فائدہ ہوتا تھا۔ وہ سرکاری ملازمین پر دباؤ ڈال کر اپنی مرضی کے فیصلے کرا لیتے تھے یا فوائد حاصل کرتے تھے۔ شہر آباد ہونے کے ساتھ ہی منظم جرائم پیشہ گروہ سر اٹھانے لگے تھے اور سیاست داں ان سے گٹھ جوڑ کر رہے تھے۔ اس صورتِ حال نے بھی جوزف کو سیاست سے دل برداشتہ کیا تھا اور اس نے محسوس کیا کہ اس گند کو سیاست میں رہ کر صاف نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے سب سے موزوں میدان صحافت کا تھا۔ جہاں عوام کو سیاست دانوں اور مجرموں کا چہرہ دکھایا جا سکتا تھا۔ یہ بتایا جا سکتا تھا کہ کہاں بدعنوانی ہو رہی ہے؟ کہاں عوام کے حقوق پر ڈاکا ڈالا جا رہا ہے۔ وہ صحافت میں رہ کر بدعنوان سیاست دانوں کا راستہ روک سکتا تھا جب کہ سیاست میں رہ کر وہ خود بھی اسی گندے سیاسی دھارے کا ایک حصہ بن کر رہ جاتا۔

جوزف نے یہ بھی محسوس کیا کہ ری پبلکن پارٹی میں بدعنوان سیاست دانوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی تھی اور وہ اپنے منشور سے اتنی مخلص نہیں تھی۔ خاص طور سے سیاہ فاموں کو

شہروں میں آباد ہونے اور کاروبار کرنے کی قانون سازی میں تاخیر سے ری پبلکن کا کردار کھل کر سامنے آیا تھا۔ وہ دستور سفید فام اکثریت کے مفادات کو اولیت دے رہی تھی۔ پھر اس کے بعض طاقتور سیاست داں امریکا میں یہودیوں کی بڑھتی قوت سے خائف تھے اور وہ اینٹی سامی ازم کا حصہ بن رہے تھے۔ ان ہی دنوں صدارتی انتخاب کے موقع پر ایک نئی جماعت لبرل ری پبلکن پارٹی سامنے آئی۔ اس نے ہوراک گیلرے نامی سیاست دان کو اپنا اُمید وار نامزد کیا مگر ہوراک گیلرے صدر نہ بن سکا اور لبرل ری پبلکن پارٹی منتشر ہوگئی۔ جوزف اس کا حامی تھا مگر اس کی توقع کے خلاف پارٹی آغاز میں ہی ناکام رہی۔ ری پبلکن پارٹی میں جانا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس کے پاس سوائے ڈیموکریٹک پارٹی میں شامل ہونے کے سوا کوئی اور راستہ باقی نہیں رہا تھا۔

ایک طرف وہ سیاسی راستہ بدل رہا تھا تو دوسری طرف اس نے 1872ء میں اپنے اخبار ویسلی چی پوسٹ کے کچھ شیئرز تین ہزار ڈالرز کے عوض خرید لیے۔ یہ اس کی کل جمع پونجی بھی تھی۔ خوش قسمتی سے ان شیئرز کی قیمت چند ہی مہینوں میں دوگنی سے زیادہ ہوگئی اور جوزف نے انہیں فروخت کردیا۔ اخبار کے منیجنگ ایڈیٹر کی حیثیت سے اس کی ساکھ بن گئی تھی اور اب وہ میسوری اور سینٹ لوئیس کی سطح پر جانا پہچانا نام بن گیا تھا۔ ابھی عوام جوزف سے بے خبر تھے کہ وہ قلمی ناموں سے سیاست دانوں اور مجرموں کے کرتوت بھی سامنے لاتا تھا لیکن خواص اس کی حقیقت سے واقف ہوگئے تھے۔ سیاسی حلقوں میں وہ ایک ایسا صحافی سمجھا جاتا تھا جسے بدعنوانی سے نفرت تھی اور اسے خریدا نہیں جاسکتا تھا۔ ظاہر ہے سیاست داں بھی اس سے نفرت کرتے تھے خاص طور سے جو بدعنوان تھے۔ اسی طرح اعلیٰ سرکاری ملازمین بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر جوزف کو ان میں سے کسی کی پروا نہیں تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ پریس کی طاقت سب پر حاوی ہے۔ اگر اس طاقت کو درست طریقے سے استعمال کیا جائے تو سیاست دانوں کو بھی تابع بنایا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

جوزف کو صحافت میں لانے اور مقبول نام بنانے میں ویسلی چی پوسٹ کا اہم کردار تھا۔ اسے صرف نام ہی نہیں ملا تھا بلکہ اس کی مالی مشکلات میں بھی کمی آئی تھی۔ منیجنگ ایڈیٹر کے طور پر اسے اچھی تنخواہ ملتی تھی۔ اس پر رپورٹنگ کے حوالے سے کوئی قدغن نہیں تھی لیکن ایک پابندی کا احساس رہتا تھا۔ وہ خود بھی اخبار کی پالیسی سمجھتا تھا اور اسی لحاظ سے اپنی رپورٹ مرتب کرتا تھا۔ مگر یہ غیر محسوس پابندی اب اسے کھلنے لگی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ ذہنی طور پر اخبار کی انتظامیہ سے دور ہونے لگا تھا۔ پھر ایک کیس نے جوزف کے صبر کے پیمانے کو چھلکا دیا۔ ایڈورڈ گلینر مین میسوری کا ایک نامور سیاست داں اور ریاستی اسمبلی کا طاقتور رکن تھا۔ اس کا تعلق ری پبلکن پارٹی سے تھا۔ عوام میں اس کی ساکھ بہت اچھی تھی اور عام طور سے اسے ایک ایمان دار سیاست داں تصور کیا جاتا تھا حالانکہ سیاست میں آنے سے پہلے وہ ایک معمولی وکیل تھا اور اس کے پاس کوئی دولت نہیں تھی۔

مگر گزشتہ بیس برسوں میں اس نے حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ اب اس کے پاس سینٹ لوئیس میں ایک عالی شان عمارت کے علاوہ دو ہزار ہیکٹر قیمتی زرعی زمین تھی اور مختلف کمپنیوں میں اس کے ایک ملین ڈالرز مالیت کے شیئرز بھی تھے۔ جوزف نے ایک سیاسی رپورٹ میں سوال اٹھایا کہ گلینر نے یہ ترقی کیسے کی جب کہ اس کا کوئی کاروبار بھی نہیں تھا اور نہ ہی اسے کہیں سے کوئی وراثت ملی تھی۔ بیس برسوں میں اسمبلی ممبر کی حیثیت سے اس کی تنخواہ جمع کی جائے تو اس میں سینٹ لوئیس والی عمارت کا دسواں حصہ بھی نہیں آتا تھا۔ اس رپورٹ کے شائع ہونے پر گلینر نے خاصا ہنگامہ کیا اور اس نے اخبار پر ہتک عزت اور جھوٹ گھڑنے کا مقدمہ دائر کردیا۔ جوزف بالکل ہراساں نہیں ہوا اس نے انتظامیہ سے کہا کہ وہ خود اس مقدمے کا سامنا کرے گا اور ایڈورڈ گلینر کو بدعنوان ثابت کردے گا۔ مگر ریاستی حکومت کی طرف سے دباؤ آیا اور اخبار کے اشتہارات روک دیئے گئے۔ اس پر اخبار انتظامیہ نے گھٹنے ٹیکتے ہوئے ایڈورڈ گلینر سے غیر مشروط معافی مانگ لی اور اس نے کیس واپس لے لیا۔

جوزف کے نزدیک یہ شرمناک بزدلی تھی جس کا مظاہرہ ایک طاقتور اخبار کے مالکان نے ایک سیاست داں کے سامنے کیا تھا۔ اشتہارات کے لیے انہوں نے اخبار کی ساکھ قربان کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ گلینر یہودیوں کا مخالف تھا۔ اس کے باوجود اخبار انتظامیہ نے اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ جوزف نے اخبار چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اسے ایک اور جرمن زبان کے اخبار کی طرف سے ملازمت کی پیشکش ہوئی لیکن اس نے

انکار کر دیا۔ اس نے سوچ لیا تھا اب وہ ملازمت نہیں کرے گا کیونکہ ملازم صحافی کہیں نہ کہیں مجبور ہو جاتا تھا۔ اس نے اپنا اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ جلد یا بدیر امریکا آنے والے تارکین وطن کی اگلی نسل اپنی مادری زبان بھول جائے گی اور وہ انگریزی اپنا لے گی۔ جرمن زبان بولنے والوں کے بچے اسکول میں انگریزی سیکھ رہے تھے اور یہی ان کی اصل زبان بنتی جا رہی تھی۔ اس لیے اس نے اپنی صحافت کو جرمن سے انگریزی میں منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بولنے کے معاملے میں کسی قدر کمزور تھا لیکن جہاں تک تحریری انگریزی کا سوال تھا تو جوزف کسی طرح کم نہیں تھا۔ اس کی انگریزی کی وجہ سے اس کے ساتھی اور دوست اسے جرمن شیکسپیئر قرار دیتے تھے۔

جوزف نیا اخبار شائع کرنے کا سوچ رہا تھا اب اس کے پاس وسائل بھی تھے اور وہ جانا پہچانا نام تھا اسے یقین تھا کہ وہ اخبار کو کامیاب بنا لے گا مگر ابھی وہ منصوبہ بندی کر ہی رہا تھا کہ اسے پتا چلا کہ سینٹ لوئیس کے دو معروف اخبار سینٹ لوئیس ڈسپیچ اور سینٹ لوئیس پوسٹ فروخت ہو رہے ہیں۔ یہ چلتے ہوئے اخبار تھے اور ان کی نمایاں ریڈر شپ تھی۔ سیاسی اور سرکاری حلقوں میں ان کا اچھا خاصا اثر تھا۔ جوزف کو لگا جیسے یہ اخبار اسی کے لیے فروخت ہو رہے تھے۔ اس نے ایک دن ضائع کیے بغیر اخبارات کے مالکان سے رابطہ کیا اور ان سے دونوں اخباروں کا سودا کر لیا۔ 1879ء میں کیا جانے والا یہ سودا جوزف کے لیے اس لحاظ سے نفع بخش تھا کہ دونوں اخباروں کے ساتھ ان کا پریس بھی تھا اور اسے اشاعت کے لیے کسی کا محتاج ہونا نہیں پڑتا اور کسی سے پرنٹ کرانے سے جو اضافی اخراجات ہوتے وہ ان سے بھی بچ جاتا۔ جوزف نے خریدنے کے بعد دونوں اخبار ایک کر لیے اور انہیں سینٹ لوئیس ڈسپیچ پوسٹ کے نام سے شائع کرنے لگا۔ خبروں کے صفحات ایک کر لیے اور باقی دل چسپی کے صفحات اس پورے اخبار کا حصہ بنا دیے یوں اسے دونوں اخباروں کی ریڈر شپ مل گئی۔ قاری بھی خوش تھے کہ انہیں ایک اخبار کی قیمت میں دو اخبار مل رہے تھے۔

اخبار کی صورت میں اسے ایک حربہ مل گیا تھا اس نے بدعنوان سیاست دانوں اور منظم جرائم پیشہ افراد کے خلاف مہم شروع کر دی۔ وہ ان کے خلاف سخت ایکشن کا حامی تھا اور اس کا کہنا تھا جب تک امریکی جمہوریت سے بدعنوانی کو خارج نہیں کیا جاتا اسے صحیح معنوں میں جمہوریت نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی مہم اور بے لاگ صحافت نے دیکھتے ہی دیکھتے جوزف کے اخبار کو سینٹ لوئیس اور میسوری کا مقبول ترین اخبار بنا دیا۔ دوسرے اس سے بہت پیچھے رہ گئے تھے اور اس ترقی کے پیچھے واحد شخص جوزف تھا جس نے ان مرتے اخباروں کو پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ بے باک رپورٹنگ کے علاوہ اس نے کچھ نئی چیزیں پیش کیں۔ پہلی بار اس نے قاری کو اخبار کا مستقل حصہ بنایا اور ان کی رائے کو باقاعدگی سے شائع کیا جانے لگا تھا۔ ان کی دل چسپی کے لیے مختلف مقابلے شروع کیے۔ اس نے مقبول سیاست دانوں سے قارئین کے سوالوں کے جوابات لینا شروع کیے۔ یہ سلسلہ بھی پہلی بار اسی نے شروع کیا تھا۔ ابھی وہ بتیس برس کا تھا اور ملک کے جانے پہچانے صحافیوں میں شامل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

صحافت کے میدان میں آتے ہی اس کی زندگی میں بہت تیزی آ گئی تھی۔ نت نئے واقعات اور لوگ یوں اس کی زندگی میں شامل ہو رہے تھے کہ بعض اوقات اسے انہیں قابو کرنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ خاص طور سے اس کا حلقہ احباب یکا یک بہت وسیع ہو گیا تھا اور اس میں میسوری کی ایلیٹ کلاس شامل ہو گئی تھی۔ اخبار کی سرکولیشن بڑھی تو جوزف بھی زندگی میں پہلی بار دولت مند ہوا تھا۔ اسی لحاظ سے سوسائٹی میں اس کا اٹھنا بیٹھنا ہوا تھا۔ اس کے واقف کاروں میں مسس پی کا ایک دولت مند کسان خاندان ڈیوس بھی شامل تھا۔ ڈیوس خاندان کے بیشتر افراد سینٹ لوئیس ڈسپیچ پوسٹ کا مالک بننے سے پہلے جوزف سے واقف تھے۔ وہ اس کی رپورٹنگ کے معترف تھے۔ اس خاندان کی ایک خاتون کیتھرین کیٹ ڈیوس جوزف میں ذرا دوسرے زاویے سے دل چسپی لے رہی تھی۔ کیتھرین ایک بار شادی کے تجربے سے گزر چکی تھی جب کہ جوزف کو آج تک شادی کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اصل میں اس نے یا کسی خاتون نے اس میں اس نقطہ نظر سے دل چسپی لی ہی نہیں تھی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی عورت اس کے نزدیک آئی تھی۔ لیکن کیتھرین عام عورت نہیں تھی۔ زندگی کے سرد گرم سے آشنا تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، ذہین اور ادب و آداب سے آشنا تھی۔ وہ خوش شکل بھی تھی جوزف اس سے ملا اور وہ دونوں بہت جلد جان گئے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے بنے

ہیں۔ ان میں ذہنی ہم آہنگی تھی اور زندگی کے بیشتر مسائل اور گوشوں کو وہ ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے۔ جوزف کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا کہ وہ ایک بار کی شادی شدہ اور عمر میں اس سے پانچ برس بڑی تھی۔ پہلی شادی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ البتہ جب 1878ء میں اس نے جوزف سے شادی کی تو دس سال کے مختصر عرصے میں اس نے سات بچوں کو جنم دیا۔ کیترین کیتھولک تھی اور جوزف یہودی دونوں میں سے کوئی ضبط تولید کا قائل نہیں تھا۔ سات میں سے ایک لڑکا سال کا ہونے سے پہلے مرگیا تھا اور سب سے بڑی بیٹی لوسیلی سترہ برس کی عمر میں ٹائیفائیڈ بخار کی شکار ہو گئی۔ لیکن پانچ بچے بڑی عمر کو پہنچے تھے اور تادیر زندہ رہے تھے۔ ان میں چار بیٹے رالف، جوزف دوم، کانسٹین اور ہربرٹ تھے۔ بیٹی چوتھے نمبر پر ایڈتھ تھی۔ بیٹوں نے صحافت اور پریس بزنس کا انتخاب کیا جب کہ ایڈتھ نے شادی کر کے گھر بسایا۔ جوزف کی آنے والی چار نسلوں نے صحافت میں حصہ لیا حتیٰ کہ جوزف پلٹزر چہارم نے 1995ء میں اخبارات کی مینجمنٹ سے استعفادے دیا اور یوں اس خاندان کا تعلق صحافت سے ختم ہوگیا۔

سینٹ لوئیس ڈسپیچ پوسٹ کی کامیابی نے جوزف کو امیر بنا دیا تھا۔ اس نے دریا کے کنارے ایک عالی شان مکان لیا تھا اور اپنے بیوی بچوں سمیت وہاں منتقل ہو گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اب اس کی زندگی میں کوئی مشکل باقی نہیں رہی ہے۔ اس نے بے باک صحافت سے سیاسی اور سرکاری حلقوں میں بھی ایک منفرد مقام پیدا کر لیا تھا۔ سیاست داں اور اعلیٰ بیوروکریسی کے نمائندے اس سے چڑتے ضرور تھے لیکن وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی مسلسل کوششوں سے پہلی بار میسوری میں ایک پبلک اکاؤنٹس کمیٹی بنی جو ریاست میں ہونے والے تمام ترقیاتی کاموں کی نگرانی کرتی تھی اور اگر اسے کہیں کوئی بدعنوانی محسوس ہوتی تو وہ مداخلت کرتی تھی۔ اس کمیٹی میں نیک نام سیاست داں اور سول سوسائٹی کے نمائندے شامل تھے۔ بارہا جوزف کو بھی اس کمیٹی کا رکن بنانے کی کوشش کی گئی لیکن اس نے ہر بار معذرت کر لی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس معاملے میں جج کی نسبت فریق بننا پسند کرے گا۔ اس کمیٹی کے قیام سے یہ نتیجہ نکلا کہ پہلے جو منصوبے لاکھ ڈالرز میں مکمل ہوتے تھے اب وہ نصف لاگت میں بہتر انداز میں تکمیل پذیر ہونے لگے۔ اس نے اپنا خیال درست ثابت کر دیا تھا کہ صحافت کی مدد سے ہی سیاست کا گند صاف کیا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

جوزف کی آنکھیں بچپن سے کمزور تھیں لیکن عینک کی وجہ سے نظر ٹھہر گئی تھی۔ پھر وہ صحافت میں آیا اور صبح سے رات تک اس کا بیشتر وقت کچھ نہ کچھ پڑھنے میں گزرنے لگا۔ پھر وہ مطالعہ بھی کرتا تھا اس کا اثر بینائی پر پڑنا شروع ہوا۔ اس کی نظر مزید کمزور ہوئی۔ ایک رات وہ مطالعے میں مصروف تھا کہ اچانک اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا۔ اس سے پہلے بھی دو تین بار ایسا ہو چکا تھا۔ کچھ دیر آرام کرنے سے یہ اندھیرا چھٹ جاتا تھا لیکن اس بار خاصی دیر گزرنے کے بعد بھی یہ اندھیرا نہیں چھٹا تو اس نے گھبرا کر اپنے بٹلر ایزاک کو پکارا۔ ایزاک بٹلر ہونے کے ساتھ اس کا ذاتی خادم بھی تھا۔ اتفاق سے وہ ہنگرین تھا اور اسے سوائے ہنگرین کے اور کوئی زبان نہیں آتی تھی۔ جوزف کی بیوی اور بچے اس زبان سے نا آشنا تھے اس لیے ایزاک صرف جوزف کی خدمت پر معمور تھا۔ جب تک جوزف گھر میں ہوتا اور جاگ رہا ہوتا تو یہ ایزاک کی ذمے داری تھی کہ اس کے آس پاس ہی رہے۔ ایزاک اسٹڈی روم میں آرہا تھا۔

''مسٹر پلٹزر.....''

''ایزاک مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔'' جوزف نے سکون سے کہا۔ ''میرا خیال ہے سب سو رہے ہیں؟''

ایزاک بھی فکر مند ہوگیا۔ ''جی جناب سب سو رہے ہیں۔''

''تم خاموشی سے بگھی نکالو اور مجھے ڈاکٹر بینکاٹ کے پاس لے چلو۔''

ڈاکٹر ولیم بینکاٹ سینٹ لوئیس کا معروف آئی اسپیشلسٹ تھا اور جوزف ایک دو بار اس سے علاج کرا چکا تھا۔ وہ جرمن تھا اور جوزف سے مل کر خوش ہوتا تھا کیونکہ اس کے ساتھ اسے جرمن زبان بولنے کا موقع ملتا تھا۔ ایزاک نے خاموشی سے بگھی نکالی اور اسے لے کر ڈاکٹر بینکاٹ کے پاس پہنچ گیا۔ ڈاکٹر بینکاٹ اسے اتنی رات گئے دیکھ کر حیران ہوا لیکن جب اسے پتا چلا کہ جوزف کو دکھائی نہیں دے رہا ہے تو وہ فوراً اسے اپنے کلینک لے گیا جہاں اس نے اس وقت کے لحاظ سے دستیاب جدید مشینوں سے اس کی آنکھوں کا معائنہ کیا اور فکر مند ہوگیا۔ اس نے جوزف سے کہا۔ ''تمہاری آنکھ کا پردہ شبکیہ آہستہ آہستہ دھندلا رہا ہے

اور جلد یہ مکمل دھندلا جائے گا اس کے بعد تم دیکھنے سے قاصر ہو جاؤ گے۔"

جوزف کو اپنی آنکھوں کے بارے میں پہلے ہی خدشہ لاحق ہو گیا تھا اس لیے وہ زیادہ پریشان نہیں ہوا اس نے ڈاکٹر بینکاٹ سے پوچھا۔ "کیا اس کا کوئی علاج نہیں ہے؟"

"بعض دوائیں ہیں لیکن وہ ابھی تجرباتی مرحلے میں ہیں۔" ڈاکٹر بینکاٹ نے بتایا پھر اس نے کوئی دوا جوزف کی آنکھوں میں ڈالی تو اسے دھندلا سا نظر آنے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد اس کی بینائی پوری طرح بحال ہو گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔ ڈاکٹر بینکاٹ نے اسے پڑھنے سے منع کیا۔ "اس سے دورانِ خون پردہ شکیہ کی طرف زیادہ آتا ہے اور اس سے بعض شریانیں پھول جاتی ہیں اور اسی وجہ سے نظر آنا بند ہو جاتا ہے۔"

"میں پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔" جوزف نے اسے صاف کہا۔ "اندھے پن کا خوف بھی مجھے اس سے باز نہیں رکھ سکتا ہے۔"

ڈاکٹر بینکاٹ نے اس کا علاج شروع کیا۔ جوزف نے سختی سے اپنی بیماری کو پوشیدہ رکھا تھا۔ ڈاکٹر بینکاٹ کے علاوہ صرف ایز اک واقف تھا کہ اسے کبھی کبھی نظر آنا بند ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں کاروبار اور کمپنیاں شخصیات کے نام پر چلتی تھیں اور اگر ان افراد کے ساتھ کوئی مسئلہ درپیش آتا یا ناگہانی طور پر ان کا انتقال ہو جاتا تو اس کا براہ راست اثر کاروبار یا کمپنی پر پڑتا تھا اور اس کے شیئرز کی قیمت گر جاتی تھی۔ جیسے ایڈیسن کی وفات کی خبر پر ان تمام کمپنیوں کے شیئرز کی قیمت دھڑام سے گری تھی جن میں ایڈیسن کا حصہ تھا۔ ہنری فورڈ ایک حادثے میں زخمی ہوا تو فورڈ موٹرز کے شیئرز کی قیمت بھی خاصی نیچے آ گئی تھی۔

سینٹ لوئیس ڈسپیچ پوسٹ صرف جوزف کی وجہ سے ملک کے ترقی یافتہ ترین اخباروں میں شامل ہو گیا تھا اور اس کے شیئرز کی قیمت مسلسل بڑھ رہی تھی اور شیئرز میں جوزف کا حصہ نصف کے قریب تھا کیونکہ وہ کمپنی ہولڈنگ اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ صرف چار سال کے عرصے میں وہ لکھ پتی بن گیا تھا۔ 1883ء میں جوزف نے اخبار نیویارک ورلڈ کے مالک جے گولڈ سے تین لاکھ چھیالیس ہزار ڈالرز میں خرید لیا اس وقت اخبار کا سالانہ خسارہ چالیس ہزار ڈالرز سے تجاوز کر گیا تھا اور اشاعت گر کر صرف پندرہ ہزار رہ گئی تھی۔ بہ ظاہر ایسے اخبار کو خریدنا جس کی سرکولیشن مسلسل گر رہی ہو اور وہ پہلے ہی خسارے میں جا رہا ہو حماقت تھی مگر جوزف کو اعتماد تھا کہ وہ اس اخبار کو اٹھا لے گا۔ نیویارک ورلڈ خریدنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔

جوزف کا بڑا بھائی البرٹ بھی ماں کے انتقال کے بعد امریکا آ گیا تھا اور اس نے نیویارک میں ایک اخبار نیویارک جرنل نکالا تھا۔ جوزف چاہتا تھا کہ البرٹ اس کے ساتھ آ جائے لیکن البرٹ نے انکار کر دیا وہ اپنا کام خود کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے وہ کئی بنیادی نظریات جیسے عورتوں کی آزادی، جمہوریت اور لبرل ازم پر جوزف سے اختلاف رکھتا تھا۔ البرٹ یہودیوں میں ابھرنے والی نئی تحریک صیہونیت کا مخالف تھا۔ امریکا میں ڈیموکریٹس اس کے حامی تھے اور ری پبلکن مخالف تھے۔ البرٹ ری پبلکن پارٹی کا حامی تھا اور اس کا اخبار بھی ان کی حمایت کرتا تھا۔ جب کہ جوزف ڈیموکریٹس کا حامی تھا اور ان کی حمایت کرتا تھا۔ اس لیے البرٹ نے جوزف کے ساتھ اشتراک سے انکار کر دیا۔ حالانکہ مالی لحاظ سے البرٹ کا اخبار زیادہ اہم نہیں تھا اس کی سرکولیشن بھی محدود تھی۔ اگر وہ جوزف کے ساتھ مل جاتا تو اسے بہت فائدہ ہو سکتا تھا۔

جوزف کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ خود اخبار چلانے کی مکمل صلاحیت رکھتا تھا۔ اس نے نیویارک ورلڈ کا نام تبدیل کر کے دی ورلڈ کر دیا اور پھر اس نے سرکولیشن بڑھانے کے لیے اس میں کہانیاں، اسکینڈل اور گرما گرم خبروں کی اشاعت شروع کی۔ اس نے نہایت مہارت سے فیکٹ اور فکشن کو یوں ملایا کہ قاری اسے پورا سچ سمجھ کر قبول کرتا تھا حالانکہ وہ پورا سچ نہیں ہوتا تھا لیکن اکثر حالات میں جھوٹ بھی نہیں ہوتا تھا۔ جیسے نیویارک پولیس ڈپارٹمنٹ کے بعض بدعنوان افسران نے نیویارک کی بعض مافیاؤں کی پشت پناہی شروع کر دی کیونکہ وہ انہیں بھاری رقوم دیتی تھیں۔ یہ پولیس افسران ان کے جرائم کی پردہ پوشی کرتے تھے۔ ان ہی دنوں میری این کا قتل ہوا۔ میری این ایک مافیا باس کے خلاف قتل کے ایک مقدمے کی عینی گواہ تھی اور اس کی حفاظت کے لیے پولیس نے اسے اپنی تحویل میں لیا ہوا تھا لیکن ایک رات پولیس ہیڈ کوارٹر میں میری این پُراسرار طور پر مردہ پائی گئی۔ اس کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ پولیس نے تحقیق کی لیکن کوئی نشان نہیں ملا نہ کسی نے قاتل کو دیکھا اور

نہ ہی کوئی ثبوت اور تھا۔
جوزف نے دی ورلڈ میں ایک کہانی شائع کرائی جس میں ایسا ہی ایک واقعہ پیش کیا گیا تھا۔ پولیس کی تحویل میں ایک گواہ پُراسرار طور پر مردہ پایا جاتا ہے اور بعد میں خود ایک پولیس افسر اس کا قاتل نکلتا ہے۔ یہ کہانی شائع ہوئی تو لوگوں نے اسے حقیقت سمجھا اور پھر ایمان دار پولیس افسران نے ان ہی خطوط پر تفتیش کی تو قاتل پکڑا گیا اور وہ سچ مچ ایک پولیس افسر تھا۔ اسے مافیا نے اس کام پر مقرر کیا تھا اور اس کا بھاری معاوضہ دیا تھا۔ اس کہانی کے مصنف جیمن کلائن کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس لیے بعض افراد کا شبہ جوزف کی طرف گیا تھا کہ وہی اس کہانی کا مصنف تھا۔ ایسی کہانیوں کے علاوہ دی ورلڈ میں عوامی حقوق کے معاملات اٹھائے جاتے تھے۔ مزدوروں اور نچلے طبقات کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کو منظرِ عام پر لایا جاتا تھا۔ سنسنی خیز خبریں جن میں شوبزنس کی خبریں نمایاں ہوتی تھیں۔ ان سے دی ورلڈ کی سرکولیشن میں ڈرامائی اضافہ ہوا اور یہ چند مہینوں میں خسارے سے نکل آیا تھا مگر ابھی اس کا سنہری دور ذرا دور تھا۔
اخبار کے معاملات درست کر کے جوزف نے کچھ اور امور پر توجہ دی۔ سیاست کا چسکا ابھی اس کے منہ میں باقی تھا۔ اپنی مقبولیت اور بعض دوست واحباب کے دباؤ پر اس نے نیویارک سے سینٹ کی نشست کے لیے انتخاب لڑا اور وہ سینیٹر منتخب ہو گیا۔ مگر اس بار بھی اس کے انتخاب کا دورانیہ مختصر رہا اور صرف ایک سال اور ایک مہینے بعد اس نے اپنی صحافتی ذمے داریوں کی وجہ سے سینٹ سے استعفا دے دیا۔ سیاست اس کے لیے کٹھ پتلیوں کے تماشے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی وہ جانتا تھا کہ سیاست دانوں کی ڈوریاں کہیں اور سے ہلائی جاتی ہیں وہ کٹھ پتلی کی بجائے انہیں نچانے اور اپنے اشاروں پر چلانے والا بننا چاہتا تھا۔
ایک طرف جوزف اپنی صحافتی ذمے داریاں نبھا رہا تھا وہ صرف اخبارات کا مالک بن کر سکون سے نہیں بیٹھ گیا تھا بلکہ عملی صحافت کر رہا تھا اس کے قلم سے مضامین اور کہانیاں نکل رہی تھیں۔ لیکن یہ اور بات تھی کہ یہ مضامین اور کہانیاں زیادہ تر قلمی ناموں سے شائع ہوتی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ جوزف کچھ نئے خیالات پر کام کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک انقلابی خیال تفتیشی صحافت کا تھا۔ اس وقت تک صحافی بس وہی خبریں لاتے تھے جو سورس سے ان کے علم میں آجاتی تھیں، گویا صحافی کلی طور پر سورس اور اپنے تخیل کے محتاج تھے مگر جوزف کا خیال تھا کہ صحافی کو پولیس افسر کی طرح کام کرنا چاہیے اور کسی بھی کیس کی باقاعدہ تفتیش کر کے حقیقت تک پہنچنا چاہیے۔ اس کے لیے اسے ایک ایسے دلیر اور ذہین رپورٹر کی ضرورت تھی جو اس کے ساتھ کام کر سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے کئی رپورٹرز کو آزمایا لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے معیار پر پورا نہیں اتر سکا تھا۔
بالآخر اس کی تلاش نیلی بلائے پر ختم ہوئی۔ یہ اس کا صحافتی نام تھا اور اس نے آنے والے دنوں میں تفتیشی صحافت کی بنیاد رکھی اور اس صنف کا نمایاں ترین رپورٹرز ثابت ہوا تھا۔ اس نے بے شمار رپورٹس لکھیں۔ جن میں اس نے معاشرے، سیاست اور جرائم کے خفیہ گوشوں کو عیاں کیا۔ اس کی رپورٹس نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ ان دنوں ہر طرف دی ورلڈ اور نیلی بلائے کا ذکر تھا۔ وہ ایک ایسا اساطیری کردار بن گیا تھا جو خفیہ ترین گوشوں میں گھس کر خبر نکال لاتا تھا۔ غیر قانونی شراب کی اسمگلنگ ہو، یا معزز گھرانوں کی عورتوں سے پیشہ کرانے کا انکشاف یا پھر نیویارک کی بندرگاہ پر ہونے والے عجیب وغریب جرائم ہوں۔ دی ورلڈ اور نیلی بلائے نے ان کی حقیقت کا انکشاف کر کے لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ آج بھی نیلی بلائے ایک مثالی تفتیشی رپورٹر سمجھا جاتا ہے اس پر کتابیں لکھی گئیں اور اس کی زندگی میں اس پر فلم بھی بنی تھی۔
دیکھتے ہی دیکھتے دی ورلڈ نیویارک کا سب سے بڑا اخبار بن گیا تھا لیکن ترقی کا یہ سفر ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ جوزف کے زرخیز ذہن میں اس حوالے سے اور بھی خیالات تھے۔ سینٹ لوئیس ڈسپیچ پوسٹ ایک سنجیدہ اور سیاسی موضوعات رکھنے والا اخبار تھا۔ جس میں حقائق کو مدِنظر رکھتے ہوئے سنجیدہ رپورٹنگ ہوتی تھی۔ افواہوں اور سنسنی خیز خبروں کی اشاعت سے گریز کیا جاتا تھا۔ مضامین میں فکشن کا عنصر کم ہوتا تھا کیونکہ میسوری کے عوام اسی طرح کی رپورٹنگ پسند کرتے تھے لیکن نیویارک کا ماحول اور عوام کی پسند ناپسند بالکل مختلف تھی۔ یہ صنعتی اور کاروباری شہر تھا۔ عوام سارا دن تھکے ہارے کام سے آنے کے بعد بور اور سنجیدہ سیاسی موضوعات کی بجائے کوئی دل چسپ چیز پڑھنا چاہتے تھے۔ جوزف نے مختصر عرصے میں تجربہ کر کے دی ورلڈ کو ان ہی خطوط پر شائع کرنا شروع کیا جو عوام چاہتے تھے۔ اس نے کہانیاں شائع کرنا شروع کیں اور کامک کے

صفحات بڑھا دیئے۔

اس وقت تک اخبار بلیک اینڈ وائٹ چھپتے تھے۔ کلر پرنٹنگ شروع نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس کی ٹیکنالوجی آچکی تھی۔ 1895ء میں دی ورلڈ نے ایک کامک سیریز ’’دی یلو کڈ‘‘ شروع کی اور اس میں پہلی بار اخبار کا یہ حصہ کلر میں شائع ہوا۔ اگرچہ یہ بھی صرف دو کلر تھے لیکن پھر بھی عوام کو ایک بالکل نئی چیز دیکھنے اور پڑھنے کو ملی۔ لوگ ٹوٹ پڑے تھے اور دی ورلڈ امریکا اور دنیا کا پہلا اخبار بن گیا جس کی ایک دن کی اشاعت پانچ لاکھ سے اوپر گئی تھی۔ اس کی مانگ اتنی زیادہ تھی کہ اخبار آنے کے چند گھنٹے کے اندر بک جاتا تھا اور اس کے بعد مشکل سے ہی کسی نیوز پیپر اسٹینڈ پر دی ورلڈ نظر آتا تھا۔ بعض ہوشیار نیوز پیپرز ایجنٹ دی ورلڈ کے کچھ شمارے روک لیتے تھے اور جب نیوز اسٹینڈ ان سے خالی ہو جاتے تو یہ اخبار بلیک کرتے تھے۔ اس طرح اخبار کے مارکیٹ میں آنے کے بعد پہلے دو گھنٹے میں اسٹال والوں کا کمیشن کم ہوتا تھا۔

جوزف کا اپنا پریس دی ورلڈ چھاپنے کے لیے ناکافی ہو گیا تھا اس لیے نیویارک کے تین اعلیٰ درجے کے پرنٹنگ پریس اس کے لیے مخصوص کر لیے گئے تھے جہاں صرف دی ورلڈ چھپتا تھا۔ یہ واحد اخبار تھا جو مسلسل بارہ گھنٹے پرنٹنگ کے مرحلے سے گزرتا تھا اور اس دوران میں اس کی چھ الگ الگ کاپیاں چھپتی تھیں۔ یہ رواج بھی دی ورلڈ سے شروع ہوا کہ کاپی آخری وقت تک اپ گریڈ ہوتی رہتی تھی اور اس میں دیر سے آنے والی تازہ خبریں بھی شامل ہو جاتی تھیں۔ صبح چھ بجتے ہی ایک ہزار گھوڑا گاڑیاں اخبار سے لدی مختلف علاقوں کی طرف روانہ ہو جاتی تھیں۔ آس پاس کے شہروں کے لیے خصوصی ریل کار چلائی جاتی تھیں جو یہ اخبار لے کر جاتی تھیں۔ بارہ بجے سے پہلے دی ورلڈ واشنگٹن پہنچ چکا ہوتا تھا۔ بارہ سال پہلے جب جوزف نے یہ اخبار لیا تھا تو اس کی اشاعت صرف پندرہ ہزار تھی۔ عروج کے دنوں میں اس کی اشاعت سات لاکھ تک جا پہنچی تھی۔

جوزف کی اس بے مثال کامیابی نے اسے صرف مقبول ہی نہیں بنایا تھا بلکہ اس کے بے شمار حاسد بھی پیدا کر دیئے تھے خاص طور سے نیویارک سے شائع ہونے والے دوسرے تمام اخبارات دی ورلڈ اور جوزف سے خار کھانے لگے تھے۔ اس کی بڑی سادہ سی وجہ تھی وہ یہ کہ ان تمام اخبارات کی مجموعی اشاعت دی ورلڈ سے کم تھی۔ اشتہارات کا ساٹھ فیصد دی ورلڈ کو ملتا تھا اور باقی چالیس فیصد دوسرے اخبارات کے پاس آتا تھا۔ جب کہ دی ورلڈ کا ریٹ بھی سب سے زیادہ تھا۔ دی ورلڈ کا قریب ترین حریف اخبار نیویارک سن تھا۔ اس کا مدیر چارلس اے ڈانا جوزف کے سخت ترین نقادوں میں سے ایک تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جوزف صحافت میں حقائق سے زیادہ افسانے کا استعمال کرنے لگا تھا۔ وہ اپنے اخبارات کے ذریعے وفاق میں موجود سیاست دانوں اور اعلیٰ سرکاری حکام کو مخصوص راہ اختیار کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ چارلس کا یہ الزام کسی حد تک درست تھا۔ مگر بدقسمتی سے چارلس سنجیدہ صحافت کے میدان میں جوزف کا مقابلہ کرنے کی بجائے غلط طرزِ عمل پر اتر آیا۔ اس نے جوزف کے یہودی ہونے کے حوالے سے اس پر طنز شروع کر دیئے۔ وہ اسے جوزف پلٹزر کی بجائے جوڈس پلٹزر کہتا تھا اس کا مطلب تھا یہودی پلٹزر۔ چارلس نے اینٹی سامی مہم شروع کی اور اس کا اصل نشانہ جوزف تھا۔

اخباری صنعت میں جوزف کا حریف ولیم رینڈولف ہیرسٹ تھا۔ وہ بھی جرمن نژاد تھا اور اس کی ملکیت میں کئی اخبارات تھے جن میں سب سے نمایاں نیویارک سن تھا پھر اس نے جوزف کے بھائی البرٹ سے اس کا اخبار نیویارک جرنل منہ مانگے داموں خرید لیا۔ اسے نیویارک سن سے ملا کر اس نے اشاعت بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر اشاعت اور نت نئی چیزیں متعارف کرانے میں جوزف کے تمام حریف اس سے پیچھے تھے اس لیے اس نے سیاسی نظریات اور ہدف بنانے کا فیصلہ کیا۔ خوش قسمتی سے امریکن اسپینش جنگ سے انہیں یہ موقع مل گیا۔ جوزف اس جنگ کا حامی تھا۔ اس نے اپنے اخبار کو بھی اس کی حمایت میں استعمال کیا اور اس کے حریفوں نے اسے یلو جرنلزم (زرد صحافت) کا نام دیا کیونکہ دی ورلڈ اب پیلے کاغذ پر چھپتا تھا اور دی یلو کڈ کی کامک سیریز میں بھی پیلے رنگ کا استعمال کیا جاتا تھا اس لیے یہ پھبتی جوزف پر اتنی ٹھیک بیٹھی کہ آج بھی یہ اصطلاح منفی صحافت کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

امریکی لبرل حلقے محسوس کر رہے تھے کہ اگر امریکا نے اس جنگ میں شرکت کی تو اسے اور بھی ملکوں پر حملے کا جواز مل جائے گا اور یہ جنگ اس کی جانب سے دنیا بھر میں مختلف ممالک پر حملوں اور ان پر قبضہ کرنے کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ اس وقت مخالف امریکی حلقوں نے واضح کیا تھا کہ اگر امریکا اس جنگ سے باہر نہیں آیا تو یہ سلسلہ آئندہ بھی

جاری رہے گا اور ایسا ہی ہوا۔ کیوبا پر اسپین کا قبضہ تھا۔ حالانکہ کیوبا میں نوے فیصد اسپینی نژاد افراد آباد تھے مگر اب وہ کیوبا کو اسپین کے تسلط سے نکالنا چاہتے تھے۔ جلد انہوں نے تحریکِ آزادی شروع کی اور امریکا ان کی حمایت پر میدان میں آگیا۔ میکسیکو سے پہلے ہی امریکا کی جنگ ہو چکی تھی یہ بھی ایک اسپینش کالونی تھی۔ امریکا نے کیلیفورنیا، نیو میکسیکو، نیواڈا اور ایریزونا کے علاقے اس جنگ میں ہتھیا لیے تھے اور اسپین والے پہلے ہی خار کھائے بیٹھے تھے۔ نتیجے میں کیوبا میں امریکی مداخلت سے جنگ چھڑ گئی۔

1870ء میں کیوبا نے تحریکِ آزادی شروع کی۔ جوزف اس کے حامیوں میں سے تھا۔ اس وقت ڈیموکریٹس دنیا بھر میں امریکی مفادات کے تحفظ کے لیے مداخلت اور فوجی کارروائیوں کے حامی تھے جب کہ لبرل مخالف تھے۔ ستم ظریفی دیکھیں کہ ایک وقت آیا جب ڈیموکریٹس بیرونی معاملات میں فوج کے استعمال کے مخالف ہو گئے اور ری پبلکن نے ان کا کردار سنبھال لیا۔ ریگن، بش سینئر اور جونیئر ری پبلکن تھے۔ مگر پہلے ری پبلکن جنگوں کے مخالف تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جوزف کی لبرل حلقوں سے نہیں بنی تھی۔ کیوبا کے معاملے پر جوزف شروع سے لابنگ کر رہا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ امریکا کا فرض ہے کہ وہ کیوبا کی حریت پسند عوام کی مدد کرے اور انہیں اسپین کے تسلط سے نجات دلائے حالانکہ یہ کسی اور ملک کے معاملے میں کھلی مداخلت تھی۔ مگر فلوریڈا اور جارجیا کے لوگ اپنی سرحد کے بالکل پاس اسپین کی کالونی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے جنگ کی حمایت بھی زیادہ تر ان ہی ریاستوں کے سیاست داں کر رہے تھے۔ دراصل وہ کیوبا کو آزادی دلا کر امریکا کی طفیلی ریاست بنانا چاہتے تھے جو داخلی طور پر خودمختار ہو لیکن بیرونی معاملات میں وہ امریکا کی محتاج ہو اور اس کی سرزمین امریکی فوجی اڈے کے طور پر استعمال کی جا سکے۔ بعد میں ایسا ہی ہوا۔

جنگ کے آغاز سے جوزف اس کا پوری شدت سے حامی تھا۔ اس نے اپنے تمام اخبارات اس کی حمایت کے لیے وقف کر دیئے تھے۔ صفحۂ اوّل پر جنگ میں رضاکاروں کی بھرتی کا اشتہار مفت شائع کیا جاتا تھا۔ جوزف کی وسیع لابنگ رنگ لائی اور شمالی امریکا کے عوام جو پہلے اس جنگ کے اتنے حامی نہیں تھے اب کیوبا کو اسپین سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ تحریکِ مزاحمت کے لیڈروں کو امریکا میں دی

آئی پی پروٹوکول دیا جاتا تھا انہیں یہاں اپنا سفارت خانہ کھولنے اور امریکی عوام میں تحریک کے لیے چندے کی مہم چلانے کی اجازت بھی دی گئی تھی۔ اس کے پیچھے جوزف پوری طرح موجود تھا۔ اس کے اخبار میں روزانہ ایسی کہانیاں شائع ہوتی تھیں جن میں کیوبا حکومت کے مظالم کا ذکر ہوتا تھا جو وہ حریت پسندوں پر ڈھا رہا تھا۔

ان میں سے بہت ساری رپورٹس کے بارے میں مخالف اخبارات کا دعویٰ تھا کہ وہ جوزف پلٹزر کے دفتر میں بیٹھ کر لکھی گئی تھیں اور ان کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ڈیموکریٹس اس جنگ میں شرکت کے پوری طرح خواہاں تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ وائٹ ہاؤس میں ری پبلکن صدر ولیم مک کینلے بیٹھا ہوا تھا اور وہ جنگ سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ ری پبلکن پارٹی کیوبا میں مداخلت کی اتنی حامی نہیں تھی مگر رائے عامہ کو جنگ کی حامی پا کر وہ کھل کر مخالفت بھی نہیں کر رہی تھی۔ امریکی صدر ری پبلکن تھا مگر کانگریس اور سینٹ میں ڈیموکریٹس اکثریت میں تھے۔ اس لیے وہ صدر پر دباؤ ڈالنے کی پوزیشن میں تھے۔ پھر ان ہی دنوں ہوانا کی بندرگاہ پر امریکی جنگی جہاز ''مین'' پُراسرار طور پر ڈوب گیا۔ اس کے بعد ڈیموکریٹس اور اس کے حامی پریس اور سب سے بڑھ کر امریکی فوج نے صدر ولیم پر دباؤ ڈالا اور اسے جنگ میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا۔

کیوبا پر الزام تراشی کی ایک مثال وہ واقعہ ہے جس میں امریکی بحری جہاز پر کوئی حملہ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس میں کوئی تباہی ہوئی تھی بس وہ کھڑے کھڑے اچانک ڈوب گیا اور اس کا الزام کیوبا کی حکومت پر لگا دیا گیا۔ امریکن اسپینش وار نے ایک نئے امریکا کو جنم دیا۔ جو اپنے مخالفوں پر الزامات لگاتا رہتا۔ اس کے بعد انہیں امریکا کی سلامتی کے لیے خطرہ قرار دیتا اور پھر اچانک کوئی ایسا واقعہ رونما ہوتا جس سے امریکی الزامات کی تصدیق ہو جاتی اور اس کے بعد وہ اپنی قاہرانہ قوت سے اس ملک پر حملہ کر دیتا جو عام طور سے کسی طرح اس کے مقابلے کے قابل نہیں ہوتا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم میں بسمارک کا واقعہ، دوسری جنگِ عظیم میں پرل ہاربر پر جاپانی حملہ، کوریا کی جنگ میں ایک امریکی طیارے کی پُراسرار گمشدگی، جنگ ویت نام میں ایک امریکی جنگی جہاز پر حملہ اور تازہ ترین نائن الیون کا واقعہ۔ یہ سب واقعات پُراسراریت کی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ان واقعات کو بہانہ بنا کر امریکا دوسرے ملکوں پر حملہ آور ہوا۔

کہتے ہیں اس رجحان کا آغاز شمالی اور وسطی امریکا میں بڑے پیمانے پر دفاعی صنعتوں کے قیام سے ہوا۔ بڑے پیمانے پر فوج اور جنگی ہتھیاروں کا واحد جواز کوئی جنگ ہی ہو سکتی تھی۔ اس لیے امریکا کو جنگوں کا جواز پیدا کرنا پڑا۔ شاید جوزف کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس رجحان کی حمایت کر رہا ہے اور آنے والے دنوں میں دنیا اس وجہ سے کتنی جنگوں سے دوچار ہوگی؟ یہ جنگ جو دس ہفتے جاری رہی تھی اس میں اسپین نے صرف کیوبا سے ہی نہیں بلکہ گوام اور فلپائن سے بھی ہاتھ دھو لیے تھے۔ اسپین کی فوج کے پاس جدید اسلحہ تھا لیکن امریکی فوج کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا اور پھر امریکا کی طاقت ور بحریہ نے اسپین کی افواج کو کچل کر رکھ دیا۔ بحرالکاہل پر امریکی راج قائم ہو گیا اور اسپین کو یہاں سے پسپا ہونا پڑا تھا۔ ان دنوں اسپین خراب حالت سے گزر رہا تھا کیونکہ کالونیوں سے لوٹ کر لائی جانے والی دولت ختم ہو گئی تھی اور کالونیاں بھی اب خود مختار ہو گئی تھیں۔ اسپین کی مزید بدقسمتی تھی کہ اس کی فوج اور رضا کار جو امریکیوں کے خلاف لڑ رہے تھے وہ زرد بخار کا شکار ہو گئے۔

امریکی فوج اور کیوبن رضا کار علاج کی سہولت کی وجہ سے اس سے محفوظ رہے اور جنگ کا پانسہ امریکا کے حق میں پلٹ گیا۔ اس جنگ نے امریکا کو ایک علاقائی طاقت سے ایک بین الاقوامی طاقت میں بدل دیا تھا۔ وہ سپر پاور بن گیا اور اس کی یہ حیثیت ایک صدی سے زیادہ وقت گزرنے کے بعد بھی برقرار ہے۔ درمیان میں سوویت یونین اس کا حریف بن کر سامنے آیا لیکن درحقیقت وہ ہمیشہ دوسرے نمبر کی سپر پاور رہا اور کبھی فوجی طاقت میں امریکا سے آگے نہیں نکل سکا تھا۔ امریکا کو سپر پاور اس کی فوج نے نہیں بلکہ اس کی جدید دفاعی صنعت نے بنایا تھا۔ اس صنعت کے پسِ پشت یہودی سرمایہ کام کر رہا تھا اور آج بھی ستر فیصد دفاعی اداروں کے مالک یہودی ہیں۔ سیاست داں خود کو طاقتور فوج کے بغیر کمزور سمجھتے ہیں۔ یوں انہیں آسانی سے جنگ پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ مزید آسانی کے لیے جوزف جیسے میڈیا میں موجود تھے۔ انہوں نے جنگ کے لیے رائے عامہ ہموار کی۔ اس کا سارا فائدہ ایک مخصوص طبقے کو ہوا۔ جنگ نے اسلحہ سازی کی صنعت کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ پہلے جنگوں کے لیے اسلحہ بنتا تھا تو اب اسلحہ سازی کے لیے جنگیں کی جانے لگیں۔

جوزف پلٹزر نے انجانے میں یا جان بوجھ کر ایک ایسے رجحان کی حمایت کی جس نے آنے والے دنوں میں بے شمار جنگیں برپا کیں اور ان جنگوں میں لاکھوں نہیں کروڑوں لوگ مارے گئے تھے۔ امریکا اسپینش وار کے دوران میں جوزف اور اس کے اخبارات نے تمام صحافتی اخلاقیات بالائے طاق رکھ کر مخصوص مقاصد کے تحت رپورٹنگ کی۔ یہ رجحان آج بھی برقرار ہے۔ کسی بھی جنگ کے دوران امریکی میڈیا عملاً پنٹاگون کی پی آر ٹیم بن جاتا ہے۔ پہلے یہ امریکی رائے عامہ کو ہموار کرتا تھا لیکن اب اس کے پاس دنیا کو متاثر کرنے کی صلاحیت آگئی ہے۔ اس کا سب سے پہلے استعمال خلیج کی پہلی جنگ کے موقع پر ہوا جب امریکی میڈیا نے ساری دنیا کو جنگ اپنی نظر سے دکھائی۔ امریکن اسپینش وار میں جوزف کے اخبارات نے بے پناہ کمائی کی۔ جنگ کی خبریں سب سے پہلے اسی کے اخبار دیتے تھے اور پھر سرکاری اشتہارات فراخ دلی سے ملنے لگے تھے۔

شاید ان دنوں جوزف پلٹزر سب سے زیادہ دولت کمانے والے امریکیوں میں شامل تھا۔ کم سے کم پریس میں اس جتنی دولت اس وقت تک کسی نے نہیں کمائی تھی۔ اس کی مستقل رہائش سینٹ لوئیس میں ہی تھی جہاں اس نے ایک اور عالی شان پیلس خرید لیا تھا۔ پھر اس تے نیویارک میں ایک بہت بڑی عمارت خریدی اور اس کے سب سے اوپری حصے میں ایک شاندار قسم کی پینٹ ہاؤس رہائش اختیار کی تھی۔ بعد میں اس نے ایک مینشن خرید لیا اور وہاں رہنے لگا۔ جوزف اور اس کا خاندان لگژری زندگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ چھٹیاں گزارنے کونی آئی لینڈ جاتے تھے اور ان کا سرما فلوریڈا کے ایک فارم ہاؤس میں گزرتا تھا۔ جوزف نے پریس سے کمائی دولت کو دوسرے شعبوں میں بھی لگایا تھا۔ اس نے کارخانے خریدے، فارم ہاؤسز اور جائدادیں خریدیں۔ صرف نیویارک کے جزیرے مین ہٹن آئی لینڈ پر اس کی ایک درجن عمارتیں تھیں جو اس نے کرائے پر دے رکھی تھیں۔ یہ سب اس نے انیسویں صدی ختم ہونے سے پہلے بنا لیا تھا۔

جنگ ختم ہوگئی اور اس میں امریکی فتح نے عوام کو وہ تمام متنازعہ امور بھلانے پر مجبور کر دیا جو دورانِ جنگ پیش آئے تھے۔ ان میں کیوبا کے ایک گاؤں میں جہاں کیوبن فوج نے شدید مزاحمت کی تھی۔ امریکی فوج نے قتل عام کیا تھا اور مارے جانے والے نوّے فیصد لوگ بے گناہ دیہاتی تھے۔ اس قتل عام میں چار سو سے زائد افراد مارے گئے تھے جن میں اکثریت عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی تھی۔ بعض امریکی اخبارات نے اس قتل عام کا معاملہ اٹھایا تھا مگر جوزف اور اس کے حامیوں کے اخبارات نے اس معاملے کو سرے سے نظرانداز کر دیا تھا۔ انہوں نے اسے کیوبا کی حکومت کا پروپیگنڈا قرار دیا تھا۔ اسی طرح فلپائن کے ایک جزیرے پر امریکی جنگی بحری جہاز کی گولہ باری سے عام افراد نشانہ بنے جب کہ اس جزیرے پر کوئی فوج نہیں تھی۔ جوزف نے نہایت بے پروائی سے اسے دوستانہ بمباری قرار دیا۔ یہ اصطلاح بھی اس کی ایجاد کی ہوئی ہے۔

جوزف نے اپنے اخبارات کو دوبارہ سے عوامی دل چسپی سے بھر دیا اور تفریحی خبریں شائع کرنے لگا۔ سنسنی خیز خبروں کے ساتھ اس نے تفتیشی صحافت کو مزید فروغ دیا اور اس شعبے میں کئی رپورٹر بھرتی کیے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں دی ورلڈ امریکا کا سب سے زیادہ شائع ہونے والا اخبار تھا۔ جوزف نے جن طریقوں اور رجحانات کو فروغ دیا تھا اب دوسرے اخبارات بھی ان کو اپنا کر آگے آ رہے تھے۔ ان میں سے بعض اس سے بہتر رجحانات کو سامنے لا رہے تھے جن میں لوگوں کو زیادہ دل چسپی تھی۔ صنعتی انقلاب عروج پر آ گیا تھا۔ ٹرین اور بحری جہاز ڈیزل انجن سے چلنے لگے تھے۔ سڑکوں پر کاریں اور دوسری آٹو موبائل دوڑ رہی تھیں۔ ریڈیو سروس کا آغاز ہو گیا تھا۔ کلر پرنٹنگ کہیں بہتر انداز میں سامنے آئی تھی۔ جوزف اور اس کے اخبارات نے کچھ نئی چیزیں اپنائیں اور کچھ سے گریز کیا۔ اس کے حریفوں نے ان چیزوں کو اپنا لیا اور وہ دی ورلڈ سے آگے نکلنے لگے۔

فوٹوگرافی کا آغاز ہوتے ہی جنسیت اور عریانیت کا ایک طوفان صحافت میں گھس آیا۔ اخبار اپنی سرکولیشن بڑھانے کے لیے کھل کر عریاں تصاویر شائع کرنے لگے۔ جوزف اگرچہ لبرل ذہن کا آدمی تھا لیکن وہ اس بے محابہ جنسیت اور عریانیت کے خلاف تھا اس لیے اس کے اخبارات میں عریاں تصاویر شائع کرنے سے گریز کیا جاتا تھا وہ ایسے اشتہار بھی قبول نہیں کرتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پیچھے رہ گیا۔ پھر بھی دی ورلڈ اور سینٹ لوئیس ڈسپیچ پوسٹ کے نام تھے اور سنجیدہ قاری اب بھی انہیں ترجیح دیتا تھا۔ پھر

پانامہ کینال اسکینڈل سامنے آیا اور اس نے جوزف کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ جوزف کے رپورٹرز نے خفیہ ذرائع سے معلوم کیا کہ امریکی حکومت نے پانامہ فرنچ کمپنی کو چار کروڑ ڈالرز کی خطیر رقم غیر قانونی طور پر ادا کی ہے۔

پانامہ وسطی امریکا میں ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کے ایک طرف بحر اوقیانوس اور دوسری طرف بحر الکاہل ہے۔ دونوں سمندروں کے درمیان صرف اڑتالیس میل کا فاصلہ ہے۔ اس وقت پانامہ پر فرانس کا قبضہ تھا۔ اس سے پہلے یہاں اسپین قابض تھا۔ فرانس نے محسوس کیا کہ اگر دونوں عظیم سمندروں کو ایک نہر کے ذریعے ملا دیا جائے تو اس علاقے میں تجارت بہت زیادہ ترقی کر جائے گی کیونکہ اس وقت دونوں سمندر جنوبی امریکا کے آخری سرے سے ملتے تھے۔ بحری جہازوں کو بہت طویل اور کوئی دس ہزار میل کا سفر طے کر کے دوسری طرف جانا پڑتا تھا۔ اس سے پہلے بحیرہ قلزم اور بحیرہ احمر کو نہر سوئز کے ذریعے ملانے کا کامیاب تجربہ کیا جا چکا تھا۔ مگر یہاں درمیان میں ہموار صحرا تھا جس میں نہر بنانا بہت آسان ثابت ہوا تھا۔

یہاں مسئلہ یہ تھا کہ درمیان میں پانامہ کی زمین سطح سمندر سے بہت اونچی تھی اور اکثر مقامات پر اس کی اونچائی سطح سمندر سے سو فٹ سے زیادہ تھی۔ اتنی زمین کو کاٹنا کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی یہ سارا علاقہ سخت ترین چٹانوں پر مشتمل تھا۔ درمیان میں گاٹن جھیل تھی جس کی سطح سمندر سے پچاسی فٹ بلند تھی۔ آتش فشاں کے عمل سے پانامہ کی زمین وجود میں آئی تھی اور پھر مسلسل بارشوں نے پہاڑ کاٹ کر اس جھیل کو وجود دیا تھا۔ اڑتالیس میل طویل نہر کا بڑا حصہ اسی جھیل سے گزرتا تھا۔ نہر بنانے کے لیے یہ طریقہ سوچا گیا کہ جھیل کے آغاز اور اختتام پر ایک بڑا کنواں نما بنایا جائے جس میں پانی کی سطح سمندر کی سطح کے برابر ہو۔ جب بحری جہاز اس میں آ جائے تو کنویں کا گیٹ بند کر دیا جائے اور اس میں موٹرز کی مدد سے پانی بھر دیا جائے۔ پانی کی سطح بڑھنے سے جب بحری جہاز جھیل کی سطح تک پہنچ جائے تو جھیل والا گیٹ کھول دیا جائے۔ بحری جہاز جھیل سے گزر کر دوسری طرف پہنچے تو اسی طرح پانی سے بھرا ہوا کنواں ہو جب بحری جہاز کنویں میں آ جائے تو اس سے پانی خارج کر دیا جائے۔ یوں بحری جہاز دوسری طرف پہنچ جائے گا۔

مگر جب فرانسیسی کمپنی نے اسے بنانا شروع کیا تو جھیل والے حصے میں بے پناہ مشکلات پیش آئیں جن سے نمٹنے کے لیے کمپنی کے پاس نہ تو ٹیکنالوجی تھی اور نہ وسائل تھے۔ پھر سرکاری رقوم میں بے پناہ خرد برد ہوئی اور کمپنی حکام پر فرانس میں مقدمہ بھی چلا کہ انہوں نے ایک ارب فرانک کی خطیر رقم بدعنوانی سے غائب کی ہے۔ دوسری طرف امریکا نے محسوس کیا کہ نہر پانامہ اس کی اقتصادیات اور بحر الکاہل میں فوجی استحکام کے لیے ناگزیر ہے۔ امریکا کے پاس وسائل بھی تھے اور ٹیکنالوجی بھی تھی وہ نہر پانامہ پروجیکٹ مکمل کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے نہر کا پروجیکٹ لے لیا۔ اب کمپنی کو بہ ظاہر ادائیگی ہوئی تھی لیکن ساتھ ہی امریکی حکومت نے فرنچ پانامہ کمپنی کو چار کروڑ ڈالرز (آج کے حساب سے یہ رقم ایک ارب ڈالرز بنتی ہے) کی مخفی ادائیگی بھی کی۔ جوزف نے اس اسکینڈل کا انکشاف کیا اور اس وقت کے امریکی صدر تھیوڈور روز ویلٹ اور اس کے نائب جے پی مورگن کو ذمے دار ٹھہرایا۔ معاملہ عدالت میں گیا اور وہاں سے ان دونوں حضرات کو بری الذمہ قرار دے دیا گیا۔ جوزف اور دی ورلڈ کا دعویٰ جھوٹا ثابت ہوا اور اس کیس سے دونوں کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ دی ورلڈ کی اشاعت اس کے بعد گرنے لگی۔

جوزف نے اس کا کہیں زیادہ اثر لیا تھا۔ اس کی صحت ویسے ہی خراب ہو رہی تھی۔ اس کی ناکامی پر اس کے پرانے حریف ایک بار پھر میدان میں آ گئے اور اس پر الزامات اور طنز کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ زرد صحافت کا الزام دُھرایا جانے لگا۔ بینائی کا مسئلہ بھی اپنے عروج پر تھا اور وہ دیکھنے سے قاصر ہو گیا تھا۔ یوں بہت سارے عوامل مل کر ایک عروج کو زوال کی طرف لے جا رہے تھے۔ جب معاملہ عدالت میں گیا تو جوزف کو اُمید تھی کہ وہ بدعنوانی کا سب سے بڑا کیس جیت جائے گا اور پہلی بار ایسا ہو گا کہ ایک امریکی صدر اور اس کے نائب کو سزا ہو گی۔ جوزف اسے اپنے کیریئر کا اہم ترین کیس سمجھ رہا تھا اس کے خیال میں اس کے رپورٹرز نے کافی ثبوت حاصل کر لیے تھے۔ مگر وہ ایک بات بھول رہا تھا۔ صدر لنکن کے بعد امریکی ریاست اور سیاست میں سب سے اہم چیز ملک کے مفاد کی ہو گئی تھی اور اس کے لیے قانون، اخلاق اور عوام کے حقوق کو قربان کیا جا سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ صاحبانِ اقتدار ہی وضاحت کر سکتے تھے کہ ملک کا مفاد کس چیز میں ہے۔ اس کے لیے عدلیہ اور انتظامیہ ان کے

آلے کی حیثیت رکھتی تھی۔

عدالت کا فیصلہ جوزف کے لیے غیر متوقع سہی لیکن وہ ریاست کے مفاد کے مطابق تھا۔ چند سال پہلے اس نے بھی ریاست کے مفاد کے نام پر امریکن اسپینش وار کے حق میں مہم چلائی تھی اور اس میں اس نے بہت سی باتوں کو نظر انداز کیا تھا۔ جیسے انسانی حقوق اور خفیہ ادائیگیاں وغیرہ۔ اس بار جوزف کو آئینہ دیکھنا پڑ گیا تھا۔ نہر پاناما اسکینڈل نے ایک بات کو اور واضح کر دیا کہ امریکی حکومت قانون اور آئین سے بالاتر ہو کر فیصلے بھی کر سکتی ہے۔ عدالت اور انتظامیہ اس کی حمایت کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ جنگوں کے دوران میں ان دونوں اداروں کی طرف سے امریکی حکومت کے ایسے فیصلوں کو بھی سہارا دیا گیا جو سراسر بے انصافی اور ظلم پر مبنی ہوتے تھے۔

☆☆☆

آنکھوں کا مسئلہ چالیس سال کی عمر میں شدت اختیار کر گیا تھا۔ اس وقت جوزف اپنے کیریئر کے عروج پر تھا۔ وہ کامیاب ترین ایڈیٹر اور پریس پبلشر تھا۔ اس کے اخبارات کی مجموعی سرکولیشن ایک ملین سے تجاوز کر گئی تھی۔ بینائی اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اسے عینک کے بغیر بہ مشکل ہی نظر آتا تھا۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی چھانے کا دورہ بھی رہ رہ کر پڑتا تھا اور کبھی تو اسے چوبیس گھنٹے کے لیے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ایسے میں وہ گھر بیٹھ جاتا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ اس کے نابینا پن کی خبر باہر نہ نکلنے پائے۔ صرف اس کے بیوی بچے، قریبی عزیز اور رفقا اور اس کے ڈاکٹرز جانتے تھے کہ اس کے ساتھ آنکھوں کا مسئلہ ہے۔ اگر باہر ہوتے ہوئے اسے نظر آنا بند ہو جاتا تو وہ خاموشی سے گھر روانہ ہو جاتا تھا۔ اگر اسے باہر کہیں کچھ پڑھنا پڑتا یا ایسا ہی کوئی کام کرنا پڑتا تو وہ گھر سے اسے یاد کر کے اور اس کی ریہرسل کر کے جاتا تھا۔ اس کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ عام طور سے وہ ایک بار کوئی چیز پڑھتا تو وہ اسے اپنے سیاق و سباق کے ساتھ یاد ہو جاتی تھی۔

انیسویں صدی کے آخری دو عشرے اس کے عروج کے تھے۔ بیس سال تک اس کے نام کا سکہ جاری رہا۔ وہ پریس اینڈ پبلی کیشن کا بے تاج بادشاہ تھا۔ جرائم پیشہ مافیائیں اور بدعنوان سیاست داں اور سرکاری ملازم اس کے اور دی ورلڈ کے نام سے گھبراتے تھے۔ اخباری صنعت میں کوئی اس کا مدمقابل نہیں تھا۔ اس نے بے حساب دولت کمائی۔ آج ایک محتاط اندازے کے مطابق جوزف پلٹزر نے جو کمایا وہ تقریباً دس ارب ڈالرز کے مساوی تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اس کے اخباروں، پریس اور دوسرے اداروں میں کام کرنے والے ملازمین کی تعداد دس ہزار سے زیادہ تھی۔ اتنی بڑی تعداد میں ملازمین کو اسے خود دیکھنا پڑتا تھا۔ کیونکہ اس کے بیٹے ابھی پڑھ رہے تھے اور اس کا کوئی پارٹنر بھی نہیں تھا۔

اخباروں کے ادارتی معاملات، کاروبار اور پھر سیاسی معاملات، ان سب نے اسے بے پناہ مصروف رکھا تھا۔ وہ صبح نو بجے سے رات دس گیارہ بجے تک لگاتار کام کرتا تھا۔ شاید ہی وہ کبھی بارہ بجے سے پہلے گھر گیا ہو یا دو بجے سے پہلے سویا ہو۔ رات بھر میں اسے صرف پانچ گھنٹے کی نیند نصیب ہوتی تھی۔ وہ شروع سے اتنی نیند کا عادی تھا۔ جب تک جوان اور مضبوط رہا اسے فرق نہیں پڑا لیکن جیسے جیسے اس کی عمر بڑھنے لگی۔ جوانی سے ادھیڑ عمری میں آیا تو بہت زیادہ محنت کا اس کی صحت پر فرق پڑنے لگا۔ ڈاکٹر بینکاٹ کی وارننگ کے باوجود اس نے مطالعے کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ نتیجے میں اس کی آنکھ کا پردہ شبکیہ دھندلاتا چلا گیا۔ اس کی دور کی نظر کمزور تھی اور قریب کا منظر بھی صاف نظر نہیں آتا۔ دفتر میں اسے باریک لکھائی پڑھنے کے لیے عدسہ استعمال کرنا پڑتا تھا۔ 890ء کے بعد تاریکی کے دورے جلدی جلدی پڑنے لگے۔ یہ وقت اس کے لیے بہت اذیت ناک ہوتا تھا۔ وہ ایک تاریک دنیا میں قید ہو کر رہ جاتا۔ اس نے اپنے نابینا پن کے علاج کی ہر ممکن کوشش کی مگر اس وقت اس کا کوئی علاج نہیں تھا آج بھی اس کا علاج بہت مشکل سمجھا جاتا ہے۔

نابینا پن، مسلسل محنت اور ذہنی دباؤ اس کی صحت پر اثر انداز ہونے لگا۔ قابلِ رشک صحت کا مالک تو وہ کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ اس کا قد کسی قدر طویل اور جسم دبلا تھا۔ قد کی وجہ سے اس کا دبلا پن اور بھی نمایاں ہوتا تھا۔ صحت گرنے سے وہ بہت کمزور نظر آنے لگا۔ بڑھتے ذہنی دباؤ اور آنکھوں کی وجہ سے اس نے محسوس کیا کہ اخبار کے لکھنے پڑھنے یعنی ادارتی معاملات سے اب اسے الگ ہو جانا چاہیے۔ اس نے مشہور مدیر فرینک آئی کوب کو دی ورلڈ کا مدیر مقرر کیا۔ کوب کا شمار امریکی اخباری تاریخ کے چند ذہین ترین مدیروں میں ہوتا تھا۔ دی ورلڈ میں آنے سے پہلے وہ نام کما چکا تھا۔ جوزف نے ادارت اس

کے سپرد کردی لیکن پالیسی سازی اس نے اپنے پاس رکھی تھی۔ جبکہ کوب پالیسی سازی بھی خود کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ گوارہ نہیں تھا کہ جوزف اپنے نیویارک کے مینشن میں بیٹھ کر ادارتی معاملات میں رہنمائی کرے۔ وہ مسلسل دفتر سے رابطہ رکھتا تھا۔ جب وہ سرما کے دوران جارجیا کے نزدیک سمندر میں جزیرے جیکائل پر منتقل ہو جاتا یا چھٹیاں گزارنے بیوی بچوں کے ساتھ بار بار بر جاتا تھا تب بھی دفتر سے اس کا رابطہ برقرار رہتا تھا۔

کوب جوزف کی طرف سے دفتر کو گھر میں بیٹھ کر چلانے کی کوشش میں مزاحمت کرتا تھا اور دونوں میں وقتاً فوقتاً زبانی جھڑپیں ہوتی تھیں جو بعض اوقات گرم گفتاری کی حد تک بھی پہنچ جاتی تھیں۔ ہر بار ایسا لگتا تھا کہ کوب استعفا دے دے گا یا جوزف اسے فائر کر دے گا لیکن جھگڑے کے اگلے دن دونوں کے تعلقات معمول پر آجاتے تھے۔ یہ سرد و گرم چلتے رہے۔ جوزف کے بیٹے اب جوان اور تعلیم یافتہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے پہلے عشرے کے وسط میں رفتہ رفتہ کاروبار کا چارج سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔ اسی رفتار سے جوزف انتظامیہ کے مختلف شعبوں سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ بالآخر 1907ء میں جب اس کے بیٹوں نے مکمل طور پر اخباروں اور بزنس کو سنبھال لیا تو اس نے مجبوراً ایک بہت احتیاط سے مرتب کیا ہوا استعفا تیار کیا اور اسے نیویارک کے ہر اخبار میں شائع کرایا سوائے دی ورلڈ کے۔

اس سے ظاہر تھا کہ وہ اپنی اس پسپائی کا ذمے دار کوب کو سمجھتا تھا۔ اس طرح سے اس نے کوب کو ذلیل کیا۔ مگر بتدریج وہ کوب کی ادارتی صلاحیتوں اور اس کی آزادروی کی عزت کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ اس کا رویہ تبدیل ہوا تو کوب بھی اسے اہمیت دینے لگا۔ جب تک وہ باس تھا کوب نے ایک بار بھی اس سے مشورہ نہیں مانگا لیکن اب وہ اکثر ادارت کے مسائل اور پالیسی کے بارے میں اس سے مشورہ لینے آتا تھا۔ جوزف کی وفات تک ان میں اچھے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ جس سال جوزف دنیا سے رخصت ہوا اس سال وہ اور کوب اخبار کی ایک مستقل ادارتی پالیسی پر کام کر رہے تھے مگر جوزف کی وفات سے یہ کام ادھورا رہ گیا۔

جن دنوں دونوں میں تناؤ جاری تھا جوزف کا مطالبہ تھا کہ اداریوں میں بریکنگ نیوز کو اہمیت دی جائے۔ جب کہ کوب اسے پالیسی تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر جب جھگڑا زیادہ ہی شدت اختیار کر گیا تو جوزف نے اپنے مدیر کو چھ ہفتے کی رخصت پر یورپ بھیج دیا تاکہ وہ تازہ دم ہو کر جھگڑے کے اگلے مرحلے کے لیے تیار ہو کر آئے۔ مگر اس کی واپسی کے کچھ عرصے بعد ہی جوزف دنیا سے رخصت ہو گیا اور اس کی وفات کے اگلے دن کوب نے اسے یوں خراج تحسین پیش کیا کہ اس کا استعفا دی ورلڈ میں شائع کیا۔ اس کے بعد وہ 1923ء میں اپنی وفات تک جوزف کے ساتھ طے کی ہوئی پالیسی کے تحت اداریے لکھتا رہا تھا۔ کوب زیادہ نہیں جیا تھا اسے کینسر نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس کی وفات کے بعد دی ورلڈ کی رہی سہی ساکھ بھی ختم ہو گئی اور 1931ء میں یہ اخبار بند ہو گیا جس نے ایک وقت میں پورے امریکا میں دھوم مچا دی تھی۔ یہ زوال عبرت ناک تھا کیونکہ اس سے کہیں معمولی اخبار زندہ رہے اور بعد میں انہوں نے اچھے دن بھی دیکھے جب کہ دی ورلڈ جب بین الاقوامی اخبار بننے کی پوزیشن میں آگیا تھا تو اپنے مالک اور مدیر سے محرومی نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

جوزف نے رپورٹر کی حیثیت سے اپنا کیریئر شروع کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ساری عمر رپورٹرز کو اہمیت دیتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ رپورٹرز ہی ہوتے ہیں جو اخبار کا پیٹ بھرتے ہیں اور اسے چلاتے ہیں۔ ایک بار پروفیسر تھومس ڈیوڈسن نے اس سے پوچھا۔ ''مسٹر پلٹزر کیا وجہ ہے کہ تم رپورٹرز سے بہت نرمی سے پیش آتے ہو اور ان کی غلطیاں نظر انداز کر دیتے ہو لیکن مدیروں سے تمہارا رویہ درشت ہوتا ہے۔''

''کیونکہ جب میں رپورٹرز کو دیکھتا ہوں تو مجھے اُمید نظر آتی ہے جب کہ مدیر کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ مایوسی ہوتی ہے۔''

پروفیسر تھومس ڈیوڈسن کو یہ جواب ہضم نہیں ہوا تھا اس نے جوزف کی وفات پر ایک مضمون لکھا اور اس میں اس نے کہا۔ ''جوزف اچھی طرح جانتا تھا کہ مدیر ہی اصل میں اخبار چلاتا ہے، وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کیا چھپنا چاہیے اور کیا نہیں، کسی بھی اخبار کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہمیشہ مدیر پر ہوتا ہے۔ رپورٹرز اس کے آلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود جوزف مدیروں سے نالاں تھا۔''

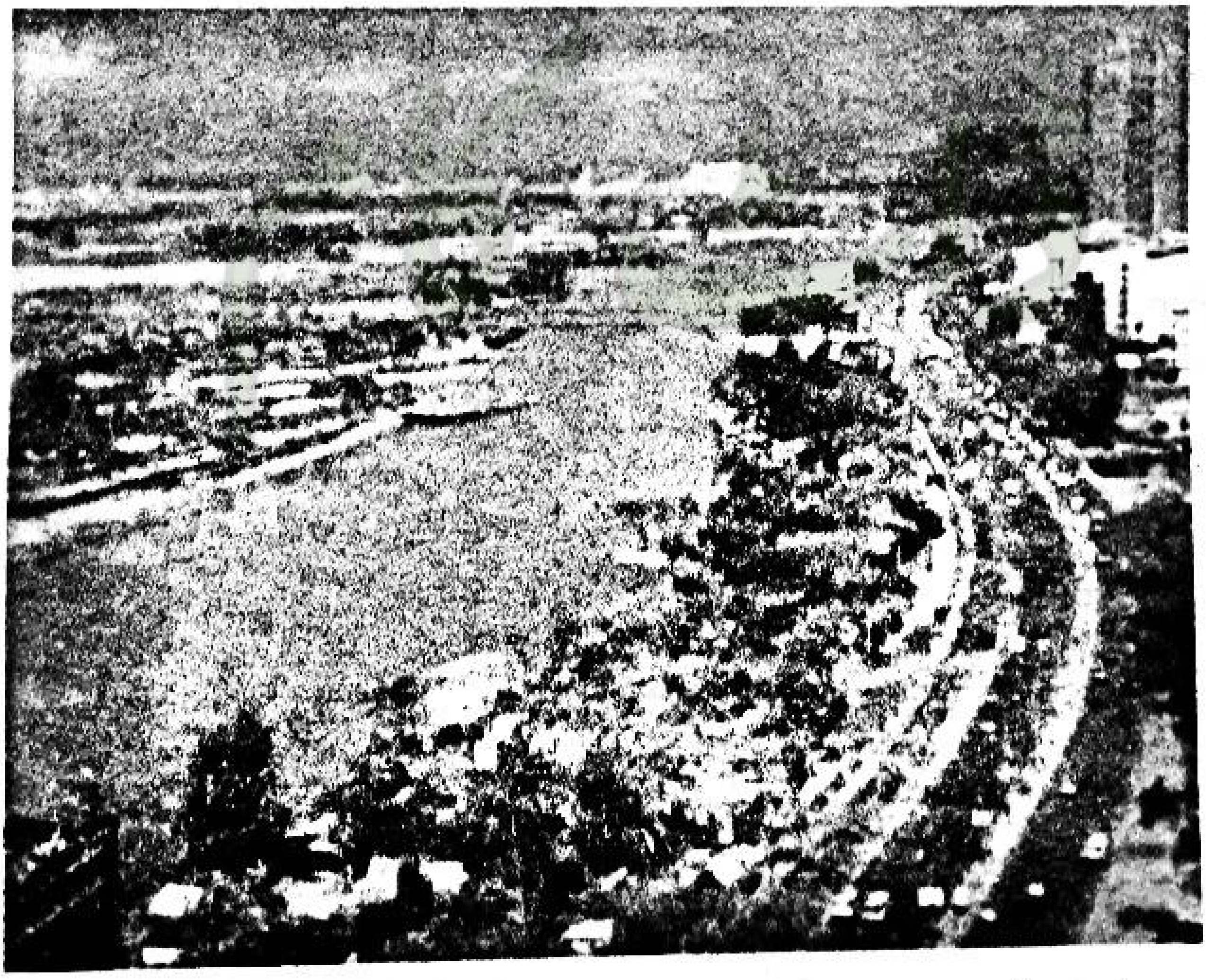
دریائے نیل

طارق عزیز خان

قدیم اور اسرار بھرے اس دریا کا تذکرہ جس کے کنارے بہت سے پیغمبروں نے نصیحت کی محفل برپا کی۔ اس کے ساحل پر تاریخ نے کئی کروٹیں بدلیں اسی لیے اسے پُراسرار دریا بھی کہتے ہیں۔

علم کے متلاشیوں کی خاطر تحقیق کا خزانہ

میں آفس سے گھر پہنچا تو ایک خوشخبری میری منتظر تھی۔ رائل جیوگرافیکل سوسائٹی آف لندن کے صدر نے ایک خط کے ذریعے میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ انہوں نے دریافتوں کے دور (The Age Of Discovery) کے حوالے سے اردو زبان میں لکھی گئی میری دونوں کتابوں کی تعریف کی تھی اور میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا (نوٹ: دونوں کتابوں کے کئی مضامین سرگزشت میں پہلے ہی چھپ چکے ہیں)۔ تاہم میرے لیے اس سے بھی بڑی خوشخبری



یہ تھی کہ سوسائٹی کی طرف سے مجھے دریائے نیل میں سفر کے حوالے سے ترتیب دی گئی ایک مہماتی ٹیم کا حصہ بننے کی دعوت دی گئی تھی۔ میں دنیا کے سب سے عظیم دریا میں مہماتی سفر کو لے کر بہت پُرجوش تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک میرا سب سے پسندیدہ مشغلہ دنیا کے نقشے کی چھان بین رہا ہے۔ میرے اسی شوق نے مجھے دریافتوں کے دور کا اسیر بنایا۔ میں نے کرۂ ارض کی جغرافیائی تلاش کے حوالے سے ہر قابل ذکر مہم کا نہ صرف مطالعہ کیا ہے بلکہ ''سو عظیم مہمات'' کو یکجا کر کے ایک کتاب بھی تحریر کی ہے۔ مجھے کرۂ ارض پر واقع جن مقامات نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے دریائے نیل ان میں سے ایک ہے۔

اگر آپ دنیا کے نقشے پر پھیلے رنگ برنگے ممالک، سمندروں، دریاؤں، پہاڑی سلسلوں اور جزیروں کا جائزہ لیں تو افریقا کے سینے کو چیرتی سیاہی مائل نیلگوں لکیر کو نظرانداز نہیں کر پائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ جغرافیہ سے معمولی سی شد بد بھی رکھتے ہیں تو دریائے نیل اپنی ایک الگ ہی پہچان کے ساتھ آپ کو ضرور متاثر کرے گا۔

دریائے نیل دنیا کا سب سے لمبا دریا ہے جو بیک وقت برّاعظم افریقا کے آٹھ ممالک میں بہنے کے بعد مصر کے شمال میں واقع بحیرہ روم میں جا ملتا ہے۔ دریائے نیل جہاں شمال مشرقی افریقی ممالک کی معیشت کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے وہاں یہ قدیم افریقی تہذیب کا آئینہ دار بھی ہے۔ 4 سے 6 ہزار قبل مسیح کے دوران میں شمال مشرقی افریقا کی بیشتر آبادی صحرائے اعظم کی وسعت اور خشک سالی کی وجہ سے دریائے نیل کے کناروں پر آباد ہوگئی تھی۔ آبادی کا یہ بڑا انخلاء 5000 ہزار قبل مسیح میں دنیا کی قدیم ترین مصری تہذیب کے آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

3100 سو قبل مسیح میں دریائے نیل نے فراعینِ مصر کی عظیم تہذیب کو پنپتے دیکھا۔ اگلے پانچ ہزار سال تک دریائے نیل نے نہ صرف دیگر افریقی تہذیبوں کو بنتے مٹتے دیکھا بلکہ یہ عظیم دریا متعدد متعلق العنان حکمرانوں کے عروج و زوال کا گواہ بنا رہا۔

دریائے نیل کے نام سے دریا کا آغاز افریقا کی سب سے بڑی جھیل وکٹوریہ سے ہوتا ہے۔ تاہم دریا کا دہانہ وسطی افریقا کے چھوٹے سے ملک برونڈی میں ہے۔ جھیل وکٹوریہ سے بحیرہ روم تک دریا کی لمبائی 5584 کلومیٹر ہے جبکہ دریائے نیل کی برونڈی میں واقع اپنے دہانہ سے بحیرہ روم تک اصل لمبائی 6695 کلومیٹر (4160 میل) ہے۔ دریا کے پانی کا سب سے بڑا ماخذ جھیل وکٹوریہ ہے مگر ہم دریائے نیل کو برساتی دریا ہی کہیں گے کیونکہ وسطی افریقا میں بہنے والے تمام دریاؤں کا ماخذ استوائی خطے میں ہونے والی بارشیں ہیں اور شمال مشرقی افریقا میں بہنے والے تمام چھوٹے بڑے ندی نالے اور دریا مختلف سمتوں سے آکر جھیل وکٹوریہ ہی میں گرتے ہیں۔

1990ء کی دہائی میں بعض مغربی جغرافیہ دانوں کے درمیان یہ بحث چھڑ گئی کہ دریائے ایمزن، دریائے نیل سے لمبا ہے۔ اسی سال امریکی خلائی ادارے ناسا نے خلاء سے دونوں بڑے دریاؤں کی نئی تصاویر اتاریں، ان تصاویر کی مدد سے نئے نقشے تیار کیے گئے۔ جن سے یہ بات صاف ہوگئی کہ دریائے نیل ہی دنیا کا سب سے لمبا دریا ہے۔

دریائے نیل مصر میں بحیرہ روم میں گرنے سے پہلے شمال مشرقی افریقا کے کل 8 ممالک برونڈی، روانڈا، عوامی جمہوریہ کانگو (زائر) تنزانیہ، یوگنڈا، ایتھوپیا، سوڈان اور مصر کی حدود میں بہتا ہے۔ دریا کا زیادہ تر حصہ بالترتیب سوڈان، مصر، ایتھوپیا اور یوگنڈا کی حدود میں ہے۔ برونڈی میں دریائے نیل کے دہانے کی بلندی 1134 میٹر بلند علاقے میں ہے۔ دریا کا اوسط بہاؤ 2830 مکعب میٹر فی سیکنڈ یا 99956 مکعب فٹ فی سیکنڈ ہے۔ جبکہ آٹھوں افریقی ممالک میں واقع دریائے نیل کا طاس یا بیسن 34 لاکھ مربع کلومیٹر کے علاقے پر محیط ہے۔ یاد رہے کہ یہ رقبہ بھارت کے کل رقبہ سے بھی چار لاکھ مربع کلومیٹر زیادہ ہے۔

دریائے نیل کی ابتداء لاکھوں سال پہلے اس وقت ہی ہوگئی تھی جب کرۂ ارض کا واحد برّاعظم پانگیا Pangaea ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ تقریباً 200 ملین سال پہلے اس ٹوٹ پھوٹ کے نتیجے میں برصغیر پاک و ہند مشرقی افریقا سے الگ ہوا تھا۔ اگلے 100 ملین سال کے دوران میں شمال مشرقی افریقا میں جغرافیائی تبدیلیوں کی وجہ سے متعدد جھیلیں وجود میں آئیں۔ اندازہ ہے کہ یہی وہ وقت تھا جب اس علاقے میں دریائے نیل سمیت متعدد دریا وجود میں آئے۔

پچھلے کئی عشروں سے جغرافیہ دانوں کے درمیان یہ بحث چھڑی آرہی ہے کہ دریائے نیل کا دہانہ کہاں واقع ہے؟ عام طور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دریائے نیل کا آغاز افریقا کی سب سے بڑی میٹھے پانی کی جھیل ''وکٹوریہ'' سے ہوتا ہے۔ یہ بات یہاں تک تو درست ہے کہ دریائے نیل کے پانی کا سب سے بڑا ماخذ جھیل وکٹوریہ ہی ہے اور دریا اپنے اصل نام سے اسی

جھیل سے نکلتا ہے۔ تاہم جغرافیائی اعتبار سے جھیل وکٹوریہ کو دریائے نیل کی پیدائش نہیں مانا جاسکتا۔ دنیا کی تمام بڑی جھیلوں میں پانی کا سب سے بڑا ماخذ وہ سینکڑوں ندی نالے ہوتے ہیں جو جھیل کے اردگرد کے علاقے سے بہتے ہوئے آکر اس جھیل میں گرتے ہیں۔ جھیلیں عموماً سطح سمندر سے بلندی پر واقع ہوتی ہیں یہی وجہ ہے جھیل میں پانی کی سطح بلند ہونے پر پانی کا بہاؤ سطح سمندر کی طرف ہوجاتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ سمتوں سے پانی بہہ نکلتا ہے۔ یوں ایک یا ایک سے زیادہ نئے ندی نالوں کی پیدائش ہوتی ہے۔ اگر جھیل کے ایک ہی سمت میں زمین کی سطح ڈھلوان کی طرح ہو تو تمام چھوٹے بڑے ندی نالے ایک بڑے دریا میں تبدیل ہوکر سمندر کی طرف بہنا شروع کردیتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جھیل وکٹوریہ کے شمال میں بحیرہ روم تک سطح زمین ڈھلوان کی طرح ہے۔ زمین کی یہی ڈھلوان اردگرد کے تمام چھوٹے بڑے ندی نالوں اور دریاؤں کو ایک عظیم دریا کی تشکیل پر مجبور کردیتی ہے۔ البتہ یہ سوال اب بھی برقرار ہے کہ کیا جھیل وکٹوریہ ہی دنیا کے سب سے لمبے دریا کی پیدائش کا سبب ہے؟ اس سوال کے جواب کی تلاش کے لیے ہمیں شمالی مشرقی افریقا کا جغرافیائی جائزہ لینا ہوگا۔

عین خط استواء پر واقع ہونے کی وجہ سے جھیل وکٹوریہ اور اس سے ملحقہ علاقہ سارا سال بارشوں کی زد میں رہتا ہے۔ جھیل وکٹوریہ کے جنوب، مغرب اور مشرق میں واقع علاقے شمال مشرقی علاقوں کی نسبت بلندی پر ہیں جس کی وجہ سے مغرب میں جمہوریہ کانگو (زائر) روانڈا، برونڈی اور جنوب میں تنزانیہ کی طرف سے بہہ کرآنے والے سینکڑوں چھوٹے بڑے برساتی نالے اور دریا جھیل وکٹوریہ ہی میں گرتے ہیں۔ جغرافیہ داں ابتدا میں انہی دریاؤں میں سے کسی ایک دریا کی پیدائش کی جگہ کو دریائے نیل کا دہانہ مانتے تھے۔ جھیل وکٹوریہ میں گرنے والے ان دریاؤں میں مغرب میں تنزانیہ کی طرف دریائے کاگیرا، جنوب میں برونڈی کی طرف دریائے روی رونزا اور مشرق میں کینیا کی طرف سے بہہ کرآنے والا دریائے ایثارے اہم ہیں۔ ان تینوں دریاؤں میں دریائے روی رونزا دراصل دریائے کاگیرا ہی کی برانچ ہے جو تنزانیہ کی حدود میں دریائے کاگیرا کے نام سے بہتا ہے۔ ان دریاؤں کے علاوہ جھیل وکٹوریہ کے جنوب مغرب میں یوگنڈا، روانڈا اور برونڈی کی جمہوریہ کانگو (زائر) سے ملنے والی مشترکہ سرحد پر میٹھے پانی کی چار بڑی جھیلیں

بھی واقع ہیں جن میں یوگنڈا اور کانگو کی سرحد پر دو بڑی جھیلیں جھیل البرٹ اور جھیل ایڈورڈ واقع ہیں۔ جبکہ جنوب میں روانڈا اور کانگو کی سرحد پر بھی دو بڑی جھیلیں جھیل کیو اور جھیل ٹانگانیکا واقع ہیں۔ ان چار بڑی جھیلوں کے علاوہ اس علاقہ میں بے شمار چھوٹی بڑی جھیلیں واقع ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے جھیل وکٹوریہ کے گردونواح کا سارا علاقہ دریائے نیل کا طاس یا بیسن کہلاتا ہے۔ اس علاقے کا سب سے بڑا ملک جمہوریہ کانگو (زائر) ہے۔ جغرافیہ دانوں نے دریائے نیل کا دہانہ تلاش کرنے کے لیے پہلے پہل کانگو کے شمالی علاقوں پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ یہ فرض کرلیا گیا کہ دریائے نیل کا دہانہ کانگو کے شمالی پہاڑی علاقوں میں کہیں موجود ہے۔ 1960ء کے عشرے میں جب کمپیوٹر ٹیکنالوجی کو فروغ حاصل ہوا تو کینیڈا میں زمین کے درست نقشے تیار کرنے کے لیے "جیوگرافک انفارمیشن سسٹم" GIS تیار کیا گیا۔ 1970ء کے بعد جب خلائی ٹیکنالوجی کو فروغ حاصل ہوا تو امریکی اور روسی خلائی سیاروں نے کرۂ ارض کی سینکڑوں نئی تصاویر اتاریں۔ ان تصاویر کی روشنی میں جہاں جی آئی ایس میں متعدد تبدیلیاں کی گئیں وہیں زمین کے پہلے سے کہیں زیادہ قابلِ اعتبار نقشے تیار کیے گئے۔ نئی معلومات کی روشنی میں جغرافیہ دانوں نے جمہوریہ کانگو میں دریائے نیل کے دہانے کے ہونے کے امکان کو مسترد کردیا۔

اب ماہرین نے جھیل وکٹوریہ کے جنوبی ممالک روانڈا اور برونڈی پر توجہ مرکوز کی اور نئی تحقیق و جستجو کے بعد بیشتر جغرافیہ داں اس نتیجے پر پہنچے کہ دریائے نیل کا دہانہ جھیل وکٹوریہ کے جنوب میں واقع ملک برونڈی میں ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا کہ برونڈی کے علاقے سے جھیل وکٹوریہ میں گرنے والے متعدد ندی نالوں میں ایک دریا نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ "دریائے روی رونزا" ہے۔ یہ چھوٹا سا برساتی دریا باقی ذیلی دریاؤں کی نسبت سال کے زیادہ تر حصے میں بہتا رہتا ہے۔ یہ دریا جھیل وکٹوریہ کی طرف بڑھتے ہوئے شمال میں جب یہ تنزانیہ کی حدود میں داخل ہوتا ہے تو اسے دریائے کاگیرا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دوسری طرف کینیا کی طرف سے جھیل وکٹوریہ میں گرنے والے دریاؤں میں قابلِ ذکر دریا "دریائے ایثارے" دریائے روی رونزا کی نسبت نہ صرف چھوٹا ہے بلکہ سال کے زیادہ تر حصوں میں خشک بھی رہتا ہے...... چنانچہ علاقے میں موجود تمام جغرافیائی حقائق اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دریائے نیل کا اصلی دہانہ

برونڈی سے نکلنے والا" دریائے روی رونزا" اہی ہے۔

دریائے نیل کے بیسن میں واقع تمام ممالک نے جہاں دریائے نیل اور اس سے ملحقہ جھیلوں سے معاشی فوائد حاصل کیے ہیں وہاں دریائے نیل کی پیدائش کا سبب بننے والے ملک برونڈی کے بدعنوان حکمرانوں نے ملک کو طویل خانہ جنگیوں میں الجھا کر اس اسٹیج پر پہنچا دیا ہے جہاں برونڈی کا شمار دنیا کے دس غریب ترین ممالک میں ہوتا ہے۔ برونڈی کا کل رقبہ 27834 مربع کلو میٹر اور آبادی 63 لاکھ 70 ہزار 6 سو 9 نفوس پر مشتمل ہے۔ ملک کا دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر "بوجمبورا" ہے جو جھیل ٹانگانیکا کے کنارے آباد ہے۔ بوجمبورا کے 80 کلو میٹر جنوب میں ایک چھوٹا سا گاؤں "کولائن کلکی دی" آباد ہے۔ اس چھوٹے سے گاؤں کی اہمیت دنیا کے نقشے پر بس اس قدر ہے کہ گاؤں سے چند میٹر مغرب میں ایک پہاڑی ٹیلے کے عقب میں دنیا کے سب سے لمبے دریائے نیل کا دہانہ واقع ہے۔

☆☆☆

جولائی کے مہینے میں عام طور پر سہ پہر کے وقت جب گرمی اور حبس اپنے عروج پر ہوتا ہے، تب جھیل ٹانگانیکا کی طرف سے اٹھنے والی کالی کالی گھٹائیں دیکھتے ہی دیکھتے برونڈی کے تمام جنوبی علاقوں پر چھا جاتی ہیں۔ زبردست گرج چمک کے ساتھ اچانک ہی موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی ہے۔ کولائن کلکی دی کے مغرب میں واقع ایک ٹیلے پر سے پانی کی چند نالیاں بہہ بہہ کر ایک جگہ تالاب کی صورت میں اکٹھی ہوتی جاتی ہیں۔ جوں جوں بارش میں تیزی آتی جاتی ہے، محض چند مربع میٹر پر بنے اس قدرتی تالاب میں پانی کی سطح بھی اونچی ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ پانی ایک لکیر کی صورت میں تالاب سے نکل کر شمال کی طرف بہنے لگتا ہے۔ دراصل پانی کی یہ پتلی سی لکیر ہی آگے چل کر عظیم دریائے نیل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ادھر تالاب کے رقبے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ادھر پانی کی پتلی لکیر ایک بڑے برساتی نالے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چند کلو میٹر کے سفر کے دوران میں اس برساتی نالے میں علاقے میں بہنے والے دیگر چھوٹے چھوٹے برساتی نالے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ اب یہ دریائے روی رونزا کی صورت اختیار کر کے برونڈی کے وسطی علاقوں کو سیراب کرتا ہوا شمال کی طرف بہتا جاتا ہے۔ 85 کلو میٹر کے سفر کے بعد یہ برونڈی کے دوسرے بڑے شہر گی ٹیگا کے قریب پہنچتا ہے۔ گی ٹیگا کے مغرب میں دریائے روی رونزا 90 کلو میٹر کا طویل چکر کاٹ کر برونڈی کے سب سے بڑے نیشنل پارک "روبو" میں داخل ہوتا ہے۔ پارک میں داخل ہونے سے پہلے علاقے کے دو بڑے اور متعدد چھوٹے برساتی نالے بھی روی رونزا میں شامل ہو جاتے ہیں۔ 70 کلو میٹر لمبا اور اوسطاً 14 کلو میٹر چوڑا روبو نیشنل پارک شمال میں تنزانیہ کی سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔ دریائے روی رونزا، روبو نیشنل پارک سے نکل کر تنزانیہ کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے تنزانیہ اور برونڈی کی مشترکہ سرحد کے طور پر شمال کی سمت میں بہتا ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان 50 کلو میٹر لمبی سرحد بنانے کے بعد دریائے روی رونزا باقاعدہ طور پر تنزانیہ کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔

تنزانیہ کی حدود میں یہ "دریائے کاگیرا" کے نئے نام سے بہنا شروع کرتا ہے۔ تنزانیہ کی حدود میں شمال کی طرف 60 کلو میٹر تک بہنے کے بعد دریائے کاگیرا، تنزانیہ کے مغرب میں تنزانیہ اور روانڈا کے سرحدی علاقے میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ تنزانیہ اور روانڈا کی مشترکہ سرحد کے طور پر شمال کی سمت 220 کلو میٹر تک بہتا ہے۔ اس سفر کے دوران میں دریا کے مشرق میں تنزانیہ اور مغرب میں روانڈا کے سب سے بڑے نیشنل پارک" کاگیرا نیشنل پارک" کی حدود واقع ہیں۔ اس سفر کے بعد دریائے کاگیرا تنزانیہ، روانڈا اور یوگنڈا کے مشترکہ سرحدی پوائنٹ پر پہنچتا ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد دریائے کاگیرا بجائے شمال کے ایک دم موڑ کاٹتے ہوئے تنزانیہ اور یوگنڈا کی مشترکہ سرحد کے طور پر مشرق کی سمت بہنا شروع کر دیتا ہے۔ 40 کلو میٹر تک دونوں ممالک کے درمیان سرحد بنانے کے بعد دریائے کاگیرا جنوب مغرب کی سمت رخ کرتے ہوئے ایک بار پھر تنزانیہ کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ تنزانیہ کی حدود میں جنوب کی سمت سے آنے والے بے شمار ندی نالے دریائے کاگیرا میں گرتے ہیں۔ یہاں نہ صرف دریا کا بہاؤ تیز ہو جاتا ہے بلکہ اس کا پاٹ بھی چوڑا ہو جاتا ہے۔ مزید 160 کلو میٹر کے سفر کے بعد یہ ایک بار پھر شمال کی طرف رخ کرتے ہوئے یوگنڈا کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ یوگنڈا میں یہ محض 10 کلو میٹر تک بہنے کے بعد اپنا رخ مشرق کی سمت کر لیتا ہے۔ اب دریا کے سامنے افریقا کی سب سے بڑی میٹھے پانی کی جھیل وکٹوریہ موجود ہے۔ یہاں دریائے کاگیرا کوئی ڈیلٹا بنائے بغیر اچانک جھیل وکٹوریہ میں سما جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا کہ جھیل وکٹوریہ تین افریقی ممالک تنزانیہ، یوگنڈا اور کینیا کی حدود میں

پھیلی ہوئی ہے۔ یوگنڈا کے دارالحکومت کمپالا سے 70 کلومیٹر مشرق میں جھیل وکٹوریہ کے کنارے یوگنڈا کا دوسرا بڑا شہر جنجا آباد ہے۔ اسی جنجا شہر کی حدود میں جھیل وکٹوریہ کی شمالی کنارے سے ایک دریا شمال کی جانب بہتا ہوا نکلتا ہے۔ دراصل یہی وہ دریا ہے جو دریائے نیل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس سے پہلے ہم دریائے نیل کے دہانے کا جغرافیائی جائزہ لے چکے ہیں۔ اب ہم جنجا شہر کے قریب جھیل وکٹوریہ سے نکلنے والے دریائے نیل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے شمال میں بحیرہ روم تک جائیں گے۔

دریائے وکٹوریہ نیل۔Victoria Nile جھیل وکٹوریہ سے نکل کر دریائے نیل یوگنڈا کے شمالی پہاڑی علاقے میں بہتا ہوا شمال کی جانب اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ اس علاقے میں دریا ''وکٹوریہ نیل'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یوگنڈا کا یہ علاقہ سطح سمندر سے اوسطاً 2000 میٹر بلند ہے۔ اس علاقے میں چھوٹے بڑے ندی نالوں کے علاوہ دو درجن سے زیادہ میٹھے پانی کی جھیلیں موجود ہیں۔ ان جھیلوں میں جھیل کویوگا اور جھیل البرٹ باقی جھیلوں سے بڑی ہیں۔ خط استوا پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ سارا سال بارشوں کی زد میں رہتا ہے اور قدرتی حسن سے مالا مال ہے جا بجا بے شمار آبشاریں بھی موجود ہیں۔ جنجا شہر سے نکلتے ہی دریائے نیل ایک آبشار Owen Falls کے نام سے ڈھلوان کی طرف کرتا ہے۔ اس آبشار پر 1954ء میں بند بنا کر بجلی پیدا کرنے کا ایک منصوبہ مکمل کیا گیا تھا۔ اس آبشار کے بعد 15 کلومیٹر شمال میں دریائے نیل ایک اور بلند آبشار کی صورت میں نیچے ڈھلوانی سطح پر گرتا ہے۔ یہ آبشار ''بوسودا فالز'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں دریا کی روانی میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کا پاٹ بھی چوڑا ہو جاتا ہے۔ مزید 130 کلومیٹر کے سفر کے بعد دریائے نیل شمال میں جھیل کویوگا میں شامل ہو جاتا ہے۔ جھیل کویوگا سے باہر آتے ہی زمین کی سطح ڈھلوان ہونے لگتی ہے جس کی وجہ سے دریا کی روانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں دریائے نیل 117 کلو میٹر سفر کے بعد اوپر تلے دو بڑی آبشاروں کی صورت میں ایک ہزار سے 500 میٹر کی ڈھلوانی سطح تک آ جاتا ہے۔ پہلی آبشار ''کاروما فالز'' اور دوسری ''گورا گنگ ریپڈ'' کے نام سے موسوم ہے۔ دونوں آبشاروں سے گرنے کے بعد دریائے نیل یوگنڈا کے سب سے بڑے نیشنل پارک ''کابالیگا'' میں داخل ہوتا ہے۔ یہ نیشنل پارک سطح سمندر سے اوسطاً 500 میٹر بلند علاقے میں واقع ہے۔ جو جنگلی بھینسوں اور گینڈوں کے لیے مشہور ہے جبکہ دوسرے جنگلی درندے بھی یہاں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ کابالیگا کی حدود میں دریائے نیل ایک اور بڑی آبشار کی صورت میں چند میٹر مزید نیچے گرتا ہے یہ آبشار ''کابالیگا فالز'' کے نام سے مشہور ہے۔ دریائے نیل 130 کلومیٹر تک کابالیگا کی حدود میں بہنے کے بعد یوگنڈا اور جمہوریہ کانگو (زائر) کی سرحد پر واقع ایک بڑی جھیل البرٹ میں شامل ہو جاتا ہے۔ جھیل البرٹ میں شامل ہونے کی وجہ سے جمہوریہ کانگو کو بھی دریائے نیل کی میزبانی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

دریائے البرٹ نیل۔ دریائے نیل آدھا کلو میٹر چوڑے پاٹ والے دریا کی صورت میں جھیل البرٹ کے انتہائی شمالی کنارے سے باہر نکلتا ہے۔ یہاں دریائے نیل ''البرٹ نیل'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ابھی یوگنڈا ہی کی حدود میں ہے۔ جھیل کے اس کنارے پر ایک چھوٹا سا شہر پیک وچ Pakwach آباد ہے۔ اس شہر کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں سے ایک ریلوے لائن جنوب مشرق میں جھیل کویوگا کے اوپر سے گھوم کر یوگنڈا کے دارالحکومت کمپالا تک جاتی ہے۔ جبکہ ایک اور ریلوے لائن شمال میں یوگنڈا اور جمہوریہ کانگو کی سرحد پر واقع شہر ''آروا'' تک بھی پہنچی ہوئی ہے۔ یہ ریل ٹریک نہ صرف یوگنڈا کی معیشت میں اہم کردار ادا کرتا ہے بلکہ اس سے ملک کی سیاحتی آمدنی میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔ جھیل البرٹ کی حدود سے باہر آکر دریائے نیل شمال میں سوڈان کی جانب اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ جھیل البرٹ سے سوڈانی سرحد تک یہ علاقہ 200 کلو میٹر لمبی اور 170 کلومیٹر چوڑے ایسے علاقے پر مشتمل ہے جہاں برساتی دریاؤں اور ندی نالوں کی بہتات ہے۔ دریائے نیل اس علاقے کے درمیان سے ایک گھاٹی نما علاقے سے بہتا ہوا شمال میں بڑھتا ہے۔ تقریباً 200 کلومیٹر بہنے کے بعد دریائے نیل سوڈان کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔

دریائے نیل ''نمولے'' کے سرحدی شہر کے قریب سے سوڈان کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ سوڈان رقبے کے لحاظ سے براعظم افریقا کا سب سے بڑا اور دنیا کا دسواں بڑا ملک ہے جس کا رقبہ 25 لاکھ 5 ہزار 8 سو مربع کلومیٹر ہے۔ ملک کی کل آبادی 3 کروڑ 55 لاکھ 30 ہزار 3 سو 71 نفوس پر مشتمل ہے۔ دارالحکومت ''خرطوم'' ہے جبکہ شمال

مشرق میں بحیرۂ احمر پر ملک کی اکلوتی بندرگاہ پورٹ سوڈان بھی موجود ہے۔ بندرگاہ کے علاوہ سوڈان کے تمام بڑے شہر بشمول دارالحکومت کے دریائے نیل کے کنارے آباد ہیں۔ ملک کی زراعت کا تمام انحصار دریائے نیل پر ہے۔سوڈان کی حدود میں داخل ہوتے وقت دریائے نیل ''بحرالجبل'' یا کوہستانی دریا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے لکھا جاتا ہے۔پورے سوڈان میں دریائے نیل نیم صحرائی علاقے سے گزرتا ہے۔ یہ نیم صحرائی علاقہ ''صحرائے اعظم'' کا حصہ ہے۔

نمولے سے 145 کلومیٹر شمال میں دریائے نیل ''بیدن ریپڈ'' نامی ایک آبشار پر پہنچتا ہے۔اس آبشار سے گرنے کے بعد دریا کا پاٹ اوسطاً ایک کلومیٹر تک چوڑا ہوجاتا ہے۔مزید 50 کلومیٹر کے سفر کے بعد دریائے نیل سطح سمندر سے اوسطاً 100 میٹر اونچے علاقے میں داخل ہوتا ہے۔سوڈان کی حدود میں دریا کو کم وبیش اسی سطح مرتفع پر سفر کرنا ہوگا۔دریائے نیل اس سطح مرتفع پر 170 کلومیٹر کے سفر کے بعد بور کے قصبے کے قریب تین بڑی اور متعدد متوازی بہنے والی شاخوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔اس علاقے میں متوازی دریاؤں کے بننے سے متعدد چھوٹی چھوٹی جھیلیں بھی وجود میں آگئیں ہیں۔ یہی وہ علاقہ ہے جو اساعد کے نام سے موسوم ہے۔ اساعد دراصل عرب افریقا اور سیاہ فام افریقا کے درمیان حد فاصل ہے۔ اساعد سے ایک سیدھی لکیر مغرب کی سمت میں بحراوقیانوس تک کھینچیں تو اس لکیر کے شمال میں واقع ممالک عرب افریقن اور جنوبی ممالک سیاہ فام افریقن کہلائیں گے۔

بور کے قصبے کے بعد دریائے نیل کی تین بڑی شاخیں 450 کلومیٹر شمال میں بہنے کے بعد مالاکل کے قصبے سے ذرا پہلے پھر اکٹھی ہوجاتی ہیں۔ یہاں دریائے نیل ''نیل ابیض'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔آگے شمال میں نیل ابیض کے نام سے دریائے نیل سوڈان کے دارالحکومت خرطوم تک تقریباً ایک ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرتا ہے۔اس سفر کے دوران میں انجبلین کے قصبے سے ایک ریلوے لائن دریا کے دائیں کنارے کے ساتھ بچھی ہوئی ہے یہ ریلوے لائن 70 کلومیٹر کے سفر کے بعد رابک کے قصبے سے دو حصوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ایک حصہ دریا پار کر کے ملک کے مغربی حصوں میں چلا جاتا ہے اور دوسرا بائیں طرف مڑ کر دریائے نیل کی ایک اور شاخ ''نیل ازرق'' کے کنارے آباد شہر سینار تک جاتا ہے۔

سینار اس علاقے کا بڑا ریلوے جنکشن ہے جہاں ریل ٹریک کئی حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ان میں سے ایک لائن بندرگاہ پورٹ سوڈان اور دارالحکومت خرطوم تک جاتی ہے۔دریائے نیل ابیض پر خرطوم شہر سے 40 کلومیٹر جنوب میں جبل الاولیا کے مقام پر ایک بند موجود ہے۔جس کی تعمیر 1937ء میں مکمل ہوئی تھی۔

خرطوم شہر میں دریائے نیل ابیض میں جنوب سے آنیوالی دریائے نیل کی ایک اور شاخ ''نیل ازرق'' Blue Nile آکر ملتی ہے۔نیل ازرق دراصل سوڈان کے مشرق میں واقع ملک ایتھوپیا کی ایک جھیل ''ٹانا'' Tana سے نکلتا ہے۔جھیل ٹانا ایتھوپیا کی سب سے بڑی جھیل ہے جو ملک کے شمالی پہاڑی علاقے میں سوڈان کی سرحد سے 95 کلومیٹر مشرق میں واقع ہے۔جھیل کی سطح سمندر سے بلندی 1840 کلومیٹر ہے۔ جبکہ جھیل 84 کلومیٹر طویل اور 66 کلومیٹر عریض ہے۔اور اس کی زیادہ سے زیادہ گہرائی 15 میٹر ہے۔ایتھوپیا کے دو بڑے دریا ''ریب'' اور ''گومارا'' جھیل ٹانا میں گرتے ہیں۔ایک اندازے کے مطابق جھیل ٹانا پچھلے 400 سال میں 6 فٹ تک گرگئی ہے۔جھیل کے گرنے سے اس میں کئی جزائر وجود میں آگئے ہیں۔

دریائے نیل کی شاخ نیل ازرق جھیل ٹانا کے جنوب میں واقع شہر ''باہردار'' کے نواح سے نکل کر ایتھوپیا کے جنوبی پہاڑی علاقوں میں ایک لمبا چکر کاٹ کر مغرب میں سوڈان کی سرحد کی طرف سفر شروع کرتا ہے۔تقریباً 825 کلومیٹر سفر کے بعد یہ سوڈان میں داخل ہوجاتا ہے۔سوڈان میں داخل ہونے کے فوراً بعد ''الروسیرس'' کے قصبے سے پہلے ایک 61 کلومیٹر لمبی اور اوسطاً 13 کلومیٹر چوڑی جھیل کی شکل میں ایک بند تعمیر کیا گیا ہے۔اس بند کی تعمیر 1962ء میں مکمل ہوئی تھی۔

اس بند کے فوراً بعد ''الروسیرس'' کے قصبے سے ایک ریلوے لائن دریا کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ چلتی ہے یہ لائن آگے شمال میں سینار کے ریلوے جنکشن تک پہنچی ہوئی ہے۔سینار سے ذرا پہلے دریائے نیل ازرق پر ایک بند موجود ہے۔سینار بند کے نام سے اس بند کی تعمیر 1914ء میں مکمل کی گئی تھی۔سینار کے قصبے کے 80 کلومیٹر شمال میں نیل ازرق میں جنوب سے نیل ازرق ہی کی ایک چھوٹی سی شاخ آکر مرکزی نیل ازرق میں شامل ہوجاتی ہے۔دریائے نیل ازرق بھی اپنے تمام سفر کے دوران میں سوڈان کے مشرق میں نیم صحرائی علاقے سے گزرتا ہے اور آخر کار سوڈان کے علاقے

دریائے نیل کے طاس میں واقع ممالک کے بارے میں بنیادی اعداد و شمار۔

ملک	دارالحکومت	رقبہ (مربع کلومیٹر)	آبادی	زبان	کرنسی	شرح خواندگی	مذہب %
برونڈی	بوجمبورا	27834	63,70,609	رونڈا، فرانسیسی	برونڈی فرانک	48.1	رومن کیتھولک 62، توہم پرست 32
۲۔روانڈا	کے گالی	26338	83,36,995	کنیا رونڈا	روانڈن	67	رومن کیتھولک 48 پروٹسٹنٹ 9 اسلام 9
۳۔تنزانیہ	دارالسلام	945100	3,19,62,769	سواحلی، انگریزی	شلنگ	75.2	عیسائی 45 اسلام 35
۴۔یوگنڈا	کمپالے	241038	2,34,51,687	انگریزی، لوگانڈا	شلنگ	67.3	رومن کیتھولک 30، پروٹسٹنٹ 30، اسلام 7
۵۔عوامی جمہوریہ کانگو	کنساشا	2344885	5,19,87,773	فرانسیسی، لنگالا، سواحلی	نیوزائرے	77.3	رومن کیتھولک 52، پروٹسٹنٹ 20 اسلام 2
۶۔سوڈان	خرطوم	2505800	3,55,30,371	عربی، نوبین	سوڈانی پاؤنڈ	57.1	اسلام 70، توہم پرست 25
۷۔ایتھوپیا	عدیس ابابا	1133380	6,09,67,436	امحریک	بر Birr	38.7	آرتھوڈوکس 40، اسلام 45
۸۔مصر	قاہرہ	997739	6,84,94,584	عربی، انگریزی	مصری پاؤنڈ	55.3	اسلام 94، عیسائی 4

میں کل 600 کلومیٹر کے سفر کے بعد نیل ازرق خرطوم شہر کے بیچوں بیچ نیل ابیض سے مل کر عظیم دریائے نیل کی تشکیل کرتا ہے۔ دراصل خرطوم شہر سے ہی دریا کو اس کے اصل نام ”نیل“ سے پکارا جاتا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نیل ازرق کا دہانہ چونکہ ایتھوپیا میں ہے اس لیے جغرافیائی اعتبار سے نیل ازرق دریائے نیل سے ہٹ کر ایک الگ دریا کی شناخت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دریائے نیل کی مجموعی لمبائی میں نیل ازرق کی لمبائی (1400 کلومیٹر) شامل نہیں کی جاتی۔ جبکہ دوسری طرف وکٹوریہ نیل، البرٹ نیل، بحرالجبل اور نیل ابیض چونکہ ایک ہی دریا کے نام ہیں اس لیے یہ دریائے نیل کا ہی حصہ سمجھے جاتے ہیں۔

خرطوم شہر میں ملنے سے پہلے دونوں بڑے دریا نیل ازرق اور نیل ابیض خرطوم کے جنوب میں 225 کلومیٹر طویل اور 110 کلومیٹر عریض ایک دوآبہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ ”الجزیرہ“ نامی یہ دوآبہ سوڈان کا سب سے زرخیز علاقہ ہے جس میں سوڈان کا سب سے بڑا نہری نظام واقع ہے۔ خرطوم شہر کے بعد دریائے نیل ایک بار پھر ایک نیم صحرائی علاقے ”صحرائے نوبیا“ Nubia میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس صحرائی علاقے میں 1500 کلومیٹر کے طویل سفر کے بعد آخر کار دریائے نیل اپنے آخری پڑاؤ مصر میں داخل ہو جاتا ہے۔ مصری حدود میں داخل ہوتے ہی دریائے نیل افریقا کی سب سے بڑی مصنوعی جھیل کی تشکیل کرتا ہے۔ ”جھیل ناصر“ کے نام سے موسوم یہ جھیل مصر اور سوڈان کے سرحدی علاقے میں ہے۔ جنوبی مصر میں اس مقام پر سب سے پہلے 1902ء میں ایک چھوٹا بند تعمیر کر کے دریا کے پانی کو ذخیرہ کیا گیا تھا۔ 1936ء میں اس بند کی بلندی میں مزید اضافہ کیا گیا۔ جبکہ 1971ء میں مصری حکومت نے سوویت یونین کے اشتراک سے اسی مقام پر ”اسوان ہائی ڈیم“ کی تعمیر مکمل کی۔ ڈیم کی تعمیر کے لیے دریا پر بند کی بلندی بڑھا کر 365 فٹ کردی گئی۔ جبکہ بند کے پشتے کی لمبائی کو 11800 فٹ (3600 میٹر) یا 3.5 کلومیٹر کر دیا گیا۔ بند کی بلندی بڑھنے سے اس علاقے میں جھیل ناصر کی تشکیل ہوئی۔ جھیل 480 کلومیٹر طویل اور 16 کلومیٹر عریض ہے۔ جبکہ جھیل کا

کل رقبہ 5250 مربع کلومیٹر ہے۔ جھیل ناصر کا 83 فیصد حصہ مصر اور 17 فیصد حصہ سوڈان کی حدود میں واقع ہے۔ سوڈان کی حدود میں اسے جھیل نوبیا کہا جاتا ہے۔ جھیل میں پانی کا ذخیرہ 157 مکعب کلومیٹر ہے۔ مکمل ہونے پر اسوان ہائی ڈیم پر کل ایک ارب امریکی ڈالر کی لاگت آئی تھی اس لاگت کا تیسرا حصہ سوویت یونین نے ادا کیا تھا۔ ڈیم کی تعمیر میں بھی 400 روسی انجینئرز نے حصہ لیا تھا۔ جنوبی اور وسطی مصر میں اسوان ڈیم کی تعمیر کے بعد سبز انقلاب برپا ہو گیا ہے۔ آب پاشی سے ہٹ کر اسوان ڈیم سے 2100 میگا واٹ بجلی بھی پیدا کی جاتی ہے۔

مصر کی حدود میں مصر کے تمام شہر بشمول دارالحکومت قاہرہ کے دریائے نیل کے کنارے آباد ہیں۔ مصر کی حدود میں دریائے نیل کے مشرقی کنارے پر جھیل ناصر کے شمال میں اسوان کا شہر آباد ہے۔ 2 لاکھ 20 ہزار آبادی والے اس شہر کی اہمیت میں اسوان ڈیم کی وجہ سے بہت اضافہ ہوا ہے۔ یہ شہر ایک سیاحتی مرکز کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اسی شہر سے دریائے نیل کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ مصر کی مرکزی ریلوے لائن بھی شروع ہو جاتی ہے جو شمال میں قاہرہ سے ہوتی ہوئی بحیرہ روم کی مصری بندرگاہ اسکندریہ تک جاتی ہے۔ اسوان سے 220 کلومیٹر دوری پر دریا کے مشرقی کنارے پر ہی لکسر کا شہر آباد ہے۔ یہ ایک مشہور سیاحتی مرکز ہے۔ لکسر کے مغرب کے دریا کے پار تھیبس کے آثار قدیمہ موجود ہیں۔ لکسر سے 62 کلومیٹر شمال میں قینا کے قصبے کے قریب دریائے نیل ایک لمبا موڑ کاٹ کر مغرب کی سمت میں بہنا شروع کر دیتا ہے۔ 60 کلومیٹر تک مغرب کی سمت میں بہنے کے بعد دریائے نیل نج حمادی کے چھوٹے سے قصبے کے قریب اپنا رخ ایک بار پھر شمال میں کر لیتا ہے۔ نج حمادی کے قریب ہی ریلوے لائن جو ابھی تک دریا کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ تھی اب ایک پل کے ذریعہ دریا پار کر کے مغربی کنارے پر چلی جاتی ہے۔ یہاں سے قاہرہ تک کے 570 کلومیٹر کے سفر کے دوران مصر کے چار بڑے شہر ساج، اسیت، ال مینیا اور بنی سوف دریائے نیل کے ساتھ ساتھ مغربی کنارے پر آباد ہیں۔

حلوان کے قریب سے دریائے نیل مصر کے دارالحکومت قاہرہ کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ 99 لاکھ (2000ء) آبادی والا شہر قاہرہ مصر کا سب سے بڑا اور لاگوس (نائجیریا) کے بعد افریقا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ قاہرہ کے نواح میں دریائے نیل کے مغربی کنارے پر غزا کا تاریخی علاقہ بھی موجود ہے جہاں مصر کے بیشتر بڑے اہرام موجود ہیں۔ قاہرہ کے جنوب میں حلوان کے قریب دریا کے مغربی کنارے پر ممفس کے تاریخی کھنڈرات بھی موجود ہیں۔ ممفس کو مصر کا قدیم دارالحکومت ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق یہ تاریخی شہر 2920 قبل مسیح میں تعمیر کیا گیا تھا۔ قاہرہ سے 60 کلومیٹر جنوب میں دریائے نیل کے مغرب میں مصر کی دوسری بڑی جھیل ”قارون“ واقع ہے۔ 40 کلومیٹر لمبی اور 10 کلومیٹر چوڑی اس جھیل میں دریائے نیل سے نکلنے والے چھوٹے بڑے ندی نالے گرتے ہیں۔

قاہرہ کے فوراً بعد دریائے نیل کا ڈیلٹائی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ دریائے نیل کا یہ ڈیلٹا دنیا کے چند بڑے ڈیلٹاؤں میں شمار ہوتا ہے۔ قارئین کو بتاتے چلیں کہ دریا کا ڈیلٹا وہ علاقہ ہوتا ہے جہاں دریا سمندر میں گرنے سے پہلے کئی درجن چھوٹے چھوٹے دریاؤں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اسے دریا کا منہ بھی کہتے ہیں۔ دریائے نیل کا ڈیلٹا 250 کلومیٹر چوڑا اور 150 کلومیٹر لمبا ہے۔ ڈیلٹا کے مغربی کنارے پر اسکندریہ کا تاریخی شہر اور بندرگاہ واقع ہے۔ 37 لاکھ آبادی کا اسکندریہ شہر مصر کا دوسرا بڑا اور افریقا کا پانچواں بڑا شہر ہے۔ اسکندریہ کو مشہور فاتح اور مقدونیہ کے بادشاہ اسکندر اعظم نے 332 قبل مسیح میں دریافت کیا تھا۔ اسکندر اس شہر کو علاقے کی بہترین بندرگاہ کے طور پر تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے یہاں ایک سات منزلہ لائٹ ہاؤس بھی تعمیر کروایا تھا جو اپنے عہد کی ایک شاندار تعمیر تھی۔ دریائے نیل کے ڈیلٹا میں آباد دیگر اہم شہروں میں دامن ہر، کفر الشیخ، المنصورہ اور تانتا قابل ذکر ہیں۔ دریائے نیل کا ڈیلٹا تین بڑی جھیلوں کی تشکیل بھی کرتا ہے۔ ان میں ڈیلٹا کے مغربی حصے میں جھیل بورولس مشرقی حصے میں جھیل منزلہ اور مشرقی حصے میں اسکندریہ کے قریب جھیل ادکو واقع ہیں۔ ان جھیلوں میں جھیل منزلہ کے مشرقی کنارے پر نہر سویز کی مشہور بندرگاہ پورٹ سعید واقع ہے۔

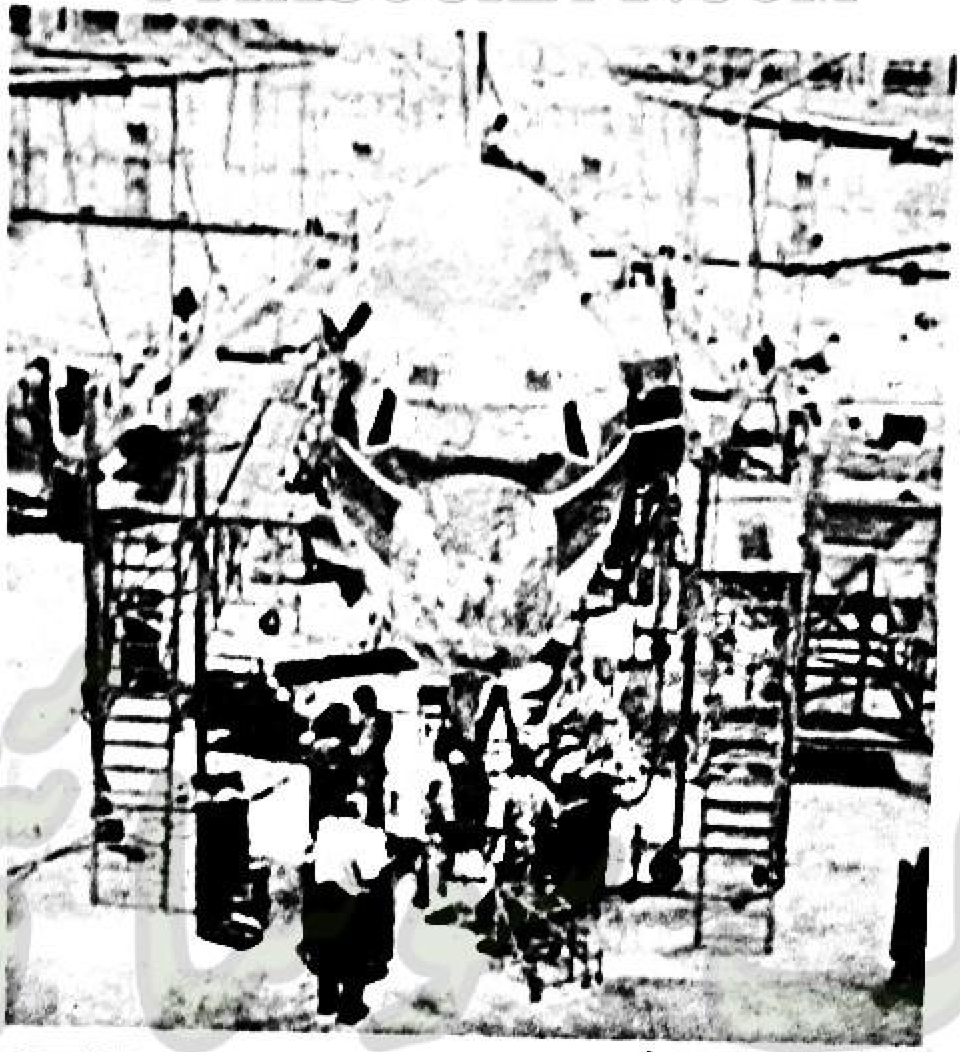
دریائے نیل کا ڈیلٹا دنیا کے زرخیز ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس علاقے کی سب سے بڑی فصل کپاس کی ہوتی ہے یاد رہے کہ نیل کے ڈیلٹا کی کپاس دنیا بھر میں مشہور ہے۔ کپاس کے علاوہ اس علاقے میں دنیا کی بہترین کھجوریں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ دریائے نیل کا یہ زرخیز ترین ڈیلٹا دریا کا اختتام

ثابت ہوتا ہے اور بالآخر دریا افریقا کے آٹھ ممالک کو سیراب کرنے کے بعد مصر کے شمالی علاقے میں ایک وسیع ڈیلٹا کی تشکیل کرتا ہوا بحیرہ روم میں سما جاتا ہے۔

☆☆☆

دریائے نیل اپنے اصل نام سے یوگنڈا کی حدود میں جھیل وکٹوریہ سے نکلتا ہے۔ جھیل وکٹوریہ شمال مشرقی افریقا میں تین ممالک یوگنڈا، کینیا اور تنزانیہ کی مشترکہ سرحد پر واقع ہے۔ جھیل کا کل رقبہ 69490 مربع کلومیٹر ہے۔ جھیل کے کل رقبے کا 60 فیصد تنزانیہ 40 فیصد یوگنڈا اور باقی 10 فیصد حصہ کینیا کی حدود میں ہے۔ جھیل کے ساحلوں کی کل لمبائی 3400 کلومیٹر ہے۔ جھیل میں تازہ پانی کا ذخیرہ 2750 مکعب کلومیٹر ہے۔ جھیل کی زیادہ سے زیادہ گہرائی 84 میٹر جبکہ اوسطاً گہرائی 40 میٹر ہے۔ جھیل میں تین ہزار سے زائد جزائر بھی موجود ہیں جن میں سے اکثر غیر آباد ہیں۔ تاریخ میں جھیل وکٹوریہ کے بارے میں سب سے پہلی معلومات عرب تاجروں کے ذریعے ملتی ہیں جو سونے، ہاتھی دانت اور دیگر اشیاء کی تجارت کے لیے افریقا کے اندرونی علاقوں میں جایا کرتے تھے۔ معروف جغرافیہ دان ''ادریسی'' نے 1160 عیسوی میں دنیا کا جو نقشہ ترتیب دیا ہے اس میں جھیل وکٹوریہ کو دکھایا گیا ہے اور اسے دریائے نیل کا منبع بھی قرار دیا گیا ہے۔ یورپین اقوام نے پہلی مرتبہ جھیل کا نظارہ 1858ء میں کیا جب ایک برطانوی مہم جو ''جون ہنگ اسپیک'' جھیل کے جنوبی ساحلوں تک پہنچا۔ انہوں نے ہی جھیل کو برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ کے نام سے منسوب کیا۔ جھیل وکٹوریہ یوگنڈا، تنزانیہ اور کینیا کے درمیان بحری سفر میں بھی اہم حیثیت رکھتی ہے۔ 21 مئی 1996ء کو جھیل میں ایک بحری جہاز کے ڈوبنے سے ایک ہزار سے زیادہ افراد ہلاک ہو گئے تھے یہ افریقا کی تاریخ کے بدترین بحری حادثوں میں سے ایک ہے۔

دریائے نیل شمال مشرقی افریقا کے آٹھ ممالک میں بہتا ہوا مصر کے شمال میں بحیرہ روم میں جا ملتا ہے۔ یہ آٹھ ممالک برونڈی، روانڈا، تنزانیہ، یوگنڈا، عوامی جمہوریہ کانگو (زائر) سوڈان، ایتھوپیا اور مصر ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا کہ اس علاقے میں جھیل وکٹوریہ کو سب سے پہلے برطانوی مہم جو جون ہیننگ اسپیک نے دریافت کیا۔ ایک اور برطانوی مہم جو سیمویل وائٹ بیکر نے 1864ء میں جھیل البرٹ دریافت کی۔ 1868ء سے 1871ء کے درمیان ایک جرمن مہم جو جارج آگسٹ شوین فورتھ نے جنوبی سوڈان کا بحرالغزال نامی نیم صحرائی علاقہ دریافت کیا۔ امریکی مہم جو بھی کسی سے پیچھے نہ رہے اور 1875ء میں ایک امریکی مہم جو ہنری مارٹن سٹینلے نے جھیل البرٹ اور 1889ء میں یوگنڈا اور عوامی جمہوریہ کانگو کی سرحد پر واقع پہاڑی سلسلہ ''کوہ رون زوری'' کو دریافت کیا۔ 19ویں صدی کے آخر تک برطانیہ نے دریائے نیل کے طاس میں واقع ممالک مصر، سوڈان، یوگنڈا اور کینیا پر قبضہ کرلیا تھا۔ اسی دوران میں جرمنی نے تنزانیہ، روانڈا اور برونڈی جبکہ بیلجیئم نے عوامی جمہوریہ کانگو پر اپنا تسلط جمالیا۔ جنگ عظیم اول کے بعد جرمنی اور برطانیہ نے ایک معاہدہ کے تحت تنزانیہ کو آپس میں تقسیم کرلیا۔ یہاں یہ بھی بتاتے چلیں کہ دریائے نیل کے علاقے میں ایتھوپیا ایک ایسا ملک ہے جو پچھلے دو ہزار سال سے مسلسل آزاد و خود مختار ملک کے طور پر موجود ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایتھوپیا پر ماضی میں کبھی کسی ملک نے نہ تو قبضہ کیا اور نہ اسے اپنی نوآبادی بنایا۔ دریائے نیل کے ممالک میں سب سے پہلے مصر نے 28 فروری 1922ء کو برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ مصر کی آزادی کے بعد برطانیہ نے مصر کے ساتھ مل کر سوڈان پر اپنا قبضہ مستحکم کیا۔ یکم جنوری 1956ء کو سوڈان نے مصر اور برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ اس کے بعد 1960ء کے عشرے میں دریائے نیل کے طاس پر آباد تمام ممالک نے یکے بعد دیگرے یورپی ممالک سے آزادی حاصل کی۔ ان میں عوامی جمہوریہ کانگو نے 30 جون 1960ء کو بیلجیئم، برونڈی اور روانڈا نے ایک ہی دن یعنی یکم جولائی 1962ء کو اقوام متحدہ کے تحت بیلجیئن ایڈمنسٹریشن سے اور یوگنڈا نے 9 اکتوبر 1962ء کو برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ تنزانیہ کی آزادی کا قصہ کچھ یوں ہے کہ 9 دسمبر 1961ء کو ٹانگانیکا نامی ملک نے یو این او کے تحت برطانوی ایڈمنسٹریشن سے آزادی حاصل کی۔ جبکہ تنزانیہ کی سمندری حدود میں واقع جزیرے زین زیبار نے 19 دسمبر 1963ء کو برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ 26 اپریل 1964ء کو زین زیبار اور ٹانگانیکا نے ''یونائیٹڈ ری پبلک آف ٹانگانیکا اینڈ زین زیبار'' کے نام سے ایک فیڈریشن کی تشکیل کی۔ تاہم اسی سال 29 اکتوبر 1964ء کو فیڈریشن کا خاتمہ ہو گیا جب دونوں ممالک پر مشتمل ایک آزاد ملک تنزانیہ کا قیام عمل میں آیا۔



الوداع

حسن رزاقی

اپنی قومی ایئرلائن کا اپنا مزاج ہے۔ اس ایئرلائن میں برسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شب وروز کی لفظی تصویر کہ وہ کس طرح اور کن کن مراحل سے گزرا۔ کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

باذوق قارئین کے لیے توشۂ خاص

میری دو ہفتے کی چھٹیاں ابھی باقی تھیں مگر میں کام کی زیادتی کی بنا پر چھٹیوں پر نہ جاسکا۔ اب میں اپنی یہ دو ہفتے کی چھٹیاں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ چھٹی کی درخواست اپنے باس کرٹ کے پاس لے گیا تو اس نے پہلے اپنی عینک اتار کر اپنے مخصوص انداز میں اسے دانتوں کے بیچ دبایا پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر مجھ سے مخاطب ہوا۔

''خیریت۔'' اس کی آنکھوں میں شوخی تھی۔ ''کیا اپنا دل لندن میں چھوڑ آئے ہو؟''

میں کل رات ہی کمپنی کا کام مکمل کرنے کے بعد لندن سے واپس آیا تھا۔ لیکن چھٹی کی درخواست کا میرے لندن میں کچھ چھوڑنے یا نہ چھوڑنے سے کیا تعلق۔

"میں اپنا دل لندن میں کیوں چھوڑ آتا؟" میں نے پوچھا۔ پھر اپنا جملہ جاری رکھا۔ "ویسے بھی میں کوئی ٹین ایجر نہیں ہوں کہ ہر جگہ دل پھینکتا پھروں۔ پچھلے سال میری پینتیسویں سالگرہ تھی۔" میں نے کرٹ کو مطلع کیا۔

"پہلی چیز...... کرٹ نے اپنا انگوٹھا ٹھینگے کی طرح میری طرف بڑھایا۔ کرٹ کا گنتی گننے کا یہی انداز تھا۔ نمبر ایک انگوٹھا، نمبر دو انگشتِ شہادت، نمبر تین بیچ کی انگلی۔ اس کے بعد کوئی بھی انگلی یا انگلیاں۔ دل گھمانے کی عمر تین سال سے شروع ہوتی ہے اور ننانوے سال تک جاری رہتی ہے۔ میں اب بھی اکثر اپنا دل گھما دیتا ہوں مگر جب روتھ (کرٹ کی بیوی کا نام) کے پاس واپس آتا ہوں تو میرا دل اس کے سیف میں محفوظ ہوتا ہے۔ تم شادی کیوں نہیں کرلیتے؟"

اگر میں نے اپنے ہر کرم فرما کی فرمائش پر صرف ایک ایک ہی شادی کرلی ہوتی تو دنیا کی کسی نہ کسی سلطنت کا بادشاہ بننے کی پہلی شرط ضرور پوری کر چکا ہوتا۔

اب انگشتِ شہادت کی باری تھی۔ "دوسری چیز تم پاکستانی ہو مگر تم میں جرمنوں کی ایک اچھی عادت ہے۔" کرٹ جرمن نژاد تھا۔

میں اس انکشاف کے لیے بے چین تھا کہ میں کیسے پاکستان اور جرمنی کو ایک جان دو قالب بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

ارشاد ہوا۔ "تم عام طور سے دفتر کے کام کو ذاتی مصروفیات پر ترجیح دیتے ہو۔"

اب بیچ کی انگلی کی باری تھی۔ "تیسری بات۔ جو پہلی اور دوسری بات سے نکلتی ہے۔" جادوگر کی ٹوپی سے خرگوش نکلنے والا تھا۔ "آج کل کام کی زیادتی ہے اور تم چھٹی پر جانا چاہتے ہو۔ وہ بھی دو ہفتے کی چھٹی ایک ساتھ" خرگوش کے کان نمودار ہو چکے تھے۔ "اس سارے تناظر سے صرف ایک ہی نتیجہ نکل سکتا ہے وہ یہ کہ تم کام کی طرف سے بے پروا ہو چکے ہو اور اس کی صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے تمہاری نظر کہیں لڑ گئی ہے۔" فیصلہ ہو چکا تھا۔ اپیل کی گنجائش نہ تھی۔ صرف سزا سننا باقی تھا۔

"کام بہت ہے میں تمہیں صرف تین دن کی چھٹی دے سکتا ہوں۔ اس کو ویک اینڈ کے ساتھ ملا کر کل پانچ دن کی چھٹی بنتی ہے۔" "بالی گئے ہو؟ اگر نہیں تو وہاں چلے جاؤ۔ بہت پُرسکون جگہ ہے۔ عشق کے مارے خودکشی کرنے وہیں جاتے ہیں...... ہاہاہا......"

میرا اس ہاہاہا میں شامل ہونے کا کوئی موڈ نہ تھا۔ میں چھٹی کے فارم پر دستخط کروا کر کرٹ کے دفتر سے باہر نکل آیا۔ پندرہ دن کاٹ کر سرخ روشنائی سے تین کر دیے گئے تھے۔

میں خودکشی کرنے بالی جا رہا تھا۔ براستہ بینکاک لیکن آج کا بینکاک صرف ائرپورٹ تک محدود تھا۔ دو گھنٹے بعد بالی کی پرواز پکڑنا تھی۔

انڈونیشیا کے تینتیس صوبوں میں سے ایک صوبہ جو ایک بڑے جزیرے بالی اور چند چھوٹے جزیروں پر مشتمل ہے۔ اس کے مغرب میں جاوا اور مشرق میں لومبوک ہے۔ بالی کا دارالخلافہ ڈینپسار ہے جو جنوب میں واقع ہے۔ آج میری منزل مقصود ڈینپسار شہر تھا۔ جہاز ڈینپسار کے ہوائی اڈے پر اتر چکا تھا۔ جہاز کے دونوں دروازے کھولے جا چکے تھے۔ مسافر جہاز کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ ائرہوسٹس مسافروں کو نمستے کہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر رخصت کر رہی تھی۔ جہاز کے تقریباً سارے ہی مسافر یورپین تھے سوائے میرے اور پانچ چھ تھائی باشندوں کے۔ زیادہ تر کے شانوں پر کیمرے اور دوربینیں لٹک رہی تھیں۔ مردوں کی اکثریت برموڈا شارٹس اور پھول دار شرٹس میں ملبوس تھی سب پر ہالی ڈے موڈ طاری تھا۔

ہوائی اڈے کی عمارت جزیرے سے مطابقت رکھتی تھی یعنی بہت ہی چھوٹی اور معمولی سی۔ صرف بنیادی سہولتیں میسر تھیں۔ داخلے کے دروازے کے دونوں طرف بالی لڑکیاں ہاتھوں میں پھولوں کے ہار اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے آنے والے مسافروں کا استقبال کر رہی تھیں۔ پھولوں کا ایک ہار میرے گلے میں بھی ڈالا گیا۔ بالی کے لوگ عام طور پر ملنسار اور مہمان نواز ہوتے ہیں۔

امیگریشن سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو شہر جانے کے لیے ویگنیں موجود تھیں۔ ڈینپسار میں کئی بیچ ہیں لیکن کوٹا بیچ سیاحوں کا مرکز تھا۔ ویگنز کوٹا بیچ جا رہی تھیں۔

زیادہ تر سیاح کوٹا بیچ میں ہی ٹھہرتے تھے کہ وہاں پر سیاحوں کے لیے وہ سہولتیں تھیں جو دوسری جگہوں پر نہ تھیں۔ یہ آج سے تیس پینتیس سال پہلے کی بات ہے۔ آج کا بالی پہلے کے مقابلے میں کتنا بدل چکا ہے اس کا اندازہ لگایا

جاسکتا ہے۔ اگرچہ میں 2003ء میں بالی گیا تو میرے ساتھ جو گائیڈ تھا اس کو اپنی تہذیب اور ثقافت کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ الٹی گنگا بہہ رہی تھی۔ میں اسے اس کی تہذیب کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا رہا تھا کہ اب ہم جس جگہ کھڑے ہیں پہلے یہاں کیا تھا اور کہاں کیا تبدیلی ہوئی ہے اس کے باوجود اس نے مجھ سے اپنی اجرت وصول کرلی۔

کوٹا بیچ میں رہائش دو طرح کی تھی۔ ایک تو عام ہوٹل تھے۔ دوسرے ذاتی گھروں میں ملنے والے کمرے۔ میں ہوٹل میں چلا گیا جس کا یومیہ کرایہ آٹھ امریکی ڈالر تھا۔ ہوٹل کیا تھا آرمی کی بیرکس لگتا تھا۔ ایک قطار میں آٹھ دس کمرے اس کے سامنے چھت دار ورانڈا پھر کھلا صحن۔ میرے ساتھ ویگن میں ورلڈ ائرویز (یہ ائرلائن اب دلوالیہ ہوچکی ہے) کی ایک ائرہوسٹس بھی تھیں۔ وہ بھی اسی ہوٹل میں پناہ گزیں ہونے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ نام مارگریٹ تھا، ان کا خیال تھا کہ چونکہ ہم دونوں ائرلائن میں کام کرتے ہیں لہٰذا ہم ایک طرح سے رشتے دار ہیں یہ رشتے داری مزید مضبوط کی جاسکتی ہے۔ میں ان کا ہم خیال نہ تھا۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے۔

ہوٹل بیچ کے کنارے پر واقع تھا۔ میں سامان کمرے میں رکھ کر بیچ کی طرف نکل گیا۔ تھوڑی دور چلا تھا کہ کسی نے میرا نام پکارا۔ یہ مارگریٹ تھی۔ ایک عورت سے تیل کی مالش کروا رہی تھی۔ اس کے پاس نہ جانا بداخلاقی ہوتی میں چلا گیا۔ مالش کرنے والی عورت مارگریٹ کے ہاتھ پیر کی مالش کرچکی تھی۔ اب بدن کی باقی ماندہ حصوں کی باری تھی۔ بالی کے بیچ پر عام طور سے خواتین بلاؤز کا تکلف نہیں کرتیں۔ مالش کرنے کا سین ایک نیا موڑ اختیار کرچکا تھا۔ میرے لیے وہاں مزید ٹھہرنا غیر مناسب تھا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ مارگریٹ نے مجھے روکتے ہوئے پکارا۔ ’’تم بھی ناریل کے تیل کی مالش کروالو۔ بالی کی دھوپ بہت تیز ہوتی ہے، جلد کو کھا جائے گی۔ تم یہاں پہلی دفعہ آئے ہو تم کو یہاں کی دھوپ کے مضر اثرات کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔‘‘

میں اس کی بات سنی ان سنی کرکے آگے بڑھ چکا تھا۔

سو دو سو گز چلا ہوں گا کہ آواز آئی۔ ’’ہیلو اسٹرینجر‘‘ دیکھا تو ایک صاحب ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ میں ان کے پاس چلا گیا۔

’’اناس کھاؤ گے؟‘‘ انہوں نے سوال کیا۔

ان کے پاس ایک اناس بیچنے والی لڑکی کھڑی تھی جس سے انہوں نے دو بڑے اناس خرید کر ان کو کٹوا کر ایک پلیٹ میں رکھ چھوڑا تھا۔ میں نے دعوت قبول کرلی۔ اناس مجھے پسند ہے۔ بالی میں اناس بہت بڑی تعداد میں اگتا ہے۔

کہنے لگے۔ ’’میں جولی کا انتظار کررہا ہوں۔ پھر ایک دم خیال آیا کہ مجھے کیا معلوم کہ جولی کون ہے۔ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔‘‘ انہوں نے اعتراف کیا۔ ’’تم کو کیا معلوم کہ جولی کون ہے۔ جولی میری بیوی ہے۔ کمرے میں گئی ہے ابھی آتی ہوگی۔‘‘

کمرے سے ان کی مراد وہ کمرا تھا جو انہوں نے کسی کے گھر میں کرائے پر لے رکھا تھا۔ ’’میں اور جولی ہر سال بالی آتے ہیں۔ ارے ہاں میرا نام جان ہے۔‘‘ اتنے میں جولی آگئی۔

’’جولی یہ ہمارے نئے دوست ہیں۔ دوست کیا نام ہے تمہارا۔‘‘

’’جی حسن۔‘‘

’’جولی یہ حسن ہیں۔‘‘ جولی نے ہاتھ ملا کر خوش آمدید کہا۔ ’’ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں اور جولی یہاں ہر سال آتے ہیں۔ ہم آسٹریلین ہیں۔ یہاں سے ہم باٹک (انڈونیشی کپڑا) لے کر آسٹریلیا میں فروخت کردیتے ہیں۔ ہمارا سارا خرچا نکالنے کے بعد منافع بھی ہوتا ہے۔‘‘ پھر مجھے مشورہ دیا کہ ’’تم بھی یہ دھندا شروع کردو۔ ٹکٹ کے پیسے نکل آئیں گے۔‘‘

بالی میں بیچ پر زیادہ کپڑوں کا تکلف لوگ معیوب سمجھتے ہیں۔ جولی بھی اس کو معیوب سمجھتی تھی۔ اس نے تمام فالتو کپڑوں سے فراغت حاصل کرلی، جب وہ فارغ البوشاک ہوچکی تو جان نے مجھ سے اپنی بیگم کے حسن کی داد طلب کی۔

’’جولی کا بدن کتنا خوب صورت ہے نا۔‘‘

میں نے جواب دیا۔ ’’بے شک۔‘‘ جولی یقیناً سیمیں تن تھی لیکن تہذیب اور ماحول کا فرق تھا۔ اگر ہمارے یہاں کوئی کسی کی بیوی کے بے پوشاک بدن کی تعریف کردے تو خون خرابہ ہوجائے لوگ پھانسی چڑھ جائیں۔

جان نے مجھے بالی کے متعلق کارآمد معلومات دیں۔

’’ڈینپسار کے آس پاس چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔‘‘ جان نے بتایا۔ ’’ان میں سے ہر گاؤں میں مختلف قسم کی گھریلو صنعتیں ہیں۔ ان میں دو تین قابل ذکر ہیں۔ ایک جگہ آرٹسٹ ہیں جو پینٹنگ بناتے ہیں۔ دوسری جگہ ابونی (آبنوس) کی لکڑی تراش کر خوب صورت مجسمے بناتے ہیں۔

ایک اور جگہ چاندی کے بہت ہی باریک کام کیے ہوئے زیورات بنتے ہیں اور ہاں سب سے اہم چیز کھانے کے لیے تمہارے ہوٹل سے تھوڑی دور پر جھونپڑی نما ریسٹورنٹ ہے جہاں تمہیں بہترین مچھلی کھانے کو ملے گی اور بیئر بھی۔'' بیئر یا شراب کے بغیر سفید فام لوگوں کا کھانا نامکمل ہوتا ہے۔

رات کو میں کھانے کے لیے ایسی ہی ایک جھونپڑی میں داخل ہوا۔ انواع و اقسام کی مچھلیاں موجود تھیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ کون سی مچھلی کھانی چاہیے۔ ہوٹل والے نے مدد کی۔ میں مچھلی کھا رہا تھا کہ ایک اطالوی جوڑا سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

''ساری میزیں بھری ہیں کیا ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں؟''

میں نے جواب دیا۔ ''ضرور کیوں نہیں۔'' میاں کا نام الفریڈو بیوی کا نام بوتی گولیا تو تھا۔

مچھلی مزے کی تھی۔ ہوٹل واپس آیا تو تھکن کے شدید احساس نے منہ زوری دکھائی۔ بستر پر لیٹتے ہی نیند آگئی۔

صبح جلدی آنکھ کھل گئی۔ بستر سے اتر کر جیسے ہی کھڑا ہوا۔ دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ مارگریٹ کے الفاظ میرے کانوں میں گونجے ''تم بھی مالش کروالو بالی کی دھوپ بہت تیز ہوتی ہے۔'' اب مجھے اس کے مشورے کی قدر معلوم ہوئی۔

اپنے ہاتھوں سے کافی دیر تک پیروں کی مالش کی۔ کوئی گھنٹے بھر بعد پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوا۔ بیچ پر جا کر مارگریٹ کے مشورہ پر عمل کیا۔ سکون ملا۔ واپس آکر ناشتا کیا۔

جان نے بتایا تھا کہ اگر گاؤں گاؤں گھومنا ہے تو اس کے لیے بہترین سواری موٹر سائیکل ہے یا تو تم خود چلا لو یا ڈرائیور سمیت کرائے پر لے لو۔ مجھے راستے معلوم نہ تھے۔ میں نے ڈرائیور سمیت موٹر سائیکل کرائے پر لے لی۔

واپسی چار بجے ہوئی۔ ورانڈے میں مارگریٹ کھڑی تھی اپنے سامان سمیت۔ ائرپورٹ جانے کے لیے تیار۔ میں نے اس کے مشورے پر نہ عمل کرنے کی قیمت ادا کرنے کا بتایا۔ کہنے لگی۔ ''میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا۔ اگر تم بھی میرے ساتھ مالش کروا لیتے تو اتنی پریشانی نہ اٹھاتے مگر تم مجھ سے دور بھاگ رہے تھے۔''

''میں اس لیے دور بھاگ رہا تھا کہ تمہاری مالش کا سین خاصا دردناک تھا۔ لگتا تھا آٹا گوندھا جا رہا ہے۔''

''بدتمیز۔'' مارگریٹ نے آدھا کھایا ہوا امرود مجھے پھینک کر مارا۔

''تم کو اور پریکٹس کی ضرورت ہے تمہارا نشانہ خطا گیا۔ خیریت سے اپنے گھر پہنچو۔'' میں نے امرود پکڑتے ہوئے کہا۔

''شکریہ...... میں نے تمہاری بدتمیزی معاف کردی، لڑکیوں سے بات کرنے کا سلیقہ سیکھو بائی بائی۔''

''مشورے کا شکریہ۔ بائی بائی۔''

اگلی صبح میں مالش کروانے پھر بیچ پر چلا گیا۔ مالش کروا کر میں وہیں ریت پر بیٹھ گیا۔

''ہیلو حسن۔'' یہ الفریڈو کی آواز تھی۔ بوتی اور وہ میرے برابر چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔ پھر بوتی نے کپڑوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو جولی نے کیا تھا لیکن خیریت گزری الفریڈو نے بوتی کے کیمیں تن ہونے کی تصدیق نہ چاہی۔

یہ جوڑا نیپلز (اٹلی) میں رہتا تھا۔ ''ہم دونوں سال بھر محنت کرتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کی طرح لغویات پر پیسے نہیں پھینکتے۔ ہم اپنے پیسے جمع کرتے ہیں اور سالانہ چھٹیوں میں دنیا کے کسی اچھے سے گوشے کی سیر کو نکل جاتے ہیں۔'' الفریڈو نے بتایا۔ پھر پوچھا۔ ''تم موریشس گئے ہو؟''

میں نے نفی میں جواب دیا۔

''ہم پچھلے سال چھٹیوں میں وہاں گئے تھے۔ حسین مناظر سے بھرپور جگہ ہے۔ اگر موقع ملے تو ضرور جانا۔'' بوتی نے کہا پھر مجھ سے پوچھا۔ ''تم کو معلوم ہے میں کیا کرتی ہوں؟''

''بی بی جب تک آپ نہیں بتائیں گی مجھے کیسے معلوم ہوگا۔'' میں نے عرض کیا۔

''میں نیپلز میں سڑکیں کوٹتی ہوں۔'' پھر اس نے فخر سے کہا۔ ''میں واحد لڑکی ہوں اپنی ٹیم میں۔ باقی سب مرد ہیں۔'' پھر اپنے ہاتھ دکھائے۔ ''میرے ہاتھ دوسری لڑکیوں کی طرح نرم نہیں ہیں۔ ان سے محنت کی خوشبو آتی ہے۔'' پھر اپنی بانہوں کی طرف میری توجہ دلوائی۔ ''تم نے میرے مسلز دیکھے۔ چھو کر دیکھو شرماؤ نہیں۔''

میں نے اس کے بازو چھو کر دیکھے۔ اس کے بازو میرے بازوؤں سے زیادہ سخت تھے۔ میں نے ان کی سختی کی تعریف کی اور دل ہی دل میں اس کو سیلوٹ کیا کہ اس لڑکی کے اندر جفاکشی اور محنت کا جذبہ کتنا راسخ ہے۔ مجھے پاکستان کے وہ ہٹے کٹے فقیر یاد آگئے جو دو ٹکے کے لیے عزتِ نفس کا

سودا کرلیتے ہیں۔ الفریڈو اور بوتی رات کے کھانے پر میرے مہمان تھے۔

اگلے روز صبح میں بیچ پر جان اور جولی سے رخصت ہونے گیا کہ آج میری واپسی تھی۔ جان راجا اندر بنے بیٹھے تھے۔ جولی کے علاوہ چھ سات لڑکیاں اور بھی تھیں جو آسٹریلیا کی کسی یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں۔ چھٹیاں منانے بالی آئی تھیں۔ ان کا کپڑوں کا فیشن بھی وہی تھا جو جولی کا تھا۔ جان کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

جدہ واپسی کا سفر خیریت سے گزرا۔

بالی ایسی خاموش اور پرسکون جگہ تھی۔ جہاں وقت تھم جاتا ہے یا بہت آہستہ آہستہ گزرتا ہے۔ یہ وہ پرسکون جنت تھی جہاں بار بار جایا جاسکتا تھا۔

میں 2003ء میں آخری دفعہ بالی گیا تھا۔ اس دفعہ میں تقریباً پندرہ برس بعد بالی گیا تھا۔ بالی بدل چکا تھا۔ مکمل طور پر۔

میں نے بالی کے اپنے پہلے سفر میں جس جھونپڑی نما ہوٹل میں الفریڈو اور بوتی گولیاتی کے ساتھ مچھلی کھائی تھی اس کا نام ونشان مٹ چکا تھا۔

''بگ میک میل'' میں نے کاؤنٹر پر کھانے کا آرڈر دیا۔ ٹرے میں اپنا کھانا لے کر میں ایک خالی میز پر آکر بیٹھ گیا جس کے سامنے شیشے کی دیوار تھی۔ باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں اس وقت بالی کے مکڈونلڈ میں بیٹھا تھا۔ ماضی کے بالی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

میرے سامنے وہ منظر تھا جب میں اپنے گائیڈ کے ساتھ اس کی موٹر سائیکل پر ڈینپسار کے آس پاس کے گاؤں گھوم رہا تھا۔ پہلے وہ مجھے اس گاؤں میں لے گیا جہاں آبنوس کی لکڑی تراش کر مختلف چیزیں بناتے تھے پھر اس گاؤں میں جہاں چاندی کے انتہائی باریک کام کے زیور بنائے جاتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ ہم دونوں کھانا کھانے ایک کھوکھے کے ہوٹل میں بیٹھ گئے۔

مچھلی ذائقہ دار تھی۔ اس نے دو کام کیے۔ ایک تو پیٹ کی آگ بجھائی۔ دوسرے میرے اور میرے گائیڈ جوجو کے درمیان دوستانہ ماحول پیدا کردیا۔

''تم ہندوستانی ہو؟'' جوجو نے پوچھا۔

''نہیں میں پاکستانی ہوں۔''

''میں ہندو ہوں۔'' جوجو نے بتایا۔ ''بالی کی نوّے فیصد آبادی ہندو ہے۔ جکارتا چاہتا ہے کہ پورا انڈونیشیا

جہالیت

اصطلاح میں اس سے مراد زمانہ قبلِ اسلام کے عربوں کی حالت۔ دعوتِ اسلام سے پہلے اور بالخصوص قبل از ہجرتِ نبوی کا زمانہ مراد ہے کیونکہ اس زمانے میں عرب میں مشرکین عرب کا اجتماع اور سیاسی قانون جاری وساری تھا جو قانون الٰہی کے تابع نہ تھا۔ قرآن مجید میں یہ لفظ چار مختلف جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔ ''اور ایک دوسرا گروہ جس کے لیے ساری اہمیت بس اپنے مفاد ہی کی تھی اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلاف حق تھا۔ (3:154)'' تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے''۔ (5:50) ''اور اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔ (33:34) جاہلیت کا لفظ اسلام کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلام کا طریقہ سراسر علم ہے کیونکہ اس کی طرف خدا نے رہنمائی کی ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے۔ اس کے برعکس بقیہ جو اسلام سے مختلف ہے جاہلیت کا طریقہ ہے۔

مرسلہ: دانش۔ لاہور

مسلمان ہو لیکن مجھے ہندو رہنا پسند ہے۔ ہمارا اپنا طرزِ زندگی ہے جو مسلمانوں سے الگ ہے۔ مجھے یہ طرزِ زندگی پسند ہے۔'' پھر سوال کیا۔ ''تم بھی مسلمان ہو؟''

''ہاں میں مسلمان ہوں۔'' جوجو نے میری یہ خطا معاف کردی۔ وہ اپنے لوگوں کے اور اپنے معاشرے کے بارے میں فکرمند تھا۔

''گوری قوم نے پہلے اپنا سکون گنوایا۔ مشین کے غلام بن گئے اور اب ہمارا سکون لوٹنا چاہتے ہیں۔''

''لیکن تمہاری موٹر سائیکل بھی ایک مشین ہے جو گوروں کی ایجاد ہے۔ تم اس کو کیوں استعمال کرتے ہو؟'' میں نے جوجو سے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں اس سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا ہوں اگر یہ نہ ہوتی تو میں اپنے باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتا چاول اگاتا وہ مجھے زیادہ پسند ہے۔''

''خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تم ہندوستان سے آئے ہو

تم میرے دوست ہو۔ تم گورے نہیں ہو۔ میں تم کو اصلی بالی کی زندگی دکھاؤں گا میں گوروں کو وہاں نہیں لے جاتا۔"

میں نے جوجو کو یاد دلایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں۔ جوجو نے موٹر سائیکل کا رخ پگڈنڈیوں کی طرف موڑ دیا تا کہ مجھے بالی کی روزمرہ کی زندگی کا مشاہدہ کروا سکے۔ ان لوگوں کی زندگی واقعی انتہائی سادہ تھی۔ مغربی معاشرہ ابھی اس طرح بالی میں نہ در آیا تھا جس طرح دوسرے پسماندہ علاقوں میں تھا۔ گوکہ آہستہ آہستہ بالی کے لوگوں کو مغرب کی تہذیب اور چیزوں سے شناسائی ہو رہی تھی۔ یہاں کے جوان لوگوں میں امریکی جینز خاص طور سے مقبول تھی۔ آبنوس کی تراشی ہوئی اشیاء جن کی باقی دنیا میں بہت مانگ تھی ایک استعمال شدہ امریکی جینز کے عوض باآسانی بارٹر کی جاسکتی تھیں۔

جوجو اب مجھے اپنا گھر دکھانا چاہتا تھا۔ موٹر سائیکل کا رخ اس کے گاؤں کی طرف ہو گیا۔ ہم اس کے گھر پہنچ گئے۔ یہ گھر نہ تھا ایک طرح کا جھونپڑا تھا جس میں جوجو، بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی بیوی ہمارے لیے چائے بنا کر لے آئی۔ چائے پینے کے بعد جوجو اور اس کی بیوی مجھے دریا کی سیر کروانا چاہتے تھے۔ اسی دریا سے ان کے کھیتوں کو پانی ملتا تھا۔

دریا پر پہنچے تو وہاں چار پانچ لڑکیاں نہا رہی تھیں۔ کپڑے دھو رہی تھیں ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے دریا میں ڈبکی لگا دی۔ جوجو نے اپنی بھاشا میں ان لڑکیوں سے کچھ کہا۔ وہ لڑکیاں واپس اوپر آگئیں۔ مجھے ہندوانہ انداز میں دونوں نے ہاتھ جوڑ کر نستے کیا اور واپس اپنے نہانے دھونے میں مشغول ہوگئیں۔

"یہ ہمارے گھر کی لڑکیاں ہیں۔" جوجو نے بتایا۔ "ان میں میری چھوٹی بہن بھی ہے۔" پھر سوال کیا۔ "تم کو معلوم ہے یہ لڑکیاں تمہیں دیکھ کر پانی میں کیوں چھپ گئی تھیں؟"

"یہ تو نسوانی شرم وحیا کا تقاضا ہے۔"

"نہیں۔" جوجو نے غصے سے جواب دیا۔ "عورت کی شرم وحیا اس کی چولی میں نہیں اس کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔" یہ فلسفہ میرے لیے نیا تھا۔ پھر جوجو نے ان لڑکیوں کے پانی میں ڈبکی لگانے کی وجہ بتائی۔ "جب گورے مرد یہاں آتے ہیں تو وہ ہماری بہو بیٹیوں کی تصویریں اتارتے ہیں اور واپس جا کر اپنے دوستوں میں ان کی نمائش کرتے ہیں۔" جوجو بپھرا ہوا تھا اگر سامنے کوئی گورا ہوتا تو وہ اس کا گلا دبا دیتا۔ جوجو نے اپنے غصے پر قابو پایا اور بات آگے بڑھائی۔ "بے شرم ہماری بیٹیاں نہیں ہیں۔ بے شرم وہ لوگ ہیں جو ان کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ ہماری بیٹیاں معصوم ہیں۔" جوجو کی بات سچی تھی۔ "یہ گورے نہ صرف ہماری بیٹیوں پر گندی نظر ڈالتے ہیں بلکہ انہوں نے ہماری تہذیب، ہمارے رہن سہن اور ہمارے معاشرے کو بھی گندا کر دیا ہے۔ اس میں زہر گھول دیا ہے۔ بالی کی نوجوان نسل ان کے جال میں پھنستی جا رہی ہے۔ ایک دن وہ آئے گا کہ ہم اپنی تہذیب کو مکمل طور پر بھول چکے ہوں گے۔ ہماری قوم کے ذہن گوروں کی غلامی کریں گے۔"

میں نے اپنا بگ میک ختم کیا اور ماضی کے دریچے سے کود کر حال میں آگیا پھر مکڈونلڈ سے باہر آگیا۔

باہر آتے ہی میں سوچ رہا تھا کہ نامعلوم جوجو اس وقت کہاں ہوگا۔ ہے بھی یا نہیں مگر اس کی پیشگوئی میرے سامنے تھی۔ میرے سامنے مکڈونلڈ کا بورڈ پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔

مجھے پینٹنگز جمع کرنے کا شوق ہے۔ میں انڈونیشیا کی روایتی پینٹنگ کی تلاش میں تھا۔ مکڈونلڈ کی لائن میں ایک تصویروں کی دکان تھی۔ میں اس میں داخل ہو گیا۔ دکان کے مالک سے اپنی مطلوبہ پینٹنگ کے بارے میں معلوم کیا تو اس نے کہا۔ "یہ پینٹنگ آپ کو یہاں نہیں ملے گی۔ اس کے لیے آپ کو اودو جانا پڑے گا۔" ہوٹل واپسی پر میں نے ٹریول ایجنٹ سے اگلے دن اودو جانے کا ٹکٹ خرید لیا۔

اگلے روز جب اودو جانے والی مائیکرو بس مجھے لینے کے لیے ہوٹل آئی تو اس میں میرے علاوہ اور کوئی نہ تھا... سوائے ڈرائیور کے اور ایک نوجوان گائیڈ کے۔ میں نے گائیڈ کو بتایا کہ اودو میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ مجھے وہاں زیادہ گھومنا نہیں ہے، بس صرف ایک پینٹنگ خریدنا ہے جو روایتی انڈونیشی طرز پر بنائی گئی ہو۔

اودو پہنچ کر گائیڈ مجھے ایک احاطے کے اندر لے گیا۔ اس احاطے میں ایک بہت بڑی عمارت تعمیر کی گئی تھی جس کے کئی کمرے تھے۔ یہ عمارت خاص طور سے تصویروں کی نمائش کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کے ہر کمرے میں دیواروں پر تصویریں لٹکی ہوئی تھیں۔ اس سے قبل جب میں اودو آیا تھا تو وہاں اتنی شاندار عمارت موجود نہ تھی۔ لوگ اپنے گھروں میں تصویریں بنایا اور بیچا کرتے تھے۔ اس عمارت کے ورانڈے میں نوجوان آرٹسٹ تصویریں بنانے میں مشغول تھے۔ وہ بالی

کی روایتی طرز پر تصویریں بنا رہے تھے۔ یہ تصویریں برش کی اسٹروک کی بجائے مختلف رنگوں کے نکتوں سے بنائی جارہی تھیں جو بہت محنت طلب کام لگ رہا تھا مگر وہ لوگ اس طرز سے تصویریں بنانے میں ماہر تھے اور بڑی پھرتی سے اپنا کام کررہے تھے۔ میں بڑی دیر تک انہیں ستائش بھری نظروں سے کام کرتے دیکھتا رہا پھر اس ہال میں داخل ہوگیا جہاں تصویریں دیواروں پر لٹکا کر ان کی نمائش کی جارہی تھی۔ میں نے ایک تصویر کو پسند کرلیا اس میں انڈونیشیا کے پرندے ''گرودا'' کی عکاسی کی گئی تھی۔ منظر ایک جنگل کا تھا۔ گرودا ایک خیالی پرندہ ہے۔ جس کا کوئی وجود نہیں جس طرح ہمارے یہاں ''ہما'' ایک خیالی پرندہ ہے۔ انڈونیشیا کی قومی ائرلائن کا نام بھی گرودا ہے جو اسی پرندے کی مناسبت سے ہے۔ اسی طرح ایران کی قومی ائرلائن کا نام ''ہما'' ہے۔ ہما کا مکمل نام ہے۔ ''ہواپیمائی ملی ایران''۔

تصویر کی قیمت ایک ہزار ڈالر سے شروع ہوکر ڈھائی سو ڈالر پر طے ہوئی۔ میں وین میں آکر بیٹھ گیا۔ ایک لڑکے نے تصویر وین میں پہنچادی۔ وین کا ڈرائیور تو موجود تھا لیکن گائیڈ غائب۔ ڈرائیور سے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ ''ابھی آتا ہوگا۔ کام سے گیا ہے۔''

چند منٹ بعد گائیڈ آچکا تھا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جس ضروری کام سے وہ گیا تھا وہ مکمل ہوچکا تھا۔ اس کو اس کا کمیشن مل چکا تھا۔ بالی میں اب ہر کام خالص تجارتی نکتہ نظر سے کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی گائیڈ کسی سیاح کو کسی دکان وغیرہ پر لے جاتا ہے اور وہ سیاح اس دکان سے کوئی چیز خریدتا ہے تو دکان دار گائیڈ کو ایک مقررہ رقم کمیشن کے طور پر ادا کرتا ہے۔ پرانے زمانے میں کمیشن کا تصور ناپید تھا۔ لوگ خود ہی چیزیں بناتے تھے اور انہیں سیاحوں خریداروں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔ جب میں نے پہلی دفعہ جوجو کے ساتھ بالی میں آبنوس کے مجسمے اور دوسری اشیا خریدی تھیں تو اس میں جوجو کا کوئی کمیشن نہیں تھا۔ اپنی سیر کے اختتام پر میں نے اس کو ٹپ بے شک ادا کی تھی۔ جوجو نے ٹپ لینے سے انکار کردیا تھا مگر میرے حد سے زیادہ اصرار نے اسے مجبور کردیا تھا۔

تصویر لے کر ہم واپس آرہے تھے۔ راستے میں، میں نے اس نوجوان گائیڈ سے جوجو کے ساتھ گزارے ہوئے وقت اور واقعات کا ذکر کیا۔

''اچھا تو بالی میں لوگ اس تہذیب کے ساتھ رہتے تھے۔'' اس نے مجھ سے اس طرح سوال کیا جیسے وہ بالی کا باشندہ نہ ہو کوئی غیر ہو۔ ''آپ کو تو بالی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے بلکہ یہ ساری چیزیں آپ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔'' پھر اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ ''ٹھہریے۔'' اس نے اپنی نوٹ بک نکالی۔ ''میں یہ ساری باتیں نوٹ کرلوں۔ میں یہ سب کچھ اپنے سیاحوں کو بتایا کروں گا۔''

مجھے جوجو کے خدشات جیتی جاگتی شکل میں دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے کہے ہوئے الفاظ یاد آگئے۔ بالی کی نوجوان نسل ان کے (گوروں کے) جال میں پھنستی جارہی ہے۔ ایک دن وہ آئے گا کہ ہم اپنی تہذیب کو مکمل طور پر بھول چکے ہوں گے۔ ہماری قوم کے ذہن گوروں کی غلامی کریں گے۔

ہم ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ مائیکروبس سے اترنے کے بعد گائیڈ نے میری خریدی ہوئی تصویر مجھے تھمائی اور ہاتھ ملا کر رخصت ہوگیا۔ آج کا بالی اور اس کی تہذیب اس جواں سال گائیڈ کی تہذیب تھی۔ بالی کی وہ تہذیب جسے جوجو دنیا کی ہر دوسری تہذیب سے بہتر جانتا تھا معدوم ہوچکی تھی۔ ماضی میں دفن ہوچکی تھی۔

گم گشتہ تہذیب صرف بالی کا، جوجو کا المیہ نہیں ہے۔ آج مغرب کی چمک دمک والی مادی تہذیب کا ریلا ہر تہذیب کو بہا کر لے جارہا ہے۔ آج کا نوجوان بالی کے نوجوان گائیڈ کی طرح اپنی موروثی تہذیب اور اقدار کو بھلا چکا ہے، وہ گلے تک مغربی تہذیب کی دلدل میں دھنس چکا ہے۔ ستم بالائے ستم وہ اس دلدل کو اپنی ترقی اور خوش حالی کی ضمانت گردانتا ہے اور اپنے آباؤ اجداد کی کہنہ تہذیب اور اقدار کو اپنی ترقی میں رکاوٹ تصور کرتا ہے۔ خود فریبی سی خود فریبی ہے۔

نہیں معلوم کہ جوجو آج اپنی پیش گوئی کو پورا ہوتے دیکھنے کے لیے زندہ ہے یا اپنے دور کی مردہ تہذیب کو اپنے سینے میں دفن کیے اس دنیا سے رخصت ہوچکا ہے اور اس کی چتا کی راکھ اسی دریا میں بہادی گئی ہے کہ جس دریا کا پانی اس کے گھر کی لڑکیوں کو سجاتا سنوارتا تھا۔ اس کے کھیتوں کو سیراب کرتا تھا

بالی سے واپس آنے کے بعد میں دفتر گیا تو معلوم ہوا کہ یاجوج ماجوج کرٹ اور فلائیڈ آج کل اپنا تمام تر وقت شرمی کے دفتر میں گزار رہے تھے۔ کرٹ کی جگہ ایک دفعہ

پھر سے عمر خان عارضی طور پر انجینئرنگ مینیجر بنا دیے گئے تھے۔ لگتا تھا کہ جیسے یاجوج ماجوج کسی خفیہ اور خطرناک مشن کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ لوگ مشن پر تو ضرور لگا دیے گئے تھے مگر یہ مشن نہ تو خفیہ تھا اور نہ ہی خدانخواستہ خطرناک۔

تیل کی آمدنی کی بہتات کے کرشمے سعودی عرب میں ہر طرف واضح طور پر دیکھے جاسکتے تھے۔ نئی سڑکیں، نئے ائرپورٹ، نئے گھر، ان نئے گھروں کے لیے نئی بیویاں۔ ہر طرف، ہر شعبے میں زندگی کی ہر دوڑ میں افرادی قوت کی ضرورت تھی۔ سعودی عرب کے مقامی لوگ تعداد میں بھی کم تھے اور تعلیم و تجربہ میں بھی۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے لاکھوں کی تعداد میں لوگ مختلف ملکوں سے سعودی عرب آرہے تھے۔ مزدوروں، کاریگروں، افسروں اور پیشہ وارانہ مہارت رکھنے والے افراد کو سعودی عرب سے لانا لے جانا سعودیہ کی ذمہ داریوں کو بہت زیادہ بڑھا چکا تھا۔ اس کے مسافروں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ چکی تھی گو کہ سعودیہ اپنے بیڑے میں چند جہازوں کا اضافہ کر چکی تھی۔ یہ نئے خریدے گئے جہاز بھی ناکافی پڑ رہے تھے۔ مزید کئی جہازوں کے خریدنے کی ضرورت تھی۔ جہازوں کی خریداری میں مرکزی کردار انجینئرنگ کا ہوتا ہے۔ یہ خریداری محنت اور وقت دونوں کی طلب گار ہوتی ہے۔ اس خریداری کی کارروائی کی وجہ سے انجینئرنگ کے شعبے کی ذمہ داریاں بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ ہر انجینئر ہر قسم کا کام کر رہا تھا۔ ان تمام عوامل کا تقاضا یہ تھا کہ انجینئرنگ کے ڈھانچے کو بدلا جائے اس کو نئے سرے سے منظم کیا جائے۔ ری آرگنائز کیا جائے۔ اس نئے ڈھانچے کے تخیل اور تخلیق کا کام یاجوج ماجوج کے سپرد کیا گیا تھا۔ وہ اس مشن پر دن رات مصروف تھے۔

یاجوج ماجوج اپنا کام مکمل کر چکے تھے۔ انجینئرنگ کے نئے ڈھانچے کے تحت انجینئرنگ کو دو ذیلی شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک ذیلی شعبے کے ذمے موجودہ جہازوں کی دیکھ بھال کا کام تھا اور دوسرے کے ذمے نئے جہازوں کی خریداری۔ موجودہ جہازوں کے ذیلی شعبے کا نام فیلڈ سپورٹ انجینئرنگ اور نئے جہازوں کے ذیلی شعبہ کا ڈیولپمنٹ انجینئرنگ۔ فیلڈ سپورٹ انجینئرنگ اسی طرح سے کام کرتا رہے گا جیسے پہلے کر رہا تھا۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ نئے جہازوں کا بوجھ اس کے کاندھوں سے اتار کر ڈیولپمنٹ انجینئرنگ کے مضبوط شانوں پر ڈال دیا جائے گا۔ فیلڈ سپورٹ کے انچارج فلائیڈ اور ڈیولپمنٹ کے انچارج کرٹ ہوں گے۔ شرعی بدستور ان دونوں کے افسر ہوں گے۔

نئے جہازوں کا کام دو جہتوں سے لیا جائے گا۔ ایک کے ذمے مواصفات اور دوسرے کے ذمے کنٹریکٹ، پہلے کا عہدہ مدیر مطالبات و مواصفات طائرات اور دوسرے کا مدیر عقود فنی۔

اب لازم ہو گیا ہے کہ میں کنٹریکٹ کے سوٹ اور ٹائی کو اتروا کر اور اس کو عربی لباس ''توب'' پہنوا کر اس کو اس کے عربی نام ''عقود'' سے پکاروں۔ پاکستان میں عقد چند گنے چنے افراد کے لیے خوشی مگر زیادہ تر کے لیے حسرت کا باعث ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں لفظ عقد شادی یا نکاح کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر افراد کے لیے یہ عقد حسرت کا باعث ہوتا ہے کہ یہ ''ایک'' سے آگے نہیں بڑھ پاتا ہے۔ اس سے بھرپور فائدہ صرف وہی چند خوش نصیب لوگ اٹھا سکتے ہیں جو عقد پر عقد کرنے کے متحمل ہو سکیں۔ عقد ثانی کی بات ہی کچھ اور ہے مگر حقیقی معنوں میں خوش نصیب وہ ہے کہ جس کی قسمت کا ستارہ اس کی رہنمائی عقد اربعہ (چار نکاح) تک کرلے۔ سنا ہے کہ ایسے لوگ بلا کسی روک ٹوک کے جنت کے مستحق قرار پائیں گے کہ دوزخ تو وہ دنیا میں ہی بھگت چکے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود لوگ بیوی کی اہمیت سے واقف نہیں ہیں اور نہ ہی بیوی کے وجود کو سراہتے ہیں۔ ایک مسروقہ قصہ ذہن کے افق پر ماہ تمام کی طرح روشن ہے۔

ایک دفعہ دو دوست آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک دوست نے دوسرے کو مخاطب کیا۔ ''میری بیوی فرشتہ ہے۔''

دوسرے دوست نے آہ بھری۔ پہلے دوست کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور اپنے اس دوست سے مخاطب ہوا۔ ''تم خوش نصیب ہو۔'' پھر جیب سے رومال نکال کر اپنے گالوں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا اور رقت بھری آواز میں بولا۔ ''میری تو ابھی زندہ ہے۔'' یہ سن کر پہلے دوست کا دل بھر آیا۔ اس نے اٹھ کر دوسرے دوست کو اپنے کلیجے سے لگایا اور اس کی ڈھارس بندھائی۔ ''فکر نہ کرو۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔''

سعودیہ انجینئرنگ میں اگر کوئی ایسا عقد عمد کرتا تو اس کو نوکری سے نکال دیا جاتا۔ وہاں پر صرف عقود فنی کی اجازت تھی کہ جس میں ایسا کچھ نہیں ہوتا کہ زندگی بھر پچھتانا پڑے۔

سعودیہ انجینئرنگ میں افرادی قوت کی کمی تھی۔
انجینئرنگ کے دو شاخہ ہونے کے بعد یاجوج ماجوج میں چھینا جھپٹی شروع ہوگئی کہ کون سا انجینئر مواصفات کی بھینٹ چڑھے اور کون سا موجودہ جہازوں کی سیوا جاری رکھے۔ وہ دونوں چاہتے تھے کہ بہتر صلاحیتوں والے لوگ ان کے ساتھ ہوں۔ چند دنوں کے بحث مباحثے کے بعد یہ معاملہ شرمو کی مدد سے حل ہوگیا۔ میرا قرعہ تو پہلے ہی نئے جہازوں کے نام نکل چکا تھا۔

اب مواصفات اور عقود کرٹ کے ذمہ تھے۔ کرٹ نے مواصفات کے لیے بطور مدیر (منیجر) ڈاکٹر اینڈی پاول کا انتخاب کیا۔ مجھے اینڈی کے ساتھ کام کرنا تھا لیکن جب تک کوئی مدیر عقود لفی نہیں رکھ لیا جاتا اس کا کام مجھے سونپ دیا گیا۔ کرٹ کو ایک تیسرا منیجر اور رکھنا تھا لیکن اس کے لیے ابھی وقت تھا۔

ہوائی جہاز کے آرڈر سے لے کر اس کی ڈلیوری تک ڈیڑھ سال سے لے کر تین سال کا عرصہ لگ سکتا ہے۔ جہاز کی تیاری کے اس دورانیہ میں ائر لائن اور جہاز ساز کمپنی مسلسل رابطے میں رہتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اکثر فنی نوعیت کے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو باہمی مشاورت سے حل کیے جاتے ہیں اس کے علاوہ ائر لائن کے انجینئر جہاز کے بنائے جانے کے دوران میں مرحلہ وار اس کا انسپکشن یا جانچ کرتے رہتے ہیں۔ ان تمام فرائض کی انجام دہی کے لیے عام طور سے ائر لائن جہاز ساز کمپنی کی حدود میں دفتر کھول کر اس میں اپنے انجینئر تعینات کرتی ہے۔ دفاتر کی جگہ اور بنیادی سہولیات کی ذمہ داری جہاز ساز کمپنی مہیا کرتی ہے۔

L-1011 کی خریداری کے لیے سعودیہ نے اپنا ذاتی رابطہ آفس (جو کہ ائر کرافٹ ایکسپٹینس آفس کہلاتا ہے) لاک ہیڈ کی حدود میں نہیں کھولا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سعودیہ نے اس کام کا ٹھیکا TWA کو اپنے مینجمنٹ کنٹریکٹ کے تحت دے رکھا تھا۔ TWA کا دفتر لاک ہیڈ کی حدود میں موجود تھا۔ اسی دفتر میں کام کرنے والے انجینئر سعودیہ کے L-1011 طیاروں کی بھی دیکھ بھال کرتے تھے۔ سعودیہ کو ذاتی ائر کرافٹ ایکسپٹینس دفتر اور عملے کی ضرورت نہیں تھی لیکن جس وقت سعودیہ نے B-747 جہاز خریدے اس وقت TWA کا کنٹریکٹ اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ لہٰذا B-747 کے لیے لازمی ہوگیا تھا کہ سعودیہ سیاٹل میں اپنا ذاتی رابطہ آفس کھول کر اس میں اپنے انجینئر بھرتی کرے۔ یہ دفتر کرٹ کے ماتحت کام کرتا تھا۔ اس کے منیجر کا نام ڈیموس تھا۔ ڈیموس کا تعلق گریس (یونان) سے تھا مگر اس نے امریکی شہریت لے رکھی تھی۔ جب ڈیموس سے میری دوستی بڑھ گئی تو ایک دن اس نے اپنے بچوں کے حوالے سے شکایت کی۔ اس بے ہودہ ملک میں پلنے بڑھنے کی وجہ سے میرے بچوں کا اخلاق تباہ ہوچکا ہے۔ وہ اپنی گریک تہذیب اور معاشرت کو بھول کر بے مہار ہوچکے ہیں۔ ان کی زندگی ڈالر کے سوا کچھ بھی نہیں رہی ہے۔

ڈیموس کا یہ مکالمہ کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ لیکن حیرت اس بات پر ہوئی کہ ڈیموس نے پاکستانی دلوں کا حال کیسے جان لیا۔ امریکا وہ ملک ہے جہاں جانے کے لیے شاید دنیا کی 80 فیصد آبادی دن رات تڑپتی ہے مگر ہر موقع پر اسی امریکا کو برا بھلا کہنے سے نہیں چوکتی۔ امریکا ترک وطن کر کے جانے والے اس بات سے صرف نظر کرلیتے ہیں کہ ان کے بچوں کو امریکا لے جاکر اپنی خاندانی اور قومی روایات اور معاشرت سے بیگانہ کرنے کے وہ خود ذمے دار ہیں۔ اس میں بچوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔

سعودیہ انجینئرنگ میں جس طرح سے افراد کی کمی تھی۔ اسی طرح سے جگہ کی بھی کمی تھی۔ کرٹ اور فلائیڈ میں ساس بہو کے روایتی جھگڑے شروع ہوچکے تھے۔ بہو (کرٹ) کو اپنا الگ گھر چاہیے تھا۔ اس کو ساس (فلائیڈ) کے ساتھ گزارا کرنا روا نہیں تھا۔ انجینئرنگ کے موجودہ دفاتر سے کرٹ اور اس کے چوزوں کا انخلا دو مراحل میں تکمیل کو پہنچا۔

پہلے مرحلے میں ہم لوگ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکے۔ انجینئرنگ کے دفاتر کے بالکل نیچے ایک بہت بڑا کمرا تھا جس کو انسپکشن ڈیپارٹمنٹ استعمال کررہا تھا۔ اس کمرے کو استعمال کرنے والے جہاز کے انسپکٹر تھے جو مکینک کے کام کو چیک کر کے پاس کرتے تھے ان کو دفتر کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اس لیے کہ وہ اپنا تقریباً تمام وقت جہاز پر گزارتے ہیں۔ صرف ستانے کے لیے یا خالی وقت میں دفتر استعمال کرتے ہیں۔ دو میزیں ان لوگوں کے لیے چھوڑ کر باقی دفتر پر کرٹ معہ اپنے چوزوں کے قابض ہوگئے۔ بہو کو ساس سے نجات مل چکی تھی۔ گو کہ دفتر کے اوقات کے بعد بیئر ساس بہو ایک ساتھ لنڈھاتے تھے۔

ایک دن میں اپنے اس عارضی دفتر میں اپنی سیٹ پر بیٹھا کام کر رہا تھا کہ اچانک سامنے کا دروازہ کھلا۔ دروازہ

کھولنے والا ایک چھوٹے قد کا فربہ آدمی تھا۔ یہ آدمی ائر لائن کے یونیفارم میں ملبوس تھا۔ نیوی بلیو پتلون اس کے اوپر ہلکے نیلے رنگ کی قمیص۔ آنکھوں پر کالا چشمہ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی اس نے اپنے ماتھے پر زور سے اپنا ہاتھ مارا اور ایڑیوں کے بل پیچھے کو گھوم گیا۔ دو چکر لگانے کے بعد جب وہ اپنی سانس درست کرنے کے لیے رکا تو میں نے اس کو پہچانا۔ یہ قریشی تھا جو میرے ساتھ پی آئی اے ہینگر میں بطور ایویانکس انسپکٹر کام کیا کرتا تھا۔ جب اس کا سانس درست ہو چکا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

''دو......دو......دوسرا......حہ......حے......حیلہ باز کہاں ہے۔'' پھر دوسری معلومات چاہی۔ ''تت......تت......تو یہاں......ک......ک......کیسے؟''

انسپکٹر قریشی کا دوسرے حیلہ باز کا اشارہ اعجاز کی طرف تھا۔ قریشی کو ہمارے پی آئی اے کے وہ ابتدائی ایام یاد تھے جب اعجاز اور میں سعید صاحب کو سلام کرنے کے بعد بوہری بازار گھومنے اور دوپہر کو کھانا ہانگ کانگ یا اے بی سی چائنیز ریسٹورانٹ میں کھانے کے بعد تین بجے اپنے اپنے گھروں کو سدھارتے تھے کہ تین بجے پی آئی اے کی صبح کی شفٹ کی چھٹی ہوجایا کرتی تھی۔ اگر گھر پہلے پہنچ جاتے تو گھر والوں کو شبہ ہو جاتا۔ حیلہ باز کے خطاب کو حیاتِ دوام اس وقت ملی جب میں نے پی آئی اے کے بوئنگ ہینگر میں کام کرنا شروع کیا۔ زیادہ تر شفٹوں میں، میں اور قریشی ساتھ ہوا کرتے تھے۔ جہاز پر اپنے ہاتھ سے کام کرنے کا نیا نیا تجربہ تھا۔ میں اپنا کام ختم کرنے کے بعد اسے چیک کروا کر پاس کرانے کے لیے زیادہ تر قریشی کی خدمات حاصل کیا کرتا تھا۔ انہیں میرے کام میں نقص نکالنے میں انجانی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ میں انہیں اس مسرت کے حصول کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنا چاہتا تھا۔ معمولی خرابیوں کو وہ مجھ سے ٹھیک کروا دیتے تھے اگر پھر بھی مجھے عقل نہ آتی تو وہ ان خرابیوں کو خود ٹھیک کر دیا کرتے تھے۔ ہماری گہری دوستی ہو چکی تھی۔ ایک کام ایسا تھا کہ جسے میں تقریباً ہر دفعہ غلط کرتا تھا اور قریشی یا تو اسے خود سے ٹھیک کردیتے تھے یا مجھ سے دوبارہ اپنی موجودگی میں ٹھیک کرواتے تھے۔ یہ کام تھا وائر لاکنگ۔

جہاز میں جب کوئی بجلی کی موٹر یا کمپیوٹر وغیرہ تبدیل کیے جاتے ہیں تو یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کے پلگ کو اچھی طرح اور مضبوطی سے لگایا جائے۔ اگر یہ پلگ ٹھیک سے نہ لگے ہوں تو پرواز کے دورانِ ارتعاش کے سبب یہ پلگ ڈھیلے ہو سکتے یا کھل بھی سکتے ہیں۔ اس امر کو یقینی بنانے کے لیے کہ یہ پلگ کھل نہ پائیں یا ڈھیلے نہ ہوں ان کو اسٹیل کے باریک تار سے باندھ دیا جاتا ہے۔ پلگ کے جہاز والے حصے میں اور موٹر یا کمپیوٹر والے حصے میں کنڈے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کنڈوں میں سے ایک میں باریک تار ڈال کر اس کو بٹ لیا جاتا ہے۔ یہ بٹ تمیزی ڈاکٹر یونس بٹ کی بٹ تمیزیاں کی طرح مشکل نہیں ہوتی ہیں۔ آسان ہوتی ہیں۔ اس بٹے ہوئے تار کو پلگ کے گرد گھما کر دوسرے کنڈے میں باندھنا ہوتا ہے۔ اگر یہ تار غلط سمت میں گھما دیا جائے تو مقصد حاصل نہ ہوگا۔ پلگ ڈھیلا ہو سکتا ہے۔ کھل بھی سکتا ہے۔ میں اسے تقریباً ہر دفعہ غلط سمت میں گھما دیا کرتا تھا۔ میرے اس فعل سے حیلہ باز کے خطاب کو تقویت پہنچتی تھی۔ قریشی کا خیال تھا کہ ہر کسی کو جہاز پر کام کرنا سکھایا جاسکتا تھا سوائے میرے اور اعجاز کے۔

قریشی ابھی تک دوسرے حیلہ باز کی خیریت دریافت کرنے میں مصروف تھے۔ میں نے پوچھا کیسے آنا ہوا تو ماتھے پر ہاتھ مارنے کا دوسرا دور شروع ہو گیا۔ کئی دفعہ اپنا سر پیٹنے کے بعد مجھے مطلع کیا۔ میں پی آئی اے کے جہاز کے ساتھ آیا ہوں۔ آٹو پائلٹ کا مسئلہ ہو گیا ہے۔ ٹھیک کرواتا ہے۔

میں انہیں شفٹ انچارج کے دفتر لے گیا کہ یہ ان کا کام تھا۔ رخصت ہوتے وقت قریشی نے مجھے گلے لگایا اور ہاتھ ملایا لیکن اب قریشی سے ہاتھ ملانا مشکل کام ہو گیا ہے۔ اس کے لیے مجھے لمبا سفر کرنا پڑے گا۔ مشکل یہ ہے کہ اس سفر کے بعد کوئی شخص اس دنیا میں واپس نہیں آسکتا سوائے یومِ حشر کے۔

مجھے یقین ہے کہ میدانِ حشر میں اگر قریشی کہیں میرے آس پاس ہوئے اور ان کی نظر مجھ پڑ گئی تو پورا میدان حشر ایک صدا سے گونج اٹھے گا۔ ''حیے......حیے......حیلے باز......دو......دو......دوسرا...... کک......کک......کہاں ہے؟''

قریشی سے میری ملاقات جس ٹریلر میں ہوئی تھی وہ ہمارا عارضی دفتر تھا۔ اس ملاقات کے چند ہفتے کے بعد ہم اپنے ذاتی ٹریلر کے دفتر میں منتقل ہو چکے تھے۔ یہ ٹریلر ہینگر کے باہر والی سڑک کے دائیں جانب رکھا ہوا تھا۔ سعودیہ میں کام کرتے ہوئے مجھے ایک سال ہو چکا تھا۔ میری سالانہ کارکردگی کی رپورٹ تیار کی جاتی تھی۔ اس رپورٹ

کی بنا پر مجھ کو اضافی تنخواہ بھی مل سکتی تھی جو میرٹ بونس کہلاتی تھی۔ اس کی حد سالانہ تنخواہ کی دس فیصد تھی۔ اسی رپورٹ کی بناء پر ملازمت سے برخواست بھی کیا جاسکتا تھا لیکن انجینئرنگ کی حد تک ابھی تک کوئی انجینئر اس رپورٹ کی بنا پر نوکری سے برخواست نہیں کیا گیا تھا۔ مگر صرف یہی ایک حقیقت باعثِ تسکین نہیں ہوسکتی تھی کہ میں نوکری سے برخواست نہیں کیا جاؤں گا۔ ڈاکٹر جے بی کوئس سے پیچھا چھڑانا آسان نہ تھا۔ کانوں میں ان کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ہوسکتا ہے اس پہل کا اعزاز تم کو حاصل ہو۔

کارکردگی رپورٹ تیار کرنے کے بعد متعلقہ ملازم کو دی جاتی تھی کہ وہ اس کو پڑھ کر اس پر دستخط کرے اور اگر اس کو کوئی اعتراض ہے تو اس کو لکھ کر اپنے افسر کے حوالے کردے۔

کرٹ نے میری رپورٹ مکمل کرنے کے بعد مجھے دفتر میں بلایا کہ میں اسے پڑھ کر دستخط کردوں۔ رپورٹ پڑھنے کے بعد میں نے کرٹ سے پانی کا گلاس مانگا رپورٹ کو دوبارہ پڑھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ کرٹ نے یہ رپورٹ نشے کی حالت میں لکھی تھی۔

سعودی عرب میں ہر کوئی نشہ نہیں کرسکتا۔ یہ سہولت صرف امیر اور بااثر لوگوں کے لیے مختص ہے۔ ان پر کوئی پابندی نہیں۔ پابندی صرف عام لوگوں کے لیے ہے۔ جو اس ناانصافی کے احتجاج کے طور پر شراب اپنے گھروں میں کشید کرتے ہیں۔ خود بھی پیتے ہیں اور یاروں کو بھی پلاتے ہیں کہ اس کے نشے میں وہ بھی اپنے آپ کو دولت مند اور بااثر ہونے کا خواب دیکھ سکتے ہیں۔ میرے گھر میں اوپر والی منزل پر ایک برطانوی پائلٹ اکیلا رہتا تھا۔ وہ بھی اکثر اپنے آپ کو امیر شیخ کے روپ میں دیکھا کرتا تھا۔

ایک دن فلائٹ پر جاتے ہوئے وہ اپنا دروازہ ٹھیک طرح سے بند کرنا بھول گیا تھا۔ مالی جب گھاس کاٹنے آیا تو اس نے دروازہ آدھا کھلا دیکھا۔ اس نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے سر کوئی الزام آجائے وہ سعودیہ کی سیکیورٹی کو بلا لایا۔ سیکیورٹی والے اوپر پہنچے تو وہاں شراب کشید کرنے کا مکمل انتظام موجود تھا۔ ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔ سعودیہ سیکیورٹی والے سعودی حکومت کی سیکیورٹی کو بلا لائے۔ وہ لوگ یقین کرنا چاہتے تھے کہ یہ واقعی شراب ہے یا نہیں۔ ایسے موقعوں پر سب سے آزمودہ طریقہ یہی ہوتا ہے کہ آپ خود پی کر اس کی تصدیق کریں۔ سنی سنائی باتوں پر نہ جائیں۔ ایک دو گلاس اگر چڑھا بھی لیے تو یہ "ان لائین آف ڈیوٹی" ہوتا ہے۔ قصہ مختصر جب وہ کپتان جہاز لے کر جدہ واپس آیا تو اسے گرفتار کرلیا گیا۔ تین مہینے جیل میں رکھا گیا پھر ڈی پورٹ کردیا گیا۔ مگر کرٹ نشہ میں نہیں تھا۔ مجھے اس کے نشے میں ہونے کا گمان اس لیے ہوا تھا کہ اس نے نہ صرف یہ کہ مجھے دس فی صد میرٹ بونس دیا تھا بلکہ یہ سفارش بھی کی تھی کہ مجھے سینئر انجینئر سے ترقی دے کر ماسٹر انجینئر بنا دیا جائے۔ ترقی کی یہ سفارش ہی میری حیرانگی کا باعث بنی تھی کیوں کہ میرے ساتھ تین یا چار ایسے انجینئر بھی موجود تھے جو میرے سعودیہ میں شمولیت اختیار کرنے سے دو تین سال پہلے ہی سعودیہ میں نوکری شروع کرچکے تھے مگر ان لوگوں کی ترقی کی کوئی سن گن نہیں تھی۔ میں اگر حیرت میں نہ ڈوبتا تو اور کیا کرتا دو ماہ بعد میری ترقی ہو چکی تھی لیکن بات یہیں پر نہیں رکی۔

ڈاکٹر اینڈی پاول میرا مینیجر تھا مگر ابھی عارضی تھا۔ پکا نہ ہوا تھا۔ اینڈی ہپی تحریک کے زمانے کی پیداوار تھا۔ ہپی وہ نوجوان نسل تھی جو امریکا کے انتہا سے زیادہ منظم نظام سے تنگ آچکی تھی اس کے تحت انسان کام کا غلام بن چکا تھا اس کی شخصی حیثیت کام پر قربان ہوچکی تھی۔ ان نوجوانوں نے اس نظام کے خلاف بغاوت کر رکھی تھی ان کے نزدیک انسان کی ذاتی زندگی اور خوشی زیادہ اہم تھی وہ حکومتی اداروں اور ڈھانچوں کی غلامی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہپی تحریک بیس پچیس سال چل کر دم توڑ گئی کیوں کہ ہپی کو بھی روٹی کپڑا اور مکان چاہیے ہوتا ہے اور یہ ضروریاتِ زندگی بغیر کسی نظام کی غلامی کے نہیں مل سکتیں۔

کرٹ اینڈی کو کسی ضروری کام سے ایک دن کے لیے لندن بھیجنا چاہتا تھا۔ کام بہت ضروری تھا۔ اینڈی نے جانے سے انکار کردیا۔ اس کی اپنی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے جرمن بچے کے نزدیک یہ ذاتی مصروفیات کا گناہ کبیرہ ناقابل معافی تھا۔ وہ خود اینڈی کی بجائے لندن چلا گیا لیکن لندن سے واپس آنے کے بعد کرٹ نے اینڈی کو واپس سسٹم انجینئرنگ بھیج دیا کہ اینڈی وہیں سے آیا تھا۔ اس کے بعد کرٹ نے مجھے عارضی طور پر مدیر بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے میرے مدیر کی آسامی پکی کرنے کے کاغذ بھی بھیج دیے جو اعتراض کے ساتھ واپس آگئے کیوں کہ مجھے ماسٹر انجینئر کی ترقی ملے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ جب تک میں کم از کم ایک سال بحیثیت ماسٹر انجینئر کام نہیں کرلیتا میری مزید ترقی

نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ ایک سال جلد گزر گیا۔ اب میں پکا پکا مدیر مطالبات و مواصفات طائرات بن چکا تھا۔

ترقی ذمہ داریاں بھی ساتھ لاتی ہے۔ بحیثیت مدیر مجھے ایویانکس کے ساتھ ساتھ انجن۔ ایئر فریم اور سسٹم کا کام بھی سنبھالنا تھا۔ جہاز کے ان شعبوں میں میرا تجربہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس سب کے ساتھ ساتھ میرے لیے ایک چیلنج اور بھی تھا۔ مواصفات کے شعبے کے ساتھ ہی ساتھ مجھے عقود کا کام بھی دیکھنا تھا۔ اس لیے کہ اس وقت تک مدیر عقود ملازم نہیں رکھا گیا تھا گو کہ تلاش جاری تھی۔ ہفتے کے پانچ دن کا پینتیس (35) گھنٹے کا کام کبھی ستر (70) کبھی اسی (80) گھنٹے تک پہنچ جاتا۔ اس تمام تر سر کھپانے کے باوجود میں نے آج تک جتنی بھی نوکریاں کی ہیں۔ ان سب میں یہ نوکری مجھے سب سے زیادہ پسند تھی۔ جتنا کچھ میں نے بطور مدیر مواصفات سیکھا اور کسی نوکری میں نہیں سیکھا۔ کام کی نوعیت انتہائی معلوماتی بھی تھی اور دلچسپ بھی۔ چیلنج بھی اور خطرناک بھی کہ اگر کوئی کوتاہی ہو گئی تو باہر جانے کا دروازہ ہر وقت کھلا تھا۔

میں مدیر مواصفات کی آسامی پر فائز تو ہو چکا تھا لیکن ایک بات میرے دل میں بری طرح سے کھٹک رہی تھی۔ میرے ماتحت ایک فلپائنی انجینئر کام کر رہا تھا جس کا نام امانڈو ولادو تھا۔ میں نے جس وقت سعودیہ میں بحیثیت سینئر انجینئر نوکری شروع کی ہے اس کے چند ماہ بعد ہی امانڈو نے بحیثیت ماسٹر انجینئر نوکری شروع کی تھی۔ امانڈو کے پاس مختلف جہازوں کے ایئر فریم اور انجن کے لائسنس بھی تھے۔ بہت محنت سے کام کرتا تھا اور انجن اور ایئر فریم کے علاوہ اس کو جہاز کی پرفارمنس (کارکردگی) پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس کے مقابلے میں میرے پاس صرف ایویانکس کا تجربہ اور مینجمنٹ میں Msc کی ڈگری تھی اور عقود کا کچھ تجربہ ہو گیا تھا۔ جہاز میں جو اہمیت ایئر فریم اور انجن کی ہوتی ہے وہ ایویانکس کی نہیں ہوتی۔ ان تمام عوامل کے باوجود کرٹ نے امانڈو کو مدیر مواصفات کیوں نہیں بنایا تھا۔ یہ سوال مجھے بری طرح تنگ کر رہا تھا۔ اتنا ہی کچھ کافی نہ تھا ایک مضحکہ خیز بات اور بھی تھی۔

جب میرے سینئر انجینئر سے ماسٹر انجینئر کی ترقی کے کاغذات داخل کیے گئے تھے تو ان کو امانڈو نے ہی بحیثیت عارضی مدیر مواصفات داخل کیا تھا کیوں کہ ڈاکٹر اینڈی پاول چھٹی پر تھا۔ امانڈو بحیثیت عارضی مدیر کام کر رہا تھا۔ تکنیکی طور پر بھی امانڈو کے تحت کام کر رہا تھا۔ اب یہ صورتِ حال الٹ چکی تھی امانڈو میرے ماتحت کام کر رہا تھا۔ غیر متعلق آدمی کے لیے یہ بات غیر اہم ہے لیکن چونکہ میرا اس سے براہ راست تعلق تھا اس لیے یہ سوالات مجھے بے چین رکھتے تھے مجھے جواب چاہیے تھا۔ میں ایک طرح سے اپنے آپ کو امانڈو کا مجرم سمجھتا تھا کہ جس چیز پر اس کا حق بنتا تھا وہ میں نے چھین لی تھی۔ (جب تک مجھے کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملے گا یہ احساسِ جرم میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا) میں کرٹ سے پوچھنا چاہتا لیکن کسی مناسب موقع پر آخر مجھے یہ موقع مل گیا۔

یہ 1980ء کی بات ہے۔ ان دنوں ہر فرد کے سر پر 2000ء چھایا ہوا تھا۔ اکثر تقریریں شروع ہوتی تھیں۔ جب ہم اکیسویں صدی میں داخل ہوں گے یا کیا ہم اکیسویں صدی کے لیے تیار ہیں۔ کمپیوٹر کی دنیا خاص طور سے متاثر تھی۔ سن 2000ء کو Y2K پکارا جاتا تھا۔ Y2K کا بھوت ہوابازی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ نئے جہاز، نیا مواد، نئے انجن، نئی ایویانکس، اس میں ایویانکس کے منڈھوے تلے ایک کانفرنس منعقد ہونے والی تھی۔ امریکا کے شہر سیڈار ریپڈز میں۔ اس کا اہتمام کولنز کمپنی نے کیا تھا جن کا ہیڈ آفس سیڈار ریپڈز میں تھا۔ کانفرنس کا نام تھا ''ایویانکس 2000'' مجھے اور کرٹ کو اس کانفرنس میں شرکت کرنی تھی۔ سیڈار ریپڈز، ریاست آیووا میں ہے۔ یہ شہر ''ایمز آیووا'' سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع ہے۔ میں ایمز کی یونیورسٹی میں کچھ عرصہ پڑھ چکا تھا لیکن کانفرنس سے پہلے سیڈار ریپڈز آنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ چھوٹا سا شہر کانفرنس کے بعد جانے کے لیے کوئی خاص جگہ نہ تھی۔ رات کا کھانا کھا کر میں اور کرٹ ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ یہ سنہری موقع تھا کہ میں کرٹ سے اپنی الجھن بیان کروں۔

کرٹ تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر مجھ سے پوچھا۔ ''تم اور گریم دونوں ایویانکس میں کام کرتے ہو تم دونوں نے بحیثیت سینئر انجینئر سعودیہ میں نوکری شروع کی اگر مجھے ماسٹر ایویانکس انجینئر چاہیے ہو تو میں تم دونوں میں سے کس کو ترقی دوں گا۔'' میں نے لاعلمی کے انداز میں شانے اچکا دیے۔ کرٹ نے خود ہی جواب دیا۔ ''گریم کو اس لیے کہ وہ تم سے بہتر ایویانکس انجینئر ہے گو کہ تجربہ میں اور عمر میں وہ تم سے کم ہے۔'' پہلی منطق پوری ہو چکی تھی۔ مجھے ڈر ہوا کہ

غرناطہ تو نہیں چھن گیا

جب کوئی ہسپانوی گہری سوچ میں گم ہو تو پوچھا جاتا ہے۔ "کیا غرناطہ یاد آرہا ہے؟" مسلم غرناطہ کو ختم ہوئے صدیاں بیت گئیں۔ الحمرا کے ایوانوں پر ہلال کو غروب ہوئے پانچ سو برس ہونے کو آئے اور اب بھی انہیں غرناطہ یاد آتا ہے۔ ان کے ہم وطنوں نے مسلمانوں کے خلاف مذہب کی مقدس جنت جیت لی...... کچھ عرصے کے لیے اہلِ غرناطہ بھی اس فتح کے جشن میں شریک ہوئے مگر آہستہ آہستہ غرناطہ کے در و دیوار کی اداسی اور الحمرا کے اجڑے ایوانوں کی سوگواری ان کے دلوں میں اترنے لگی...... انہوں نے اپنے شہر میں ہوتے ہوئے بھی اسے کھو دیا تھا...... غرناطہ کی شکست ان کی اپنی شکست تھی...... یہ پچھتاوا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تقویت پکڑتا گیا...... اور آج اہلِ غرناطہ پر اگر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے ہیں۔ "یہ آفت تو معمولی ہے، غرناطہ کے چھن جانے کے صدمے سے کہیں کم......" وہ اداس ہوں تو پوچھا جاتا ہے۔ "غرناطہ تو نہیں چھن گیا؟"

مستنصر حسین تارڑ کی کتاب "اندلس میں اجنبی" سے انتخاب

احکامِ الٰہی

- کیا تم اس بات سے خاطر جمع ہو گئے ہو کہ وہ تم کو خشکی کی طرف لے جا کر زمین میں دھنسا دے، یا تم پر آندھی کا پتھراؤ چلا دے اور اس وقت تم کسی کو اپنا مددگار نہ پاؤ۔
- وہی قادرِ مطلق ہے جو ماں کے پیٹ میں جیسی چاہتا ہے تمہاری صورت بناتا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زبردست حکمت والا ہے۔
- اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو قتل ہوں، انہیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم ان کی زندگی کو نہیں سمجھ سکتے۔
- جو شخص عزت کا خواہاں ہو، اس کو چاہیے کہ خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کرے کیوں کہ عزت ساری خدا کی دین ہے۔

شاید میں نے بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ جب ہر منطق اپنی اختتام کو پہنچ چکی ہو گی تو کرٹ کہے گا۔ ہماری اس گفتگو کا بڑا اچھا اثر ہوا۔ تم نے اچھا کیا کہ اس بحث کے ذریعے میری آنکھیں کھول دیں۔ میرا خیال ہے کہ تم سینئر ایویانکس انجینئر کے روپ میں زیادہ بھلے دکھائی دو گے۔ میں اپنے پیر پر آپ کلہاڑی مارنے میں ماہر ہوں لیکن اب کیا ہو سکتا تھا تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ (میں نے تم کو ماسٹر انجینئر اور مینیجر کی ترقی دے کر سخت غلطی کی ہے) اب کرٹ کی دوسری منطق کی باری تھی۔ فنی معلومات کے حساب سے امانڈو میرا بہترین اثاثہ ہے۔ مجھے ایک دفعہ پھر الٹے بانس بریلی کی طرح اپنی راہیں واپس سینئر ایویانکس انجینئر کی طرف جاتی ہوئی واضح طور پر دکھائی دے رہی تھیں۔ کرٹ نے بات آگے بڑھائی۔ وہ انجینئرنگ کے کنویں کا بہترین مینڈک ہے مگر مدیر کنویں کا باسی نہیں ہوتا اس خدمت کے لیے دریا کا مینڈک چاہیے جو میں تم کو بنانا چاہتا ہوں۔ اب تک تم اس دریا میں ٹھیک طرح سے تیر رہے ہو۔ میری جان میں جان آئی لیکن ابھی کرٹ کو اپنے لیکچر کا آخری ٹکڑا لگانا باقی تھا۔ "تم بحیثیت انجینئر اوسط ہو۔" اوس پھر گرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ خطاب جاری رہا۔

"مگر تمہاری تعلیم اور تمہارا کینیڈا کا تجربہ تم کو ایک کامیاب مدیر بنا سکتا ہے۔ میں نے اسی بنیاد پر تم کو آگے بڑھانے کا خطرہ مول لیا ہے۔" بات اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ میں اور کرٹ اٹھ کر اپنے اپنے کمرے کی طرف نکل گئے۔ کل کانفرنس کا دوسرا دن تھا۔

نیند کی وادی میں ڈوبنے سے پہلے میں سوچتا رہا کہ کرٹ نے مجھے کوئی نئی بات نہیں بتائی تھی یہ ساری کی ساری منطق کتابی علم کی صورت میں، میں برٹش ہم میں پڑھ چکا تھا مگر وہ مردہ صفحات تھے۔ اب وہی منطق جیتی جاگتی صورت میں میرے اپنے اوپر لاگو ہو چکی تھی۔ کرٹ کی ہار صرف میری اپنی ہار کی وجہ سے ہی ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔ مجھے اپنے کاندھوں پر بوجھ بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اگلے روز کانفرنس حسبِ معمول جاری رہی۔ میرے لیے اس میں دو چیزیں دلچسپی کا باعث تھیں۔ پہلی چیز ریڈار کا اینٹینا تھا۔ ریڈار کا اینٹینا اس کے منہ کے اندر لگا ہوتا ہے۔ منہ کو جہاز کی زبان میں نوز کہتے ہیں۔ اب تک یہ اینٹینا ایک گہری پلیٹ کی شکل میں بنائے جاتے تھے لیکن اب یہ اینٹینا ایک نئی شکل میں بنایا گیا تھا جو ایک سپاٹ رکابی کی طرح

تھا۔ اس کے بہت سے فنی فائدے تھے۔ یہ خشک مضمون ہر ایک کے لیے دلچسپی کا باعث نہیں ہوسکتا صرف فنی ماہرین ہی اس غوطہ زنی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس کے بخیے ادھیڑ سکتے ہیں۔ میں اور آپ نہیں۔ دوسری چیز GPS ((1) GPS بنیادی طور پر گیارہ۔ (2) مصنوعی سیاروں پر مشتمل ہے جو زمین کے ساتھ ساتھ گھومتے ہیں۔ زمین کے ساتھ ان کا مقام متعین ہوتا ہے بدلتا نہیں۔ (3) یہ جیو اسٹیشنری اسٹیلائٹ کہلاتے ہیں امریکا نے ان کو خلا میں اس طرح چھوڑا ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں اگر کسی چیز کو کم از کم ان میں سے تین سیاروں سے سگنل پہنچ رہے ہوں تو یہ حتمی طور پر متعین کیا جاسکتا ہے کہ وہ چیز زمین میں کس جگہ موجود ہے)۔

گلوبل پوزیشنگ سسٹم یہ نظام ہر جگہ دستیاب ہے۔ پیدل چلنے والے بھی ہاتھ میں تھامنے والا GPS کا آلہ لے کر اپنا راستہ معلوم کر سکتے ہیں بھٹکنے سے بچ سکتے ہیں۔ پاکستان میں بھی اب یہ نظام گاڑیوں میں بڑے شہروں میں استعمال ہونا شروع ہو گیا ہے۔ مغربی دنیا میں اب زیادہ تر گاڑیاں GPS سے آراستہ ہوتی ہیں جن کے استعمال سے آپ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے تمام راستے ایک اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں۔ اگر کوئی غلط موڑ کاٹ لیں یا کوئی صحیح موڑ نہ کاٹیں تو GPS آپ سے پکار پکار کر شکایت کرے گا کہ آپ راہِ راست سے بھٹک کر شیطانی راستوں کی جانب گامزن ہیں۔

ہوائی جہاز میں یہ نظام نیویگیشن کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن 1980ء میں یہ سہولت عام نہ تھی یہ نظام امریکی حکومت کی ملکیت تھا باہر والوں کو اس کی بھنک تک نہ تھی۔ 1980ء میں امریکی فوج نے شہری ہوا بازی کے ضمن میں پہلی دفعہ اس کے استعمال کی اجازت دی تھی مگر اس شرط کے ساتھ کہ جو بھی نظام GPS کو استعمال میں لا کر بنایا جائے گا اس کی ایکیوریسی سو فیصد نہیں ہو گی۔ اس کا نشانہ اپنے ہدف سے کم سے کم ایک میل اِدھر اُدھر ہوگا۔ ورنہ یہ نظام اتنا مکمل تھا کہ فوجی طیارے اس کو استعمال کر کے زمین پر رکھی ہوئی بالٹی کے اندر کئی سو یا کئی ہزار فٹ کی بلندی سے اس بالٹی کے اندر بم گرا سکتے تھے۔ اس ایکوریسی کا مظاہرہ عراق کی جنگ میں ساری دنیا نے دیکھا۔

تیسرے دن کانفرنس ختم ہو چکی تھی۔ ہم لوگ براستہ نیویارک اور لندن جدہ واپس پہنچے۔

☆......☆

انجینئرنگ کی تنظیم نو کے بعد میرا تعلق صرف نئے خریدے جانے والے جہازوں سے ہو گیا تھا جس میں بوئنگ B-747 اور ائربس A-300-600 شامل تھے۔ پرانے جہازوں سے میرا ناطہ ٹوٹ چکا تھا۔

قابلِ ذکر ائرلائنوں میں ایک شعبہ ہوتا ہے جو عام طور سے فلیٹ پلاننگ کہلاتا ہے۔ اس شعبے کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس بات کا تعین کرے کہ آنے والے دو پانچ یا دس برس میں اس ائرلائن کو کس قسم کے اور کتنے جہاز درکار ہوں گے۔ سعودیہ کے شعبہ فلیٹ پلاننگ نے اس بات کا تعین کر لیا تھا کہ چار نئے L-1011 جہازوں کے ساتھ ساتھ سعودیہ کو اگلے دو سے پانچ برس کے لیے B-747 اور ایک اور قسم ٹائپ کے جہاز درکار ہوں گے۔ B-747 کا ابتدائی کام شروع ہو چکا تھا۔ دوسرے قسم کے جہاز پر کچھ عرصے بعد کام شروع کیا جائے گا۔

انجینئرنگ کے ارکان نے B-747 کے معیاری مواصفات کا تفصیلی مطالعہ مکمل کر لیا تھا۔ اس مطالعے کی بنیاد پر B-747 کے معیاری مواصفات میں جو تبدیلیاں سعودیہ چاہتی تھی ان کا تعین کرنے کے بعد ان تبدیلیوں کا پلندہ CR کے پلندے کی شکل میں بوئنگ کو روانہ کیا جا چکا تھا۔ اب یہ بوئنگ کی ذمہ داری تھی کہ وہ سعودیہ کو مطلع کرے کہ وہ مطلوبہ تبدیلیوں میں سے کون کون سی تبدیلیاں فراہم کر سکتی ہے اور کن شرائط پر۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بوئنگ کو یہ بھی بتانا تھا کہ اگر وہ سعودیہ کی کوئی مطلوبہ تبدیلی نہیں کر سکتی ہے تو اس کی کیا وجوہات ہیں۔ اس تمام کارروائی کی ابتداء کے لیے بوئنگ کے ایک کسٹمر انجینئر کو جدہ آکر سعودیہ کے ساتھ ایک میٹنگ میں شرکت کرنی تھی۔ یہ صرف ابتدائی میٹنگ ہو گی۔ سعودیہ کے مطلوبہ حتمی مواصفات کے لیے کئی میٹنگز درکار ہوں گی۔ ان میں سے کچھ جدہ میں ہوں گی اور کچھ بوئنگ کی فیکٹری میں جو امریکا کی ریاست واشنگٹن کے شہر سیاٹل میں تمیز ایکڑ کے رقبے پر بنائی گئی ہے۔

بوئنگ کے کسٹمر انجینئر کے ساتھ میٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ چائے کا دور بھی ختم ہو چکا تھا۔ CR چینج ریکوسٹ کے پلندے پر سہولت کے ساتھ طبع آزمائی ہو رہی تھی کہ اچانک کسٹمر انجینئر نے تین چار CR ہمارے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ لوگ اپنے جہازوں میں بستر اور سونے کے بنے ہوئے نل کیوں لگوانا چاہتے ہیں؟“ یہ بات

ازراہ مذاق نہ تھی اور نہ ہی چائے میں کوئی قابلِ اعتراض شے گھولی گئی تھی۔

سعودیہ کی اپنی فلیٹ میں اس وقت تک کوئی B-747 شامل نہیں تھا مگر سعودی عرب کے شاہی خاندان کے جہازوں کی اپنی ایک الگ فلیٹ تھی جس کے لیے ایک B-747-SP جہاز آرڈر پر تھا۔ شاہی فلیٹ کے جہازوں کی خریداری اور ان کی دیکھ بھال سعودیہ کی ذمہ داری تھی۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے سعودیہ نے ایک پورا ڈیپارٹمنٹ بنا رکھا تھا جو رائل فلیٹ کہلاتا تھا۔ جہاز میں پلنگ نصب کرنے اور سونے کے نل لگانے کی CR اسی شاہی بیڑے کے B-747 کے لیے جاری کی گئی تھی اور غلطی سے سعودیہ کے اپنے جہازوں کے CR کے پلندہ میں شامل ہو گئی تھی۔ سعودیہ کے مظلوم مسافر اتنے خوش نصیب کہاں کہ خالص سونے کے بنے ہوئے نلکوں سے پانی بہا بہا کر اپنی محنت مشقت کرنے والے ہاتھ دھوتے۔ وہ تو صرف اپنے ہاتھ مل سکتے تھے۔ دوسروں کی شاہ خرچیاں دیکھ دیکھ کر سوچتے کہ ان بے چاروں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔

شاہی بیڑے کے لیے جو جہاز خریدا جا رہا تھا وہ B-747-SP تھا۔ SP اسپیشل پرفارمنس کا مخفف ہے۔ یہ B-747 کے وہ جہاز ہیں جو خاص کارکردگی کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ جہاز اگر کسی ایئرپورٹ پر کھڑے ہوں تو اپنی لمبائی کے کٹھے پن سے پہچانے جاتے ہیں۔ ایک عام B-747 کی لمبائی 232 فٹ ہوتی ہے۔ اس کے فیوز لاج میں سے تقریباً 47 فٹ کا ٹکڑا نکال کر B-747-SP بنایا جاتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جہاز کا وزن کم ہو جاتا ہے جب کہ جہاز کے پیٹرول کے ٹینکوں میں پیٹرول اسی مقدار میں ہوتا ہے کہ جتنا اس سے زیادہ بھاری بھرکم B-747 میں ہوتا ہے۔ اس وزن کے کم ہونے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اتنی ہی مقدار کے پیٹرول میں B-747-SP جہاز B-747 کے مقابلے میں زیادہ فاصلہ طے کرسکتا ہے زیادہ دور تک جاسکتا ہے۔ شاہی بیڑے کے لیے SP جہاز اس لیے خریدا جا رہا تھا کہ یہ جہاز سعودی عرب کے دارالخلافہ ریاض سے امریکا کے دارالخلافہ واشنگٹن ڈی سی تک بغیر راستے میں کہیں رکے ہوئے سفر کرسکے۔

شاہی خاندان کے استعمال کے لیے خریدا جانے والا یہ جہاز کوئی عام جہاز نہیں تھا۔ اس میں بے شمار لوازمات تھے جو ایک عام جہاز کے لیے تصور بھی نہیں کیے جاسکتے۔

جمال، عبدالناصر

(1336ھ/15/جنوری 1918ء

1390ھ/28/ستمبر 1970ء)

مصر کے سابق صدر۔ شمالی مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں بنی مور میں پیدا ہوئے۔ جس گھرانے میں پیدا ہوئے وہ ایک متوسط الحال مصری گھرانا تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں انہیں تعلیم کے لیے قاہرہ بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ نہضتہ المصر ثانوی اسکول میں داخل ہوئے۔ ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد 19 سال کی عمر میں 1937ء میں ملٹری اکیڈمی میں داخل ہوئے۔ ایک سال تکمیل علم سے فارغ ہونے کے بعد جولائی 1938ء میں انفنٹری میں انہیں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے کمیشن مل گیا۔ اس کے بعد تھرڈ کیولری بٹالین کے ساتھ منسلک ہوگئے اور ان کا ملک آباد میں تقرر کیا گیا۔ یہیں پر ان کی انوار السادات زکریا محی الدین اور احمد نور سے ملاقات ہوئی۔ جمال عبدالناصر اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے ملک و ملت کے مسائل میں دلچسپی لیتے رہے تھے۔ خود ان کے قول کے مطابق "میری زندگی میں وہ دن 1935ء کے اس پُرآشوب دور سے بھی پہلے آچکا تھا جب میں طالب علم تھا اور میرے شب و روز فلک شگاف نعروں اور جلوسوں میں بسر ہو رہے تھے۔ 1923ء کے آئین کی بحالی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا جو بالآخر بحال کر دیا گیا۔ میں ان دنوں طلباء کے وفود کے ساتھ قوم کے زعماء کے پاس بھاگا بھاگا پھرتا تھا کہ خدا کے لیے مصر کی خاطر متحد ہو جائیے۔ چنانچہ 1936ء میں جو نیشنل فرنٹ کا قیام عمل میں آیا وہ انہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔"

مرسلہ: انتصار حسین۔ لاہور

دوسرے تمام لوازمات کے ساتھ ساتھ اس جہاز میں ایک اسپتال بھی تھا جس میں سینہ کھول کر دل کا آپریشن کیا جاسکتا تھا جو اس وقت کی ضرورت تھا۔ سعودی عرب کے اس وقت کے بادشاہ شاہ خالد دل کے مریض تھے۔ اس جہاز کے مواصلاتی کمیونیکیشن کے نظام کی قیمت اتنی تھی کہ اس سے ایک نیا B-707 خریدنے کے بعد بھی خاصی بڑی رقم بچ جاتی۔ اس جہاز کی قیمت ایک عام B-747 سے تقریباً تین گنا زیادہ تھی۔ اس جہاز میں مجلس، خواب گاہ، TV وغیرہ لگائے گئے تھے۔

کسٹمر انجینئر کے ساتھ میٹنگ جنوری 1979ء میں منعقد ہوئی تھی۔ جدہ میں بارش یا تو بالکل نہیں ہوتی ہے یا اگر ہوتی بھی ہے تو عام طور سے بہت تھوڑی مقدار میں۔ شاید اس لیے جدہ میں پانی کی نکاسی کا نظام اتنا ہی اعلیٰ ہے جتنا کراچی میں ہے۔ اگر ایک بالٹی پانی بھی سڑک کے اوپر پھینک دیا جائے تو وہ پانی سڑک پر کھڑا ہو جاتا ہے مگر اس سال قدرت کا جدہ میں بارش کا منصوبہ کچھ اور ہی تھا۔

میٹنگ کے دوسرے روز کسٹمر انجینئر کا فون آیا کہ جیسے ہی وہ ہوٹل سے باہر نکلا ایک دم بارش شروع ہو گئی اور اس کے کپڑے بھیگ گئے۔ پھر اس نے کہا۔ ”میں اپنے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد میٹنگ کے لیے آجاؤں گا مجھے صرف پندرہ منٹ لگیں گے۔“ جس ہوٹل میں کسٹمر انجینئر ٹھہرا ہوا تھا ہینگر سے پانچ منٹ پیدل چلنے کے فاصلے پر تھا۔ اسی لیے اس کے کپڑے بھیگ گئے تھے کہ وہ پیدل آرہا تھا۔ گاڑی میں نہیں تھا۔

ابھی دس منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ ایسا لگا جیسے دفتر کی چھت کے اوپر زبردست فائرنگ ہو رہی ہو۔ یہ چھتیں عارضی قسم کی بنی ہوئی تھیں۔ ہمارے دفتر ہینگر کے ہی ایک کونے میں اوپری منزل پر بنے ہوئے تھے۔ کھڑکی سے باہر ہینگر میں جھانکا تو وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ تیز بارش شروع ہو چکی تھی۔ میں ڈھاکا، منیلا اور دوسری کئی جگہوں پر جہاں کثرت سے بارش ہوتی ہے تیز بارش ہوتے ہوئے دیکھ چکا ہوں لیکن ایسی بارش نہ میں نے زندگی میں پہلے کبھی دیکھی تھی اور نہ ہی اس کے بعد دیکھی۔ اگلے روز خبروں سے معلوم ہوا کہ دو گھنٹے کے اندر تقریباً اٹھتر 78 ملی میٹر بارش ریکارڈ کی گئی۔

سعودیہ کے اس زمانے کے ہینگر بہت زیادہ پرانے اور خستہ حال تھے۔ مخدوش بھی تھے۔ خدشہ ہوا کہ کہیں ہینگر کی چھت جہازوں پر نہ گر پڑے۔ اس خطرے کے تحت جو بھی جہاز اس ہینگر میں کھڑے ہوئے تھے ان کو فوری طور پر دھکیل کر Tow کر کے ہینگر سے باہر نکال کر کھڑا کیا گیا۔ باہر بھی قیامت خیز بارش تھی مگر آسمان کے گرنے کا خدشہ نہیں تھا۔ ایسے رومانی موسم میں میٹنگ کا جاری رکھنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔

اگلے روز میٹنگ کے تمام شرکا نے متفقہ طور پر اس بات سے اتفاق کیا کہ عام حالات میں مسافروں کو جہاز میں بستر اور سونے کے تکیے استعمال کرنے کی حاجت نہیں ہو گی۔ اگر پھر بھی کوئی مسافر جہاز میں پلنگ بچھا کر سونا چاہے تو اس کو اپنی چارپائی اپنے کاندھوں پر رکھ کر خود لانا پڑے گی۔ یہ اہم مسائل تو حل ہو گئے مگر FMS پر آکر گاڑی ہچکولے کھا گئی۔ ان ہچکولوں کے نتیجے میں حاضرین میٹنگ کا تمام اخلاقی میک اپ اس بارش کے پانی کی نذر ہو گیا جو ابھی تک جدہ کی سڑکوں پر کھڑا تھا۔

FMS مخفف ہے فلائٹ مینجمنٹ سسٹم کا۔ اس کی تفصیلات پیچیدہ ہیں۔ صرف اتنا سمجھ لیا جائے کہ یہ وہ نظام ہے جو ہوائی جہاز کی اڑان کو اس طرح سے سنبھالتا ہے کہ جہاز کے اڑانے کا خرچا مناسب ترین کی پر رہے۔ کمترین نہیں۔ صرف مناسب ترین...... اور ایندھن کا بہترین استعمال کیا جاسکے۔ جہاز رانی کی دنیا میں یہ ایک بالکل نیا نظام تھا جو متعارف کروایا گیا تھا۔ اس کے وجود میں لانے کا مرکزی محرک تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتیں تھیں۔ اس نظام کو ایک کمپنی آرما (ARMA) نے بنایا تھا اور سعودیہ وہ پہلی ائر لائن تھی جس نے اس نظام کو اپنے L-1011 جہاز میں نصب کروایا تھا۔ حالانکہ سعودیہ کو تیل کے پیسے بچانے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ایک طرح سے آرما نے اسکیمو کے ہاتھ آئس کریم بیچی تھی لیکن اس زمانے میں سعودی عرب کی سوچ میں سب سے بڑا، سب سے اچھا، سب سے پہلا، سب سے اونچا کا عنصر کار فرما تھا۔ سعودیہ کو شاید دنیا کی آخری ائر لائنوں میں ہونا چاہیے تھا FMS کو اپنے جہازوں میں نصب کروانے کے لیے۔ آج صورتِ حال دوسری ہے۔ آج کے بنائے جانے والے FMS حد درجہ کار آمد ہیں اور آج کی ہر ائر لائن کی ضرورت ہے لیکن سعودیہ کے L-1011 میں آج سے چالیس سال پہلے جو FMS لگائے گئے تھے وہ بالکل نیا اور غیر آزمودہ نظام ہونے کے باعث مرمت اور دیکھ بھال کے مسلسل مسائل پیش کرتے تھے لیکن اس کے باوجود سعودیہ آرما کے ہی بنائے ہوئے

FMS کو اپنے B-747 میں بھی لگوانا چاہتی تھی۔ وہی سب سے پہلے والی سوچ کارفرما تھی۔
بوئنگ نے اس سے پہلے FMS پر کام نہیں کیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ائر لائن نے B-747 پر FMS لگانے کی فرمائش کی تھی۔ کسی بھی جہاز میں کوئی بھی نیا نظام لگانا آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لیے نہ صرف یہ کہ جہاز ساز کمپنی کو پیسے اور وقت لگانا پڑتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کو محکمہ شہری ہوا بازی سے Certify یعنی منظور بھی کروانا پڑتا ہے جس کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں جو جہاز ساز کمپنی کے لیے پورے کرنا لازمی ہوتا ہے۔ یہ تقاضے اس لیے ہوتے ہیں کہ جہاز کی سلامتی...... سیفٹی کو یقینی بنایا جاسکے۔ انسانی جانوں کا تحفظ شہری ہوا بازی کا پہلا اصول ہوتا ہے۔ یہ تمام ایسے معاملات تھے جو کسٹم انجینئر کے بس سے باہر تھے۔ اس کے لیے سعودیہ اور بوئنگ کی اعلیٰ سطح کی میٹنگ ضروری تھی۔ چند اور مسائل بھی تھے جو اس میٹنگ میں حل نہیں ہوسکتے تھے۔ ان سب کے حل کرنے کے لیے سعودیہ کی ٹیم کو سیاٹل جانا ہوگا۔ کل میٹنگ کا آخری دن ہوگا مگر اس میں کوئی نیا شوشا نہیں چھوڑا جائے گا۔ صرف اب تک کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے گا اور رپورٹ تیار کی جائے گی۔
اگلی صبح کسٹمر انجینئر آیا تو بے حال لگ رہا تھا۔ اس کو اپنا ٹکٹ کنفرم کروانے کے لیے برٹش ائرویز کے دفتر جانا تھا مگر اس کے ہوٹل سے لے کر شارع فلسطین تک...... جہاں BA کا دفتر تھا گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا تھا جو دو دن پہلے کی بارش کا مرہونِ منت تھا۔ اس پانی کے تالاب میں اس کو ڈیڑھ ہی میل پیدل چل کر BA کے دفتر جانا پڑا اور وہی ڈیڑھ میل پیدل چل کر واپس آنا پڑا۔ کھایا پیا سب ہضم ہو گیا۔ ٹیکسی میں جانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اس کو صرف اس بات کی شکایت تھی کہ حکومت امریکا نے اپنے شہریوں کے لیے کوئی ایڈوائزری نہیں جاری کی تھی کہ وہ جدہ سفر کرنے کا خطرہ مول نہ لیں کیوں کہ جدہ کی سڑکیں بطور سوئمنگ پول کے بھی استعمال کی جاسکتی ہیں۔
جہاز بنانے کے عمل، مینوفیکچرنگ کی پیچیدگیوں کو عام فہم بنانے کی غرض سے اس کو سادہ الفاظ میں یوں سمجھایا جاسکتا ہے کہ بنیادی طور پر جہاز ساز کمپنی صرف جہاز کے مختلف حصوں کو جوڑ کر اسمبل کر کے جہاز کا ڈھانچا بنانے کا اور اس ڈھانچے پر المونیم کی چادریں چڑھانے کا کام کرتی ہے۔ باقی جو بھی چیزیں ہیں وہ کہیں اور کوئی اور کمپنی بناتی ہے۔ جہاز ساز کمپنی صرف ان چیزوں کو جہاز میں نصب کرنے کا کام انجام دیتی ہے۔ ان چیزوں میں زیادہ تر کی فراہمی کی ذمہ داری جہاز ساز کمپنی کی ہی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں سیلر فرنشڈ ایکوپمنٹ کہلاتی ہیں۔ SFE، اس SFE میں جو بڑی بڑی چیزیں ہوتی ہیں ان میں انجن اور لینڈنگ گیئر شامل ہوتے ہیں۔ چند وہ چیزیں کہ جن کی فراہمی کی ذمہ داری ائر لائن کی ہوتی ہے۔ وہ بائر فرنشڈ ایکوپمنٹ BFE کہلاتی ہیں۔ BFE میں سیٹ (Seat) اور گیلی (Galley) وغیرہ شامل ہوسکتی ہیں اگر ائر لائن چاہے تو جہاز ساز کمپنی BFE خرید کر ائر لائن کی جانب سے فراہم کردیتی ہے۔ اس طرح ائر لائن ان چیزوں کی خریداری کے بارے سے بچ جاتی ہے مگر ائر لائن کو اس بچت کی قیمت جہاز ساز کمپنی کو ہینڈلنگ چارجز کی شکل میں ادا کرنی پڑتی ہے جو BFE جہاز ساز کمپنی فراہم کرتی ہے۔ اس کو BFE کی بجائے SPE کہا جاتا ہے۔ سیلز پرچز ایکوپمنٹ۔ اگر آپ اس تمام تفصیل کو اچھی طرح سے سمجھ کر ہضم کرچکے ہیں تو آپ سے گزارش ہے کہ مجھے بھی یہ سلسلہ آسان الفاظ میں سمجھادیں۔ مجھے ابھی تک SFE,BFE اور SPE کے چکر آرہے ہیں۔
انجن گو کہ SFE ہوتا ہے۔ یعنی انجن فراہم کرنا جہاز ساز کمپنی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس کا انتخاب ائر لائن کرتی ہے۔ B-747 کے لیے انجن تین کمپنیاں بنارہی تھیں۔ رولس رائس، جنرل الیکٹرک اور پریٹ اینڈ وٹنی (Pratee & whitney)۔ جی ہاں رولس رائس مشہور زمانہ رولس رائس گاڑیاں بنانے کے ساتھ ساتھ ہوائی جہاز کے انجن بھی بناتی ہے۔ یہی حال جنرل الیکٹرک کا بھی ہے۔ وہ آپ کا گھریلو فریج اور واشنگ مشین بنانے کے ساتھ ساتھ ہوائی جہاز کے انجن بھی بناتی ہے۔ سعودیہ کو ان تینوں کمپنیوں کے انجنوں کا موازنہ کر کے بوئنگ کو اپنے انتخاب سے آگاہ کرنا تھا۔ سعودیہ کے L-1011 جہازوں میں رولس رائس کے انجن لگے ہوئے تھے مگر جو B-747-SP شاہی بیڑے کے لیے خریدا جارہا تھا اس کے لیے پریٹ اینڈ وٹنی کے انجن کا انتخاب کیا جاچکا تھا۔
انجن کے موازنہ میں عام طور سے تین پہلو ہیں جو اہم ہوتے ہیں۔ انجن کی فنی خصوصیات و مواصفات، کمرشل یا مالی پیشکش اور معاونت یعنی سپورٹ، انجن کی خصوصیات

میں مواصفات کے علاوہ جو چیزیں اہم ہوتی ہیں ان میں ایندھن کا خرچ۔ آن ونگ یعنی جہاز پر لگے ہوئے انجن کی مرمت کی آسانی بمقابلہ اس چیز کے کہ انجن کو ٹھیک کرنے یا مرمت کرنے کے لیے جہاز سے اتار کر ورکشاپ لے جانا پڑے۔ انجن کی قوت یا تھرسٹ (Thrusts)۔

مالی معاملات میں انجن کی قیمت کے علاوہ دوسرے بہت سے کاروباری معاملات ہوتے ہیں جو کنسیشن کہلاتے ہیں۔ کنسیشن کی نہ تو کوئی قید ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی حد۔ اس میں جو چیزیں شامل ہوسکتی ہیں اس میں مفت اسپیئر انجن۔ انجن کے فالتو پرزہ جات کم قیمت پر یا مفت۔ انجن مرمت کرنے کے لیے پوری کی پوری ورکشاپ جس کی قیمت اس زمانہ میں پچیس سے تیس ملین ڈالر ہوسکتی تھی۔ مفت انجن کا ٹیسٹ سیل جس میں مرمت کے بعد انجن چلا کر ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔ ائرلائن اگر چاہے تو کنسیشن کے طور پر چاند کا بھی مطالبہ کرسکتی ہے لیکن عام طور سے انجن کے ساتھ چاند سپلائی نہیں کیا جاتا ہے۔

انجن کی سپورٹ میں جو چیزیں شامل ہوتی ہیں اس میں اس جہاز کی مرمت اور اوور ہال کی ٹریننگ۔ وارنٹی، گارنٹی اور فنی ماہرین کی فراہمی شامل ہے۔ انجن کی گارنٹی بھی انواع واقسام کی ہوسکتی ہے۔ مثلاً انجن کی مرمت کا خرچا ایک حد سے زیادہ نہیں بڑھے گا یا انجن ایک حد سے زیادہ ایندھن استعمال نہیں کرے گا اگر یہ حدیں پار ہوجائیں تو انجن بنانے والی کمپنی تاوان ادا کرے گی۔

یہ معلومات اب جیڑا توڑ کے زمرے میں داخل ہو چکی ہیں۔ ہم سب کی عافیت اسی میں ہے کہ اس سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ صرف اتنا بتانا کافی ہوگا کہ اپنا موازنہ ختم کرنے کے بعد سعودیہ نے B-747 کے لیے رولس رائس کے انجن کا انتخاب کیا۔ سعودیہ کے L-1011 جہازوں پر بھی رولس رائس کے ہی انجن لگے ہوئے تھے اور ان کا ماڈل نمبر بھی ایک ہی تھا۔ RB211-524 لیکن ان دونوں انجنوں کی تھرسٹ میں فرق تھا۔ B-747 کے انجنوں کی تھرسٹ زیادہ تھی۔

ابھی جیڑا ٹوٹنے میں تھوڑی سی کسر باقی ہے۔ اس کسر کو پورا کرنے کے لیے یہ بتادوں کہ انجن کے انتخاب سے جہاز ساز کمپنی کو بہت پہلے آگاہ کرنا پڑتا ہے اس لیے کہ ہر انجن جہاز میں مختلف طرح سے فٹ ہوتا ہے اور جہاز کو اس طرح سے بنانا پڑتا ہے کہ منتخب شدہ انجن اس میں فٹ ہوجائے۔

ایک گلاس ٹھنڈا پانی!!

ایک گلاس ٹھنڈے پانی کی طلب اگر آپ کو اپنے گھر میں ہو تو آپ خود فریج سے نکال کر یہ پانی حاصل کرسکتے ہیں یا اگر بیوی پر آپ کا رعب چلتا ہے تو اس سے منگوا سکتے ہیں لیکن اگر آپ کو پانی کی طلب جہاز میں ہو تو اس وقت بیوی آپ کے کام نہیں آسکتی یہ پانی آپ کو ائرہوسٹس سے طلب کرنا پڑے گا۔ اکثر لوگ جہاز میں سفر کرتے وقت کوشش کر کے بیوی کو گھر پر ہی چھوڑ آتے ہیں تاکہ ائرہوسٹس سے بار بار پانی کی فرمائش کرسکیں لیکن ائرہوسٹس یہ پانی اپنے گھر سے نہیں لاتی ہے۔ اس پانی کو حاصل کرنے کے لیے اس کو جہاز میں نصب کی گئی گیلی کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ گیلی BFE ہوتی ہے اس لیے کہ ہر ائرلائن کی مسافروں کے لیے کھانے پینے کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں اور ہر ائرلائن اپنے جہازوں کے لیے گیلی اپنی ان ضروریات کے مطابق بنواتی ہیں۔ عام حالات میں گیلی کوئی اتنا بڑا مسئلہ کھڑا نہیں کرتی لیکن B-747 کچھ الگ تھا۔

B-747 میں چار پانچ گیلی ہوتی ہیں۔ عام طور سے گیلی اس سائز کی ہوتی ہیں کہ یہ سیٹوں کے بیچ والی قطار کی چوڑائی میں فٹ کردی جاتی ہیں لیکن سعودیہ کے B-747 میں ایک گیلی لگی تھی جو بہت زیادہ لمبی تھی۔ یہ جہاز کے دائیں بائیں رخ فٹ نہیں ہوتی تھی۔ یہ جہاز کے اگلے حصے میں آگے پیچھے رخ فٹ ہوتی تھی۔ یہ گیلی اتنی لمبی تھی کہ اس کو جہاز کے دروازوں سے گزار کر جہاز کے اندر نہیں لے جایا جاسکتا تھا۔ اس کو جہاز میں لے جانے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ جہاز کے بنائے جانے کے دوران میں اس کو جہاز پر چڑھا دیا جائے اس کے بعد جہاز کو بند کیا جائے۔ اس وجہ سے اس گیلی کو بنانے والی کمپنی کا انتخاب بھی سعودیہ کو فوری طور پر کرنا تھا۔ یورپ، امریکا اور جاپان میں بہت سی کمپنیاں ہیں جو اس گیلی کو بنارہی تھیں۔ سعودیہ نے اپنی گیلی بنانے کے لیے جاپان کی کمپنی جیمکو (Jamco) کا انتخاب کرنے کے بعد بوئنگ کو مقررہ وقت پر مطلع کردیا۔

گیلی کے انتخاب کے بعد اہم چیزوں میں سے صرف FMS کا مسئلہ حل کرنا باقی رہ جاتا تھا۔ اس کی تفصیل صرف جیڑا توڑ ہی نہیں بلکہ "منہ توڑ" ثابت ہوگی۔ اتنا بتادینا کافی ہوگا کہ اس کے لیے ایک بیچ کا راستہ نکالا گیا جو سعودیہ کو قبول نہیں تھا مگر اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

(جاری ہے)

سونے کی سڑک

سید احتشام

اس جنگل میں موت کا ایک ایسا کھیل شروع ہوا جس کی نظیر دنیائے جرائم میں نہیں ملتی۔ موت ارزاں ہو چکی تھی۔ کسی کی زندگی کی ضمانت نہ تھی لیکن ہوس کا ناگ پھر بھی پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ لوٹے گئے سونے کو برآمد کرنے کے لیے ایک پوری سڑک تعمیر کی گئی۔

جرائم کی دنیا کا سب سے خون ریز واقعہ

''وہ لوگ آرہے ہیں۔'' ٹریگ نے دھڑکتے دل سے سوچا۔

وہ فروری کی ایک سرد رات تھی۔ تینتیس سالہ سابق امریکی سی آئی اے ایجنٹ ٹریگ پچھلے دو ہفتے سے تھائی لینڈ کی ''چیانگ ڈاؤ'' وادی میں پھیلے ہوئے گھنے، پُرخطر جنگل میں ایک کچا راستہ بنوانے کے لیے مزدوروں کی سربراہی کر رہا تھا تاکہ وہ پورے جنگل کو گھیرے میں لے کر وہاں چھپے ہوئے خطرناک اور سفاک ڈاکوؤں کے گروہ کا صفایا کر



کے ان کے قبضے سے تقریباً پانچ کروڑ ڈالر مالیت کا سونا برآمد کرسکے جوانہوں نے ایک ماہ پہلے لوٹا تھا۔
ٹریگ نے بہت آہستگی سے اپنے سلیپنگ بیگ سے ہاتھ نکال کر مزدوروں کے فورمین جیک ملز کا شانہ چھوا۔ وہ بھی دوسرے تمام لوگوں کی طرح گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔
''وہ لوگ گھس آئے ہیں۔'' ٹریگ نے سرگوشی کی۔
''مجھے اس کا پورا یقین ہے۔ فوراً ایکشن میں آجاؤ۔''
وہ لوگ جنگل کے ایک ناہموار قطعہ میں خیمہ زن تھے۔ پچھلی تین راتوں میں ڈاکو ملیشیا گارڈز کی نظروں سے چھپ کر آٹھ تھائی مزدوروں کا گلا کاٹ چکے تھے۔ ان کی اس بہیمانہ واردات نے پوری فورس کا خون کھولا دیا تھا اور اس سے پہلے کہ ڈاکو ان کے پروجیکٹ کو تباہ کرتے ٹریگ نے جوابی حملے کے لیے ایک منصوبہ تشکیل دیا تھا۔
جیک جماہی لیتا ہوا اپنے سلیپنگ بیگ سے برآمد ہوا۔ اس نے ایک انگڑائی لی اور ایک سگریٹ سلگا کر خیمے سے نکل گیا جہاں جنریٹر رکھا ہوا تھا۔ اس نے پھر انگڑائی لی اور جنریٹر سے ٹیک لگا کر اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ ٹریگ نے خیمے سے باہر جھانکا۔ وہ جیک کے اشارے کا منتظر تھا۔ جیک ملز نے سگریٹ زمین پر پھینک دی، پھر گویا اسے اٹھانے کے لیے جھکا اور اگلے ہی لمحے جنریٹر کے اسٹارٹر کی ڈوری کھینچ دی۔ جنریٹر جیسے ہی اسٹارٹ ہوا ٹریگ نے لوکل سوئچ کھینچ دیا۔ آناً فاناً بجلی کے ان تاروں میں ہزاروں والٹ دوڑنے لگے جوانہوں نے کیمپ کے چاروں طرف بچھا رکھے تھے جو جھاڑیوں کے کیموفلاج تھے۔ ایک بھیانک انسانی چیخ سنائی دی اور پھر لگاتار کرب ناک چیخیں سنائی دینے لگیں۔ کیمپ سے تقریباً پچاس فٹ پر واقع جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں آگ بھڑک اٹھی۔ ٹریگ نے پھر سوئچ کو کھینچا۔ ایک جھلسا ہوا آدمی ان شعلہ زن جھاڑیوں سے لڑکھڑاتا ہوا نکلا۔ اس کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ ایک تھائی مزدور تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے لوہے کی ایک سلاخ نہایت بے رحمی سے اس ڈاکو کی کھوپڑی میں اتار دی۔
ٹریگ کے ایک ساتھی کازیک نے دوسرا سوئچ کھینچا اور درختوں پر سیٹ کی ہوئی روشنیوں سے جنگل کا وہ حصہ بقعہ نور ہوگیا۔ کازیک ٹریگ اور جیک کی طرف بھاگا۔
''ہمارا منصوبہ کامیاب ہوگیا۔'' وہ چیخا۔ ''ہم نے ان بدمعاشوں کا کام تمام کردیا۔''
کچھ فاصلے پر گولیاں چلنے لگیں۔ وہ یقیناً ملیشیا گارڈز تھے جو بچ کر فرار ہونے والے ڈاکوؤں پر فائرنگ کررہے تھے۔ ٹریگ، جیک اور کازیک احتیاط سے جنگل میں داخل ہوگئے۔ وہاں انہیں بریتائی ہوئی مزید چار لاشیں ملیں۔
''اگر یہ لاشیں انہیں دکھادی جائیں تو وہ دوبارہ حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں کریں گے۔'' کازیک نے خیال آرائی کی۔
''ممکن ہے، وہ اب اس طرح سے نہیں کسی اور طرح سے حملہ آور ہوں۔'' ٹریگ بولا۔ اس کی سرد آنکھیں جنگل کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ''یہ پہلی جھڑپ تھی۔ ابھی ہم یہ نہیں جانتے کہ ہمیں کن مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ اب یا تو وہ رہیں گے یا ہم۔ سورت ترنگ کو بہت جلد اس کا احساس ہو جائے گا۔''

☆☆☆

امریکا اور ویت نام میں ہونے والی جنگ کے دوران میں ٹریگ سائیگون میں متعین تھا لیکن جنگ بندی کے فوراً بعد اس نے سی آئی اے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ چونکہ اسے جنگ کا خاصا تجربہ تھا لہٰذا اسے تھائی گورنمنٹ میں فوراً ہی نوکری مل گئی تھی۔ ان دنوں تھائی گورنمنٹ ڈاکوؤں کا قلع قمع کرنے کے منصوبے پر عمل کرنے کے اقدامات کررہی تھی جنہوں نے عوام کا سکھ چین چھین لیا تھا۔ حکومت نے ان کی سرکوبی کے لیے فوج سے مدد طلب کی تھی۔ ٹریگ کو ایک نئی بٹالین کے ساتھ جو ڈاکوؤں کا صفایا کرنے کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔ ٹریننگ پر بھیج دیا گیا۔ وہ ٹریننگ سے لوٹا تو اسے ہیڈ کوارٹر طلب کرلیا گیا جہاں میجر لوم لوئی اس کا منتظر تھا۔ ڈسٹرکٹ ملیشیا کا یہ دبلا پتلا خوبرو کمانڈر اپنی دلیری اور بدعنوانی دونوں کے لیے یکساں طور پر مشہور تھا۔ وہ ٹریگ کو دیکھ کر مسکرایا جس سے وہ پہلے بھی ایک بار مل چکا تھا۔
''مسٹر ٹریگ۔'' وہ مخاطب ہوا۔ ''ہم دونوں امیر بننے والے ہیں۔''
''وہ کیسے؟'' ٹریگ نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔ وہ اس کی بری شہرت سے خوب واقف تھا۔
''تم نے سونے کی سڑک کے بارے میں ضرور سنا ہوگا۔''
''ہاں۔'' ٹریگ نے اثبات میں سر ہلایا۔

بینکاک میں واقع یہ سڑک چھ بلاک طویل تھی جہاں سیکڑوں ہنرمند سونے کو پتیوں کی شکل میں ڈھالتے تھے۔ تھائی باشندے سونے کی وہ پتیاں شہر کے بے شمار مندروں کے میناروں اور ذاتی جواہرات میں استعمال کرتے تھے۔

''سورت ترنگ کے ٹولے نے اسے لوٹ لیا۔'' لوم نوئی نے دھماکا کیا۔

''کیا؟'' ٹریگ بھونچکا رہ گیا۔ ''تمہارا مطلب ہے..... پوری سڑک لوٹ لی؟''

میجر اداسی سے مسکرایا۔ ''پوری سڑک۔'' وہ بولا۔ ''حیرت انگیز بات ہے...... ہے نا؟ اس شخص کی ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے جس نے یہ سوچا۔ آج سے ایک ہفتہ قبل سورت ترنگ اور اس کے سو سے زیادہ آدمیوں نے فوج سے چرائی ہوئی دو بکتر بند گاڑیوں سے پوری سڑک بلاک کر دی اور ایک ایک دکان اور فیکٹری کو لوٹ کر فرار ہو گئے۔ لوٹی جانے والی سونے کی اینٹوں اور پتیوں کی مالیت پانچ کروڑ ڈالر ہے۔''

''اور جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو پولیس کیا کر رہی تھی؟'' ٹریگ نے پوچھا۔ وہ لوم نوئی کی بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔

''اوہ، انہوں نے روکنے کی کوشش کی۔'' میجر بولا۔ ''لیکن وہ اتنے تجربے کار اور جنگجو نہیں تھے۔ چودہ پولیس والے ہلاک ہو گئے جب کہ ان کے مقابلے میں ایک ڈاکو بھی ہلاک نہیں ہوا۔''

''تو ہم اس واردات سے امیر کیسے ہو جائیں گے؟'' ٹریگ پوچھ بیٹھا۔ اس کے تجسس میں ہر لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔

''ان کا سراغ لگا لیا گیا ہے جو چیانگ ڈاؤ وادی تک رہنمائی کرتا ہے۔'' میجر نے وضاحت کی۔ ''جیسا کہ تم جانتے ہو برما کی سرحد کے قریب واقع وہ علاقہ جنوب مشرقی ایشیا کا سب سے دشوار گزار، کٹا پھٹا خطہ ہے جو گھنے جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس خطے کو پرہل پلین کہتے ہیں۔''

ٹریگ، پرہل پلین کے تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ وہ کئی بار ہیلی کاپٹر سے اس کے اوپر سے گزر چکا تھا۔ فضا سے یہ خطہ سبزے کی ٹھوس دیوار دکھائی دیتا تھا۔ ڈاکوؤں کی بہترین پناہ گاہ۔

''وہ ڈاکو اسی وادی میں روپوش ہیں۔'' میجر لوم نوئی نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میرے آدمی وہاں سے نکلنے والے ہر راستے پر متعین ہیں۔ ڈاکوؤں کی ٹولی ایک ایک کر کے بے شک وہاں سے نکل سکتی ہے لیکن وہ اپنے ساتھ لوٹا ہوا سونا لے کر نہیں نکل سکتے اور سورت ترنگ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرے گا۔ اس کی بجائے وہ ہم سے دو دو ہاتھ کرنا پسند کرے گا لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے آدمی بکتر بند گاڑیوں کے بغیر ان کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکیں گے۔''

''بمباری کر کے انہیں وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔'' ٹریگ نے خیال پیش کیا۔

''اب رہنے بھی دو مسٹر ٹریگ۔'' میجر استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''بمباری نے ویت نام کے جنگلوں میں کیا بگاڑ لیا تھا؟ نہیں...... ہم صرف بکتر بند گاڑیوں ہی سے ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔''

''یہ ممکن نہیں۔'' ٹریگ نے جواب دیا۔ ''یہ بات تو تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتا ہوں کہ چیانگ ڈاؤ وادی میں کوئی سڑک نہیں ہے۔''

''پھر تو ہمیں سڑک تعمیر کرنی پڑے گی۔'' لوم نوئی شانے اچکا کر بولا۔ ''جنگلوں میں بنائی جانے والی ایک پگڈنڈی سے بھی کام چل جائے گا لیکن یہ کام برسات شروع ہونے سے پہلے مکمل کرنا پڑے گا۔ تم تو یہاں کی برسات سے بھی واقف ہو۔''

''بہت اچھی طرح۔'' ٹریگ نے کہا۔ ''لیکن یہ ناممکن ہے۔ برسات میں اب ایک ماہ بھی نہیں رہا ہے۔''

''تمہیں اس محنت کا پورا پورا صلہ ملے گا۔'' میجر بول پڑا۔ ''بینکاک کے سونے کے تاجروں نے ان کو لوٹا ہوا سامان برآمد کرنے والوں کو تین چوتھائی ملین ڈالر کی پیشکش کی ہے۔ لہٰذا اس کی آدھی رقم میری اور میری ملیشیا کی جیب میں جائے گی اور آدھی تمہیں مل جائے گی۔ کہو کیا خیال ہے؟''

ٹریگ اتنی خطیر رقم کا سن کر چکرا گیا۔ اس کا ذہن پہلے ہی جنگل کو کاٹ کر اس میں سے راستے بنانے کے مسئلے پر کام کر رہا تھا اور پھر تھوڑی دیر غور و خوض کرنے کے بعد اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ ایک امریکی تعمیراتی کمپنی پچھلے سال سے دریائے سیلون پر ہائیڈرو الیکٹرک بند بنانے میں لگی ہوئی تھی۔ دریائے سیلون پرہل پلین سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ٹریگ جانتا تھا کہ برسات شروع ہوتے ہی ان کا کام رک جائے گا۔ اب اگر وہ اس کمپنی کے فورمین اور اس کے مزدوروں کو اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے

آباد کرسکے جو اس کے ذہن میں تھا تو......

☆☆☆

اگلے ہی روز وہ اور میجر لوم نوئی، دریائے سیلون پر پہنچ گئے اور فورمین جیک ملز کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

"لیکن ہمارے پاس ایسا کوئی سامان نہیں ہے جو......" فورمین جیک ملز نے احتجاج کیا۔

"اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔" لوم نوئی بول پڑا۔ "اگر تم نے میری پیش کش قبول نہیں کی تو میں تمہارا سارا سامان عارضی طور پر ضبط کرسکتا ہوں۔ میرے آدمی بے شک ان مشینوں کے استعمال میں زیادہ مہارت نہیں رکھتے اور......"

"بس۔" ملز نے ایک گہری سانس لی۔ "میں سمجھ گیا لیکن میں خبردار کرتا ہوں۔ برسات شروع ہونے والی ہے اور اس سے پہلے اس منصوبے کی تکمیل کا کوئی امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔"

"ہم کوشش تو کرہی سکتے ہیں۔" میجر فلسفیانہ انداز میں بولا۔

اس کے بعد وہ اور ٹریگ وہاں سے رخصت ہوگئے۔ ان کے رخصت ہوتے ہی ملز نے اپنے ایک ماہر کاریگر اور ہیوی مشینری آپریٹر کلائیڈ کو طلب کرلیا۔

"میں جانتا ہوں۔ تم لوگ چھٹی پر جانا چاہتے ہو اور یہ تمہارا حق بھی ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ ابھی نہ جاؤ۔ لوم نوئی پاگل ہے لیکن وہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ ہم نے اگر اس کی بات نہ مانی تو وہ ہمارے بلڈوزر اور دوسرے آلات زبردستی لے جائے گا اور جب ہم برسات ختم ہونے کے بعد دوبارہ کام شروع کرنے کے لیے آئیں گے تو ہمیں یہاں لوہے کے زنگ آلود ٹکڑوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اس کے علاوہ اگر اس وحشیانہ جوئے کی بازی ہمارے ہاتھ رہی تو ہم بہت مالدار بھی ہوسکتے ہیں۔ ٹریگ نے انعام کی آدھی رقم ہمیں دینے کی پیش کش کی ہے۔" انہوں نے آپس میں صلاح ومشورہ کرنے کے بعد اس مشن میں حصہ لینے پر اپنی رضامندی ظاہر کردی۔

"لیکن ہم اپنا سازوسامان چیانگ ڈاؤ وادی میں کیسے پہنچائیں گے؟ یہ تقریباً پچاس میل لمبا سفر ہے۔" کلائیڈ نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"لوم نوئی کے اسکاؤٹس نے ہاتھی کی گزرگاہ کا پتا چلایا ہے جو بالکل وادی کے کنارے تک جاتی ہے۔" ملز نے جواب دیا۔ "لوم نوئی قسم کھا کر کہتا ہے کہ چار پہیوں والی گاڑی اس پر سے گزر سکتی ہے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" کلائیڈ بڑبڑایا۔

☆☆☆

ان کے سفر کا آغاز دو دن کے بعد ہوا۔ ان کا سازوسامان چھ ٹرکوں پر لدے ہوئے پیٹرول، اشیائے خورونوش، اسلحہ جات، کدال اور دیگر چیزوں پر مشتمل تھا۔ تین بلڈوزر اس کے علاوہ تھے۔ لوم نوئی کی ملیشیا پیدل ان کی رہنمائی کررہی تھی جن میں ڈیم پر کام کرنے والے پانچ سو تھائی مزدور بھی شامل تھے۔ یہ عظیم الشان پارٹی ایک خطرناک سفر کے بعد جنوری میں ایک Base کیمپ پہنچی جو ملیشیا نے بنایا تھا۔ اس موقع پر ٹریگ، میجر لوم نوئی سے ملا اور انہوں نے وادی کا چارٹ سامنے رکھ کر تفصیلات طے کیں۔

"یہ بہترین جگہ ہے جہاں سے ہم کام کا آغاز کرسکتے ہیں۔" میجر نے کہا۔ "ہمیں جنگل کے بیچ سے وادی کے دوسری طرف شمالی درے تک پہنچنے کے لیے صرف دس میل کی مسافت طے کرنی پڑے گی۔"

یہاں کے دس میل کہیں اور کے ہزار میل کے برابر ہیں۔ ٹریگ بولا۔ "میں نے آج تک اتنی گھنی جھاڑیاں نہیں دیکھیں۔ ہمیں تقریباً پانچ میل تک پہاڑ کے پہلو میں راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنا پڑے گا اور یہ جان جوکھم کا کام ہے۔"

اگلے دو ہفتے تک ٹریگ اپنے مزدوروں سے روزانہ سولہ گھنٹے کام لے کر اس گھنے جنگل میں سڑک بنواتا رہا۔ چند دنوں کی مشقت کے بعد وہ لوگ بالکل روبوٹ بن چکے تھے۔ لنچ کے وقفے میں جلدی جلدی دو چار لقمے زہر مار کرتے اور کام ختم ہونے پر زمین پر ڈھیر ہوکر دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوجاتے۔ پھر بھی سڑک انچوں کے حساب سے بن رہی تھی۔ ہر صبح ٹریگ اپنے خیمے سے آنکھیں ملتا ہوا برآمد ہوتا اور آسمان کی طرف دیکھ کر اطمینان کی ایک گہری سانس لیتا۔ مقام شکر تھا کہ اب تک گہرے بادل نظر نہیں آئے تھے اور یہ بڑے اطمینان کی بات تھی کہ ابھی بارش کے آثار نہیں تھے۔

27 جنوری کو پہلی ضرب اس وقت پڑی جب میجر لوم نوئی، ٹریگ کے خیمے میں داخل ہوا۔ اس کے ماتھے پر سوچ و فکر کی گہری شکنیں تھیں۔

"مجھے آدھی فورس کو 'بان پوا' لے جانے کے

احکامات ملے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''میرے علاقے میں ربر کی کاشت پر کمیونسٹوں کے کئی بار حملے ہو چکے ہیں۔ پھر بھی تمہارے پاس بہت سے گارڈز رہ جائیں گے۔ تم جیسے ہی مجھے اطلاع دو گے کہ سڑک بن گئی ہے، میں لوٹ آؤں گا۔ اس کے علاوہ مجھے یقین ہے کہ ڈاکوؤں کے سرغنہ سورت تنگ کو اب تک اس بات کا علم نہیں ہو سکا ہو گا کہ ہم لوگ وادی میں موجود ہیں۔''

''اب رہنے بھی دو لوم۔'' ٹریگ نے اسے پھٹکارا۔ ''ہمارے یہاں وارد ہوتے ہی اسے اس بات کی اطلاع مل چکی ہو گی۔ اس کے جاسوس اتنے بے خبر نہیں ہیں۔ خود میں نے اپنی آنکھوں سے اس کے دو جاسوس دیکھے ہیں۔''

ٹریگ کی پریشانیاں جلد سامنے آ گئیں۔ نصف ملیشیا فورس کے رخصت ہو جانے کی وجہ سے کیمپ کی سیکیورٹی بے حد متاثر ہوئی۔ 10 فروری کو وہ لوگ نیند سے بیدار ہوئے تو تین خوابیدہ تھائی مزدوروں کا گلا کٹا ہوا پایا۔ اس دن کے بعد ڈاکو تابڑ توڑ حملے کرنے لگے۔ وہ بھوتوں کی طرح جنگل میں داخل ہوتے اور مزدوروں کا گلا کاٹ کر غائب ہو جاتے۔ تب جیک ملزنے جنگل کو ''بوبی ٹریپ'' کرنے کی اسکیم تیار کی اور انہوں نے کیمپ کے چاروں طرف بجلی کے تار بچھا کر انہیں پتوں اور جھاڑیوں سے چھپا دیا۔ یہ اسکیم کامیاب رہی۔ پانچ ڈاکو جل بھن کر جہنم رسید ہو گئے لیکن یہ چھوٹی سی فتح ٹریگ کے موڈ میں تبدیلی نہیں لا سکی۔ انہوں نے پانچ میل کا احاطہ کر رکھا تھا لیکن سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کر راستہ بنانے کا کام ہنوز باقی تھا۔

18 فروری کو وہ جنگل سے عارضی طور پر نکل کر چڑھائی پر کام کرنے لگے۔ اگلے ہفتے تک ڈاکوؤں کی طرف سے بالکل خاموشی رہی اور ٹریگ کو جلد ہی اس کا سبب معلوم ہو گیا۔ وہ لوگ 25 فروری کی صبح پاور بیلچے کی مدد سے بارود سے اڑائی گئی چٹانوں کے بڑے بڑے ٹکڑے ہٹانے میں مصروف تھے کہ اوپر چوٹی پر زوردار گڑگڑاہٹ ہونے لگی اور پھر یہ شور حد سے زیادہ بڑھنے لگا۔ ٹریگ چڑھائی پر اور لوگوں سے ذرا پیچھے کی طرف کھڑا اگلی چٹانوں کو اڑانے کے سلسلے میں کازیک سے گفتگو کر رہا تھا کہ معاً اس نے دیکھا کہ ڈھلوان پر ٹنوں مٹی اور بڑے بڑے تودے لڑھکتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ سیلاب بلاخیز پاور بیلچے سے ٹکرایا اور وہ ٹنوں وزنی مشین کسی پلاسٹک کے کھلونے کی مانند اڑ گئی۔

مزدوروں کی چیخ و پکار نے قیامت صغریٰ بپا کر دی۔

نہ جانے کتنے مزدور زندہ درگور ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ ٹریگ اور کازیک جائے حادثے پر پہنچتے، پاور بیلچہ سیکڑوں فٹ کی گہرائی میں کسی پچکے ہوئے کھلونے کی مانند پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کلائیڈ بھی جو اسے آپریٹ کر رہا تھا اجل کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ پہلا امریکی تھا جو اس خطرناک مہم میں کام آ گیا تھا۔ مزدور بیلچوں کی مدد سے مٹی ہٹا کر اپنے زندہ درگور ہونے والے ساتھیوں کو نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اچانک ہی گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور ٹریگ کے پہلو میں کھڑے ہوئے ایک مزدور نے اپنا گلا پکڑ لیا۔ اس کی انگلیوں کے درمیان سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ مزید گولیاں چلیں اور قبل اس کے کہ کوئی کچھ سمجھ پاتا تقریباً ایک درجن تھائی مزدور ڈھیر ہو چکے تھے۔

ٹریگ نے چابک دستی سے اپنا ریوالور نکال لیا اور ایک بلڈوزر کی آڑ لیتا ہوا ملیشیا کے لیفٹیننٹ تک پہنچنے کی

علی بن محمد جرجانی

(740ھ 1339ء۔ 816ھ 1413ء)

کنیت ابوالحسن المعروف سید شریف۔ ایک عالم دین و مصنف استرآباد کے قریب تاجو میں پیدا ہوئے۔ 766ھ/1365ء میں وہ قطب الدین محمد الرازی التحتانی سے علم حاصل کرنے کی خاطر ہرات گئے لیکن انہوں نے اپنے شاگرد مبارک شاہ سے جو مصر میں مقیم تھے تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ 770ھ/1368ء تک وہ ہرات ہی میں ٹھہرے رہے۔ اس کے بعد قرمان گئے اور محمد الفناری کی شاگردی اختیار کی بعد میں ان کے ہمراہ مصر گئے اور مبارک شاہ اور اکمل الدین کے درس سے مستفیض ہوئے۔ 776ھ/1374ء میں قسطنطنیہ کا سفر کیا اور پھر وہاں سے شیراز پہنچے جہاں پر 779ھ/1377ء میں شاہ شجاع نے انہیں معلم مقرر کیا۔ جب تیمور نے شیراز فتح کیا تو سید شریف کو اپنے ساتھ ہی سمرقند لے گیا۔ یہاں پر ان کی سعد الدین تفتازانی سے بحثیں ہوئیں۔ تیمور کی وفات کے بعد سید شریف شیراز واپس آ گئے۔ سید شریف نے مختلف موضوعات پر پچاس سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ فارسی زبان میں منطق اور صرف و نحو کی کتابیں لکھیں۔ متکلم کی حیثیت سے انہوں نے فلسفے کو بہت بڑا مقام دیا۔

مرسلہ: بدرالدین۔ گجرات

کوشش کرنے لگا جسے لوم توئی انچارج بنا کر گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ لیفٹیننٹ تودوں کے درمیان چھپا بیٹھا تھا۔ ٹریگ اس کے سر پر پہنچ گیا۔

''تم نے اپنے آدمیوں کو اوپر درّے میں کیوں نہیں متعین کیا تھا؟'' اس نے برہمی سے پوچھا۔ ''مٹی اور تودوں کا یہ خوف ناک سیلاب تخریبی کارروائی تھی جس میں کئی جانیں ضائع ہوگئیں اور اب یہ لوگ گولیوں کا نشانہ بن رہے ہیں۔''

''اوپر بہت خطرہ تھا۔'' دہشت زدہ لیفٹیننٹ نے جواب دیا۔ ''میرے آدمی بلندی سے چلائی جانے والی گولیوں کا نشانہ بن جاتے۔''

ٹریگ نے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی۔ ''انہیں اوپر جانے کا حکم دو ورنہ میں تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔'' وہ چیخا۔

لیفٹیننٹ نے چیخ کر سڑک کے کنارے کھڑے فوجیوں کو حکم دیا اور پھر وہ اور ٹریگ فوجیوں کی رہنمائی کرتے ہوئے ڈھلان پر چڑھنے لگے۔ ان کے چاروں طرف گولیاں چل رہی تھیں۔ پھر بھی وہ جان جوکھم میں ڈال کر کسی نہ کسی طرح بچتے بچاتے اوپر پہنچ گئے اور دیکھا کہ پندرہ بیس ڈاکو مغرب کی سمت فرار ہو رہے تھے۔

''فائر۔'' لیفٹیننٹ نے چیخ کر حکم دیا۔

فوجیوں نے فائر کھول دیا۔ ساتھ ہی ٹریگ کا ریوالور بھی شعلے اگلنے لگا۔ آٹھ ڈاکو وہیں ڈھیر ہوگئے۔ باقی نے چٹانوں کی آڑ لے کر راہ فرار اختیار کی۔

''اپنے آدمیوں کو یہیں متعین کیے رکھو۔'' ٹریگ نے لیفٹیننٹ سے کہا۔

اب اسے اپنے غصے پر افسوس ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ نوجوان لیفٹیننٹ ابھی دیگر ملیشیا کی طرح کم تربیت یافتہ تھا۔ غالباً وہ لوم توئی کو رشوت دے کر لیفٹیننٹ بن گیا تھا۔ ''مجھے اپنے رویے پر افسوس ہے۔'' ٹریگ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن ہمارا تحفظ ہر قیمت پر ہونا چاہیے۔''

لیفٹیننٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا مگر اگلے ہی لمحے کسی سمت سے چلنے والی گولی نے اس کا سر اڑا دیا۔ یقیناً کوئی ڈاکو گھات لگائے بیٹھا ہوا تھا۔

☆☆☆

اس دن سے ٹریگ نے ملیشیا اور مزدور دونوں کی کمان خود سنبھال لی۔ اگرچہ ملیشیا بہتر تحفظ فراہم کر رہی تھی پھر بھی جانی نقصان کا سلسلہ جاری تھا۔ ڈاکو گھات لگا کر فائر کرتے تھے۔ صرف ایک ہی حقیقت مزدوروں کو کام چھوڑ کر بھاگنے سے روکے ہوئے تھی اور وہ حقیقت یہ تھی کہ ''پر پل پلین'' سے پیدل سفر کر کے نکلنا خودکشی کرنے کے مترادف تھا۔

سڑک کی تعمیر جاری تھی۔ ایسے میں ٹریگ کو ایک نئی تشویش نے آن گھیرا۔ حالانکہ سورت ترنگ کے آدمیوں کی تعداد ملیشیا کے جوانوں کی تعداد سے ہرگز کم نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے اب تک اپنے ساتھیوں سمیت ان پر بھرپور حملہ نہیں کیا تھا۔ وہ ان لوگوں کے مقابلے میں بہت زیادہ غضب ناک تھا۔ اسے یقیناً اس طرف سے پورا اطمینان ہوگا کہ یہ لوگ برسات شروع ہونے سے پہلے پہلے اپنا کام ختم نہیں کر سکیں گے۔ لہٰذا وہ اپنے آدمیوں کو خوا مخواہ خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ تاوقت یہ کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور نہ ہو جاتا لیکن اب ایسی علامتیں واضح طور پر نظر آنے لگی تھیں کہ اس سال برسات دیر سے شروع ہوگی اور جونہی سڑک، جنگل سے گزر کر شمالی درے تک بن جاتی، فوج ہر طرف سے ٹوٹ پڑتی اور ان ڈاکوؤں کو ان کی کمین گاہوں سے نکال پھینکتی۔

اس خیال سے پریشان ہو کر ٹریگ نے بذریعہ ریڈیو لوم توئی سے رابطہ قائم کیا اور اسے مزید فوج کے ساتھ آنے کی ہدایت کی لیکن اس کا جواب ہمیشہ کی طرح یہی تھا کہ جب وقت آئے گا تو وہ پہنچنے میں دیر نہیں کرے گا۔ کام جاری رکھو۔ اس نے کہا۔

مارچ کے پہلے ہفتے میں ٹریگ اس بات کا قائل ہو گیا کہ کام بچ بچ وقت پر ختم ہو سکتا ہے۔ اب تک تھوڑی بہت بوندا باندی ہوئی تھی اور ایک میل سے بھی کم طویل سڑک بننی رہ گئی تھی۔ چنانچہ ٹریگ نے گفت و شنید کے لیے کازیک کو اپنے خیمے میں طلب کر لیا۔

''ہمیں حقائق کا سامنا کرنا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اگلے چند دنوں میں ہمیں زبردست بحران کا اندیشہ ہے۔ یہ دہقان جنہیں ملیشیا کہا جاتا ہے بہت برہم ہیں۔ مزدور بھی خوش نہیں ہیں اگر ڈاکوؤں نے بھرپور حملہ کر دیا تو یہ سب بھاگ جائیں گے۔''

''ممکن ہے، میں خود بھی بھاگ جاؤں۔'' کازیک غرایا۔ ''یہ سراسر خودکشی ہے۔ مجھے سب سے زیادہ غصہ اس بات پر آرہا ہے کہ وہ بدمعاش لوم توئی اپنی شکل نہیں دکھا رہا

ہے۔ شاید وہ اس وقت بینکاک میں کسی طوائف کے کوٹھے پر بیٹھا داد عیش دے رہا ہوگا۔"

"بھاگنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔" ٹریگ نے کہا۔ "ایک زبردست معرکہ متوقع ہے اور ہمیں اس کے لیے تیاری کرنی ہے۔ ہمیں ایک سہولت ہے جو ڈاکوؤں کو حاصل نہیں ہے وہ یہ کہ ہمارے پاس گاڑیاں ہیں اور ان کے پاس نہیں ہیں۔"

☆☆☆

اگلی رات ٹریگ، اس کے امریکی ساتھیوں اور ملیشیا نے معرکے کی تیاری کرلی۔ ان لوگوں کے پاس 30 کیلبر کی تین مشین گنیں تھیں۔ یہ مشین گنیں بلڈوزروں پر نصب کردی گئیں اور ترپال سے ڈھک دی گئیں۔ کازیک اور اس کے ساتھیوں نے Covered fuse کو ڈائنا مائیٹ کی اسٹکس میں بھرنے کا انتہائی خطرناک کام انجام دیا پھر انہوں نے چار اسٹکس کے گرد ربر لپیٹ کر انہیں بم بنا دیا۔ پو پھٹنے تک ان کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ پھر دن کا کام معمول کے مطابق شروع ہوگیا۔

ٹریگ، جیک طنز اور کازیک نے حسبِ معمول پہلی شفٹ میں بلڈوزر سنبھال لیے جن پر ترپال سے ڈھکی ہوئی مشین گنیں نصب تھیں۔ ٹریگ کو ان تین فوجیوں پر ترس آرہا تھا جو اس کی سیٹ کے پیچھے ترپال کے اندر مشین گنیں سنبھالے ہوئے تھے۔ سورج آگ برسا رہا تھا اور وہ خود پسینے سے شرابور ہوگیا تھا۔ ان تین فوجیوں کا نہ جانے کیا حال ہو رہا ہوگا۔

"معرکہ شاید آج ہی شروع ہو جائے۔" لنچ کے دوران میں طنز غرایا۔ "دوسری طرف ایسی خاموشی ہے کہ ایک ڈاکو بھی نظر نہیں آیا ہے۔ یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بھی ہوسکتی ہے۔"

"یہی بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔" ٹریگ بولا۔

اس کے ایک گھنٹے بعد جب مزدور کھلی فضا میں جس کے چاروں طرف گھنے جنگلات تھے۔ سڑک بنانے میں مصروف تھے کہ اچانک ڈاکوؤں نے حملہ کردیا۔ وہ درختوں پر چھپے بیٹھے تھے۔ یکا یک پوری فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ پہلی باڑھ میں اٹھارہ ملیشیا اور مزدور ڈھیر ہو گئے۔ ٹریگ اور دوسرے امریکی فوراً ایکشن میں آ گئے۔ وہ تینوں بلڈوزروں کو مثلث کی شکل میں دفاعی پوزیشن میں لے آئے۔ ان کے ٹریکٹرز ان سے بیس فٹ کے فاصلے پر تھے۔

"ان کی دوسری فائرنگ کا انتظار کرو۔" ٹریگ نے چیخ کر اپنے پیچھے ترپال میں چھپے ہوئے ملیشیا کے جوانوں کو ہدایت کی۔

وہ پہلے ہی اپنے بلڈوزر سے کود کر اس کے ٹائروں کی آڑ لے چکا تھا۔ فورمین چیخ چیخ کر مزدوروں کو بلڈوزروں کی آڑ لینے کی ہدایت کر رہا تھا۔ مشین گنوں پر سے ترپال ہٹا۔ ملیشیا کے جوانوں نے پوزیشن سنبھال لی تھی کہ ٹریگ چیخا۔ "فائر۔"

مشین گنوں کے دہانے شعلے اگلنے لگے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور گھن گرج سے پورا جنگل لرز اٹھا۔ درختوں پر چھپے ہوئے ڈاکو کود کر بھاگنے لگے۔ مشین گنوں کی گولیاں ان میں سے درجنوں کو چاٹ گئیں۔ مشین گنوں کے عقب سے ٹریگ اور کازیک بھاگتے ہوئے ڈاکوؤں پر بم برسا رہے تھے اور فضا میں ان کے کٹے ہوئے اعضا اڑ رہے تھے۔ ٹریگ اپنے ریوالور میں مزید گولیاں بھر رہا تھا کہ ایک ملیشیا سارجنٹ بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔ "میں نے میجر لوم نوئی کو اطلاع دے دی ہے۔" وہ ہانپتا ہوا بولا۔ "وہ آرہا ہے۔"

"سو میل دور سے۔" ٹریگ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "واقعی وہ بڑا مددگار ثابت ہوگا۔"

بموں اور مشین گنوں کی گولیوں کی بوچھاڑ کے باوجود درجنوں ڈاکو راہ فرار اختیار کر رہے تھے۔ ٹریگ نے ان میں سے تین کو ڈھیر کردیا اور ابھی وہ اپنے ریوالور کو دوبارہ لوڈ کر ہی رہا تھا کہ اس نے ایک ڈاکو کو تلوار اٹھائے ہوئے اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس نے خالی ریوالور اس پر پھینک مارا۔ ریوالور ڈاکو کے دانتوں سے جا ٹکرایا۔ پھر بھی وہ رکے بغیر ٹریگ کی طرف لپکا۔ ٹریگ مرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس سے صرف چند سیکنڈ پہلے کازیک کی کنپٹی پر ایک گولی آکر لگی اور وہ اپنے ہاتھ میں ایک ہینڈ گرنیڈ جکڑے ہوئے ڈائنا مائیٹ کے کھلے ہوئے بکس پر ڈھیر ہوگیا۔ اچانک ہی پورا کریٹ ایک زبردست دھماکے سے پھٹ گیا۔ اس کے نارنجی شعلے فضا میں سو فٹ بلند ہوئے اور اس تلوار بدست ڈاکو کا سر اڑ گیا۔

ٹریگ اس غیر متوقع حادثے سے اپنی جگہ شل ہو کر رہ گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب گرد و غبار کا طوفان تھما تو اس کے ارد گرد ڈاکوؤں، ملیشیا کے جوانوں اور مزدوروں کی خاک و

خون میں تھرتھری ہوئی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے اندازہ لگایا کہ وہ یہ جنگ ہار گیا ہے۔ اس کی دفاعی لائن کے پرخچے اڑ گئے تھے جب کہ ڈاکوؤں کا سردار سورت تنگ اب بھی جنگل میں موجود تھا اور اسے ایک خراش تک نہیں آئی تھی۔ اب چند ہی لمحوں کے بعد وہ دوبارہ حملہ آور ہوتا اور اس مرتبہ اس کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔

ٹریگ چھلانگ لگا کر اپنے بلڈوزر پر سوار ہو گیا۔ اس نے مشین گن چلانے والے کی لاش ایک طرف ہٹائی اور خود مشین گن سنبھال لی۔ اگلے ہی لمحے پوری فضا گولیوں کی ہولناک تڑتڑاہٹ سے تھرا اٹھی۔ اس پر جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح جنگل کی سمت گولیاں برساتا رہا۔ اس کی کنپٹی کے ایک زخم سے بہتا ہوا خون آنکھوں میں بھر گیا تھا اور اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اندھا دھند گولیاں برساتا رہا۔ پھر یکایک اسے احساس ہوا کہ دوسری طرف بالکل خاموشی تھی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ ''وہاں کوئی نہیں ہو سکتا۔'' اس نے سوچا۔ 'کوئی نہیں ہو سکتا......کوئی نہیں......' اس کے ساتھ ہی وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

☆☆☆

''ہتھیار ڈال دو......ہتھیار ڈال دو......!'' میجر لوم نوئی چیخ چیخ کر اعلان کر رہا تھا۔ میجر کی للکار ٹریگ کو ہوش میں لے آئی۔ پورے جنگل میں بگل بج رہا تھا اور میجر لوم نوئی چیخ چیخ کر ڈاکوؤں کو ہتھیار ڈالنے کو کہہ رہا تھا۔ اس معرکے میں ملیشیا کے ستائیس جوان اور تقریباً ایک سو پچاس مزدور کام آ گئے تھے۔ ڈائنامائیٹ کے دھماکے میں کازیک کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ ٹریگ کے زخموں کی مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ اسی دوران گرد و غبار میں سے جیک ملز نمودار ہوا۔

''میجر لوم نوئی، تھائی لینڈ کا بدترین انسان ہو سکتا ہے۔'' وہ بولا۔ ''لیکن وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ جنگلی چال کیسے چلی جاتی ہے۔''

اس کے چند ہی منٹ کے بعد میجر لوم نوئی، ٹریگ سے معذرت خواہانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''ہاں ہوا میں کوئی کمیونسٹ گوریلا نہیں تھا۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ میں اپنی نصف فورس کو لے کر صرف پہاڑوں کے پیچھے چلا گیا تھا جہاں میں مزدوروں سے ہیلی پیڈ بنوا رہا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جب سورت تنگ کو یہ معلوم ہو گا کہ ہماری دفاعی لائن کمزور ہو گئی ہے تو وہ تم پر بار بار حملہ کرے گا اور آخر میں بھرپور طریقے سے حملہ آور ہو گا۔ میں ہیلی کاپٹر کے ذریعے اپنے آدمیوں کے ساتھ منٹوں میں یہاں پہنچ سکتا تھا۔ تم نے جو سڑک بنوائی ہے وہ ہیلی کاپٹر کے لیے لینڈنگ پیڈ کا عمدہ کام دے سکتی ہے۔''

''لیکن تم نے اصل منصوبے کے مطابق عمل کیوں نہیں کیا؟'' ٹریگ نے برہمی سے پوچھا۔

''میں نے اصلی منصوبے کے مطابق ہی عمل کیا ہے۔ مسٹر ٹریگ۔'' اس نے شانے اچکا کر کہا۔ ''میں نے صرف تم سے کچھ تفصیلات چھپا رکھی تھیں۔ آج ہمارے بہت سے آدمی مارے گئے۔ ہمارا بہت زیادہ جانی نقصان ہوا اور اگر میں سڑک کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد فورس بھیجتا تو اس کا بھی صفایا ہو جاتا۔ لہٰذا بہتر یہی تھا کہ میں اپنی نصف فورس کو نکال کر لے جاتا اور جب ڈاکو اکٹھا ہو کر حملے کرتے تو ہم ان کا مکمل صفایا کر دیتے اور ہوا بھی یہی۔ تمہاری دلیری نے میرا حوصلہ بڑھایا اور یوں یہ خطرناک مشن پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ سورت تنگ ہلاک ہو چکا ہے۔ ہم نے اس کے ایک نائب کو پکڑ لیا جس نے سونے کے ذخائر تک ہماری رہنمائی کی۔ یہ ذخیرہ یہاں سے نصف میل سے بھی کم فاصلے پر ایک جھونپڑے میں چھپا کر رکھا گیا تھا جو اب ہمارے قبضے میں ہے۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ انعام کی رقم اسی طرح تقسیم ہو گی جیسا کہ میں نے وعدہ کیا تھا۔ آدھی رقم میں لوں گا اور آدھی رقم تم...... میں ایک معزز آدمی ہوں۔ تمہارے سی آئی والے میرے خلاف بہت پروپیگنڈا کرتے ہیں، پھر بھی میں بھروسے کا آدمی ہوں۔''

''کیا سورت تنگ واقعی مارا گیا؟'' ٹریگ نے غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

میجر نے ایک جھرجھری سی لی۔ ''مجھے یقین ہے۔'' وہ بولا۔ ''اگرچہ اس کی لاش ابھی تک دستیاب نہیں ہوئی ہے تاہم جلد ہو جائے گی لیکن مجھے اپنی بیوی کو سب کچھ بتانے میں بڑی دقت پیش آئے گی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیسے وضاحت کروں گا۔''

''اس مشن سے تمہاری بیوی کا کیا تعلق؟'' ٹریگ حیرت سے پوچھ بیٹھا۔

''ارے، تو کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا؟'' میجر عام سے لہجے میں بولا۔ ''سورت تنگ میرا سالا ہے۔''

فلمی الف لیلیٰ

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

علی سفیان آفاقی

قسط نمبر: 234



پاکستان میں تو حکومتوں کی مسلسل بے پروائی بلکہ ظالمانہ نظرانداز ی کے سلوک کی وجہ سے پاکستان کی فلمی صنعت اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ اگر حکومت صنعت کی مدد نہ کرتی لیکن کم از کم قمار بازوں، بدمعاشوں اور جرائم پیشہ لوگوں کو اس میں داخل ہونے سے روک لیتی تو بھی ہماری فلمی صنعت رفتہ رفتہ گرتے ہوئے پستی کی گہرائیوں تک نہ پہنچتی لیکن حکومتوں کی مسلسل بے پروائی اور نظرانداز ی کے باعث نہ صرف فلمی صنعت بدمعاشوں کی آماجگاہ بن گئی بلکہ

معاشرے میں بھی ایسی خرابیاں پیدا ہوگئیں جنہوں نے پاکستان کو ایک ایسی مملکت بنا دیا ہے جس میں اب جرم کو جرم تصور نہیں کیا جاتا۔ اگر فلموں کے ذریعے لوگوں کو قانون شکنی کا سبق دیا جائے، قانون نافذ کرنے والے اداروں یہاں تک کہ عدالتوں تک کو مذاق بنا کر ان کا احترام خاک میں ملا دیا جائے۔ جن فلموں میں پولیس کے ایس پی کو بدمعاش ہیرو ''اوڈی ایسپیا'' کہہ کر مخاطب کرے جن میں رات کے بارہ بجے انصاف کا طلب گار عدالت میں پہنچ کر دھاڑ کر کہے کہ یہ کیسا انصاف ہے اور کیسی عدالت ہے جس کے دروازے غریب کے لیے بند ہیں۔ جس فلم میں یہ مناظر دکھائے گئے وہ ہمارے بے انتہا ذہین اور باصلاحیت ہدایت کار کی فلم میں شامل ہیں، کیوں کہ روزگار کے لیے وہ ہر قسم کی فلم میں کام کرنے پر آمادہ ہوگئے تھے سب سے زیادہ ظلم کرپٹ اور ضمیر واحساس سے عاری سینسر بورڈ نے کیا جس نے آنکھیں بند کر کے ہر فلم کو کسی قطع و برید کے بغیر سینسر سرٹیفکیٹ جاری کرنے شروع کر دیے۔ ایک زمانے میں ہمیں لاہور سینسر بورڈ کا رکن مقرر کرنے کا اعزاز دیا گیا۔ ساری مصروفیات چھوڑ کر ہم چند صاحب ضمیر لوگ سینسر شو باقاعدگی سے ادا کرتے تھے لیکن جب یہ فلم مرکزی سینسر بورڈ تک پہنچتی تھی تو اس کو کسی اعتراض کے بغیر پاس کر دیا جاتا تھا۔ انصاف کی یہ بے حرمتی ناقابلِ برداشت تھی۔

جس فلم کے مناظر کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں اس کا سرمایہ کار جرائم پیشہ افراد تھے لیکن انہوں نے اپنا مقام بڑھانے کے لیے فلم ساز کے طور پر حبیب جالب کا نام دے دیا تھا۔ سینسر کی تاریخ سے پہلے بڑی بڑی فلمی شخصیات اور خود جالب مرحوم نے بطور خاص ہم سے اپیل کی کہ دیکھنا یہ فلم حبیب جالب کی ہے۔ اس لیے لحاظ رکھا جائے۔ ہم اس وقت فلمی دنیا چھوڑ کر ایک ہفتہ وار میگزین کے ایڈیٹر بن چکے تھے اور زندگی کے کئی قیمتی سال نذر کرنے کے باوجود فلمی دنیا کا ماحول دیکھ کر زمانہ عروج میں ہی فلمی صنعت سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ ہماری آخری فلم ''عاشی'' تھی جو بہت کامیاب تھی لیکن دوستوں کے سمجھانے کے باوجود ہمیں فلمی صنعت کا مستقبل صاف نظر آ رہا تھا اس لیے دکھ بھرے جذبات کے ساتھ فلم سے رابطہ ہی ختم کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ فلم اسٹوڈیوز جہاں شب و روز گزرتے تھے دو تین بار کے سوا کبھی نگار خانوں میں قدم بھی نہیں رکھا لیکن جتنی بار بھی گئے پرانے شناساؤں اور کارکنوں نے بہت محبت سے خیر مقدم کیا مگر ان جگمگاتے صاف شفاف اسٹوڈیوز تعلیم یافتہ اور ذہین لوگوں کی عدم موجودگی میں ایک بیوہ کی مانند اجڑا ہوا نظر آیا۔ ماحول ایسا کہ دوبارہ اس طرف رخ کرنے کی ہمت نہ ہوئی حالانکہ فلم والے ہمیں بھولے نہیں تھے اور ہر تقریب پر مدعو ضرور کرتے تھے۔

اب دوبارہ فلم کے سینسر کا احوال پیش ہے۔ جس کے فلم ساز کے طور پر حبیب جالب جیسے درویش صفت باغی شاعر کا نام دیا گیا تھا۔ سینسر کے اجلاس میں پہنچے تو بڑے بڑے جغادری فلم والوں کے علاوہ حبیب جالب بھی موجود تھے۔ ہم علیک سلیک کرتے ہوئے ہال میں داخل ہونے لگے تو حبیب جالب نے بازو تھام لیا اور کہا ''آفاقی صاحب! یہ میری فلم ہے''۔

جب فلم اسکرین پر نمودار ہوئی تو جیسے جیسے فلم آگے بڑھتی رہی ہماری اور دوسرے اراکین کی حیرت اور مایوسی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ذاکر، سلیم اختر اور دیگر بورڈ کے اراکین بھی صاحب علم الفہم تھے۔ فلم ختم ہونے پر ہم سب اکٹھے ہوئے تو ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ اس فلم میں دیگر بے ہودہ باتوں اور فحش رقص کے مناظر کے علاوہ انتہائی قابلِ اعتراض مناظر شامل تھے جن میں یہ بھی تھا کہ بدمعاش پستول کی نال ایس پی کے منہ میں ڈال کر اس کو دھمکیاں دیتا ہے۔

ہم سب کی متفقہ رائے تھی کہ یہ فلم کسی طرح بھی نمائش کے قابل نہیں ہے۔ نوٹ لکھنے کا فرض ہمیں سونپا گیا۔ ہم نے باہمی مشورہ کے بعد فلم کے بارے میں کوئی رائے دینے کی بجائے یہ لکھ دیا کہ اس فلم کو سینسر کرنے سے پہلے محکمہ قانون سے رائے لی جائے۔

باہر نکلے تو سارے جانے پہچانے فلمی چہرے اور حبیب جالب بے تابی سے منتظر تھے۔ ہم سب ان کے درمیان سے کسی سوال کا جواب دیے بغیر گزر گئے۔ آخر میں حبیب جالب کھڑے تھے۔ بے تابی سے پوچھا۔ ''آفاقی صاحب کیا فیصلہ ہوا؟''

ہم کیا جواب دیتے۔ صرف اتنا کہا۔ ''جالب صاحب! کیا یہ فلم آپ نے بھی دیکھی ہے؟'' اور اپنی کار کی طرف بڑھ گئے۔

یہ خبر فلمی صنعت میں پھیل گئی کہ مقامی بورڈ نے فلم کو پاس نہیں کیا۔ کرپشن زدہ بورڈ کے عملے نے بھی اندرونی خبریں سب کو بتا دیں۔



یہ فلم مرکزی سینسر بورڈ کو ارسال کر دی گئی جس نے محکمہ قانون کی رائے طلب کیے بغیر اور کسی کٹ کے بغیر پاس کر دیا۔ اس زمانے میں سجاد حیدر صاحب مرکزی سینسر بورڈ کے چیئرمین تھے۔ نہایت بااخلاق اور شائستہ انسان تھے اور ان کی دیانت کا بھی شہرہ تھا۔ اسلام آباد میں فلم کو کسی تراش خراش کے بغیر نمائش کی اجازت مل گئی تو لاہور میں ہمارے دیرینہ فلمی کرم فرماؤں نے فون کر کے طنزیہ انداز میں ہم سے کہا۔ ”آفاقی صاحب! افسوس ہے کہ آپ نے اپنی برادری کا بھی لحاظ نہیں کیا لیکن یہ فلم کسی کٹ کے بغیر پاس ہو گئی ہے۔“

ہم نے جواب میں صرف یہ کہا کہ ”ہم نے تو اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ کیا ہے اور آپ یہ نہ بھولیں کہ اب ہم فلمی برادری چھوڑ چکے ہیں۔“

غصہ، رنج، مایوسی اور بورڈ کی کارروائی سے ہمیں ناقابلِ برداشت تکلیف اور اذیت پہنچی۔ ہم نے اپنا استعفیٰ ایک طویل خط کے ساتھ چیئرمین صاحب کو ارسال کر دیا اور اگلے دن یہ خبر اور خط اخبارات میں بھی شائع کرا دیا اور پُرسکون ہو گئے۔

چیئرمین سجاد حیدر صاحب چند دن بعد لاہور آئے اور حیبہ ہاؤس میں قیام کیا۔ ہم ان سے ملاقات کے لیے گئے وہ بہت خوش اخلاقی سے ملے اور اس بات پر حیرت اور مایوسی کا اظہار کیا کہ ہم مستعفی کیوں ہو گئے۔ بورڈ کو تو ایسے لوگوں کی ہی ضرورت ہے۔

ہمارے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ ہم نے کہا۔ ”سجاد صاحب! بورڈ کو ہم جیسے لوگوں کی نہیں بلکہ ضمیر فروشوں اور بک جانے والوں کی ضرورت ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے فلم سینسر بورڈ میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔“

وہ کچھ نہ بولے۔ چائے کے لیے آرڈر دیا مگر ہم معذرت کر کے چلے آئے۔ اس فلم کا نام ”کالا چور“ اور ہدایت کار نذرالاسلام تھے۔

دراصل یہ پاکستان کی فلمی صنعت کی تباہی کی وجوہات کا ایک نوحہ ہے۔

ہم ہمیشہ سے اس بات کے قائل ہیں کہ پاکستانی اداکاروں، گلوکاروں اور ہنرمندوں میں جو صلاحیتیں ہیں وہ بھارتی ہم پیشہ لوگوں سے کم نہیں ہیں۔ اس کا ثبوت ہمارے سامنے ہے۔ مرحوم نصرت فتح علی خان نے بھارت کے بڑے بڑے موسیقاروں اور فلم سازوں کو اپنا پرستار بنا لیا تھا۔ غلام علی اور مہدی حسن جب بھی بمبئی گئے بڑے بڑے نامور ہدایت کار اور فلم ساز ان کے گرد منڈلاتے اور ان کی تعریف کرتے رہے۔

پاکستانی فن کاروں کی نئی پود اب بھارت میں اپنے فن کا جادو جگا رہی ہے۔ گلوکار علی ظفر ممبئی گئے تو دھوم مچا دیں۔ ان کی گلوکاری سے متاثر ہو کر انہیں اداکاری کی دعوت دی گئی تو انہوں نے فلموں میں اداکار کی حیثیت سے اپنا لوہا منوا لیا۔ راحت فتح علی خان کی گلوکاری پر انہیں بھارت کا سب سے قابلِ احترام فلم فیئر ایوارڈ بھی ملا۔ انہوں نے جس فلم میں گانے گائے وہ سب مقبول ہوئے اور کئی فلموں کی کامیابی میں ان کے نغموں کا بھی نمایاں ہاتھ ہے۔ گلوکار عاطف اسلم نے بھی بھارتی فلمی صنعت میں ہلچل مچا دی۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ متعصب بھارت میں صلاحیتوں کی کس طرح پذیرائی کی جاتی ہے۔

اداکار فواد خان کی صورت میں ایک اور بڑا ”خان“ سامنے آیا ہے مگر یہ بھارتی نہیں پاکستانی ہے۔ فواد خان نے شعیب منصور کی فلم ”خدا کے لیے“ میں ہی اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر دیا تھا۔ پھر پاکستان کے نجی ٹی وی کے ڈرامے ”ہم سفر“ نے ان کو ایسی مقبولیت بخشی کہ بھارت بلکہ دنیا بھر میں اردو جاننے والے پاکستانی اور بھارتی ان کے پرستار بن گئے۔ بھارت میں یہ ٹی وی ڈراما دیکھنے کے لیے دوسرے تمام پروگرام نظر انداز کر دیے جاتے تھے۔ بھارتی ان کی

وجاہت، شخصیت اور اداکاری سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے اداکاری کے میدان میں اپنا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ لاکھوں کروڑوں ان کے پرستار ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہوئے نہیں جھکتے۔ ان میں پاکستانیوں کے علاوہ بھارتی فلم بین بھی شامل ہیں۔ وہاں تین خان (سلمان خان، عامر خان اور شاہ رخ خان) دو دہائیوں سے زیادہ عرصے سے سپر اسٹار ہیں۔ ہزار ہا کوشش کے باوجود بھارتی فلمی صنعت ان کا ہم پلہ پیدا نہ کر سکی۔ اب فواد خان چوتھے خان ہیں جو ایک ہی فلم میں کام کرنے کے بعد سپر اسٹارز اور ''خانوں'' کی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔

ممبئی میں جب فلم ''خوب صورت'' کا آغاز ہوا اور فلم کی کاسٹ کے بارے میں سوچا گیا تو ہدایت کار کو ایک ایسے ہیرو کی ضرورت تھی جو نہ صرف ہیرو کی تعریف پر پورا اترتا ہو بلکہ اس کا لب ولہجہ اور تلفظ بھی بے عیب ہو۔ بالی ووڈ کی فلموں کو یوں تو ہندی فلم کہا جاتا ہے لیکن دراصل یہ اردو فلمیں ہوتی ہیں۔ جن کے مکالمے خالص اردو میں ہوتے ہیں لیکن کہیں کہیں ہندی کا پیوند بھی لگا دیا جاتا ہے۔ خوب صورت کے ہدایت کار کو ایک بہترین لب ولہجے سے اردو بولنے والے ہیرو کی تلاش تھی۔ بالآخر ان کی نظر سرحد پار کے اداکار فواد خان پر ٹک گئی۔ بھارتی فلمی نقادوں نے لکھا کہ اگر فواد خان ہندوستان آ جائیں تو فلمی صنعت میں ایک عدد وجیہہ اور پرکشش خان کا اضافہ ہو جائے گا۔ یہ فلم پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں سپر ہٹ قرار پائی۔

جب فواد خان سے پوچھا گیا۔ ''آپ کو فلمی اداکار کی حیثیت سے جو مقبولیت حاصل ہوئی تو کیا آپ کو توقع تھی کہ یہ ہمہ گیر شہرت آپ کو حاصل ہو گی؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''بالکل نہیں، مجھے اتنی زیادہ کامیابی کی اُمید نہیں تھی۔ پاکستانی اور بھارتی فلم بینوں کی یہ پذیرائی دیکھ کر مجھے بے حد خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔''

سوال: آپ فواد خان، خان اور وکرم سنگھ راٹھور کے مابین کوئی مشترکہ چیز محسوس کرتے ہیں؟

جواب: میں عملی اور اصلی زندگی میں بورنگ خاموش پسند نہیں ہوں جیسا کہ فلم میں میرے کردار کو دکھایا گیا ہے۔ وکرم سنگھ راٹھور ایک بہت سنجیدہ اور فضول باتیں کرنے کا عادی نہیں ہے جیسا کہ مجھے فلم خوب صورت میں دکھایا گیا ہے۔ دراصل میرے اور میرے اصل کردار میں کوئی یکسانیت نہیں ہے۔ ہم دو مختلف قسم کی شخصیات ہیں۔

سوال: کیا آپ بالی ووڈ کی مزید فلموں میں کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ کیا ایسے کسی منصوبے کے لیے آپ سے بات کی گئی ہے۔

جواب: آج کل میں ایک پاکستانی فلم ساز سے ایک منصوبے پر بات کر رہا ہوں۔ بالی ووڈ کے چند فلم سازوں نے بھی مجھ سے بات چیت کی ہے اس لیے میں ٹی وی ڈراموں سے کچھ عرصے دور ہی رہوں گا۔

سوال: ہندوستان کے لوگ کہتے ہیں کہ اگر آپ بالی ووڈ میں ہوتے تو بالی ووڈ کے تینوں ''خانوں'' کے لیے مشکل پیدا کر دیتے۔

جواب: (قہقہہ لگا کر) یہ میرے لیے بڑے فخر اور خوشی کی بات ہے کہ میرا تین ''خانوں'' سے مقابلہ کیا جا رہا ہے۔ میں تو ابھی خود کو ان تینوں عظیم خانوں سے مقابلے کے قابل نہیں سمجھتا۔ میں ابھی ان کا مقابلہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں ابھی اداکاری کے شعبے میں نیا ہوں اور ابھی مجھے بہت کچھ سیکھنا ہے۔

سوال: آپ اپنا فارغ وقت کیسے گزارتے ہیں؟

جواب: (مسکراتے ہوئے) فارغ دنوں میں میرا زیادہ وقت گھر پر اور رشتے داروں کے ساتھ گزرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنا فارغ وقت گھر اور خاندان والوں کے ساتھ گزاروں۔ اس طرح ہم سب بہت لطف اٹھاتے ہیں۔ فواد خان نے فلم ''خوب صورت'' میں ایک راجستھانی شہزادے کا کردار ادا کیا ہے۔ فواد خان نے اس کردار میں ایسا جادو جگایا ہے کہ دیکھنے والے مسحور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی مسکراہٹ دیکھ کر کئی دلوں کی دھڑکنیں رک جاتی ہیں۔ ابتداء میں وہ ایک عشق کے مارے شہزادے ہیں اس کے بعد انہوں نے ایک رقابت کے مارے اور حسد کرنے والا ٹریجڈی کردار بھی ایسے موثر انداز میں نبھایا ہے کہ دیکھنے والوں کو ان سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ فلمی مبصرین نے اس کو پاکستان کا پسندیدہ ترین رومانٹک ہیرو قرار دیا ہے۔ وہ انتہائی خوش لباس کردار ہے اور اس کی وجاہت آمیز شخصیت نے ہر ایک کا دل جیت لیا ہے۔ خواتین کے حلقوں میں اس کا نام لیتے ہی سنسنی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ہر عمر کی خواتین کا پسندیدہ اداکار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنی شخصیت اور اداکاری سے ایک نیا انداز پیش کیا ہے جو دوسروں سے مختلف ہے۔ اس نے ایک ایسی فلمی صنعت میں جہاں بڑے بڑے اداکار موجود ہیں اپنی ذاتی پہچان بنا لی

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بالی ووڈ کی بڑی لاگت سے فلمیں بنانے والے فلم ساز بھی اسے اپنی فلم میں کاسٹ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ اپنی فلموں کی تشہیر کے لیے موزوں ترین اداکار سمجھتے ہیں۔ فواد خان کا مستقبل یقیناً بہت درخشاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے ٹی وی ڈراموں اور فلموں کے ذریعے اپنی شناخت بنالی ہے۔ ان کے لیے کامیابیوں کا ایک درخشاں مستقبل ان کا منتظر ہے۔

انہوں نے ایک انٹرویو میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ پیش کیے جاچکے ہیں۔ گفتگو کا کچھ اور حصہ بھی سن لیجیے۔

سوال: خوب صورت آپ کے فلم بینوں کے علاوہ فلمی مبصرین کے لیے بھی ایک سحرزدہ فلم بن چکی ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: فلم کا جس طرح چرچا ہوا اور شہرت ملی یہ میرے لیے بھی حیران کن ہے مجھے خوشی ہے کہ فلم بینوں اور مبصرین نے میرے کام کو سراہا۔ میں ان کا احسان مند اور شکر گزار ہوں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ مستقبل میں بھی انہیں مایوس نہیں کروں گا اور ان کی محبت اور تعریف کا مستحق بننے کی کوشش کروں گا۔




فواد خان اور اداکارہ سونم کپور

سوال: بالی ووڈ میں کام کرنے کا تجربہ کیسا رہا؟

جواب: یہ میرے لیے آزمائش تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس میں پورا اترا۔

سوال: آپ نے پاکستان اور انڈیا میں کام کرنے کے طریقے میں کیا فرق محسوس کیا؟

جواب: میں نے بالی ووڈ میں کام کر کے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اب پاکستانی فلمیں ازسرنو مقابلے میں آگئی ہیں لیکن انڈیا میں فلم کے کاروبار میں بہت زیادہ پیسا ہے۔ وہ بہت زیادہ پیسا خرچ کرتے ہیں اور کماتے بھی ہیں۔ وہاں کی فلمی صنعت دولت پیدا کرنے کی ایک مشین بن چکی ہے۔ وہاں کام بہت نظم وضبط اور سنجیدگی سے کیا جاتا ہے۔ ہر شخص اپنے کام کی ذمہ داری

پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم جہاں بھی شوٹنگ کے لیے گئے، ایڈیٹروں اور آڈیٹروں کی ٹیم ہمارے ساتھ رہی۔ وہ ایک الگ کمرے میں بیٹھ کر کام کرتے تھے تاکہ کسی اور کو فلم کی اصل لاگت کا علم نہ ہوسکے۔ میں نے وہاں ہر شخص کو اپنے کام میں ذمہ دار اور محنت کرنے والا پایا۔ وہ کام کو کام سمجھ کر کرتے ہیں۔ پاکستانی اداکاروں کو بھی اس معاملے میں ان سے سبق سیکھنا چاہیے۔ ورنہ ان کے لیے ملک سے باہر کام کرنا مشکل ہوگا۔ دوسرے ملکوں میں کام کرکے ہم لوگ بہت کچھ حاصل کرسکتے ہیں۔ کامیابی کا گر سیکھ سکتا ہوں۔ ہمیں اپنے آرام طلب رویے تبدیل کرنے ہوں گے۔ باہر جاکر زیادہ سے زیادہ سیکھیے اور یہ تجربے اپنے ساتھ پاکستان لاکر ان کو اپنائیے۔ انہوں نے کہا کہ جب میں کوئی کردار قبول کرتا ہوں تو میں ایک ایسے شخص کا تصور کرتا ہوں جو ان حالات میں مبتلا ہوا اور اس سے وہ کیسے عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔ میں اس کردار پر یقین کرکے اور خود کو اس کی جگہ رکھ کر کردار ادا کرتا ہوں۔ فلم کے لیے میرے ملبوسات معروف ڈریس ڈیزائنر رگھویندر راٹھور نے تیار کیے ہیں۔ جب وہ اس سلسلے میں ملاقات کے لیے فلم ساز کے دفتر آتے تھے تو میں ان کی نقل و حرکت، بول چال، چال ڈھال اور لوگوں سے ان کے بات کرنے کا بغور مطالعہ کرتا تھا۔ اس بات نے مجھے اپنے کردار کی ادائیگی میں بہت مدد دی۔

ان سے پوچھا گیا کہ آج کل آپ اداکاری کی طرف مکمل توجہ دے رہے ہیں۔ کیا گلوکاری کی طرف توجہ دیں گے یا نہیں۔ انہوں نے کہا "میں گلوکاری سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے آغاز گلوکار کی حیثیت سے [illegible] تھا۔ مجھے گانے سے محبت ہے۔ میں گلوکاری کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے گانے میں اور موسیقی میں بہت لطف آتا ہے۔

سوال: آپ نے انڈیا میں فلم کی پروموشن کے لیے وہاں کے دستور کے مطابق مختلف شہروں کی تقاریب میں شرکت کی۔ کیا آپ کو یہ اچھا لگا؟

جواب: بہت زیادہ۔ یہ ایک حیرت انگیز اور دلچسپ تجربہ تھا۔ ان تقاریب میں، میں نے مزاحیہ فقرے بھی ادا کیے حالانکہ میں عملی زندگی میں ایک ریزرو اور الگ تھلگ خاموش رہنے والا شخص ہوں۔ میں ٹی وی انٹرویوز سے دور بھاگتا ہوں۔ ایک بار میں نے عمر شریف کے ٹاک شو میں حصہ لیا۔ ان کے طنزیہ اور مزاحیہ فقروں کے جواب میں، میں بے بس ہوگیا تھا اور بس ان کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

سوال: "خوب صورت" کا منصوبہ کیسے شروع ہوا؟ آپ نے اس فلم میں کام کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟

جواب: مجھے فلم کا اسکرپٹ بہت پسند آیا تھا۔ یہ ایک کلاسیکی رومانی فلم ہے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کروں۔ بس اسی وجہ سے میں نے "خوب صورت" میں کام کرنے کی ہامی بھری تھی۔ میرے لیے یہ ایک خوش گوار تجربہ تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنے ملک کی عزت بڑھائی اور پاکستانی فن کاروں کی صلاحیتوں کا دوسرے ملک میں جاکر اظہار کیا اور اللہ نے مجھے کامیاب بھی کیا۔

فواد خان جس وقت "خدا کے لیے" میں نمودار ہوئے تھے ان سے بڑی توقعات وابستہ کرلی گئی تھیں جو انہوں نے پوری بھی کیں۔ پاکستان کو فواد خان، علی ظفر، عاطف اور راحت فتح علی خان جیسے فن کاروں پر فخر ہے۔ یقیناً پاکستان کے فن کاروں میں دنیا کے کسی بھی ملک کے فن کاروں کے مقابلے میں کمی نہیں ہے۔ انہیں جب اور جہاں بھی موقع ملا انہوں نے اپنے ملک کا نام روشن کیا۔ کاش ہمارے حکمراں اور سیاستداں ان ہی سے سبق حاصل کرلیں۔

☆......☆

احمد راہی کا شمار اردو اور پنجابی کے معروف اور انتہائی کامیاب شاعروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے دونوں زبانوں میں بے مثال شاعری کی ہے۔

اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

اس موضوع پر فیض احمد فیض نے بھی بہت اچھی نظم لکھی ہے۔

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

فیض صاحب کا یہ مصرعہ ان کی زندگی میں ہی احمد راہی نے ایک فلم کے لیے اپنایا تھا اور جس خوب صورتی سے اپنایا تھا اس کی فیض صاحب نے بھی داد دی تھی۔ ان کی پنجابی شاعری کا مجموعہ "ترنجن" پنجابی شاعری کی کلاسیک میں شمار ہوتا ہے۔ وہ 1923ء میں امرتسر کے مردم خیز شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا اصلی نام غلام احمد تھا۔ متحدہ ہندوستان میں 1943ء میں ملازمت کے سلسلے میں دلی چلے گئے اور وہاں چار سال مقیم رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ امرتسر سے لاہور آگئے۔ یہاں وہ مشہور

ادبی جریدے ''سویرا'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ جب سعادت حسن منٹو اور مسعود پرویز نے بمبئی سے لاہور آ کر پنجابی فلم ''بیلی'' شروع کی تو منٹو صاحب نے اس کی کہانی لکھی۔ اس فلم کے گیت احمد راہی نے لکھے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے پرواز، مجرم اور شہری بابو کے گیت لکھے۔ شہری بابو کی کامیابی میں ان کے نغموں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ان گیتوں کی مقبولیت کے بعد فلمی صنعت میں ان کی مانگ ہوگئی۔ انہوں نے سویرا کی ادارت چھوڑ کر فلم کے گیت لکھنے شروع کر دیے۔ ''ماہی منڈا'' اور ''پتن'' میں ان کے گیت بہت مقبول ہوئے۔ یہ دونوں پنجابی فلمیں ہیں۔ فلم ''باجی'' میں ان کے گیتوں نے دھوم مچا دی تھی۔ ہدایت کار ایس سلیمان اس فلم کے ہدایت کار تھے۔

''باجی'' پاکستان کی کلاسیکی فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔ جب سلیمان صاحب نے اس کی ہدایت کاری کی اس وقت ان کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی۔ اس فلم کا ایک نغمہ آج بھی سب کو یاد ہے

دل کے افسانے نگاہوں کی زباں تک پہنچے

احمد راہی سے ہماری بھی کافی ملاقاتیں رہی ہیں۔ وہ حسین چیزوں کے پرستار تھے۔ ان سے ایک طویل انٹرویو لیا تھا جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے آج بھی احمد راہی کے بارے میں بہت سی حسین اور کارآمد یادیں تازہ کر دیتا ہے۔ اس انٹرویو کی اہمیت کا اندازہ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد بخوبی ہو جائے گا۔ ہدایت کار مسعود پرویز، موسیقار خورشید انور اور گیت نگار احمد راہی نے پاکستانی فلمی صنعت کو بہت سی یادگار فلمیں دی ہیں۔ یہ تینوں بہت عظیم فن کار تھے۔ افسوس کہ آج ان کے نام بھی نئی نسل فراموش کر چکی ہے۔

احمد راہی کم گو تھے لیکن جب کسی موضوع پر گفتگو کرتے تھے تو ان کی قابلیت کا اظہار ہوتا تھا۔ فلمی دنیا آغاز میں بہت مختصر اور ایک فیملی کی مانند تھی۔ ہر ایک دوسرے کو جانتا تھا۔ احمد راہی سے ہماری اکثر ملاقات رہتی تھی مگر بے تکلفی اور گپ شپ تک نوبت کبھی نہیں پہنچی۔

ہم نے فلمی دنیا کو خیرباد کہا پھر بھی احمد راہی اور دوسرے فلمی دوستوں سے ملاقات ہوتی رہتی تھی لیکن گاہے گاہے۔

ایک دن اچانک وہ ہمارے دفتر آ گئے۔ دورانِ گفتگو احمد راہی نے بتایا کہ مجھے شاعری ورثے میں ملی تھی۔ میرے ماموں شاعر تھے اور اردو پنجابی میں نعتیں لکھا کرتے تھے۔

میں نے بچپن میں شعر کہنے کی کوشش نہیں کی تھی البتہ میٹرک کے دوران میں مجھے افسانہ نویسی سے لگاؤ ہوا اس زمانے میں، میں نے دو چار طبع زاد افسانے لکھے لیکن زیادہ تر ترجمے کیے جو اس وقت کے معمولی رسالوں میں شائع ہوئے۔ کالج کے زمانے میں سیف الدین سیف، تقی الدین پال، ضمیر طاہر، ظہیر کاشمیری ہم سے سینئر تھے۔ ظہور الحسن ڈار بھی تھے۔ میں سیف صاحب سے بڑا متاثر تھا اور انہی کے زیر اثر میں نے شاعری شروع کی۔ یوں میں نے افسانہ نویسی چھوڑ دی اور شاعری کی طرف آ گیا۔

سیف الدین سیف کا ذکر آتے ہی کچھ سوچا اور کہنے لگے۔ ''سیف سب سے الگ تھلگ رہتے تھے، کسی ادبی جماعت سے ان کا واسطہ نہ تھا۔ انہوں نے بچپن ہی سے اچھے شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ ایک لڑکا جو نویں دسویں جماعت کا طالب علم ہو اور ادبی دنیا میں میرا جی اس کی نظم سب سے پہلے شائع کریں اس سے آپ ان کی شاعری کے معیار کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ وہ فیض احمد فیض اور ن م راشد کے عروج کا دور تھا۔ سیف الدین سیف نے اس زمانے میں بڑی اچھی نظمیں کہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان کی بیشتر اچھی شاعری طالب علمی کے زمانے کی ہے بعد میں وہ فلم میں آ گئے۔ یہ نہیں کہ وہ لکھ نہیں سکتے تھے، ویسے وہ لکھنے میں سست تھے لیکن جب لکھنے بیٹھتے تو بے تحاشا لکھتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ چار پانچ دوستوں کی محفل میں مثنوی سنایا کرتے تھے۔ ایک دن ان کو ریڈیو سے فون آیا کہ مثنوی ہمیں بھیجو ان دنوں سیف سیکنڈ ایئر میں پڑھتے تھے۔ اب سیف صاحب کو مصیبت پڑی کہ مثنوی تو تھی نہیں۔ وہ تو فی البدیہہ شعر سنایا کرتے تھے۔ چنانچہ جم کر بیٹھ گئے اور ڈیڑھ دو سو شعر دو دنوں میں کہہ کر مثنوی مکمل کر دی۔ لکھنے میں وہ اتنے تیز تھے مگر لکھتے اپنی مرضی سے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ فلم کی طرف آ گئے۔ کچھ ان کی تساہل پسندی کچھ ان کا لوگوں سے میل جول نہ رکھنا یہی وجہ تھی کہ وہ پیچھے رہ گئے۔ زمانہ آج بھی اور پہلے بھی گروپ بندی کا ہے۔ آج بھی چھ سات لڑکوں کا ایک گروپ ایسا بنا ہوا ہے جو کراچی سے پشاور تک ادبی شعبے میں ستائشِ باہمی کے تحت چھایا ہوا ہے۔''

''آپ نے ابتدا اردو شاعری سے کی پھر یکدم پنجابی کی طرف آ گئے۔''

احمد راہی نے کہا۔ ''ماموں تو زیادہ تر نعت لکھتے

تھے۔ مجھے ان سے شاعری کا مزاج تو ملا لیکن ان کی شاعری کا مجھ پر اثر نہیں ہوا۔ پنجابی لکھنے کا خیال اس طرح آیا کہ جب میں دیہات میں کسان کانفرنس میں جاتا تو دیکھتا وہاں معمولی معمولی پنجابی شعر پر کسان داد دیتے تھے۔ اس زمانے میں بڑے شاعر فیض، احمد ندیم قاسمی سمجھے جاتے تھے۔ ان کی بڑی اچھی نظمیں ہوتی تھیں لیکن کسان ان کی نظموں سے اس طرح لطف اندوز نہیں ہو پاتے تھے جس طرح وہ اپنی زبان پنجابی سے ہوتے تھے۔ اس طرح میں نے کانفرنس میں جانے کے لیے پنجابی نظمیں کہنا شروع کیں۔ 1951ء کے الیکشن میں بھی میں امروز اخبار میں ''میلا جٹ'' کے نام سے لکھتا رہا ہوں۔ میں نے اپنی نظمیں جب صفدر میر، احمد ندیم قاسمی اور کچھ دوسروں کو سنائیں تو انہوں نے بڑی حوصلہ افزائی کی اور صفدر میر نے کہا تم پنجابی ضرور لکھو اس کے بعد میں نے کچھ پنجابی نظمیں کہیں۔ دراصل میرے اندر ایک لاوا پنجابی کا تھا۔ کچھ باتیں تھیں کہنے کی۔ ترنجن چھپنے کے بعد میرے دوست مجھے خط لکھتے تھے کہ خدا کے لیے اردو میں لکھنا بند کرو اور پنجابی ہی میں لکھو۔ یوں میرا ذہن غیر شعوری طور پر ان خطوط سے بھی متاثر ہوا۔ ترنجن چھپنے کے فوراً بعد میں فلم لائن کی طرف آ گیا۔ میں دراصل سنگل ٹریک ذہن کا آدمی ہوں جدھر چلا گیا سو چلا گیا۔''

کیا اس دور میں ادب آمدنی کا ذریعہ تھا یا نہیں تھا۔

احمد راہی نے کہا۔ ''اس دور میں ادیب شاعر اپنے آپ کو اسٹیبلش کرنے کے لیے لکھتا تھا۔ یہی حال میرا بھی تھا۔ دوسرے چوتھے ماہ بعد مشاعرہ آ گیا، پچاس روپے مل گئے ہم تو زیادہ تر نظریاتی قسم کے مشاعروں میں جاتے تھے جہاں سے کچھ ملتا ہی نہیں تھا حتیٰ کہ کرایہ بھی بمشکل ملتا تھا۔ اس طرح اگر کبھی کہیں غزل چھپ گئی تو دس روپے مل گئے۔''

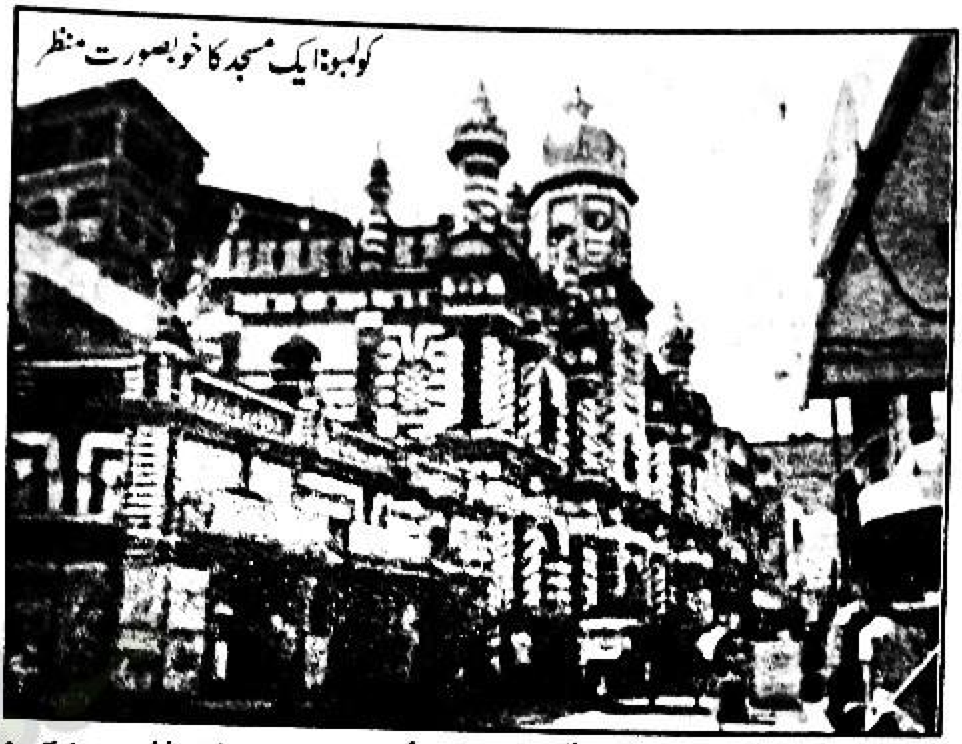
ہدایت کار مسعود پرویز اور موسیقار خورشید انور نے مل کر جو فلمیں تخلیق کیں اس حوالے سے احمد راہی کا کہنا تھا کہ میں نے خورشید انور اور مسعود پرویز کے ساتھ صرف دو فلمیں کیں لیکن ذاتی تعلقات تھے۔ وہ بڑے جینئس انسان تھے اور مرضی سے کام کرنے والے تھے۔ ان پر کوئی دباؤ ڈال کر کام نہیں کروا سکتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بیچتے نہیں تھے ہم نے تو اپنے آپ کو بیچا ہے اگر انہیں کہانی پسند نہیں آئی تو انہوں نے فلم لینے سے انکار کر دیا۔ تقسیم سے پہلے بھی اگر وہ چاہتے تو بہت کام کر سکتے تھے۔ اس لیے بمبئی میں بھی انہوں نے زیادہ کام نہیں کیا لیکن جتنا کام کیا اچھا کیا۔ مسعود پرویز اداکاری سے ہدایت کاری کی طرف آئے۔ وہ ڈبلیو زیڈ احمد کی پونا میں قائم فلم کمپنی شالیمار سے منسلک ہو گئے۔ یہ کمپنی سال میں دو تین فلمیں بناتی تھی۔ آفس کا سا ماحول تھا۔ صبح نو بجے گئے، شام پانچ بجے آ گئے۔ مسعود پرویز کے منہ سے کبھی کسی کی برائی نہیں سنی۔ فلم میں بھی گروپ بازی ہے۔ اَن پڑھ لوگ زیادہ ہیں۔ مسعود پرویز اپنے جیسے لوگوں میں کام کر کے خوش ہوتے تھے۔



اپنی کون سی فلم کے گانے اچھے لگے۔

احمد راہی نے کہا۔ ''اردو فلم باجی اور پنجابی فلم مرزا جٹ اور ہیر رانجھا کے گانے اچھے تھے البتہ مجھے ذاتی طور پر فلم ''گڈو'' کے گانے زیادہ پسند ہیں۔ وہ فلم فلاپ ہو گئی کیوں کہ فلم ایک کمرشل بزنس ہے۔ اس میں آپ کی پسند کو

کولمبو: ایک مسجد کا خوبصورت منظر



اتنا دخل نہیں ہوتا جتنا لوگوں کی پسند کا ہے۔ مجھے جو فلم پسند آئی (اپنی لکھی ہوئی نہیں) وہ فلاپ ہو گئی۔ جو بری لگی وہ سپرہٹ ہو گئی۔''

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ، بلھے شاہؒ، بری سید وارث شاہؒ کے پاس عوام جاتے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں معاشرے کی اصلاح میں ان صوفیائے کرام کا کیا مقام ہے؟

احمد راہی کا جواب تھا۔ ''ان کی بڑی کنٹری بیوشن ہے۔ انہوں نے عوام کی زبان میں عوام کے لیے شاعری کی، شاہ حسین، بلھے شاہ، میاں محمد، خواجہ فرید یہ لوگ نہ ہوتے اور پنجابی شاعری نہ کرتے تو شاید آج پنجابی شاعری کا نام بھی سننے میں نہ آتا۔''

جدید پنجابی شاعری کے حوالے سے احمد راہی کا کہنا تھا۔ ''جدید پنجابی شاعری کا بانی موہن سنگھ ہے۔ وہ بنیادی طور پر رومانی شاعر تھے جب کہ امرتا پریتم کے کلام میں سیاست آجاتی ہے۔ میں امرتا کے کلام سے متاثر ہوں تو استاد دامن اسٹیج کا بادشاہ تھا۔ ان کا اپنا انداز تھا۔ اچھا شاعر تھا۔''

احمد راہی جب ہمارے پاس فلمی میگزین میں آئے تو ہم دونوں دیر تک پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔ احمد راہی سے اتنی دیر تک اور اتنی زیادہ گفتگو پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ چند دن بعد خبر آئی کہ احمد راہی کا انتقال ہو گیا۔ ان کے ساتھ یہ ہماری طویل ملاقات تھی۔

......☆......

1978ء سے ہمارا فلموں کے سلسلے میں سری لنکا اور تھائی لینڈ کے علاوہ بنگلہ دیش جانے آنے کا سلسلہ بہت کثرت سے رہا۔ آخری بار ہم 1981ء میں سری لنکا گئے تھے۔ اس آمد و رفت اور فلمی حلقوں سے میل جول کی وجہ سے ہم نے سری لنکا کا ہر قابلِ ذکر حصہ دیکھا۔ مغرب میں نورالیا کے پل مل پر بھی گئے اور دو دن قیام کیا۔ یہ بہت پُرفضا پہاڑی مقام ہے۔ کینڈی اس کے راستے میں ہے جہاں سے خوشگوار موسم شروع ہوتا ہے۔

سری لنکا میں ہمیں وہاں کے لوگوں کی قابلِ تعریف خوبیوں کا بھی علم ہوا۔ اس وقت بھی سری لنکا میں خواندگی کا اوسط 98 فیصد تھا لیکن یہاں صرف سنہالی اور تامل زبانوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔ انگریزی کی شدبد بہت کم لوگوں کو ہے۔ تامل اور سنہالیوں کے درمیان فسادات بھی ہمارے کولمبو میں موجودگی کے وقت ہی شروع ہوئے۔ جب سنہالیوں نے تاملوں کے مکانات اور دکانیں نذرِ آتش کر دی تھیں۔ تامل رفتہ رفتہ کولمبو اور دوسرے سنہالی اکثریت کے علاقوں سے اپنے علاقے میں منتقل ہو گئے۔ تامل ٹائیگرز کی سرگرمیوں کا آغاز بھی اسی کشیدگی اور نفرت کا سبب تھا۔ یہ مسئلہ سری لنکا کی حکومت کے لیے کافی عرصہ تک دردِ سر بنا رہا۔ تامل دہشت گرد کارروائیاں بھی کرتے تھے جس کا سری لنکا کی سیاحت پر بہت زیادہ اثر ہوا تھا لیکن پھر سیاح کولمبو اور دوسرے سنہالی علاقوں میں آنے لگے۔

ہم نے سری لنکا کے لوگوں کو بے حد نظم و ضبط اور قانون کا پابند، نرم گفتار اور خوش اخلاق پایا۔ اس زمانے میں پاکستان کی معیشت مضبوط تھی اور کرکٹ ٹیم کی دنیا بھر میں شہرت تھی وہاں میں نے 1980ء میں بھی کرکٹ کا یہ

شوق دیکھا تھا کہ جب کسی میدان میں بچے کرکٹ میچ کھیل رہے ہوتے تھے تو کاریں اور پیدل چلنے والے رک کر میچ دیکھنے لگتے تھے۔

فلم ''کبھی الوداع نہ کہنا'' کی شوٹنگ میں ہم کولمبو گئے۔ دس برس کے بعد جاوید شیخ کی فلموں میں واپسی ہوئی تھی جس کے بعد وہ آگے ہی بڑھتے رہے۔ سری لنکا کا ائرپورٹ مختصر مگر بہت صاف ستھرا اور متاثر کرنے والا تھا۔ ائرپورٹ کے لاؤنج میں کئی لوگوں نے ہم سے جاوید شیخ کے بارے میں دریافت کیا کہ کیا یہ عمران خان ہیں۔ عمران خان کے نام کا اس وقت دنیا بھر کے کرکٹ کے پرستار ملکوں میں ڈنکا بج رہا تھا۔

جاوید فلم ساز، ہدایت کار نذر شباب اور کیمرا مین ریاض بخاری کے ساتھ ایک دن ہم کولمبو کے بہت اچھے نواحی علاقے میں فلم کی ہیروئن سیتا سے ملنے ان کے بنگلے پر گئے۔ اندر ہم لوگ کاروباری بات چیت میں مصروف تھے مگر باہر پڑوسیوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا تھا۔ انہیں کسی نے بتایا کہ عمران خان بھی یہاں آئے ہوئے ہیں۔ سیتا کے والد نے یہ خبر ہم لوگوں کو بتائی تو ہم جاوید شیخ کو ساتھ لے کر باہر گئے اور سیتا نے ان کو بتایا کہ یہ عمران خان نہیں اداکار جاوید شیخ ہیں۔

ہم نے سری لنکا کے بارے میں ایک سفرنامہ بھی لکھا۔ سری لنکا بہت مہذب اور قانون کا پابند ملک ہے۔ شہری نہایت آہستگی سے بات چیت کرتے تھے۔ ٹریفک قابلِ رشک تھا۔ ہم گال روڈ پر ہالی ڈے ان میں قیام کرتے تھے۔ سامنے ساحل سمندر تھا۔ نہایت صاف ستھرا اور خوب صورت۔ سری لنکا والوں کو ہم نے کالا انگریز پایا۔ نہایت مہذب، صفائی پسند اور اصولوں کے پابند۔ وہاں آس پاس اس کا ہوٹل تھا۔ ہالی ڈے ان کے سامنے ایک بلند عمارت گلاداری ہوٹل کے لیے زیرِ تعمیر تھی۔ اس وقت سری لنکا بہت زیادہ ترقی یافتہ ملک نہیں تھا اونچی عمارتیں برائے نام تھیں۔

پچھلے دنوں نوائے وقت کے اسپورٹس رپورٹر حافظ عمران کرکٹ میچوں کے سلسلے میں سری لنکا گئے اور انہوں نے جو تجربات اور مشاہدات بیان کیے وہ حیرت انگیز ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستان تو رفتہ رفتہ حکمرانوں کی مہربانی سے انتہائی پستی کا شکار ہوگیا۔

آیئے اس رپورٹ کی روشنی میں اندازہ لگائیں کہ دنیا کس تیزی سے ترقی کر رہی ہے اور ہم کس تیزی سے پستیوں میں ڈوب رہے ہیں۔ یہ ہمارے لیے عبرت ناک بھی ہے اور انتہائی افسوس ناک بلکہ شرمناک بھی۔ ہمارے حکمرانوں اور سیاستدانوں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے نبی اور قائداعظمؒ جیسے بااصول اور صاحب کردار اور دنیا بھر میں اپنے کردار اور قابلیت کے لیے معروف قائد کے ملک کو کوڑے دان بنادیا ہے۔

آیئے سری لنکا کی تازہ ترین صورتِ حال کے بارے میں پڑھیے اور سوچیے کہ کیا یہ ہمارے سروں کو شرم سے جھکانے کے لیے کافی نہیں ہے۔

ہم کرکٹ کے مقابلوں کی رپورٹنگ کے لیے کولمبو پہنچے تو ہوٹل کی بکنگ ہم بذریعہ ٹیلی فون پاکستان سے روانگی سے قبل ہی کروا چکے تھے۔ اس لیے کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہوٹل کے استقبالیہ سے بھی ہم نے پوچھا کہ کیا اس وقت کسی جگہ سے ہم کارڈ مل جائے گا تو اس کا جواب نفی میں تھا۔ بہرحال سب نے اپنے اپنے پاسپورٹ دیے۔ ہوٹل کے عملے نے اس کی فوٹو کاپی کی اور کمرے کی چابیاں ہمارے حوالے کردیں۔ یہاں ہوٹل کے ایک کمرے میں 24 گھنٹے گزارنے کا کرایہ 43 ڈالر بنتا ہے۔ یہ صرف ہوٹل کا کرایہ ہے۔ کھانے سمیت دیگر سہولتوں کے پیسے الگ سے ادا کرنا پڑتے ہیں۔ یہاں ہر شخص کو ایک پانی کی بوتل اعزازی طور پر مل جاتی ہے۔ پانی کی اس ایک بوتل کو ہی نعمت سمجھ کر قبول کیا۔ اب ہمیں کھانے کی فکر لاحق ہوئی، سب کے ذہن میں یہی خیال تھا کہ ہم کارڈ کے حصول میں ناکامی کی طرح رات کے کھانے میں بھی ہمیں ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ رات کا وقت تھا ہم اپنے ہوٹل سے زیادہ دور جانے کا خطرہ بھی مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ پیدل ہی رات کے کھانے کی تلاش میں نکلے تو جولیانا ہوٹل سے دائیں بائیں کوئی خاص کھانے پینے کی جگہ نہ ملی۔ ایک دو چھوٹے چھوٹے ہوٹلز میں گئے لیکن معیاری کھانا اور صفائی زیادہ بہتر نہ ہونے کی وجہ سے سب نے انکار کیا۔ کافی دیر تک تلاش کے بعد مکڈونلڈز ہی سب سے مناسب معلوم ہوا۔ یہاں زیادہ رش نہیں تھا۔ چند لوگ ہی موجود تھے۔ رات کے کھانے کے بعد تھوڑی چہل قدمی کی۔

گال روڈ پر جگمگاتی بتیاں اور سمندر کی لہروں کا شور ماحول کو مسحور کن بنارہا تھا۔ ہم ایسے ملک سے گئے تھے جہاں رات کے دو بجے بھی ہارن بجاتی گاڑیاں اور کانوں کو پھاڑ دینے والے رکشوں کو بھگتنا پڑتا ہے لیکن یہاں ایسا کچھ نہیں

تھا۔ موٹر سائیکل بھی گزرتی تھی تو معمولی سی آواز سنائی دیتی۔ یہی حال کولمبو گال روڈ پر دوڑنے والے ٹک ٹک رکشے کا تھا۔ ٹک ٹک میں میٹر لگا ہوتا ہے۔ میٹر کے مطابق ہی کرایہ وصول کیا جاتا ہے۔ یہاں آنے والے سیاحوں کو چونکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے فاصلے کا علم نہیں ہوتا اس لیے ڈرائیور سے میٹر کے علاوہ بھی معاملات طے پاتے ہیں کہ شاید اس طرح کچھ بچت ہو جائے لیکن اس کا فائدہ رکشا ڈرائیور کو ہی ہوتا ہے۔ گال روڈ پر ہمارے لیے آدھی رات گزرنے کے بعد سب سے حیران کن منظر زیبرا کراسنگ کا استعمال تھا۔ ہم نے پیدل چلنے والوں کو رات ایک بجے بھی زیبرا کراسنگ سے سڑک عبور کرتے دیکھا۔ یہ منظر ہمارے لیے حیران کن تھا۔ یہاں پاکستان میں تو اس کا کوئی تصور ہی نہیں۔ جس کا جہاں سے دل کرتا ہے سڑک پار کرلیتا ہے۔ بلکہ بہت سے ٹریفک حادثات پیدل سڑک پار کرنے والوں کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ہم یہاں تیز رفتار گاڑیوں کے درمیان سے سڑک عبور کرنے کو بہادری اور عقلمندی سمجھتے ہیں۔ دوڑ کر سڑک پار کرنا ہمارے ہاں بہادری کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ ہم تو جنگلے عبور کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وطن عزیز میں کئی جگہ اوور ہیڈ برج اور زیر زمین گزرگاہیں موجود ہونے کے باوجود اس کے استعمال کو شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہاں زیبرا کراسنگ کے اس حد تک استعمال نے ہم سب کو بہت متاثر کیا۔

اس معروف سڑک پر رات کے وقت تعمیراتی کام بھی جاری تھا ہم نے سڑک کی تعمیر کرنے والے عملے سے یہ پوچھا کہ کیا آپ بھی دن رات کام کرتے ہیں تو جواب ملا کہ یہاں صرف رات کے وقت سڑک کی کھدائی اور تعمیر کا کام ہوتا ہے۔ دن کے وقت اس روڈ کی مصروفیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی قسم کا کام نہیں ہوتا۔ ہم تیزی کے ساتھ اپنا کام رات کے وقت جلد از جلد مکمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ صبح یہاں کسی بھی قسم کی رکاوٹ نہ رہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ سڑک پر مختلف مقامات پر جہاں تعمیراتی کام ہو رہا تھا "ییلو ٹریک لائن" پیلی پٹی لگا کر عوام کو اس سے دور رہنے کا پیغام دے دیا گیا تھا۔ ہم نے اس نوگو ایریا کے قریب قریب بھی کسی کو نہیں دیکھا جب کہ ہمارے یہاں ایسی صورت حال میں اس رکاوٹ کو پھلانگنا اور عبور کرنا معمول کا کام ہے۔

گال روڈ پر امریکن سینٹر بھی ہے۔ انڈین ہائی کمشنر آفس بھی ہے۔ ہم یہاں آزادانہ گھوم رہے تھے۔ ہماری دائیں جانب بھی ایک سرکاری رہائش گاہ تھی جس کے باہر چند حفاظتی گارڈ موجود تھے۔ اہم دفاتر کے باوجود آزادانہ نقل و حرکت بھی ہمارے لیے حیرانی کا باعث تھی۔ جس عمارت کے باہر حفاظتی عملہ تعینات تھا بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سری لنکن صدر راجا پکھسے کی رہائش گاہ یعنی ایوانِ صدر ہے۔ جس کے سامنے نہ کوئی رکاوٹ ہے نہ ہی آمدورفت میں کوئی روک ٹوک، کیا ہمارے ہاں ایسا ممکن ہے؟ یہاں تو اہم شخصیات کی رہائش گاہ کو جانے والی سڑکیں بند کردی جاتی ہیں۔ ایوان صدر، وزیراعظم اور وزیراعلیٰ ہاؤس تو بہت دور کی بات ہے۔

گال روڈ ایک مشہور و معروف اور مصروف سڑک ہے۔ یہاں بلند و بالا عمارتیں اور بڑے بڑے ہوٹلز ہیں۔ اتنی زیادہ بلند عمارتیں ہمیں اپنے ملک میں کم ہی نظر آتی ہیں۔ بلکہ ثنا خان نے یہ بھی کہہ دیا کہ ہمارے ملک میں اتنی اونچی عمارتوں کا رجحان نہیں۔ حالانکہ ایسی عمارتیں جگہ کم گھیرتی ہیں اور ان کے فوائد زیادہ ہوتے ہیں۔ چہل قدمی کے دوران میں اظہر خان کی دلچسپ گفتگو سے ہم محظوظ ہوتے رہے۔ یوسف انجم کوئی ایسا جملہ ضرور کہہ دیتے جو اظہر خان کے مسائل میں اضافہ کرتا اور پھر دیر تک انہیں اپنا آپ بچانا مشکل ہو جاتا۔

کولمبو گال روڈ پر کیسینو، ڈانس کلب، بار اور مساج سینٹر بھی ہیں۔ یہاں آمدورفت کا سب سے بڑا ذریعہ ٹک ٹک ہی ہے۔ اپنے ہوٹل سے دائیں اور بائیں جانب حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہم ہوٹل واپس پہنچے۔ سب نے اپنے اپنے گھر اور دفتر بھی اطلاع کرنا تھی کہ ہم یہاں خیر و عافیت سے پہنچ چکے ہیں۔ کسی کے پاس بھی سم کارڈ تو تھا نہیں۔ پھر ہوٹل کی لابی میں وائی فائی سے مستفید ہوئے۔ پاس ورڈ کے حصول کے بعد سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے ذریعے رابطے قائم ہوئے۔ ہم نے اپنے قریبی دوست احمد حسیب کو فیس بک پر میسج کیا کہ وہ ہمارے گھر بھی اطلاع دے دیں کہ ہم سری لنکا پہنچ گئے ہیں اور گھر والوں سے رابطہ نہیں ہوسکتا۔ صبح ہم کارڈ خریدنے کے بعد ہی ہماری آواز ان کی سماعتوں تک پہنچے گی۔ یہاں سم کارڈ کی فوراً عدم دستیابی کی وجہ ایک اور اہم واقعہ یہ ہوا کہ ہم اپنی اہلیہ محترمہ کے فیس بک فرینڈ بھی بن گئے۔ ہماری شادی کو دو سال سے زائد عرصہ ہو چکا ہے۔ ہماری اہلیہ بھی سوشل میڈیا پر موجود



محمد علی



مصطفیٰ قریشی



شمیم آرا

ہیں اور ہم بھی لیکن ہم دونوں نے ایک دوسرے کو فرینڈ ریکوسٹ بھیجنے کی کبھی ہمت و جرأت نہ کی۔ بذریعہ احمد حسیب یہ پیغام بھی اہلیہ محترمہ کو پہنچایا گیا کہ وہ ہمیں فیس بک پر دوستی کی درخواست بھیجیں تاکہ ہم اسے شرفِ قبولیت عطا کریں اور پھر سوشل میڈیا پر بھی ہمارے رابطے ہمیشہ کے لیے بحال ہو جائیں۔ یہ ساری کارروائی ہوٹل کی لابی میں بیٹھ کر ہوئی۔ اس دوران میں ثنا خان، یوسف انجم اور اظہر خان بھی وہاں موجود تھے۔ کوئی اپنے لیپ ٹاپ پر رشید کے ساتھ اور کوئی حمید کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا۔ سب نے ضروری کام بھی مکمل کیے اور پھر اگلے دن ملنے کی نیک تمناؤں کے ساتھ اپنے اپنے کمروں کو ہو لیے۔ اظہر خان، یوسف انجم کے روم میٹ ہیں جب کہ ثنا خان اور ہمارا ساتھ رہا۔

اگلے روز ہم اپنے سم کارڈ اور کرنسی ایکسچینج کروانے کے لیے نکلے۔ گال روڈ پر ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ یہ مسلمانوں کا ہوٹل تھا۔ صفائی ستھرائی کا نظام بھی اچھا تھا۔ ہم نے یہاں ناشتا کیا۔ ہوٹل میں سب کو اردو نہیں آتی۔ یہاں ایک شخص نے اردو میں ہم سے بات چیت کر کے ہمارا ناشتا تیار کروایا۔ ہوٹل میں خالی جگہ کوئی نہیں تھی۔ لوگ کھانے کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے لیکن مجال کہ ساتھ والی میز پر بیٹھے لوگوں تک آواز پہنچ جائے۔ سری لنکن دھیمے انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ آہستہ بولتے ہیں۔ ہماری طرح زور سے بولنے کے عادی نہیں ہیں۔ اس جگہ سے ہم نے جو چائے پی اس کی خوشبو کی آج بھی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ اتنی مزیدار اور خوشبو سے بھرپور چائے ہمیں کہیں نہیں ملی۔

سری لنکا میں بھارتی کھانے زیادہ مشہور ہیں۔ زیادہ تر لوگ یہی پوچھتے رہے کہ کیا ہم بھارت سے آئے ہیں لیکن جب ہم بتاتے کہ ہم پاکستانی ہیں تو پوچھنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ اور محبت کے جذبات امڈ آتے۔ وہ خوشی سے بات کرتے، محبت کا والہانہ اظہار کرتے۔ یہاں ان لوگوں کو اردو آتی ہے جو بھارت یا متحدہ عرب امارات میں کچھ وقت گزار چکے ہیں۔ بینک میں داخلی دروازے پر ہمیں ایک عیسائی سیکیورٹی گارڈ ملا۔ اسے جب ہم نے بتایا کہ ہم پاکستان سے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا۔ ہمیں بینک آفیسر کے پاس ساتھ لے کر گیا۔ بیٹھنے کے لیے کرسی اٹھا کر لایا۔ ثنا خان نے ضروری کاغذات بھرے، ہمارے دستخط کیے اور لائن میں لگ کر پیسے تبدیل کروائے۔ اس دوران میں ہم اس سیکیورٹی گارڈ سے گفتگو کرتے رہے۔ اس نے بتایا کہ سری لنکن عوام پاکستانیوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی پاکستانی آتا ہے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم سم کارڈ خریدنے کے لیے ''ڈائیلاگ'' کمپنی کی فرنچائز گئے۔ یہاں بھی خاصا وقت لگا۔ اس دن نیٹ ورک کا بھی کوئی مسئلہ تھا۔ یہاں بھی ہم نے دیکھا کہ دو افراد آپس میں بات کرتے ہیں تو سنائی نہیں دیتا۔ دھیمے انداز میں بات چیت سری لنکا کے لوگوں کی ایک خاص نشانی ہے۔

سم کارڈ کے حصول کے بعد ہماری ایک اور مشکل آسان ہوگئی۔ دفتر اور اہلِ خانہ سے رابطہ بحال ہوا۔ گال روڈ پر ٹریفک بہت منظم انداز میں رواں دواں تھی۔ ایک فٹ پاتھ ہے۔ پیدل چلنے والے اس کا ہی استعمال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ایک پارکنگ لین ہے۔ یہاں گاڑیاں بڑے منظم انداز اور ترتیب کے ساتھ کھڑی نظر آتی ہیں۔ کسی قسم کی بدنظمی ہم نے نہیں دیکھی۔ پیدل چلنے والے بھی باشعور اور ذمے دار ہیں اور گاڑیاں چلانے والوں کو ذمے داری کا بھرپور احساس ہے۔ گال روڈ پر بہت مشکل سے کوئی پولیس والا نظر آتا ہے جو ٹریفک کو کنٹرول کرنے کی ذمے داری نبھائے لیکن اس کے باوجود ٹریفک اچھے انداز میں چلتی ہے۔ سرخ بتی کے روشن ہونے پر بریکیں لگ جاتی ہیں۔ زیبرا کراسنگ سے پیدل سڑک عبور کرنے والوں کا اشارہ

بھی روشن ہوتا ہے تو پیدل چلنے والے بھی زیبرا کراسنگ سے سڑک پار کرتے ہیں۔ شاید ہی کوئی پیدل چلنے والا فٹ پاتھ کے علاوہ سڑک پر چلتا دکھائی دے۔ کیا ہمارے ہاں ایسا ممکن ہے؟ ہمارے ہاں تو فٹ پاتھ پر تجاوزات کی بھرمار ہے۔ فٹ پاتھ اپنی تعمیر کا مقصد ہی کھو چکے ہیں۔ ہمارے ملک میں پارکنگ کا مناسب انتظام یا تو ہوتا ہی نہیں یا پھر اگر کسی جگہ ہو تو بے ترتیب پارکنگ ہماری بے پروائی اور غیر ذمہ داری کو ظاہر کرتی رہتی ہے۔ سری لنکا میں ہم جہاں بھی گئے ٹریفک اور پارکنگ کا نظام ہر جگہ مثالی نظر آیا۔ سری لنکا میں لڑکے جینز شرٹ پہنتے ہیں۔ لڑکیوں کا پسندیدہ لباس بھی پینٹ شرٹ ہے۔ نوجوان لڑکیوں کی بڑی تعداد اسکرٹ بھی زیب تن کرتی ہے۔ خواتین عموماً ساڑی کو پسند کرتی ہیں۔ سری لنکا میں کوئی بھی موٹر سائیکل سوار ہیلمٹ کے بغیر نظر نہیں آئے گا۔ حتیٰ کہ موٹر سائیکل پر بیٹھے دونوں افراد ہی ہیلمٹ پہنے ہوں گے۔

کولمبو کا ساحل بہت ہی صاف ستھرا ہے۔ غیر ملکی سیاح یہاں بہت اچھا وقت گزارتے ہیں۔ ساحل سمندر پر چہل قدمی کرتے ہوئے لہروں کے شور کے درمیان عجیب سی کیفیت ہوتی ہے۔ تاحد نگاہ پانی دیکھ کر انسان چند لمحوں کے لیے گم ہو جاتا ہے۔ یہاں سمندر کے کنارے رہنے والے سیاحوں کی رہنمائی کے ذریعے پیسے کماتے ہیں۔ مقامی افراد نے آبی جانوروں کو بھی سنبھال رکھا ہے۔ سیاحوں کے لیے ان جانوروں کو دیکھنے کے ٹکٹ بھی مقرر ہیں۔ سری لنکا میں پتنگ بازی بھی ہوتی ہے۔ کولمبو کے ساحل پر چند منچلے ہمیں پتنگ بازی کرتے دکھائی دیے۔ یہاں بعض مقامات پر ''خطرہ'' کا بورڈ بھی لگا ہوا ہے۔ اس کے اردگرد کوئی بھی نظر نہیں آیا جب کہ ہمارے ہاں جہاں ''وارننگ'' لکھا ہو سب کی خواہش ہوتی ہے کہ وہاں جا کر دیکھا جائے کہ آخر ہے کیا۔ یہی حال ''نو پارکنگ'' کا ہے جہاں لکھا ہو تو پارکنگ وہاں پارکنگ کی جاتی ہے۔ کولمبو ساحل کے ساتھ ہی ایک لوکل ریل گاڑی چلتی ہے۔ یہ مقامی افراد کے لیے سفر کا ایک آسان اور سستا ذریعہ ہے۔ گال روڈ پر اور اس کے گرد بڑے بڑے دفاتر ہیں۔ یہاں کام کرنے کے لیے آنے والوں کی بڑی تعداد اسی ٹرین سے مستفید ہوتی ہے۔ گو کہ یہ ایک مقامی ریل گاڑی ہے لیکن پھر بھی بروقت آتی ہے۔ صفائی کا نظام بھی بہت اچھا ہے۔ صبح آٹھ، نو اور پھر شام چار پانچ بجے ریلوے اسٹیشن پر بہت زیادہ رش ہوتا ہے۔ سمندر کے ساتھ ساتھ ٹرین کے سفر کا اپنا ہی مزہ ہے۔ کولمبو کے ساحل پر چہل قدمی کے دوران میں ہم نے نئے نئے شادی شدہ جوڑے کو فوٹو شوٹ کرواتے بھی دیکھا۔ سری لنکا میں آؤٹ ڈور ''ویڈنگ شوٹ'' کا رواج عام ہے۔ پاکستان میں بھی یہ کلچر فروغ پا رہا ہے لیکن محدود پیمانے پر، ابھی یہ رواج عام نہیں ہوا۔

اسی روز ہم نے سری لنکن کرکٹ بورڈ کے دفتر کا دورہ کیا۔ اپنے اپنے ایکریڈیشن کارڈ وصول کیے۔ اظہر خان کی وجہ سے یہاں بھی ہمیں انتظار کرنا پڑا کیونکہ ان کا ایکریڈیشن کارڈ ہی تیار نہیں تھا۔ سری لنکن کرکٹ بورڈ کے آغا اکبر، رضا راشد اور شکیل خان بہت یاد آئے۔ پاکستان کرکٹ بورڈ کے میڈیا ڈیپارٹمنٹ کے تمام افراد تو پاکستان میں صحافیوں کا بہت خیال رکھتے ہیں ہم نے یہاں بھی یہاں والی پریکٹس کرنے کی کوشش کی لیکن متعلقہ عملے نے انکار کر دیا۔ یوں آدھا گھنٹا انتظار کے بعد ہم کارڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ کولمبو میں بزنس مینجمنٹ کے تعلیمی ادارے بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ فیشن بگ اور فیشن ہاؤس سے مناسب قیمت میں خریداری کی جا سکتی ہے۔

یہاں معیاری کپڑے، جیولری دستیاب ہے۔ شہر میں گھومیں تو سجاوٹ کی اچھی چیزیں بھی مل جاتی ہیں۔ کھانے پر زیادہ خرچا نہیں آتا۔ جتنے پیسوں میں ہم پاکستان میں تین چار افراد ہوٹل سے کھانا کھاتے ہیں، اتنے پیسوں میں سری لنکا میں بھی اچھا کھانا کھایا جا سکتا ہے۔ یہاں روٹی بہت مہنگی ہے کسی جگہ اس کی قیمت 70 روپے اور کسی جگہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ سڑکوں اور ہوٹلز میں برقع پوش خواتین بھی نظر آتی ہیں۔ سری لنکا میں چکن پکانے کا جو طریقہ استعمال کیا جاتا ہے اس میں نہ جانے کیا مسئلہ ہے یا پھر وہ ہمارے پکانے کے انداز سے خاصا مختلف ہے۔ جتنی جگہ بھی ہم نے کھانا کھایا، چکن خاصا سخت تھا جسے چبانے کے لیے دانتوں کا مضبوط ہونا ضروری ہے۔ چاول مقامی افراد کی مرغوب غذا ہے۔ یہاں پر بریانی بہت لذیذ ملتی ہے۔ مختلف طریقوں سے چاول پکائے جاتے ہیں۔ ڈشز کے نام بھی مختلف ہیں اور ذائقے بھی لیکن لذیذ ہیں۔ کولمبو میں گھومتے ہوئے بعض مقامات پر ٹریفک میں پھنسے بھی لیکن غیر ضروری طور پر کسی نے بھی جلدی نہیں دکھائی بلکہ اپنی باری کا انتظار کرتے رہے اور لین کی پابندی بھی کی۔ شہر کے اندر بھی گراؤنڈز اور درخت بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔

گراؤنڈز میں اسکول کے طالب علم کرکٹ فٹ بال اور دیگر کھیل کھیلتے ہوئے نظر آئے۔ سری لنکا میں اسکول کرکٹ کا نظام بہت مضبوط ہے۔ یہاں بچوں کو صرف ایک ہی کھیل کی تربیت نہیں دی جاتی بلکہ ''اِن ڈور'' اور ''آؤٹ ڈور'' دونوں طرح کے کھیلوں کی تربیت دی جاتی ہے۔ اتھلیٹکس کی طرف بھی رجحان ہے۔

مصطفیٰ قریشی پاکستانی فلموں کے ممتاز ترین ویلن اور کیریکٹر ایکٹر تصور کیے جاتے ہیں۔ مصطفیٰ قریشی حیدرآباد میں پیدا ہوئے وہیں سندھ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے حاصل کرنے کے باوجود ان کے اندر کے آرٹسٹ نے انہیں کسی سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت اختیار کرنے سے روک دیا۔ ان کا رجحان آغاز ہی سے اداکاری کی جانب تھا۔ اس وقت کراچی میں بھی بڑے پیمانے پر فلم سازی نہیں کی جاتی تھی۔ اس لیے انہوں نے حیدرآباد ریڈیو کا رخ کیا اور ریڈیو اداکار بن گئے۔ محمد علی اور حمایت علی شاعر سے ان کی حیدرآباد ریڈیو میں ہی ملاقات ہوئی تھی جو بڑھ کر بھائی چارے میں تبدیل ہوگئی۔ محمد علی نے ان کی بیگم روبینہ قریشی کو منہ بولی بہن بنایا تھا اور آخر دم تک اس رشتے کو نبھاتے رہے۔

مصطفیٰ قریشی کی شخصیت انتہائی شاندار ہے۔ ان کے دراز قد، بڑی بڑی آنکھوں اور متناسب جسم کو دیکھ کر ان کے دوست انہیں مشورے دیا کرتے تھے کہ وہ اداکاری کے میدان میں قدم رکھیں۔ محمد علی صاحب بھی ان دنوں حیدرآباد ریڈیو سے پروگرام کیا کرتے تھے۔ ان کی آواز اور لب ولہجہ ریڈیو کے لیے بہت مناسب تھا۔ مصطفیٰ قریشی کی آواز میں بھی گہرائی ہے اور سندھی ہونے کے باوجود ان کا اردو لب ولہجہ اور تلفظ بے عیب ہے۔ اس زمانے میں ریڈیو پاکستان کے ایم ڈی، زیڈ اے بخاری تھے جو ریڈیو اداکاروں کے لب ولہجے اور تلفظ کی تصحیح کرتے رہتے تھے۔ درحقیقت آواز اور لب ولہجے میں اتار چڑھاؤ پر وہ خصوصی توجہ دیتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ محمد علی اور مصطفیٰ قریشی پر خاص توجہ مبذول کرتے تھے اور انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس طرح ان دونوں فنکاروں نے مکالموں کی ادائیگی میں کمال حاصل کرلیا تھا۔

حمایت علی شاعر کالج میں پروفیسر تھے لیکن انہوں نے شاعری میں بھی ایک مقام پیدا کرلیا تھا اور ریڈیو کے لیے نغمات بھی لکھا کرتے تھے۔ قسمت کی ستم ظریفی نے کچھ عرصے بعد ان تینوں کو پاکستانی فلمی صنعت میں یکجا کردیا اور تینوں نے فلمی دنیا میں بہت نام اور بلند مقام پیدا کیا۔

محمد علی کو فضل کریم فضلی کی فلم ''چراغ جلتا رہا'' میں معاون اداکار کا موقع دیا۔ اس فلم کے ہیرو تو غالباً ناظم تھے لیکن وہ کامیابی حاصل نہ کرسکے اور ایک ہی فلم کے بعد اپنے پرانے پیشے جیولری کی طرف چلے گئے۔ فضل کریم فضلی، سبطین فضلی اور حسنین فضلی کے سب سے بڑے بھائی تھے۔ دونوں چھوٹے بھائیوں نے ہندوستان میں فلم سازی اور ہدایت کاری میں بہت نام پیدا کیا تھا۔ پاکستان آکر سبطین فضلی نے صرف دو فلمیں بنائیں۔ حسنین فضلی کی فلم ''وفا'' ان کی وفات کی وجہ سے مکمل نہ ہوسکی۔

فضل کریم فضلی ہندوستان میں ایک آئی سی ایس افسر تھے جو کسی ہندوستانی کے لیے بہت بڑا عہدہ تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد وہ پاکستان میں بھی سول سروس میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ وہ بہت کامیاب سول سروس کے رکن تھے لیکن ہمیشہ سے شاعری اور ادب کا شوق تھا۔ جس کے لیے وہ دیگر سرکاری مصروفیات کے باوجود شاعری کرتے رہے جو منظر عام پر نہیں آئی۔ ریٹائر ہونے کے بعد ان کے اندر کا فن کار بیدار ہوگیا اور انہوں نے کراچی میں فلم ''چراغ جلتا رہا'' کا آغاز کیا۔ فضلی صاحب کی حوصلہ مندی اور عزم وارادہ دیکھیے کہ انہوں نے اس زمانے کے بڑے بڑے نامور فن کاروں کی بجائے کراچی سے بالکل نو آموز اور نو وارد فن کاروں کا انتخاب کیا۔ زیبا نے اس فلم میں ہیروئن کے طور پر کام کیا تھا۔ محمد علی، دیبا، کمال ایرانی اور دوسرے بہت سے نئے چہرے اس فلم کی زینت تھے۔ ''چراغ جلتا رہا'' کی صورت کی تقریب میں محترمہ فاطمہ جناح نے بھی شرکت کی تھی جو ایک بڑا اعزاز تھا۔

''چراغ جلتا رہا'' کو کاروباری کامیابی تو حاصل نہ ہوسکی لیکن فضلی صاحب نے ایک نئی تاریخ رقم کردی اور پاکستان کی فلمی صنعت کا دامن بہت اچھے فن کاروں سے بھر دیا۔ ان کی فلم میں متعارف ہونے والے سب ہی اداکاروں نے (ہیرو کے سوا) فلمی صنعت میں بہت نام پیدا کیا۔ فضلی صاحب نے اپنی دوسری فلم ''ایسا بھی ہوتا ہے'' لاہور میں بنائی تھی جس میں زیبا اور کمال مرکزی کردار تھے۔ مصنف، شاعر اور ہدایت کار وہ خود ہی تھے۔ یہ ایک ہلکی پھلکی رومانی فلم تھی جو سارے پاکستان میں بہت کامیاب

ہوئی۔ فضل کریم فضلی کی یہ آخری فلم تھی لیکن ان کے لگائے ہوئے پودے بعد میں پھل دار اور گھنے درخت بن گئے۔ ان کی یاد تازہ کرنے کے لیے ان کا یہ کارنامہ پاکستان کی فلمی صنعت کے لیے ایک بہت بڑا تحفہ اور احسان ہے۔

مصطفیٰ قریشی نے سندھی فلموں سے اداکاری کا آغاز کیا۔ پہلی فلم کا نام ''پردیسی'' تھا جو 1958ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ انہوں نے دوسری سندھی فلموں میں بھی کام کیا اور کامیاب رہے۔

ان کی پہلی اردو فلم ''لاکھوں میں ایک'' تھی۔ جس کے فلم ساز امجد حسین اور ہدایت کار رضا میر تھے۔ کہانی اور مکالمے ضیا سرحدی نے لکھے تھے جو پاکستان آچکے تھے۔ فلم کی رومانی ہیروئن شمیم آرا اور ہیرو اعجاز تھے، اس فلم کو پاکستان کی کلاسیکی فلم قرار دیا جاتا ہے۔ مصطفیٰ قریشی نے اس فلم میں ولن کا کردار ادا کیا تھا اور ان کی اداکاری کو بہت سراہا گیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے کئی اردو فلموں میں اداکاری کی لیکن کوئی فلم کامیاب نہیں ہوسکی۔

مصطفیٰ قریشی نے اپنے حسن اخلاق اور شائستگی کے باعث فلمی صنعت میں بہت سے دوست بنا لیے تھے۔ وہ دوستوں کو دعوت دینے کے بھی بہت شوقین تھے۔ ان خوبیوں کی وجہ سے وہ پاکستان کی فلمی صنعت میں بہت جلد مقبول ہوگئے۔ ان کی اردو فلموں کی ناکامی کے پیشِ نظر اسلم پرویز نے انہیں پنجابی فلموں میں کام کرنے کا مشورہ دیا۔ اگرچہ وہ پنجابی زبان پر عبور نہیں رکھتے تھے لیکن پنجابی سیکھ چکے تھے۔ انہوں نے اسلم پرویز کا یہ مشورہ قبول کرلیا اور ان کی زندگی میں انقلاب آگیا۔ ''چار خون دے پیاسے'' ان کی پہلی پنجابی فلم تھی لیکن جس فلم نے ان کو بلندیوں تک پہنچایا وہ یونس ملک کی فلم ''وحشی جٹ'' تھی جو بہت کامیاب ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب یونس ملک نے ''مولا جٹ'' بنائی تو اس فلم نے کہرام برپا کردیا اور یہ مسلسل دو ڈھائی سال تک چلتی رہی۔ بعد میں جب بھی یہ فلم ریلیز ہوتی تو فلم بین سنیما گھروں پر لوٹ پڑتے تھے۔

''مولا جٹ'' دانشور اور تعلیم یافتہ طبقے میں متنازعہ بھی رہی لیکن اس فلم نے دیکھنے والوں کے دلوں کی گہرائیوں کو چھو لیا تھا لیکن ایک انگریز فلمی نقاد نے اس فلم کو بہت سراہا تھا اور لکھا تھا کہ اگر یہ انگریزی میں بنائی جاتی پھر بھی کامیاب ہوتی۔

جب کمپیوٹر غلطی کرتا ہے...

مارچ 2003 میں ناروے کی ایک سو چھ (106) سالہ خاتون کو محکمہ تعلیم کی طرف سے ایک خط بھیجا گیا جس میں لکھا تھا کہ آپ اسکول میں داخل ہونے کی عمر کو پہنچ چکی ہیں۔ اس لیے فوراً داخلے کے لیے رابطہ کریں۔ اسکول آنے جانے کے لیے آپ کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا کیونکہ اسکول سے بس روزانہ گھر سے لے جایا کرے گی۔ 106 سالہ انجرگ برتیا حیرت کی تصویر بن گئی۔ بعد میں وہ بے حد محظوظ ہوئی۔ اس نے صحافیوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ وہ 1903 میں اسکول داخل ہوئی تھی اور اسے ہر روز ایک گھنٹا پیدل چل کر اسکول جانا پڑتا تھا۔ برتیا دراصل 1897 میں پیدا ہوئی تھیں، لیکن سرکاری کمپیوٹر نے اسے 1997 پڑھا۔ اس حساب سے اس کی عمر 6 سال بنتی تھی۔ محکمے نے اسے خط جاری کردیا تھا کہ وہ فوری طور پر اسکول میں داخلہ لے لے اور ان بچوں کے نام بھی بتائے جن کے قریب وہ رہنا چاہتی ہے۔

انجرگ برتیا نے محکمہ تعلیم کو لکھا کہ وہ داخلے کے لیے اسکول سے رابطہ کررہی ہے اور میں یہ جان کر بہت خوش ہوں کہ مجھے 106 سال کی عمر میں داخلہ دے دیا گیا ہے۔ میں اس لیے بھی مسرور ہوئی کہ مجھے ٹرانسپورٹ کی سہولت میسر ہوگی۔ یہ خط ملتے ہی محکمہ تعلیم کے اہلکاروں میں کھلبلی مچ گئی۔ انہوں نے فوری طور پر تحقیقات کیں تو پتا چلا کہ یہ تو کمپیوٹر کی غلطی تھی۔ محکمہ تعلیم نے اس سے معذرت کی۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

فلم مولا جٹ میں اس وقت کے سپر اسٹار سلطان راہی نے ہیرو اور مصطفیٰ قریشی نے ہیرو کے حریف کا کردار ادا کیا تھا۔ سلطان راہی اونچی گرج دار آواز میں مکالمے بولنے کے لیے مشہور تھے۔ مصطفیٰ قریشی نے بہت سوچ کر

یہ فیصلہ کیا کہ وہ سلطان راہی کے مقابلے میں دھیمی آواز میں مکالمے بولیں گے۔ یہ تجربہ بے حد کامیاب رہا اور مصطفیٰ قریشی کے مکالمے بولنے کا یہ انداز اتنا مقبول ہوا کہ بعد میں انہوں نے اپنا لیا اور اس کی وجہ سے بہت شہرت حاصل کی۔ ''مولا جٹ'' کے بعد سلطان راہی اور مصطفیٰ قریشی کی جوڑی لازم و ملزوم ہوگئی اور بعد میں جس پنجابی فلم میں یہ دونوں ساتھ نہ ہوتے وہ فلم بینوں کو پسند نہیں آتی تھی۔ یہ دونوں پنجابی فلموں کی ضرورت بن گئے تھے۔ تماشائی ہیرو ہیروئن کی بجائے ان کا نام دیکھ کر سینما گھر کا رخ کرتے تھے۔

پنجابی فلموں میں نام کمانے کے بعد انہوں نے دوبارہ اردو فلموں کا رخ کیا جن میں سے کئی فلمیں بہت مقبول ہوئیں۔ ان میں ''لاکھوں میں ایک'' کے علاوہ بینکاک کے چور، آسرا، آبرو، ہانگ کانگ کے شعلے، چوروں کا بادشاہ، بلیک وارنٹ اور آتش شامل ہیں۔ اب وہ پنجابی اور اردو فلموں کے مقبول اور بڑے اداکار بن چکے تھے۔

ہماری فلم ''آبرو'' میں ان کا کردار بہت مختلف تھا۔ وہ فلم کے آخری حصے میں ہمدردیوں کا مرکز بن گئے۔ وہ فلم کے اسکرپٹ کو غور سے پڑھ کر محمد علی کی طرح اعتراضات بھی کرتے تھے اور جب تک مطمئن نہ ہو جائیں وہ بے کل رہتے تھے۔ ہمارے ان کے گہرے گھریلو تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ روبینہ بھابی اور مصطفیٰ قریشی کے گھر آنا جانا تھا اور ہماری دوستی گہری تھی۔ ان کے گھر میں ہونے والی ہر تقریب میں ہمارا بلاوا لازمی تھا۔ ''آبرو'' میں وہ محمد علی کے مقابلے میں کردار ادا کر رہے تھے اور کچھ مناظر میں انہوں نے محمد علی کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔

اردو فلموں میں ان کا سفر بدستور جاری رہا اور ان کی فلمیں کامیاب ہوتی رہیں۔ وہ ہر قسم کے کردار میں خود کو ڈھالنے میں مہارت رکھتے تھے۔ فلم ''ندیا کے پار'' ان کی ذاتی فلم تھی جس میں انہوں نے محمد علی کے ساتھ جڑواں بھائیوں کا کردار ادا کیا تھا مگر انہیں شکایت تھی کہ محمد علی نے اس فلم میں ان کے ساتھ ایسا تعاون نہیں کیا جیسا کہ کرنا چاہیے تھا۔ ہم نے ان کا یہ شکوہ اپنی طرف سے محمد علی صاحب تک پہنچایا تو وہ ہنسنے لگے اور کہا کہ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ بھلا میں اس کی فلم میں دلچسپی کیوں نہیں لوں گا۔

یہ فلم میوزیکل تھی جس میں انہوں نے تان سین کا کردار ادا کیا تھا اور اس کردار میں جان ڈال دی تھی۔ تان سین کے کردار میں انہوں نے بہت اچھی اداکاری کی تھی۔ ان کا اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کا انداز اسی زمانے کا تھا۔ ان کی کامیاب اردو فلموں میں عندلیب، انیلا، ندیا کے پار اور دیگر بہت سی فلمیں ہیں۔

مصطفیٰ قریشی نے اردو پنجابی اور سندھی فلموں میں کام کیا اور ہر زبان کی فلم میں نام پیدا کیا۔

مصطفیٰ قریشی ایک انتہائی خوش مزاج، ہمدرد اور بامروت انسان ہیں۔ اسلامی معلومات اور دیگر موضوعات پر بہت جامع اور معلوماتی گفتگو کرتے ہیں۔ دوستوں کو وہ تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے اور حتی الامکان ان کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سیاسی طور پر وہ پیپلز پارٹی کے حامی رہے ہیں لیکن کبھی سیاست کے موضوع پر بات نہیں کرتے مگر اب سننے میں آرہا ہے کہ ان کا جھکاؤ پی ٹی آئی کی طرف ہے۔ دوستوں کی محفل میں وہ جان ڈال دیتے ہیں۔ ان کا مسکراتا ہوا چہرہ محفل کو جگمگا دیتا ہے۔ مہمان نوازی ان کا شوق ہے اور مہمانوں کو گھر بلا کر وہ بے حد خوش ہوتے ہیں۔

ان کی بیگم روبینہ نے گلوکاری ترک کردی ہے مگر وہ بہت اچھی گلوکارہ ہیں اور شوہر کی طرح وہ بھی خوش مزاج اور ہنس مکھ ہیں۔ مصطفیٰ قریشی گلبرگ میں اندرونی سڑک پر ایک کرائے کے خوب صورت مکان میں رہتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے اس کے نزدیک ہی اپنا بہت خوب صورت گھر بنا لیا جہاں دوستوں کا ہر وقت جمگھٹا رہتا ہے۔

اب لاہور کی فلمی صنعت اجڑ چکی ہے اور فلمی اور ٹی وی کا مرکز کراچی بن چکا ہے۔ مصطفیٰ قریشی کا دل لاہور میں ایسا لگا کہ انہوں نے یہاں ڈیرہ جما لیا ہے۔ ہر شام وہ اور چند پرانے ہم خیال دوست ایورنیو اسٹوڈیو میں اکٹھے ہو کر گپ شپ کرتے ہیں اور پرانے زمانے یاد کر کے خوش اور غمگین ہو جاتے ہیں۔ ٹی وی کے ڈراموں میں کام کرنے کے لیے وہ کراچی جاتے ہیں تو کام کرنے کے بعد فوراً لاہور لوٹ آتے ہیں۔ پروین شاکر کا یہ شعر ان پر حرف بہ حرف صادق آتا ہے۔

وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
اک یہی بات ہے اچھی میرے ہرجائی کی

(جاری ہے)

خونخوار

ابن کبیر

تاریخ کے دریچوں سے جھانکیں تو ایسے ایسے کردار نظر آئیں گے جو ورطۂ حیرت میں ڈال دیں۔ ظلم وستم اور سفّاکی کی ایسی ایسی مثالیں نظر آئیں گی کہ رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ وہ بھی ایک بادشاہ تھا مگر انتہا درجے کا سفّاک۔



ایک ذہنی بیمار بادشاہ کی سفاکی کا قصہ

دھول کا بادل شہر کی سمت بڑھ رہا تھا۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز وحشت ناک تھی۔ ان تیز رفتار گھوڑوں پر گویا درندے سوار تھے۔ ان کے ہتھیاروں سے خون ٹپک رہے تھے۔ سیکڑوں انسانوں کی جان لے کر بھی ان کی پیاس نہیں بجھی تھی۔ انہیں مزید خون چاہیے تھا۔ نووگوراڈ کی مظلوم عورتوں اور معصوم بچوں کا خون۔ لاچار بوڑھے اور بے بس معذوروں کا خون۔ شہر میں بس یہی لوگ بچے تھے کیونکہ سارے جوان تو جنگ میں کام آگئے تھے۔ جنگ جو ایک ظالم

بادشاہ کے خلاف لڑی گئی۔ ایوان چہارم... روسی تاریخ کا ظالم ترین انسان۔ جسے آج خونخوار ایوان کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔

ڈھول بڑھتی جا رہی تھی... دشمن قریب آرہا تھا۔

وہ 1570ء کا سال تھا، جو شہر نووگوراڈ کے لیے بدنصیبی لایا۔ نہ صرف اس کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال دیا گیا، بلکہ اس سرزمین پر ظلم کی ہیبت ناک داستان رقم کی گئی۔ ایسی داستان کہ سننے والے انگشت بدنداں رہ جائیں۔

ایوان کے فوجی شہر میں داخل ہوتے ہی عورتوں پر جھپٹ پڑے۔ ان سے بچے چھین کر زمین پر پٹخ دیے۔ ان کے کپڑے تار تار کر دیے اور ان کے ساتھ اجتماعی آبروریزی کے بعد انہیں بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ انہوں نے بوڑھوں کو سڑکوں پر گھسیٹا۔ پھر ان کے سر قلم کر دیے۔ انہوں نے شہر کے شرفا اور رئیسوں کو برہنہ کر کے بازاروں میں گھمایا۔ ان پر کوڑے برسائے۔ جب تھک گئے تو انہیں ایک ایک کر کے قتل کر دیا۔

قتلِ عام کے بعد وہ شہر کی جانب متوجہ ہوئے۔ انہوں نے بہت سا مال لوٹا۔ تجوریاں خالی کر دیں۔ مردہ عورتوں کے جسم سے زیورات اتار لیے۔ اگر کوئی گہنا نہیں اتر سکا، تو عورتوں کے اعضا کاٹنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

رات بھر یہ وحشی کھیل جاری رہا۔ صبح انہوں نے بستی کو آگ لگا دی۔ نہ صرف بازاروں کو تباہ کر دیا، بلکہ رہائشی علاقوں کو بھی شعلوں کے حوالے کر دیا گیا۔ انہوں نے گرجے اور خانقاہیں بھی نہیں چھوڑیں۔ ہر شے تہس نہس کر دی۔ اور اس مکروہ کھیل کے دوران میں ان کے دل مطمئن تھے۔ ذرا سا بھی ملال نہیں تھا چہرے پر کیونکہ یہ سب وہ اپنے بادشاہ کے حکم پر کر رہے تھے۔ روس کے پہلے زار کے حکم پر جو انسان کے روپ میں ایک بھیڑیا تھا۔

ایوان چہارم کو پل پل کی خبر مل رہی تھی۔ فتح کی ہر خبر اس کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ بکھیر دیتی۔

اس قیامت خیزی کے پیچھے ایوان کا خناس تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ نووگوراڈ کے باشندے پولینڈ کے ساتھ مل کر اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ وہ اس کا تختہ الٹنا چاہتے تھے اور اس سازش میں ماسکو کے کئی نواب بھی شامل ہیں۔ اس نے شہر پر چڑھائی کر دی۔ پہلے اس کی فوج کو بے دردی سے قتل کیا۔ پھر اس کے ظالم سپاہیوں نے شہر کو تہس نہس کر دیا۔ سب خاک میں ملا دیا۔ لاشیں جلا دی گئیں۔ شہر کی نمایاں شخصیات اور رئیسوں کو مرکزی بازار میں قتل کیا گیا۔ ان کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی۔

مورخین کے مطابق بربادی کے اس موسم گرما میں مجموعی طور پر تیس ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتار اگیا۔ لاشوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ پورے ایک ماہ گدھ اس تباہ حال بستی پر منڈلاتے رہے۔ وہ گدھ گوشت نوچتے نوچتے تھک گئے۔ ان کے پیٹ اتنے بھر گئے کہ کئی تو پھر اڑ ہی نہیں سکے۔ اس شہر کو آباد کرنے میں برسوں لگے۔ شہر کی تعمیر نو کے دوران لاشوں کی تعفن سے جان چھڑانے کے لیے ہزاروں روبل خرچ کیے گئے، مگر یہ بدبو کسی آسیب کی طرح شہر میں پیوست ہو گئی تھی۔

☆☆☆

نووگوراڈ کو برباد کرنے کے بعد ظالم ایوان نے ماسکو میں بھرپور جشن منایا۔ شراب پانی کی طرح بہائی گئی۔ بھاری آتش بازی ہوئی۔

تین روزہ جشن کے بعد وہ ماسکو میں بیٹھے اپنے مخالفین کی سمت متوجہ ہوا۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں۔ درجنوں جائدادیں ضبط کی گئیں۔ کئی بے قصور گھرانے اس کے جنون کی لپیٹ میں آگئے۔

لگ بھگ تین سو آدمیوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ کئی تو ایسے تھے، جو اس کے بہت قریب تصور کیے جاتے تھے۔ اس نے شہر میں منادی کروادی کہ فلاں دن ان غداروں کو عبرت ناک سزائیں دی جائیں گی۔

اس نے ملک بھر سے اپنے وفاداروں کو اکٹھا کیا جو وحشت ناک سزائیں دینے کے معاملے میں شہرت رکھتے تھے۔ پورے دو دن سزاؤں کے تعین پر غور کیا گیا۔ روس بھر سے ایسے جلادوں کو اکٹھا کیا گیا جو اپنے کام میں ماہر تھے۔

قہر کے اس منصوبے کو حتمی شکل دینے کے بعد ایوان نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”یہ نووگوراڈ کی فتح کے جشن سے زیادہ بڑا جشن ہوگا۔“

سزا کا اہتمام شہر کے ایک بڑے میدان میں کیا گیا۔ وہاں ہزاروں لوگوں کی گنجائش تھی۔ بادشاہ اور وزیروں کے لیے اونچائی پر نشستوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مقررہ دن وہ اپنی شان دار سواری میں میدان کی سمت روانہ ہوا۔ وزراء اس کے ساتھ تھے۔ وہ ایک پُرشکوہ قافلہ تھا جو ایک مکروہ کھیل سے لطف اندوز ہونے جا رہا تھا۔

میدان میں پہنچ کر جب بادشاہ نے چاروں طرف دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ غصے سے

سرخ ہو گیا۔ وہ مغلظات بکنے لگا۔ منتظمین کھڑے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا کہ پلوں میں ان کے سر اڑا دیے جائیں گے کیونکہ میدان خالی تھا۔ ماسکو کے شہریوں نے خون کی ہولی کا نظارہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنے گھروں سے نہیں نکلے۔ وہ اس مکروہ کھیل میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے۔

بادشاہ کو لگا، جیسے اس کی تذلیل کی گئی ہے۔ جیسے اس کے منہ پر تھوک دیا گیا ہو۔ اس نے اپنے فوجیوں کو حکم دیا کہ اگر دو گھنٹے میں لوگوں کو جمع نہیں کیا گیا تو ان سب کے سر قلم کر دیے جائیں گے۔ کئی دستے دیہی علاقوں کی سمت دوڑے۔ وہ ہزاروں کسانوں کو ہانکتے ہوئے میدان کی سمت لے آئے۔ خوف زدہ لاچار انسانوں کے پاس حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

میدان اتنا وسیع تھا کہ فوجی دستوں کی بھرپور کوشش کے باوجود اس کا کچھ ہی حصہ بھر سکا۔ ایوان خوش تو نہیں تھا، مگر وہ آج کا دن ضائع نہیں کر سکتا تھا ورنہ اس کی بڑی سبکی ہوتی۔ زبردستی لائے گئے تماشائیوں کو اس کے عین سامنے بٹھایا گیا۔

ایوان کے اشارے پر زنجیر میں بندھے قیدیوں کو لایا گیا۔ ان کی حالت انتہائی خستہ تھی۔ قید کے دوران میں ان پر شدید تشدد کیا گیا تھا۔ کچھ تو ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے۔ انہیں ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ جرائم پڑھ کر سنائے گئے۔

جب یہ رسم ادا ہو گئی، تو ظالم ایوان اپنی نشست پر کھڑا ہوا۔ اس نے پہلے اپنے باپ دادا کے کارنامے گنوائے۔ نوو گوراڈ کی فتح کو ایک عظیم کامیابی قرار دیا۔ اس عزم کا اعادہ کیا کہ غداروں کو قرار واقعی سزا سنائی جائے گی۔ اور پھر اچانک... اس نے نصف قیدیوں کی سزا معاف کرنے کا اعلان کر دیا۔

یہ ایک ایسا اعلان تھا جسے تماشائیوں نے حیرت سے سنا۔ قیدیوں کو بھی اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہاں موجود جلاد بھی حیران تھے۔ وہ حیرت کے زیر اثر تھے۔

شاطر بادشاہ مسکرایا۔ ''آہ، تم حیران ہو۔ اور اس کا سبب میں جانتا تھا۔ تم مجھے ایک ظالم اور جابر شخص سمجھتے ہو.... مگر میرا یقین کرو، میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ جاؤ، حالاں کہ تم نے مجھے دھوکا دیا مگر میں تم میں سے بہت سوں کی سزا معاف کرتا ہوں۔ جاؤ۔''

شاہی حکم پر ان افراد کے نام پکارے گئے جن کی سزا معاف ہو گئی تھی۔ وہ تعداد میں 180 تھے۔ اس دوران میں بادشاہ کے چہرے پر شفیق مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔

یہ مسکراہٹ اوروں کو تو دھوکا دے سکتی تھی مگر شاہی مورخ بوڑھا میخائل سیلوف جانتا تھا کہ اس کے پیچھے ایک مکروہ چہرہ ہے۔ ایک خونخوار جانور۔ وہ جانتا تھا کہ قیدیوں کی سزا معاف کرنا بادشاہ کی وسیع القلبی نہیں بلکہ وہ رشوت ہے جو ان افراد کے اہل خانہ کی جانب سے دی گئی ہے۔ ہزاروں روبل کی رقم، جو گزشتہ شام شاہی خزانہ میں جمع کروائی گئی۔ اور جن کے رشتے دار مطلوبہ رقم کی ادائیگی میں ناکام رہے، آج ان کی زندگی کا چراغ بجھنے والا ہے۔

بوڑھا میخائل صحیح تھا۔ بے شک ان افراد کی زندگی کا چراغ بجھا، مگر اس کے لیے وہ بہیمانہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ آسمان پر سیاہ کہر اچھا گیا اور زمین اضطراب سے تھر کنے لگی۔

ایک نواب کو کپڑے اتار کر الٹا لٹکا دیا گیا۔ پہلے جسم کے نازک حصے کاٹے گئے، مگر اس دوران میں اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا کہ خون زیادہ نہ بہے کیونکہ اگر شکار جلدی دم توڑ دیتا تو ظالم شکاری کے مکروہ جذبات کی تسکین کس طرح ہوتی۔

دھیرے دھیرے اس کے جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے گئے۔ اس دوران میں شاہی طبیب مسلسل نگرانی کرتے رہے۔ پھر اس کی کھال اتاری گئی اور اس کی لاش کو جلا دیا گیا۔ ایک سپہ سالار جسے صرف اس کے لیے گرفتار کیا گیا تھا کہ ایوان کی تیسری بیوی اسے بہت پسند کرتی تھی، کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دیا گیا۔ ایک نامور ادیب کے جسم کے نچلے حصے سے بانس داخل کیا گیا اور بانس کو سیدھا کھڑا کر دیا گیا۔ وہ شخص دھیرے دھیرے مرتا رہا۔ پرنس بورس نامی ایک شخص کے جسم میں میخیں گاڑ دی گئیں۔ اسے مصلوب کر دیا گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے گھر کی عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔

شاہی خزانچی بھی اس کے عتاب کا شکار بنا تھا، جس کے جسم پر پہلے یخ بستہ پانی ڈالا جاتا اور پھر اسے گرم پانی کے ٹب میں اتار دیا جاتا۔ وہ آخر تک ایوان کو یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ اس کا وفادار ہے مگر ظالم نے ایک نہیں سنی۔

تو اس گرم دوپہر ماسکو کے مرکزی میدان میں سو سے زائد انسانوں کو وحشت ناک انداز میں قتل کیا گیا۔ اور اس پورے عمل کے دوران میں ایوان کے مکروہ چہرے پر ایک

مسکراہٹ کھل رہی۔

شاہی مورخ اس خونخوار مسکراہٹ کو برسوں سے جانتا تھا۔ اس وقت سے... جب ایوان چہارم ابھی کم سن تھا۔

☆☆☆

وہ محل کا بلند ترین مینار تھا۔ وہاں سے پورا شہر دکھائی دیتا تھا۔

غزاں کی اس اداس شام بالائی منزل پر خاصی ہلچل تھی۔ شاہی محافظ زولوف ایک اعلیٰ نسل کا خرگوش ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بالکل سرد تھیں۔ شاہ کا حکم بجالانا اس کی زندگی کا اکلوتا مقصد تھا۔ اور اس وقت بھی وہ ایک حکم کا منتظر تھا۔ ایسا حکم، جو شاید کسی اور کو دیا جاتا، تو وہ کانپ اٹھتا، مگر شاہی محافظ زولوف ایک غیر جذباتی انسان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جذبات انسان کو کمزور اور ناکارہ بنادیتے ہیں۔

بالکونی کی منڈیر کے پاس شاہی کرسی رکھی تھی جس پر ایک بچہ بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں گول اور ناک کچھ مڑی ہوئی تھی۔ وہ ان بچوں میں سے نہیں تھا جنھیں دیکھ کر آپ کے دل میں شفیق جذبات پیدا ہوں۔ اس کے ہونٹ باریک اور ٹھوڑی میں خم تھا۔ اور وہ آنکھوں میں عجیب وغریب طمانیت لیے اپنے پالتو خرگوش کو دیکھ رہا تھا۔

بالآخر اس نے اشارہ کیا۔ محافظ آگے بڑھا۔ وہ شاہی کرسی کے نزدیک آیا۔ اور پھر... اس نے خرگوش کو دوسری طرف اچھال دیا۔ جانور کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ شہزادہ اسے گرتے ہوئے دیکھتا رہا۔

مینار اتنا بلند تھا کہ خرگوش کو زمین تک پہنچنے میں کچھ سیکنڈز لگے۔ اس کے زمین سے ٹکرانے کی آواز سنائی نہیں دی۔ شہزادہ تھوڑا مایوس دکھائی دیا۔ جب اس کا باپ اپنے دشمنوں کو اس اونچائی سے پھینکا کرتا تھا، تو نہ صرف اس کی چیخیں واضح ہوتیں، بلکہ ان کے زمین سے ٹکرانے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی۔ وہ دھب سے نیچے گرتے اور تڑپے بغیر جہان فانی سے کوچ کر جاتے۔ شاہی محافظ زولوف نے آج ہی اسے بتایا تھا کہ اگر ایسے کسی موقع پر وہ ذیلی منزل پر ہو، تو گرنے والے کی ٹوٹتی پسلیوں کی آواز بھی سن سکتا ہے۔

مگر اس کے لیے اسے تھوڑا انتظار کرنا پڑتا۔ نہ جانے بادشاہ پھر کب اپنے دشمنوں کو سزا دینے کے لیے اس مینار کا انتخاب کرتا۔ نہ جانے پھر کب فضاؤں میں چیخ تھرتھراتی اور ایک انسان زمین سے ٹکرا کر اپنے ہی خون میں لت پت ہو جاتا۔

شہزادہ انتظار کرنے کے موڈ میں قطعی نہیں تھا۔ اس نے اپنے پالتو جانوروں پر یہ تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے خرگوش کو تختہ مشق بنایا گیا، مگر اس کی تسکین نہیں ہوئی۔ اب کتے کی باری تھی۔

محافظ کتے کو چمکارتے ہوئے بالکونی میں تو لے آئے، مگر جانور کو فوراً ہی خطرے کا ادراک ہوگیا، وہ بھونکنے لگا۔ زولوف کے اشارے پر چار محافظوں نے اسے دبوچ لیا۔

وہ اسے منڈیر تک لے گئے۔ شہزادے نے اس کا سر تھپتھپایا۔ جانور کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔ لڑکے نے سر سے اشارہ کیا۔ اگلے ہی پل کتا ہوا میں اچھال دیا گیا۔ وہ گولی کی رفتار سے نیچے گر رہا تھا۔ شہزادے کو اس کے چلانے کی آواز خرگوش کی چیخ سے زیادہ واضح سنائی دی۔ جب وہ زمین سے ٹکرایا، تو ہلکا سا دھول کا بادل اٹھا۔

''زولوف۔ اس بار میں نچلی منزل پر کھڑے ہو کر یہ نظارہ کرنا چاہوں گا۔'' اس نے اپنے محافظِ خاص سے کہا۔

''جو حکم شہزادے۔'' زولوف جھک گیا۔

اس ہلچل کی بازگشت بادشاہ تک بھی پہنچی۔

''وہاں اوپر کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے وزیر سے پوچھا۔

وزیر اس پورے عمل کی بابت متذبذب تھا۔ ''وہ... شہزادہ... اپنے جانوروں کو مینار سے نیچے... شاید اس نے آپ کو...''

''اوہ سمجھا۔'' بادشاہ کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔ ''مشق کر رہا ہے۔ خوب ایوان سوم کے بیٹے میں یہ گن تو ہونے چاہییں۔ آخر اسے باپ دادا کی سلطنت کو آگے بڑھانا ہے۔''

دربار میں ایک قہقہہ گونجا۔ خوشامدی درباریوں نے بادشاہ کا ساتھ دیا۔ اور ٹھیک اسی وقت ایک اور کتا زمین سے ٹکرایا۔ اس بار شہزادہ بالائی منزل پر نہیں تھا۔ وہ باغ میں کھڑا تھا۔ کتے کی ٹوٹتی ہڈیوں کی آواز اس نے صاف سنی تھی اور اس بات پر وہ بہت خوش تھا۔

☆☆☆

وہ 16 جنوری 1547ء کی طوفانی رات تھی، جب ایوان چہارم کی پہلی چیخ محل میں گونجی۔ وہ کسی گیدڑ کی طرح چلایا تھا۔ شاہی نجومی، جو پہلے ہی بے وقت طوفان سے پریشان تھا، اسے بدشگونی کی علامت سمجھا مگر اس نے بادشاہ کے سامنے اس بات کا اظہار نہیں کیا۔ آٹھ ماہ قبل ہی اسے یہ عہدہ ملا تھا اور اس سے قبل جس شخص کے پاس یہ منصب تھا، اس کے قتل کی وجہ ایک ایسی پیش گوئی بنی تھی، جو بادشاہ کو

ناگوار گزری تھی اسی لیے۔ تو وہ چپ تھا۔

وہ ماسکو کے بادشاہ ایوان سوم کا پوتا تھا۔ ایوان سوم نے روس کے کئی علاقوں کو مسلمان تاتاریوں سے آزاد کروایا تھا۔ اس نے تاتاری قبیلوں کو پے در پے شکست دی اور پولینڈ تک اپنی ریاست بڑھالی۔ اس کے زمانے میں ماسکو کے دربار نے پہلی بار بین الاقوامی توجہ حاصل کی اور غیر ملکی سفیر اور فنکار وہاں آنے لگے۔ ان ہی کارناموں کی وجہ سے اسے ایوانِ اعظم بھی کہا جاتا تھا۔ زار کا لقب بھی پہلی بار اس نے برتا مگر 1505ء میں اپنی موت تک وہ اسے عروج نہیں بخش سکا۔ اس کے لیے اُس کی نسل کو ابھی تھوڑا انتظار کرنا تھا۔

ایوان سوم کی موت کے بعد اس کے بیٹے فاسیلی ایوانچ نے ماسکو کا تخت سنبھالا۔ اسے امیر اعظم ماسکو کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس نے چرچ اور قریبی ریاستوں کے گٹھ جوڑ سے باپ کی سلطنت کو بڑھایا، مگر وقت کے ساتھ ساتھ ایک مسئلہ گمبھیر شکل اختیار کرتا جارہا تھا۔ شادی کے بیس برس بعد بھی وہ وارث سے محروم تھا۔ اس کی بیوی نے بہت جتن کیے ٹونے ٹوٹکے آزمائے، مگر کچھ کام نہیں آیا۔ مایوس ہو کر بادشاہ نے جادوگروں اور مستقبل بینوں سے رجوع کیا۔ انہوں نے دنیا کے سرد ترین خطے سائبیریا کی سمت اشارہ کردیا۔ ”برف تیری مراد پوری کرے گی۔“

اس نے وہاں کے نواب گلنسکی کو پیغام پہنچا دیا کہ وہ اس کی بیس سالہ بیٹی ایلینا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جب نواب نے پس وپیش سے کام لیا، تو اس نے دھمکی دی۔

”شرافت سے ہاں کردو، ورنہ میں اپنی فوج سائبیریا کی سمت روانہ کردوں گا۔“

ماسکو کے بیش تر شرفاء اس شادی کے خلاف تھے۔ شاہی خاندان کا تعلق آرتھوڈکس چرچ سے تھا جب کہ ایلینا کیتھولک تھی مگر فاسیلی نے ایک نہ مانی۔ بلکہ نوجوان نظر آنے کے لیے اپنی داڑھی بھی منڈوادی۔

ایلینا کے محل میں آتے ہی یہ افواہ پھیل گئی کہ وہ بھی بادشاہ کی پہلی بیوی سولومینا کی طرح بانجھ ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ان افواہوں کے پیچھے خود سولومینا ہے جو حسد میں جل رہی ہے۔ بادشاہ اداس ہوگیا۔ اس نے شراب پینی شروع کردی، مگر جلد اسے خوشخبری ملی۔ عورت حاملہ تھی۔ اس نے جشن کا اعلان کردیا۔ کئی قیدی رہا کیے گئے۔

بالآخر 16 جنوری کی شام، جب ایک غیر متوقع طوفان شہر کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا اور شاہی نجومی کے دل میں اندیشے رینگ رہے تھے، ایوانِ چہارم کی... ماسکو کے تخت کے وارث کی پیدائش ہوئی۔

ایلینا ایک تہذیب یافتہ عورت تھی اور تہذیبی اطوار کے مطابق بیٹے کی پرورش کرنا چاہتی تھی، مگر وہ ایک عیار اور ظالم خصلت لے کر پیدا ہوا تھا۔ خونخواری اس کی فطرت میں تھی۔ وہ تین برس کا تھا، جب سنہری مچھلیوں کو پانی سے نکال کر انہیں فرش پر تڑپتا ہوا دیکھنے کا شوق اس پر سوار ہوگیا۔ وہ گھنٹوں اس کھیل میں مشغول رہتا، یہاں تک کہ اس کے گرد مردہ مچھلیوں کا ڈھیر لگ جاتا۔ شاہی نجومی اسے بھی بدشگونی کی علامت سمجھتا تھا مگر ایک بار پھر اس نے اس کا ذکر بادشاہ کے سامنے کرنے سے گریز کیا۔ ہاں، اس نے شاہی مورخ میخائل کو ضرور آگاہ کردیا جو خود بھی کم سن شہزادے کی بابت اندیشوں کا شکار تھا۔

وہ ہمہ وقت اپنے باپ سے چمٹا رہتا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتا۔ دربار میں اس کے پہلو میں بیٹھتا۔ اور جب فاسیلی کی آنکھوں میں غصہ ہوتا، جب اس کا چہرہ سرخ ہوجاتا، جب وہ ظلم پر مائل ہوتا... ننھا ایوان عجیب سی کشش محسوس کرتا۔ اور اسی کشش نے اسے اپنے باپ کی تقلید پر مائل کیا۔ جب اس نے بلند مینار سے نیچے پھینکے جانے والے بدنصیبوں کی چیخیں سنیں، تو طمانیت محسوس کی۔ اور اب وہ اس احساس کو دوبارہ گرفت کرنے کے لیے اپنے پالتو جانوروں کو اسی مینار سے نیچے پھینکنے لگا۔

اس کی یہ حرکت پر اس کا باپ تو بہت خوش ہوا کرتا۔

البتہ اس کی ماں ایلینا شدید مایوسی کی لپیٹ میں آجاتی۔

ہوا یوں کہ ایک روز بادشاہ بارانی جنگلات میں شکار کو گیا، تو اسے کولہے میں شدید چبھن کا احساس ہوا۔ جلد ہی جسم تپنے لگا۔ شاہی طبیب نے انکشاف کیا کہ یہ ایک پھوڑا ہے، جس میں پیپ بھر چکی ہے۔ بادشاہ کی حالت تیزی سے بگڑ رہی تھی۔ قریبی علاقے سے دو جرمن طبیب بلائے گئے۔ مگران کی دوا انفیکشن کو پھیلنے سے نہیں روک سکی۔ جب بادشاہ اپنی زندگی سے مایوس ہوگیا، تو اس نے ماسکو لوٹنے کا فیصلہ کیا۔

وہ 25 نومبر 1533ء کو ماسکو پہنچا۔ سب سے پہلے اس نے ایک وصیت تیار کی کہ موت کے بعد اس کا بیٹا ایوانِ چہارم تخت کا وارث ہوگا۔ اس نے اپنے وفادار ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور ان سے عہد لیا کہ وہ ہر بغاوت کا قلع قمع کرتے ہوئے ایوان چہارم کی حفاظت کریں گے اور بالغ ہونے کے بعد اس کی تاج پوشی کو ممکن بنائیں گے۔ توہم پرست بادشاہ نے بددعا بھی دی کہ اگر کسی نے وعدہ توڑا تو اس کی روح انتقام لینے لوٹ آئے گی۔

درباری بھی اس کی طرح توہم پرست تھے۔انہوں نے بددعا کو دماغ میں بٹھالیا۔

اس نے بااثر نوابوں کو خطوط لکھے، انہیں طرح طرح کے لالچ دیے۔ ان کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد وصیت کی ریاست میں منادی کروادی۔ رائے عامہ بیمار بادشاہ کے حق میں ہونے لگی۔

اس جانب دارانہ وصیت کے بعد، جس میں اس کے بھائیوں کے ہاتھ کچھ نہیں آیا، بادشاہ نے خدا کو یاد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے تخت تج دیا اور بھکشو بن گیا۔

''سوچو ہے کھا کر بلی حج کو چلی۔'' شاہی نجومی بڑبڑایا۔

شاہی مورخ میخائل اپنے دوست کو دیکھ کر مسکرایا۔

''جناب، کیا میں یہ جملہ لکھ لوں؟''

نجومی پاؤں پٹختے ہوئے چلے گیا۔

4 دسمبر کو بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔ اور ایوان چہارم کی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل گئی۔

☆☆☆

خاموش راہداریوں میں سازشوں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ تاریک کمروں میں افواہوں کے جھمکے ہونے لگے۔

ایوان ابھی کم عمر تھا، ابھی وہ امیر اعظم ماسکو کا خطاب سنبھالنے کے لیے قابل نہیں تھا۔ شاہی گھرانے کے اجتماعی فیصلے سے ملکہ ایلینا کو نائب سلطنت مقرر کردیا گیا۔

یہ سائبیریا میں پلی بڑھی اس لڑکی کے لیے ایک مشکل مرحلہ تھا۔ ہر طرف دشمن تھے۔ کسی پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ افواہوں کو جیسے پر لگ گئے تھے۔ کئی گھرانے اس کی مخالفت پر کمربستہ تھے کہ وہ خالص روسی نہیں۔

ان مشکل دنوں میں محل میں تعینات محافظ دستے کے امیر زدلوف نے ملکہ کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس نے کئی بغاوتوں کو ناکام بنایا۔ کئی غداروں کا سرقلم کیا۔

تاہم سازشیں تمام نہیں ہوئیں۔ تخت کی خواہش ظالم ہے۔ وہ خون مانگتی ہے۔ ایک صبح ایلینا اپنی آرام گاہ میں مردہ پائی گئی۔ اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ اسے زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا۔

محل میں کہرام مچ گیا، مگر شاہی نجومی اور محافظ دستے کے امیر زدلوف کے کہنے پر اس خبر کو عام ہونے سے روک دیا گیا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کئی شہروں میں بغاوت شروع ہوجائے گی۔ انہوں نے.... تیزی سے انتظامات کیے۔ بااثر روساء کو اعتماد میں لیا گیا، قریبی ریاستوں کے امراء سے رابطہ کیا، جس کے بعد ملکہ کی موت کا اعلان ہوا۔ تاہم یہ بات عام نہیں کی گئی کہ عورت کو زہر دیا گیا ہے۔

ایوان، جو پہلے ہی درشت تھا، اب مزید ظالم ہوگیا۔

ماں کی موت والے روز اس نے اپنے ہاتھوں سے چار کبوتروں کی گردن مروڑ دی۔ تین بھیڑوں کو مینار سے نیچے پھینکا گیا۔

آنے والے دن ایوان اور اس کے چھوٹے بھائی یوری کے لیے انتہائی دشوار تھے۔ بے شک وہ شہزادے تھے، تخت کے وارث، مگر اب امور سلطنت بااثر نوابوں کے ہاتھ میں تھا جو اس بات سے خوش نہیں تھے کہ ان کے مستقبل کا بادشاہ نصف روسی ہے۔ انہیں شک تھا کہ وہ ایوان اعظم، یعنی اپنے دادا کے مقاصد کی تکمیل میں ناکام رہے گا۔

پہلے پہل تو ایوان کو امور سلطنت سے متعلق ہونے والی نشستوں میں شامل کیا جاتا تھا، مگر پھر وہ اس کی بچکانہ باتوں اور فرمائشوں سے مایوس ہوگئے۔ ملکہ کی موت کے تین ماہ بعد ہونے والے جنگی جرگے میں کسی نے ایوان کو بلانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی، جو اس وقت باغ میں تلوار بازی کی مشق کررہا تھا۔

جب اسے واقعے کی خبر ہوئی تو وہ بہت آگ بگولا ہوا۔ اس نے تمام وزراء کو دربار میں طلب کرلیا اور انہیں بے طرح سنائیں۔ پیٹھ پیچھے ایوان کا مضحکہ اڑانے والے شاطر نواب اس کے سامنے بجھ گئے۔ دراصل وہ جانتے تھے کہ بادشاہ اور ملکہ کی ناگہانی موت کے باعث رائے عامہ ایوان کے حق میں ہے۔ پھر اسے اپنے ننھیال کی بھی پشت پناہی حاصل ہے، جسے ملکہ نے اپنے مختصر دور میں بہت نوازا۔ سائبیریا کی ریاست خاصی پُرقوت ہوگئی تھی۔

دربار میں انہوں نے جواز دیا۔ ''ہم نہیں چاہتے تھے کہ اس چھوٹے سے کام کے لیے شاہ ماسکو کو زحمت دی جائے، جو اپنے عظیم دادا کی طرح تلوار بازی کی مشق کا شائق ہے۔''

اس وقت تو ایوان مان گیا اور دربار برخاست کرکے ریچھوں کی لڑائی دیکھنے چلا گیا، جس نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا مگر پانچ ہفتے بعد پھر اس نوع کا واقعہ ہوا۔ پھر اسے نظرانداز کیا گیا۔ اس بار جرگہ مشرقی سرحدی علاقوں میں

ہونے والی بغاوت سے متعلق تھا۔

جب دربار میں اس نے متعلقہ نوابوں سے باز پرس کی تو وہ ماضی کی طرح ایک بار پھر اس کے پیروں میں گر گئے۔ اس کے باپ دادا کی شان میں قصیدے پڑھے گئے۔ عہد کیا کہ وہ اس کی ماں کے قاتلوں کو جلد گرفتار کرلیں گے وغیرہ وغیرہ۔

نوجوان مطمئن ہوگیا مگر کچھ روز بعد پھر اسی صورتِ حال نے جنم لیا۔ اس بار اسے پہلے خبر مل گئی۔ وہ تلوار ہاتھ میں لیے جرگے میں پہنچ گیا اور بری طرح چلایا۔ ''تمہاری حکم عدولی کی ہمت کیسے ہوئی غدارو۔ میں تمہارا بادشاہ ہوں۔''

وہ دیوانوں کی طرح تلوار چلانے لگا۔ ایک بااثر نواب نے آگے بڑھ کر تلوار چھین لی اور وارث سلطنت کو ایک تھپڑ رسید کردیا۔ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ایوان حیرت کے زیر اثر تھا۔ آج سے پہلے کوئی اُس سے اس طرح پیش نہیں آیا تھا۔

''تم اپنی ماں کی طرح کم نسل ہو۔ دفع ہوجاؤ یہاں سے۔'' نواب چلایا۔

زولوف ایوان کو کھینچتے ہوئے ہال سے باہر لے آیا۔ وہ بہت دیر تک روتا رہا۔ اس کی وجہ کرب نہیں، بلکہ شدید غصہ تھا۔ بے عزتی کا احساس اسے گھائل کر رہا تھا۔ اس دوران میں زولوف اور شاہی مورخ اس کے ساتھ تھے۔ اس شام ایوان نے اپنے محافظ سے عہد لیا کہ وہ اس گستاخ نواب کا سر قلم کرکے اس کے پاس لائے گا۔

زولوف نے گہرا سانس لیا۔ ''ممکن ہے کہ آپ کو کچھ انتظار کرنا پڑے جناب۔ مگر اس کا سر جلد آپ کے قدموں میں ہوگا۔''

☆☆☆

ہاں انہیں انتظار کرنا تھا، مگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔ ایوانِ چہارم نے ان نوابوں سے، جنہوں نے اس کے باپ کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا، خفیہ رابطہ کیا۔ وہ شکار کا بہانہ بنا کر محل سے نکلا اور مختلف امراء سے ملاقاتیں کیں۔ اس نے سائبیریا کے نواب جو اس کا ماموں تھا، سے مشورے شروع کردیے۔ اپنے ایک چچا سے بھی ملاقات کی۔ اسے یقین دلایا کہ اگر وہ اس کی حمایت کرے، تو تخت سنبھالنے کے بعد وہ کئی اہم صوبوں کے اختیارات اسے سونپ دے گا۔

زولوف اور اس کے وفاداروں نے ان سرگرمیوں کو

اسپائیڈر مین۔ 2002 میں آنے والی مشہور فلم۔ اس کے تو کئی حصے بن چکے ہیں۔ اس میں ایک منظر ہے کہ ایک اونچی عمارت ہے جس کے ایک کمرے میں ایک لڑکی چار عدد غنڈوں کے درمیان پھنسی ہوئی ہے۔ اچانک اسپائیڈر مین وہاں آجاتا ہے اور دو غنڈوں کو اٹھا کر کھڑکی کی طرف پھینک دیتا ہے اور دونوں غنڈے کھڑکی کے بڑے بڑے شیشے توڑتے ہوئے دوسری طرف گر جاتے ہیں۔ اسپائیڈر مین اب بقیہ دو غنڈوں کی ٹھکائی کر رہا ہے اور کھڑکی کے شیشے بالکل سلامت ہیں۔ ہے نا کمال کی بات۔

ایک اور بہت مشہور فلم ہے Piratas of the crrivean یہ فلم تقریباً ہر فلم بین نے دیکھی ہوگی۔ اس کا زمانہ بہت قدیم ہے۔ قدیم عہد کی کہانی ہے۔ اس کے ایک منظر میں جیک ملاحوں سے مخاطب ہے اور اس کے پیچھے جو ملاح کھڑا ہے اس نے کاؤبوائے ہیٹ پہن رکھا ہے اور دھوپ کا چشمہ لگا رکھا ہے۔

اسپائیڈر مین۔

اسپائیڈر مین کے سلسلہ کی ایک اور فلم، یہ فلم 2007 میں ریلیز ہوئی ہے۔ مقام ہے نیویارک۔

یعنی نیویارک کی کہانی ہے۔ بہت زوروں کی جنگ ہورہی ہے۔ نیویارک کی اونچی اونچی عمارتیں اس جنگ کی زد پہ ہیں۔ اور سب سے پہلے جو عمارت دکھائی دے رہی ہے۔ وہ ایک دوسرے شہر کلیولینڈ کا ٹرمینل ٹاور ہے جس کو کلیولینڈ کی شناخت کہا جاتا ہے۔

مرسلہ: واحد شیخ، جھنگ صدر

مکمل طور پر خفیہ رکھا۔ دوسری جانب امرائے دربار بھی اس عیاری کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایوان فقط ریچھوں کی لڑائی دیکھنے اور جانوروں کو قلعے کی فصیل سے نیچے پھینکنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔

وہ بالکل غلط تھے۔ ایوانِ چہارم تو اس لیے پیدا ہوا تھا کہ فقط ماسکو کا نہیں، بلکہ پورے روس کا حکمران بن جائے اور قہر کی ایک ہولناک کہانی رقم کرے۔

ظلم کرنے کی عادت بے شک اسے ورثے میں ملی تھی، مگر اس کے اپنے اندر بھی کچھ ایسا تھا، جو اسے تشدد پر اکساتا۔ اپنے ان سفلی جذبات کی تسکین کے لیے وہ شرم ناک طریقے اختیار کرنے لگا۔ جب قلعہ کی فصیل سے نیچے گرتے جانوروں میں دلچسپی گھٹنے لگی، تو اس نے قید خانے میں پڑے مجرموں پر تشدد کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتا۔ پہلے وہ ریچھوں کی لڑائی دیکھا کرتا تھا، اب اس نے اپنے غلاموں کو ان سے لڑنے پر مجبور کر دیا۔ انسان اور ریچھ کا کیا مقابلہ۔ کچھ ہی دیر بعد میدان میں غلاموں کی کٹی پھٹی لاشیں پڑی ہوتی۔ اور ایوان تالیاں بجا رہا ہوتا۔

جوں جوں وہ بڑا ہو رہا تھا، جنسی جذبات شدت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ اس کی داشتاؤں کی تعداد بڑھنے لگی۔ وہ ہر وقت فربہ لڑکیوں میں گھرا رہا، مگر کوئی دوشیزہ زیادہ عرصے اس کے پہلو میں نہیں رہتی۔ سبب واضح تھا۔ وہ انتہائی پرتشدد نوجوان تھا۔ د، ان پر مکے برساتا۔ انہیں زدوکوب کرتا۔

اسے ایک مکروہ شوق اور تھا۔ اس کے سپاہی دیہی علاقوں سے کسانوں کی لڑکیاں اٹھا لاتے۔ انہیں محل کے پچھلے حصہ میں لے جایا جاتا۔ سبزہ زار میں مرغیاں چھوڑ دی جاتیں اور لڑکیوں کو بنا کپڑوں کے مرغیاں پکڑنے پر مجبور کیا جاتا۔ اگر کوئی انکار کرتی، تو وہیں اسے قتل کر دیا جاتا۔ غریب لڑکیاں جان بچانے کے لیے اس مکروہ کھیل کا حصہ بن جاتیں اور ایوان انہیں دیکھ کر بغلیں بجاتا۔ مگر اس کی درندگی یہیں تمام نہیں ہوتی۔ وہ سپاہیوں کو حکم دیتا کہ جو کوئی لڑکی سست پڑے، اس پر تیر برسائے جائیں۔ اس عمل سے لڑکیوں میں کھلبلی مچ جاتی۔ وہ اپنی جان بچانے کی کوشش کرتیں اور ماحول میں ایوان کے مکروہ قہقہے گونجتے رہتے۔

کئی لڑکیاں اس ہولناک کھیل میں کام آجاتیں۔ بعد میں ان کے ماں باپ کو کچھ رقم ادا کر دی جاتی تھی۔ بادشاہ کے خلاف کون آواز بلند کرتا، پھر جن علاقوں سے لڑکیاں لائی، جاتی تھیں، وہاں کے گورنروں کو بھی خوب نوازا جاتا۔

امرائے سلطنت کو اس معاملے کا سنجیدگی سے نوٹس لینا چاہیے تھا، مگر وہ یہ سوچ کر چپ رہے کہ اچھا ہے، شہزادہ عیاشیوں میں لگا رہے، تخت پر اس کی گرفت جتنی کمزور ہو گی، اتنا ہی ان کا اثر بڑھتا جائے گا۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ شہزادہ تیزی سے سیاسی داؤ پیچ سیکھ رہا ہے۔ ہاں وہ مکروہ کھیلوں کا دلدادہ تھا، مگر انہیں اس شدت سے اختیار کرنے کا ایک سبب امرائے سلطنت کی آنکھوں میں دھول جھونکنا بھی تھا، جو تنہائی میں تو اس سے بڑی درشتی سے پیش آتے اور دربار میں اس کے سامنے بچھ جاتے۔ اب وہ اپنا پہلا وار کرنے والا تھا۔

☆☆☆

”نواب وطلیزی کو اٹھا کر قید خانے میں ڈال دیا جائے۔ یہ ہمارا حکم ہے۔“

چودہ سالہ ایوان کے اس جملے سے دربار میں سناٹا چھا گیا۔ امراء کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ زدلوف ایوان کے عین پیچھے کھڑا تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا، جب ماسکو کا شاہ اپنے انتہائی اختیارات استعمال کر رہا تھا۔ انہوں نے ترپ کا پتا پھینکا تھا، مگر چال الٹی بھی پڑ سکتی تھی۔ نواب وطلیزی انتہائی بااختیار اور طاقتور شخص تھا۔ یہ وہی آدمی تھا، جس نے کچھ برس قبل جرگے میں ایوان کو تھپڑ رسید کیا تھا۔ اس کے کئی حواری دربار میں موجود تھے۔ الغرض یہ آر یا پار والا معاملہ تھا۔

”اس گستاخ کو قید خانے کا ایندھن بنا دو۔ کیا تم لوگوں نے سنا نہیں۔ کیا تمہاری ماؤں نے تمہیں بہرہ پیدا کیا تھا۔“ ایوان دہاڑا۔

درباریوں کو محسوس ہوا، جیسے فاسیلی سوم ان سے کلام کر رہا ہے۔ جیسے ایک پختہ اور تجربے کار بادشاہ حکم صادر کر رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نواب وطلیزی بھی سہم گیا۔ اچانک اسے خوف نے آن لیا۔ دربار میں چھائی خاموشی نے یہ عیاں کر دیا تھا کہ بادشاہ کم عمر سہی، مگر کوئی اس کے حکم کے خلاف جانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ وہ دھیرے دھیرے پیچھے کھسکنے لگا۔

زدلوف کی نظر اس پر پڑ گئی۔ ”پکڑو اسے۔“ وہ چلّایا۔

اچانک دربار میں بجلی سی دوڑ گئی۔ کئی نواب، جن کا اکلوتا مقصد بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنا تھا، نواب وطلیزی پر پل پڑے۔ انہوں نے مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔

اس شخص کو قید خانے میں ڈالنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہیں دربار میں اس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔

ایوان اس منظر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار اسے اپنے بے پناہ اختیارات اور طاقت کا اندازہ ہوا۔ پہلی بار اس نے وہ سرمستی محسوس کی، جو صرف شہنشاہوں کا نصیب بنتی ہے۔ پہلی بار اس نے جانا کہ وہ روس پر حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔

''اس گستاخ کی لاش مینار پر لٹکا دی جائے، تاکہ خوف ہمارے دشمنوں کے ذہنوں کو چاٹ جائے، تاکہ ان کی ہمت ریت کی دیوار کی طرح ڈھے جائے، تاکہ ان کی بیویوں کے حمل گر جائیں۔''

ایک چاپلوس درباری آگے بڑھا۔ ''حضور، آپ تو ایوانِ اعظم کی طرح کلام کر رہے ہیں، کیا فصاحت و بلاغت ہے۔ بالکل اپنے دادا کی مانند آپ ایک عظیم بادشاہ ہیں۔''

ایوان مسکرایا۔ درباری چاپلوس ضرور تھا، مگر وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک ظالم انسان تھا، مگر وہ ادب کا بھی تورسیا تھا۔ اس کے اندر ایک شاعر چھپا تھا۔ زبان پر اس کی خوب گرفت تھی۔ اس کے عہد میں جہاں ظلم کی نئی داستان رقم ہونے والی تھی، وہیں وہ بنیاد بھی رکھی جانی تھی، جس پر چند صدیوں بعد عظیم روسی ادب کی عمارت کھڑی ہوئی۔

ایوان کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دادا کا جبہ پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں اپنے باپ کا عصا تھا۔ اس نے عصا تین بار زمین پر مارا۔ ''گدھ کا نصیب لاشیں ہوتی ہیں اور عقاب پہاڑ کی چوٹی پر بسیرا کرتا ہے۔ یہ ریاست روئے زمین کی چوٹی ہے اور ہمارے سامنے آسمان کی وسعتیں ہیں۔''

''بے شک۔'' سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

''شاہی نجومی۔ تاج پوشی کے لیے کون سا وقت بہتر ہے؟'' ایوان نے سوال کیا۔ اس کا ایک پیر نواب وطلیزی کی لاش پر تھا۔

''آپ کے قابلِ احترام باپ نے ستاروں کا جائزہ لینے کے بعد ہی تاج پوشی کی تاریخ مقرر کی تھی۔ سولہ برس کی عمر میں ماہ جنوری میں آپ کے سر پر عظیم سنہری تاج رکھا جائے گا۔ آپ امیر اعظم ماسکو کہلائیں گے۔''

''امیر اعظم ماسکو....'' وہ بڑبڑایا۔ ''اور وہ بھی ڈیڑھ برس بعد۔''

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ ''ہم اپنے باپ کی وصیت کا احترام کریں گے، مگر ہم امیر اعظم ماسکو نہیں، بلکہ روس کے زار ہوں گے۔ آج کے بعد ہمیں اسی طرح مخاطب کیا جائے۔''

زار کے لفظ پر کچھ درباری بے چین ہو گئے۔ بے شک اس کے دادا ایوان سوم نے اپنے لیے زار کا خطاب استعمال کیا تھا، مگر وہ بھی پورے روس پر اپنی سلطنت قائم نہیں کر سکا تھا۔ اور پھر تاتاریوں نے اس خطاب کو بے وقعت کر دیا تھا۔ ہر چھوٹی بڑی جاگیر کا شہزادہ اپنے لیے یہی خطاب استعمال کرتا۔

بوڑھا وزیر، جو بہت سے رازوں کا امین تھا، دھیرے سے آگے بڑھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ ایوانِ چہارم کے عروج کا وقت آن پہنچا ہے۔

اس نے شاہی انگوٹھی کو بوسہ دیا۔ ''زار کا لقب آپ ہی کے شایانِ شان ہے، مگر حضور اس ریاست میں بہت سے کم حیثیت اسے برت رہے ہیں، اس لیے یہ مناسب نہیں کہ آپ...''

''سورج طلوع ہونے کے بعد چراغوں کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ سمندر کے سامنے ندی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔'' ایوان مسکرایا۔ ''منادی کروا دو۔ زار روس کا ظہور ہو چکا ہے۔ آئندہ جس کسی نے یہ خطاب استعمال کیا، مقتل اس کا نصیب بن جائے گا۔ اعلان کر دو کہ آج کے بعد یہ لقب فقط ہمارے سینے کا ستارہ بنے گا۔ پورے روس پر ہماری حکومت ہو گی۔ زولوف...''

وہ مڑا۔ وفادار ملازم قریب آ کر جھکا۔ ''آج سے تم ہماری فوج کے سپہ سالار ہو۔ بغاوت کی ہر فصل میں درانتی چلوا دو۔ دشمنوں کا ہر قلعہ مسمار کر دو۔''

''جو حکم میرے آقا۔'' اس نے سر مزید جھکا لیا۔

اور اگلے ہی لمحے پورا دربار اس کے قدموں میں جھکا ہوا تھا۔ روس کو اپنا پہلا زار مل گیا تھا۔ ظلم کے بے انت دور کا آغاز ہونے کو تھا۔

☆☆☆

بازار میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک فوجی دستہ سڑک سے گزرا۔ ٹھیلے پتھارے ہٹا دیے گئے۔ خاکروب کام پر لگ گئے۔ پھر خوشبو کا چھڑکاؤ ہوا۔ ڈھول کی آواز سنائی دینے لگی۔ منادی ہوئی۔ ''زار روس تشریف لا رہے ہیں۔''

وہ ایک پرشکوہ سواری تھی۔ ہاتھی کی کمر پر رکھی پالکی پر سونے کا کام تھا۔ اس میں لگے جواہرات دھوپ میں چمک

رہے تھے۔ پردا تھوڑا کھسکا۔ ایوان چہارم ظاہر ہوا۔ وہ اپنی عمر سے خاصا بڑا لگ رہا تھا۔ اس کی گردن اونچی تھی اور آنکھوں میں تکبر تھا۔ سڑکوں کے دونوں طرف کھڑے اہل کار اس قافلے پر پھول اور معطر پانی چھڑک رہے تھے۔ لوگ دم سادھے کھڑے تھے۔

قافلہ آگے بڑھتا رہا۔ راستے میں ایک نان بائی کی دکان آئی۔ وہ سڑک سے کچھ باہر نکلی ہوئی تھی۔ باہر پڑی لکڑیاں ایوان کو ناگوار گزریں۔ اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ اس کا قافلہ گزرنے کے بعد دکان کو توڑ دیا جائے۔ نان بائی نے احتجاج کیا، تو اسے زدوکوب کیا گیا۔

یہ فقط آغاز تھا۔ اس دوپہر بہت سی دکانیں اور مکانات توڑے گئے۔ بہت سے لوگوں پر تشدد کیا گیا۔ کئی لڑکیوں کو اٹھا کر محل لے جایا گیا۔ شام کو جب اپنی گشت سے لوٹا، ماسکو کی رگوں میں خوف بیٹھ چکا تھا۔

☆☆☆

گلیوں میں پُراسرار قصے گردش کر رہے تھے۔

شراب خانے میں کچھ لوگ ایک سنہری دم دار ستارے کی باتیں کر رہے تھے۔ بازار میں کچھ لوگ اس روشنی کا تذکرہ کر رہے تھے، جو رات گئے سڑکوں پر ظاہر ہوتی اور پھر غائب ہو جاتی۔ کچھ لوگوں نے ایک سورما کا ذکر کیا، جس نے تاریک گلیوں میں انہیں ٹھگوں سے بچایا۔ کئی عورتوں نے، جو برسوں سے بے اولاد تھیں، دعویٰ کیا کہ وہ حاملہ ہو گئی ہیں۔ کئی مسکین سڑکوں پر ناچتے نظر آئے کہ کوئی ان کے گھروں پر اشرفی کی تھیلی پھینک گیا تھا۔

یہ سب کیا تھا؟ اسے سمجھنے کی عام آدمی استعداد نہیں رکھتا تھا، مگر سیاست پر گہری نظر رکھنے والے جانتے تھے کہ اس کی جڑیں محل سے ملتی ہیں۔ ایک بڑے واقعے کے لیے جھوٹے قصوں کی فصل تیار کی جا رہی ہے۔

محل میں چاند اتر آیا تھا۔ قیمتی اوراق کا اہتمام کیا گیا۔ ملک بھر کے مشاق خطاط دربار میں اکٹھے کیے گئے۔ انہیں انتہائی نفیس قلم سونپے گئے، تاکہ وہ سنہری روشنائی سے ایوانِ چہارم کی تاج پوشی کی عظیم الشان روداد قلم بند کریں۔

یہ 16 جنوری 1547ء کا تذکرہ ہے، جب خاندانی تاج اس کے سر پر رکھا گیا اور سرکاری دستاویزات میں اسے زار اول کہہ کر مخاطب کیا گیا۔ اس رسم پر لاکھوں روبل خرچ کیے گئے۔ ملک بھر کے نوابوں نے قیمتی تحائف اور نذرانے روانہ کیے۔ ان میں نایاب موتی تھے، قدیم سکے اور مہریں تھیں۔ زرق برق لبادے تھے۔ تحائف لانے والے قافلے اتنے طویل تھے کہ جہاں تک نظر جاتی، سر ہی سر ہوتے۔ اس عمل نے نہ صرف عوام، بلکہ امرائے دربار پر اس کی دھاک بٹھا دی۔ انہیں علم نہیں تھا کہ ان میں سے آدھے تحائف کا انتظام خود بادشاہ نے کیا تھا اور اس کا مقصد عوام پر اپنا دبدبا قائم کرنا تھا۔

ملک بھر کے گرجا گھروں میں دعائیہ تقریبات ہوئیں۔ روس کے پادری اعظم نے سولہ سالہ ایوان کے سر پر تاج رکھا۔ اس نے اپنی تقریر میں اس خواب کا ذکر کیا۔ اس نے فرشتوں کا جھرمٹ دیکھا۔ وہ روشن لبادے میں ملبوس ایک شخص کے گرد دائرے میں کھڑے تھے۔ اس نے ان سرگوشیوں کا ذکر کیا، جو مرکزی کلیسا کے چھوٹے پادری کو صلیب سے سنائی دیں، جن میں ایک سورما کے ظہور کی پیشگوئی کی گئی۔ اس نے اعترافات کے لیے آنے والے ان نامعلوم افراد کا بھی تذکرہ کیا، جنہوں نے اسے اپنے خواب سنائے، جن میں انہوں نے ایک دیومالائی شخص دیکھا، جسے نور سے مجسمہ دیا جا رہا تھا۔

پادری کی طویل تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ایوانِ چہارم جو آج کے بعد زارِ روس کہہ کر پکارا جائے گا، دراصل خدا کا منتخب کردہ انسان ہے۔ اس کی حیثیت الوہی ہے۔ اور اس کے سر پر تاج رکھنا قدرت کے عظیم منصوبے کا حصہ ہے۔ شاید پادری یہ سب نہیں کہتا، اگر سپہ سالار زدلوف کل رات اس کے گھر آ کر اس کے بیٹے کی گردن پر تلوار نہ رکھ دیتا۔

پادری کی تقریر کے بعد سب اپنے گھٹنوں پر بیٹھ گئے۔ زارِ روس زندہ باد کے نعرے سے محل گونج اٹھا۔ جشن کئی روز چلا اور بادشاہ کو الوہی حیثیت دینے کی مہم زور پکڑتی گئی۔

قرب و جوار کی ریاستوں کو خطوط روانہ کیے گئے۔ ان خطوط میں بادشاہ کو الوہی ہستی قرار دیا تھا۔ دعویٰ کیا گیا کہ عظیم روس کا سپنا سچ ہو چکا ہے، یا تو وہ زار کی اطاعت قبول کر لیں، یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔

تاج پوشی کے جشن کے بعد زار نے اعلان کیا۔ ”قدرت کا حکم ہے کہ انسان اپنی نسل بڑھائے۔ اور خدا کے ایک عاجز بندے کی حیثیت سے مجھ پر لازم ہے کہ میں اپنا جوڑی دار تلاش کروں۔ ایک سادہ اور نفیس عورت، جو آپ کی ملکہ بننے کا حق ادا کر سکے۔“

انکساری کے ساتھ ادا کیے جانے والے یہ جملے فقط

ایک ڈھونگ تھے۔ وہ کسی سیدھی سادی لڑکی کی تلاش میں نہیں تھا، اسے تو ایک اپسرا کی خواہش تھی۔ ایک عورت، جس کا حسن ملکوتی ہو۔ جو اس کے کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑی ہو سکے۔ جب بادشاہ کو الوہی حیثیت دے دی گئی، تو اس کی ملکہ بھی اساطیری حسن کی حامل ہونی چاہیے تھی۔

یہ ایک ملک گیر تلاش تھی۔ کئی مورخین نے لکھا کہ اگر اس پیمانے پر معدنی ذخائر تلاش کیے جاتے، تو روس ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتا۔

تمام نوابوں کو اپنے صوبے کی خوبصورت ترین لڑکیاں منتخب کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا۔ حسن فقط ایک شرط تھی۔ لازم تھا کہ وہ اعلیٰ نسل ہو۔ اس کی پرورش اچھے ڈھب پر کی گئی ہو۔ ساتھ ہی وہ تعلیم یافتہ اور مہذب بھی ہو۔

نوابوں نے اپنے صوبوں کے تمام امور کو پس پشت ڈال دیا۔ ان کا مقصد فقط ایک تھا، ایک حور کی تلاش، جو کل ملکہ بن سکے۔ بادشاہ نے وعدہ کیا تھا کہ جس صوبے کی لڑکی اس کے معیارات پر پوری اتری، اس کے گورنر کا منہ سونے کے سکوں سے بھر دے گا۔

بڑے پیمانے پر تلاش کی گئی۔ صوبائی سطح پر منتخب کردہ لڑکیاں امتحان کے کئی مراحل سے گزریں۔ ان کی ذہانت کی جانچ ہوئی۔ جائزہ لیا گیا کہ وہ محفل کے آداب جانتی ہیں یا نہیں۔ زار سے متعلق ان کے خیالات پرکھے گئے۔

ہر صوبے نے اپنی منتخب کردہ لڑکیوں کو، جو بلاشبہ بے حد حسین تھیں، ماسکو روانہ کیا۔ ماسکو میں چاند اتر آیا۔ وہاں پندرہ سو کے قریب حوریں اکٹھی ہو گئی تھیں، جن میں سے ملکہ بننے کا اعزاز کسی ایک کے حصے میں آنا تھا۔

ایک کڑا امتحان ہوا۔ اتنا سخت کہ کئی لڑکیاں دباؤ برداشت نہیں کر سکیں اور صدمے سے ڈھ گئیں۔ جنھوں نے یہ مرحلہ طے کیا، ان کی تعداد فقط پانچ سو تھی۔

انیس تیسیا بھی ان پانچ سو لڑکیوں میں شامل تھی۔ اکولیچی کے مرحوم نواب کی یہ بیٹی جادوئی مسکراہٹ کی حامل تھی۔ اس کی آنکھیں نیلی اور گہری تھیں۔ اور گالوں پر گڑھے پڑتے تھے۔ وہ بلا کی ذہین تھی اور گفتگو میں کمال رکھتی تھی۔

ایوان نے اپنے وفاداروں کے ساتھ پانچ سو لڑکیوں کا آخری امتحان لیا۔ اسی دوران میں اس کا پہلی بار انیس سے سامنا ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اسے دل دے بیٹھا، تو کچھ غلط بھی نہیں ہوگا۔

منگل کے دن جہانگیر پورہ میں پڑاؤ ڈالا۔ یہ موضع میری مقررہ شکارگاہ ہے۔ اس موضع کے حوالی میں منسراج نامی ہرن کی قبر پر میرے حکم سے ایک مینار تیار کیا گیا ہے۔ یہ ہرن پالتو اور صحرائی ہرنوں کی لڑائی میں بے مثل تھا۔ اس مینار کے ایک پتھر پر ملا محمد حسین کشمیری نے جو اس زمانے کے سربر آوردہ خوش نویسوں میں تھا یہ نثر لکھی تھی اور یہ پتھر پر لکھ دی گئی ہے۔

''اس دلکش فضا میں جہاندار، خدا آگاہ نور الدین جہانگیر بادشاہ کے دام میں ایک ہرن آیا جو ایک مہینے کے عرصے میں جنگل کی وحشت سے نکل کر اس طرح سدھا کہ شاہی ہرنوں کا سردار ہو گیا۔''

اس ہرن کی ندرت کی بنا پر میں نے حکم دیا کہ کوئی شخص اس جنگل کے ہرنوں کا شکار نہ کرے اور یہاں کے ہرنوں کا گوشت ہندو اور مسلمانوں کے لیے وہی حکم رکھتا ہے کہ گویا گائے اور سور کا گوشت ہے۔ ساتھ ہی میں نے یہ حکم دیا کہ اس کی قبر کے پتھر کو ہرن کی شکل میں ترشوا کر نصب کیا جائے اور میں نے سکندر معین سے جو اس پرگنے کا جاگیردار ہے یہ کہا کہ جہانگیر پورہ میں ایک مضبوط قلعہ بنایا جائے۔

منسراج ہرن کی یاد میں جہانگیر نے جو یادگار قائم کی تھی وہ آج بھی موجود ہے اور ہرن مینار کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایک مشہور سیرگاہ ہے جو شیخوپورہ کے ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے۔

شہنشاہ جہانگیر کی خودنوشت
''توزک جہانگیری'' سے ایک اقتباس
مرسلہ: شاہد جہانگیر شاہد۔ پشاور

فیصلہ آ گیا۔ تاج پوشی کے تین ہفتوں بعد روس کا زار رشتۂ ازدواج میں بندھ گیا۔ اس پرشکوہ تقریب میں نہ صرف ملک بھر کے نوابین نے شرکت کی، بلکہ پڑوسی ممالک کے شاہ بھی شریک تھے۔ تحائف کے قافلے ماسکو کی سمت آتے تھے۔ کئی روز تک جشن جاری رہا۔ اور شاید مزید چند ماہ جاری رہتا، اگر آگ دارالحکومت کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لیتی۔

☆☆☆

جہنمی آسیب زمین پر اتر آیا۔ عفریت کا لبادہ شعلوں کا تھا۔ اور اس کا منہ آگ اگلتا تھا۔

آگ۔ ہر طرف آگ ہی آگ۔ ہر طرف موت۔ ہر طرف کرب۔ ماسکو کا بڑا حصہ لکڑی کے مکانات اور عمارتوں پر مشتمل تھا اور ہر شے شعلوں کی لپیٹ میں تھی۔ اس کا آغاز شمالی حصے سے ہوا۔ آگ کیسی بھڑکی، اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل تھا۔ بعد میں سرکار نے اسے باغیوں کی سازش قرار دیا، مگر محققین کا خیال ہے کہ اس کا آغاز آتش گیر مادے کے گوداموں سے ہوا تھا۔ سب سے پہلے وہیں کہرام مچا تھا۔

یہ 24 جون کا واقعہ ہے۔ آگ ابتدا میں معمولی تھی، مگر جلد ہی اس نے دیگر گوداموں کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ لوگوں نے آگ بجھانے کی کوشش کی، مگر ان کے ہاتھ فقط ناکامی آئی۔ لکڑی کے مکانات نے تیزی سے آگ پکڑی۔ لوگوں کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ وہ گھربار چھوڑ کر جان بچانے کے لیے بھاگ نکلے، مگر آگ نے ان کا پیچھا کیا۔ اس نے گرجے، بازار اور شراب خانوں کو نگل لیا۔ کئی زندگیاں دبوچ لیں۔ اور پھر وہ شہر میں داخل ہوگئی۔

قلعہ کریملین کے اردگرد شعلے دکھائی دینے لگے۔ انتظامیہ بادشاہ کے حکم کا انتظار کرتی رہی اور بادشاہ اپنی چہیتی بیوی کے ساتھ شراب سے دل بہلاتا رہا۔ اس نے اس معاملے کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ نشے میں دھت زار اپنی بیوی کی آغوش میں سو گیا۔ قلعہ کریملین کے میناروں سے شعلے بلند ہونے لگے۔ سرکاری دفاتر کو بھی آگ لگ گئی تھی۔

زولوف ہمت کرکے بادشاہ کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ زار گہرے خمار میں تھا، مگر ذہین انیس ٹیسیا معاملے کی سنگینی سمجھ گئی تھی۔

''آپ کو یہاں سے فوراً نکلنا ہوگا۔'' زولوف کی آواز لرز رہی تھی۔ ''ہر سو تباہی ہے۔ شہر کا ایک حصہ جل کر خاکستر ہو چکا ہے۔ ہزاروں لوگ ہلاک ہوگئے۔ اسلحہ خانے کا بڑا حصہ لپیٹ میں آگیا ہے۔ شاہی گرجے کے میناروں سے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ خزانہ بھی آگ کی زد میں آنے والا ہے۔''

بادشاہ اور ملکہ کو ایک تیز رفتار بگھی سے قریبی پہاڑی مقام دارا ہیوو روانہ کر دیا گیا۔ ملکہ نے بگھی کی کھڑکی سے دیکھا۔ شعلے محل کے میناروں سے بھی بلند تھے۔ وہ دھویں سے بھری سڑکوں اور جلتی ہوئی دکانوں کے درمیان سے گزرے۔ کئی جھلسی ہوئی لاشیں دیکھیں۔ جلد بازی میں چند افراد بگھی کے پہیوں تلے کچلے گئے اور بادشاہ اس پورے عمل کے دوران میں سوتا رہا۔ خود کو دیوتا سمجھنے والے انسان کو ہوش ہی نہیں تھا کہ اس کی رعایا پر کیا قیامت گزر چکی ہے۔

آگ بجھانے میں کئی روز لگے۔ یہ سانحہ ماسکو کے لیے بدترین غربت اور سوگ لایا۔ لاکھوں لوگ اس سے متاثر ہوئے۔ مرنے والوں کی تعداد تیس ہزار کے قریب تھی۔

پورے ایک ہفتے تک سڑکیں لاشوں سے اٹی رہیں۔

شاہی اسلحہ خانہ، گرجا گھر اور محلات کھنڈر ہوگئے تھے۔

زندہ بچنے والے خوش نصیبوں میں اپنے عہد کا ممتاز ادیب اور پادری میکاروس بھی شامل تھا۔ وہ ایک بااثر شخص تھا۔ بادشاہ اس کا شمار اپنے خیرخواہوں میں کرتا تھا۔ تاج پوشی اور شادی کے انتظامات اسی کے ذمے تھے۔

جب آگ قلعہ کریملین میں داخل ہوئی، وہ شاہی کلیسا میں سویا ہوا تھا۔ اس سے قبل کہ اسے خبردار کیا جاتا، آگ نے اس کی رہائش گاہ کا گھیراؤ کر لیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی، بستر آگ پکڑ چکا تھا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی، مگر شعلے اس کے لبادے پر حملہ آور ہوگئے۔ خوش قسمتی سے اس کا وفادار ملازم موقع پر پہنچ گیا۔ اس نے بہ مشکل آگ بجھائی اور قلعے کی دیوار سے بندھی ایک رسی کے سہارے پادری کو دریائے ماسکو میں اتار دیا۔ وہاں اتھلے پانی میں ایک کشتی تیر رہی تھی، جس کا ملاح آنکھوں میں ہیبت لیے جلتے ہوئے شہر کو دیکھ رہا تھا۔

پادری کا جسم خاصا جھلس چکا تھا۔ وہ شدید تکلیف میں تھا۔ اسے فوراً طبی امداد دی گئی، جس کے بعد اسے دارا ہیوو پہنچا دیا گیا۔

بادشاہ جو شراب کے سہارے صدمے کو زائل کرنے میں جتا ہوا تھا، اسے دیکھ کر کھل اٹھا۔ اس کا خیال تھا کہ پادری مر چکا ہے۔ پادری نے، جو وادی کی سمت آنے سے قبل کچھ دیر شہر میں گزار چکا تھا، اسے مطلع کیا کہ ماسکو میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے اور اگر وہ یہیں اپنے احمق مشیروں کے ساتھ بیٹھا رہا، تو تخت اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

بادشاہ خواب غفلت سے جاگا۔ اس کے اندر کا جانور بیدار ہوگیا۔ ظالم ذہن حرکت میں آیا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، جہاں ہر سو تباہی اور راکھ تھی، جہاں لاشیں پڑی تھیں۔ بادشاہ نے ان کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ سیدھا محل پہنچا۔ وزرا اکٹھے ہوگئے۔ اس نے کئی نوابین پر بغاوت کا الزام عائد کرتے ہوئے انھیں گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ کسی نے آواز بلند نہیں کی۔ ہر شخص

اس کی آنکھوں سے جھانکتے حیوان کو دیکھ سکتا تھا۔

جن افراد پر بغاوت کا الزام لگایا گیا تھا، انہیں جلد ہی گرفتار کر لیا گیا۔ شہر میں پھیلے انتشار پر قابو پانے کے لیے بھرپور طاقت استعمال کی گئی۔ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر احتجاج کرنے والوں کو کوڑے مارے گئے۔ کئی کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔

اگلے روز غدار ٹھہرائے جانے والے نوابوں کو عقوبت خانے سے نکال کر ایک بڑے سے میدان میں ستون سے باندھ دیا گیا۔ پہلے انہیں کوڑے مارے گئے۔ پھر ان پر پتھروں کی بارش کی گئی۔ ان کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ روئے، گڑگڑائے، فریاد کی، مگر بادشاہ رحم کرنے کا قائل نہیں تھا۔

تمام لاشوں کو آگ لگا دی گئی، جس کے بعد اس نے آرام سے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ شاہی دسترخوان حسبِ سابق طرح طرح کے پکوانوں سے سجا تھا۔

اسے اطلاع ملی کہ پادری میکاروس ملنے آیا ہے۔ بادشاہ نے اسے دسترخوان ہی پر بلوا لیا۔ پادری کی حالت خستہ تھی، وہ شدید تکلیف میں تھا، مگر بادشاہ کے چہرے پر وہی سفاکی تھی، جو اس کے چہرے کا جزو بن چکی تھی۔

''باغیوں کا قلع قمع کرنا کافی نہیں حضور۔ اس کے پیچھے کچھ اور قوتیں بھی ہیں؟''

بادشاہ رک گیا۔ اس نے پادری پر نظر ڈالی۔ بوڑھے نے ہاتھ ہوا میں بلند کیے۔ ''جادوگر جناب جادوگر۔ وہ رذیل لوگ کلیسا کے دشمن ہیں۔ اور جب سے انہیں پتا چلا ہے کہ آپ خدا کے منتخب کردہ ہیں، پادری آپ کے ساتھ کھڑے ہیں، وہ آپ کے دشمن ہو گئے ہیں۔''

بادشاہ خاموشی سے سنتا رہا۔

''میں یہاں آنے سے پہلے مردہ خانے گیا تھا۔ کیا آپ کو علم ہے کہ بہت سی لاشوں کے دل غائب ہیں۔ ہاں، وہ انہیں ایک بڑے چلے کے لیے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ بدبخت اس عظیم تخت کے دشمن ہیں۔ لیجیے، میں نے آپ کے لیے ان مکروہ انسانوں کی ایک فہرست تیار کر لی ہے، جنھیں واصلِ جہنم کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔''

بادشاہ کھڑا ہو گیا۔ وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس زمانے میں توہم پرستی عام تھی۔ بادشاہ نے ان باتوں پر من و عن یقین کر لیا۔ یہ نہیں سوچا کہ اتنے مختصر وقت میں بوڑھے نے فہرست کیسے تیار کر لی۔ اور یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ فہرست میں کس کا نام درج ہے۔

جادوگروں والی بات فقط ڈھونگ تھی۔ مکار پادری نے فہرست میں ان لوگوں کا نام شامل کیا تھا، جو خرد پسندی کے حامی تھے اور کلیسا کے اختیارات کم کرنے کے مطالبات کر رہے تھے۔ وہ کلیسا اور ریاست کے گٹھ جوڑ کے خلاف تھے۔ اور پادری کے لیے ان علم دوستوں سے انتقام لینے کا اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔

آگے جو کچھ ہوا، وہ قابلِ فہم تو ہے، مگر قابلِ بیان نہیں۔ چھوٹے موٹے عامل، جنھوں نے کبھی بغاوت کے بارے میں سوچا بھی نہیں ہوگا، شاہی عتاب کی زد میں آ گئے۔ انہیں سڑکوں پر گھسیٹا گیا۔ سرتن سے جدا کر دیے گئے۔ کئی ایسے شعبدے باز، جو میلوں ٹھیلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے، اس ظلم کا شکار بنے۔ انہیں سرِعام پھانسیاں دی گئیں۔ کئی مظلوم افراد کو قلعے کی فصیل سے نیچے پھینک دیا گیا۔ ان کی لاشیں جلا دی گئیں۔ تین سودانشوروں کو کوڑے مار مار کر قتل کیا گیا۔

بڑے پیمانے پر قتلِ عام ہوا۔ کئی خاندان اجڑ گئے۔ اس تباہی سے بادشاہ کا خوف کم ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، چالاک پادری کو بڑی تسکین ملی۔ اس قتل و غارت گری کے ذریعے اس نے اپنے تمام دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیا۔

☆☆☆

یہ زولوف تھا، جس نے اسے مشرقی سرحد وسیع کرنے کا مشورہ دیا۔

اس سمت سے بری خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ دریائے وولگا سے ملحقہ علاقوں میں تاتاری مسلمان قوت حاصل کر رہے تھے۔ قازان سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ اس کا خان اردگرد کی ریاستوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆ یہ ضروری نہیں کہ جو کوئی خوب صورت ہو، نیک سیرت بھی ہو، کام کی چیز اندر ہوتی ہے باہر نہیں۔ (شیخ سعدی)

☆ حقیقی خوب صورتی کا چشمہ دل ہے اگر یہ سیاہ ہو تو چمکتی آنکھیں کچھ کام نہیں دیتیں۔ (بوعلی سینا)

☆ محبت کے لحاظ سے ہر ایک باپ یعقوب اور حُسن کے لحاظ سے ہر بیٹا یوسف ہے۔ (بوعلی سینا)

☆ ہر روز اپنا منہ آئینے میں دیکھا کرو۔ اگر بری صورت ہے تو برا کام نہ کرنا تاکہ دو برائیاں جمع نہ ہوں، اگر اچھی صورت ہے تو برا کام کر کے خراب نہ کرو۔ (افلاطون)

قازان کے مسلمانوں کی وفاداری سلطنت عثمانیہ کے ساتھ تھی۔ وہ مسلم خلیفہ کے حواری تھے۔ اور اسی بات پر ظالم ایوان ناخوش تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا سرحدی علاقہ کسی عالمی طاقت کے دائرۂ اثر میں آجائے۔

ایوان گٹھ جوڑ کا ماہر تھا۔ اس کے کارندے تیزی سے حرکت میں آئے۔ قازان کے گردونواح میں پیغام پہنچا دیا گیا کہ گھمسان کا رن پڑنے والا ہے۔ اگر قازان کا ساتھ دینا ہے، تو موت کے لیے تیار رہو، ورنہ خاموشی سے ایوان کی پناہ میں آجاؤ۔

سب ہی نے سر جھکا دیے۔ جدید اسلحے سے لیس ایک بڑی فوج سے لڑنا سراسر حماقت ہوتی۔ موسم بہار میں روسی فوجیوں نے قازان کے قریبی علاقوں میں ٹھکانے بنا لیے۔ وہاں خاصا اسلحہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ اردگرد کے سردار خاموش رہے کہ اسی میں عافیت تھی۔

ماسکو میں زولوف نے ایوان اور دیگر نوابوں کو حالات سے آگاہ کیا۔ منصوبہ مکمل تھا۔ قازان کے پاس بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

16 جون 1552ء کو ایوان ڈیڑھ لاکھ سپاہیوں کے ساتھ قازان کی سمت بڑھنا شروع ہوا۔ دیگر علاقوں سے دستے آن ملے۔ جب وہ قازان کے دروازے پر پہنچے، یوں لگتا تھا کہ انسانوں کا سمندر قلعے کی دیوار سے آن ٹکرایا ہو۔

30 اگست کی صبح قازان پر قہر نازل ہوا۔ ان کے پاس بارود اور جدید توپیں تھیں۔ ساتھ ہی ایسے مینار، جہاں سے پھینکے جانے والے تیر باآسانی فصیل عبور کر جاتے۔ ان کے پاس شاطر انجینئر تھے۔ انہوں نے شہر کا فراہمی آب کا نظام معطل کر دیا۔ خفیہ سرنگیں بند کر دی گئیں۔ ان کے محاصرین نے قازان کے اعصاب توڑ دیے۔ 2 اکتوبر کو مقامی آبادی نے ہتھیار ڈال دیے۔

گو پہلے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر قازان شاہ روس کی اطاعت قبول کر لے، تو اسے بخش دیا جائے گا، مگر وہ وعدہ ہی کیا، جو وفا ہو جائے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی ایوان اپنے اصلی روپ میں آ گیا۔ اس نے قتل و غارت گری کا حکم جاری کر دیا۔ اس کے وحشی سپاہیوں نے ظلم کی ہولناک داستان رقم کی۔ مردوں کو چوک پر پھانسی دی گئی۔ عورتیں کی آبروریزی ہوئی۔ بچے اور بوڑھے قتل کر دیے گئے۔ تین چوتھائی آبادی ہتھیاروں کی غذا بن گئی۔ سب نیست و نابود ہو گیا۔ اور بادشاہ شہر کے بلند ترین مینار پر کھڑا اس وحشت اور بربریت کی تصاویر دیکھتا رہا۔

اس نے مقامی آبادی کے عقائد اور رسومات کا خوب مذاق اڑایا۔ مساجد، خانقاہیں اور محلات گرا دیے گئے۔ ان کی جگہ گرجا گھر تعمیر کیے گئے۔ کئی علما کو شہر بدر کر دیا گیا۔ کئی افراد کو زبردستی عیسائی بنایا گیا۔ اس نے طنزاً کہا۔ ”سلطنت عثمانیہ کی حمایت کا نتیجہ دیکھ لو۔ کیا وہ تمہاری مدد کو آئے۔ یہ روس ہے۔ یہاں کا بادشاہ زار ہے۔ کوئی یہاں پر بھی نہیں مار سکتا۔ میری اطاعت ہی میں تمہاری بھلائی ہے۔“

جو ظلم اس نے قازان پر ڈھائے، اس سے گردونواح کی ریاستوں میں خوف بیٹھ گیا۔

اب وہ ایک اور تاتار مسلم علاقے استراخان کی سمت متوجہ ہوا۔ 1460ء میں اس ریاست کو محمود استراخانی نے ترک خانیت یا سنہری لشکر کے انتشار کے دنوں میں قائم کیا تھا۔ اقتدار میں آنے کے بعد اس نے تخت ماسکو کے خلاف ہونے والی بغاوتوں میں براہ راست تو حصہ نہیں لیا، مگر باغیوں کی معاونت ضرور کی تھی۔

قازان پر قبضے کے بعد ایوان چہارم نے اعلان کر دیا کہ جلد استراخان پر بھی ماسکو نواز حکومت قائم ہوگی۔ اس نے ہزاروں فوجی دستوں کو جدید آلات سے لیس کر کے استراخان کی سمت روانہ کر دیا۔ وہاں کا حکمران درویش خان قازان کے آخری سربراہ یادگار محمد کا حشر دیکھ چکا تھا، ماسوائے ماسکو کی اطاعت قبول کرنے کے اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

1554ء میں ماسکو نواز اشرافیہ اور نوگائے قبائل نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ جب درویش خان نے خانان کریمیا سے گٹھ جوڑ کر کے اپنی سلطنت حاصل کرنے کی کوشش کی، تو ایوان نے روسی آبادکاروں اور کاسک فوج کی ایک بڑی تعداد استراخان پر قابض روس نواز اشرافیہ کی مدد کے لیے روانہ کر دی، جنہوں نے نہ صرف اسے مکمل طور پر تسخیر کیا، بلکہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ انہوں نے وہاں بھی قازان والی کہانی دہرائی۔ وحشت کی اس داستان نے درویش خان کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ بعد میں وہ گمنامی میں مارا گیا۔

تاتاری پسپا ہوئے۔ زار روس ایک خونخوار درندے کے مانند اپنے پر پھیلا رہا تھا۔

☆☆☆

”مشرق سرنگوں ہو گیا، اب ہمیں مغرب کی سمت توجہ

مرکوز کرنی چاہیے۔“

سپہ سالار زولوف کے اس مشورے کی تھوڑی بہت مخالفت ہوئی۔ شاہی نجومی نے دبے دبے الفاظ میں کہا کہ یہ مہم پرخطر ثابت ہوگی۔ ممکن ہے، ہمیں بھاری نقصان اٹھانا پڑے۔ مگر ایوان کو نجومی کی مستقبل بینی سے زیادہ اپنی فوج کی قوت پر بھروسا تھا۔

لیوونیا جرمن نوآبادی تھی۔ اس علاقے کو فتح کر کے ایوان گرم پانیوں تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ بحیرہ بالٹک زیرِ تسلط آنے کے بعد بڑی تجارتی گزرگاہ اس کے ہاتھ آجاتی۔ یوں اس نے ایک ایسی جنگ کا آغاز کیا، جو اگلے چوبیس برس جاری رہی۔ وہ دیوانگی میں اتنا آگے بڑھ گیا کہ آنے والے برسوں میں اسے سویڈن، ڈنمارک اور ناروے کی فوجوں سے لڑنا پڑا۔

اس جنگ میں دونوں فریقین کا بھاری نقصان ہوا۔ کئی مراحل پر دشمنوں نے صلح کی پیشکش کی۔ چند موقع ایسے بھی تھے، جب ایوان کی فوج مشکل وادیوں میں پھنس گئی تھی، موسم کا قہر ایک ایک کر کے اس کے سپاہی نگل رہا تھا، مگر اس زمانے میں اس کا پاگل پن، اس کی دیوانگی اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ اس کی چہیتی بیوی، ملک کی سب سے خوبرو عورت ملکہ انیس ٹیسیا اس سے جدا ہو چکی تھی۔ اور ایوان یہ جدائی برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

اسے یقین تھا کہ ملکہ کو زہر دیا گیا ہے اور اس عمل میں اُس کے مخالفین شامل ہیں۔ اس شک کی بنیاد پر کئی نوابوں کو قید خانوں میں ڈال دیا گیا۔ کچھ کو بازاروں میں سزائے موت دی گئی۔

جب بھی محاذ سے صلح کی پیشکش آئی، ایوان نے درشتی سے اُسے رد کر دیا۔ جنگ جاری رہی۔ اس کے سپاہیوں کی حالت اتنی بگڑ چکی تھی کہ جب وہ کسی علاقے میں داخل ہوتے، تو جانوروں کی طرح کھانے پر جھپٹ پڑتے۔ پیٹ بھرنے کے بعد وہ عورتوں کی طرف متوجہ ہوتے۔ ان کی عزتیں تار تار کرتے، انہیں قتل کر ڈالتے۔ اور اس کے لیے وہ انتہائی وحشیانہ طریقے اختیار کرتے۔ وہ انہیں برہنہ کر کے درختوں سے لٹکا دیتے اور ان پر تیر برساتے۔ کبھی ان کے جسموں کو داغتے۔ کبھی انہیں یخ بستہ دریا میں پھینک دیتے۔ حسین عورتوں کو ماسکو بھیج دیا جاتا۔ انہیں بادشاہ، وزیر اور نوابوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ جب ان وحشیوں کا دل بھر جاتا، تو انہیں بازارِ حسن کی زینت بنا دیا جاتا۔

بہت سے لوگ آج بھی فلموں میں کرنے والے اداکاروں کے بارے میں اچھے خیالات نہیں رکھتے مگر سب ہی ایسے نہیں ہوتے کہ ان کو برا سمجھا جائے۔ ہمارے ہاں معین اختر، سلطان راہی اور محمد علی اپنی انسان دوستی کے لیے خاصے مقبول تھے۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں مگر انہیں بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ لوگ یاد کرتے ہیں۔

بالی ووڈ میں بھی ایسے کئی فلمی لوگ تھے اور آج بھی موجود ہیں جو اعلیٰ انسانی اقدار کے حامل ہیں اور زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے بہت سے اہم لوگوں کے مقابلے میں زیادہ قابلِ احترام ہیں۔ نانا پاٹیکر جو بھارتی فلموں میں عام طور پر منفی نوعیت کے کردار کرنے میں بہت مقبول ہے۔ اپنی عام زندگی میں بہت مختلف ہے۔ اسے اس بات کا بہت دکھ ہے کہ بہت سے لوگ ناآسودہ زندگی گزار رہے ہیں۔ مایوسی اور محرومی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس سے جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے وہ ایسے لوگوں کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔

ایک فلمساز نے اس کے بارے میں یہ راز کی بات بتائی ہے کہ نانا کسی بھی فلم کا نصف معاوضہ خود لیتا ہے اور باقی کی رقم کا چیک کسی آشرم یا فلاحی ادارے کو دینے کا کہہ دیتا ہے۔ جب کہ اس نے اس بات کی کبھی خود پبلسٹی کی نہ کسی نے بتایا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ اس ہاتھ دو تو دوسرے ہاتھ کو پتا نہ چلے تو اس پر وہ عمل کرتا ہے۔ اکثر اوقات چیک وصول کرنے والے ادارے کو بھی پتا نہیں چلتا کہ کس نے یہ چیک بھجوایا ہے۔

مرسلہ: انور فرہاد، کراچی

لیوونیا پر حملے نے سلطنت عثمانیہ کو چوکنا کر دیا۔ قازان اور استراخان پر قبضے کی وجہ سے سلطان اور اس کے حواریوں میں ظالم زار کے خلاف شدید غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ ترک فوج تیاری میں جت گئی۔ تاتاری اور سرحدی قبائل ان کے ساتھ آن ملے۔ جنگ لیوونیا کی صورت ان کے ہاتھ ایک سنہری موقع آ گیا تھا۔ دشمن کی فوج کا بڑا حصہ مختلف محاذوں پر الجھا تھا، ایسے میں وہ اگر بھرپور حملہ کرتے،

تو ماسکو تک پہنچ سکتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ خونخوار ایوان پر قابو پالیں گے۔ وہ جانتے تھے کہ آج کل وہ ذہنی طور پر انتہائی منتشر ہے۔

ملکہ انیس ٹیسیا کی موت کے بعد اس نے شمالی صوبے کبارڈینو کے نواب کی بیٹی ماریا سے شادی کرلی تھی۔ اس کا سبب عورت کا حسن تھا۔ جب اپنی بیوی کے غم میں ڈوبے ایوان کی نظر اس پر پڑی، تو وہ مبہوت رہ گیا۔ اس کی آنکھیں گہری تھیں اور جب وہ بولتی، تو جل ترنگ سا بجنے لگتا۔ رفقاء نے اس فیصلے کی مخالفت کی۔ لوگوں نے یاد دلایا کہ اس کی بیوی نے مرتے ہوئے تنبیہ کی تھی کہ وہ کسی بدعقیدہ عورت سے شادی نہ کرے اور ماریا کا خاندان عیسائی نہیں۔ وہ مرحوم انیس ٹیسیا کے مانند پڑھی لکھی اور تہذیب یافتہ بھی نہیں تھی۔ شہزادوں کی پرورش کے لیے اس کا انتخاب سم قاتل ثابت ہوگا۔ واضح رہے کہ ایوان کی پہلی بیوی سے دو لڑکے پیدا ہوئے تھے۔

ایوان نے ایک نہ مانی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس ضد کا سبب وہ تعویذ تھا، جو اُسے ماریا نے گھول کر پلا دیا تھا۔ شاہی مورخ میخائل سیلوف اپنی نجی محفلوں میں اسے جادوگرنی کہہ کر پکارا کرتا تھا، جس نے بادشاہ کے حواس معطل کردیے تھے۔

وجہ جو بھی رہی ہو، اپنی 31 ویں سالگرہ کے چار روز بعد اگست 1561ء میں اس نے ماریا سے شادی کرلی۔ اور جلد اسے اپنے اس فیصلے پر پچھتانا پڑا۔ لڑکی واقعی پھوہڑ تھی۔ وہ اشرافیہ کے رہن سہن اور طور طریقوں سے نابلد تھی۔ وہ اچھی ماں ثابت نہیں ہوئی۔ دونوں شہزادے اس سے کھنچے کھنچے رہتے۔ اس کے باطن سے پیدا ہونے والا بچہ انتہائی کمزور اور کم رو تھا، جو کچھ ہی ماہ بعد انتقال کرگیا۔

65ء میں ایوان نے سخت ترین پالیسیاں اپنائیں۔ خفیہ پولیس کا محکمہ قائم کیا گیا۔ تجارتی قوانین میں ترمیم کی گئی۔ محصولات بڑھائے گئے۔ بوڑھا میخائل ان کا ذمے دار بھی ماریا ہی کو ٹھہراتا تھا۔

اس نئی پالیسی کے نتائج انتہائی مہلک رہے۔ ماسکو میں انتشار بڑھنے لگا۔ ایک طرف جنگ لیوونیا، دوسری طرف ترک۔ دھیرے دھیرے بادشاہ قائل ہونے لگا کہ اس کی بدقسمتی کی وجہ کوئی اور نہیں، بلکہ اس کی بیوی ماریا ہی ہے۔

ایوان نے مشرقی سرحد کی ایک چوٹی پر بڑا اور مضبوط قلعہ تعمیر کیا تھا، تاکہ وہ وادی وولگا میں ہونے والی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکے۔ یہ علاقہ سلطنت عثمانیہ کے حدود اربع میں آتا تھا۔ اس زمانے میں دولت عثمانیہ کا کل انحصار محمد صوق ولّی پاشا نامی وزیر کی ذہانت اور دانش پر تھا۔ عثمانی سلطنت کے دسویں فرماںرواں سلیمان اعظم کے بعد سلیم ثانی نے تخت سنبھالا، مگر وہ اپنے باپ سے یکسر مختلف ثابت ہوا۔ ریاست کمزور ہونے لگی۔ بغاوت۔ جنگیں۔ آخر کار سلیمان اعظم کے تربیت یافتہ صوق ولّی کو آگے آنا پڑا۔

یہ صوق ولّی ہی تھا، جس نے ایوان پر پہلا حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

یہ ایک خطرناک حملہ تھا۔ اپنے وقت کی سب سے بڑی فوج ایوان خوانخوار کی سرحدوں میں داخل ہوگئی۔ تاتاریوں نے بھرپور ساتھ دیا۔ وہ قبائل جو خوف کے زیر اثر ایوان سے جا ملے تھے، انہوں نے بغاوت کردی۔ عثمانی فوج روسیوں کو کچلتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔ ان کی منزل ماسکو تھی۔ خونخوار ایوان کی گھبراہٹ بڑھنے لگی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا، جب ماسکو پر اندیشے منڈلانے لگے۔ شاہی نجومی کو طلب کیا گیا، جس نے پہلا مشورہ یہ دیا کہ بادشاہ ماریا کو طلاق دے دے ورنہ اس کی نحوست پوری ریاست کو نگل لے گی۔ بادشاہ خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ کچھ نہیں بولا۔ وہ ستمبر 1569ء تک خاموش رہا، پھر ایک صبح آرام گاہ میں ماریا کی لاش ملی۔ شاہی طبیب کا خیال تھا کہ اسے زہر دیا گیا ہے، مگر بادشاہ کی ہدایت پر اس نے منہ بند رکھا۔

مخالفین کا الزام تھا کہ بادشاہ اس کی موت کا ذمے دار ہے۔ مگر یہ بحث کا وقت نہیں تھا۔ عثمانی فوج ماسکو کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ تمام نواب اکٹھے ہوئے۔ عثمانیوں کو شاید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ دارالحکومت کے گردونواح میں روسی فوج کے مضبوط قلعے تھے۔ سخت مقابلہ ہوا۔ عثمانیوں کو خاصا نقصان پہنچا۔ ایوان ماسکو چھوڑ کر مغربی علاقے میں چلا گیا۔ اس نے اپنے حواریوں کو اکٹھا کیا، جنھوں نے مشورہ دیا کہ جنگ کی بجائے صلح کی راہ اپنائی جائے۔ ایوان کو یہ گوارا تو نہیں تھا، مگر اس کے وفادار زولوف نے اسے قائل کرہی لیا کہ موجودہ حالات میں یہی بہترین فیصلہ ہے، کیونکہ عثمانی فوج نے مزید کمک بلوائی ہے۔

1570ء کے اوائل میں ایوان کے ذہین سفیروں نے صوق ولّی سے رابطہ کیا۔ انہوں نے ایک معاہدہ تیار کیا، جس میں دونوں فریقوں کے مفادات کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔ مشرقی علاقوں سے متعلق بھی ایک معتدل طریقہ وضع کیا گیا۔ عثمانیوں کے لیے یہ اچھا سودا تھا۔ روس کے ساتھ

جنگ میں خاصا سرمایہ خرچ ہو چکا تھا۔

جب عثمانی فوجیں واپس جا رہی تھیں، ان کے سر بلند تھے۔ کاندھے چوڑے۔ فوجیوں کے لبوں پر گیت تھے۔ وہ ایک فاتح کے روپ میں لوٹ رہے تھے۔

ایوان کی انا کو اس واقعے سے شدید ٹھیس پہنچی۔ وہ اس بے عزتی کو برداشت نہیں کر سکا۔ پہلے اس نے اپنے وزیروں مشیروں پر ظلم کے پہاڑ توڑے۔ بہت سوں کو غفلت کا ذمے دار ٹھہراتے ہوئے قتل کر دیا۔ شکست خوردہ سالاروں کو عوام کے سامنے پھانسی دی گئی۔ کئی مشیر قلعے کی بلند ترین فصیل سے نیچے پھینک دیے گئے۔ ایک موقع پر تو وہ اپنے چہیتے زولوف کو بھی قتل کرنے کا ذہن بنا چکا تھا، مگر شاہی مورخ کے سمجھانے پر اس ارادے سے باز رہا۔

اس نے خود کو عیاشیوں کے سپرد کر دیا۔ ہمہ وقت وہ نشے میں دھت رہتا۔ اپنی داشتاؤں میں گھرا رہتا۔ شاید وہ دھیرے دھیرے پاگل ہو رہا تھا یا پھر بدقسمتی کے گھیرے میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

ایک بار پھر انتخاب ہوا، مگر اس بار ملک گیر سطح پر کوئی مقابلہ نہیں کروایا گیا، بلکہ بااثر نوابوں کی بیگمات کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مجموعی طور پر بارہ لڑکیوں کو چنا گیا، جن میں سے کسی ایک کو ملکہ بننا تھا۔ یوں تو ملکہ کا منصب ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے، یہ خوش نصیبوں کے حصے میں آتا ہے، مگر مارفا سوبیکینا کے لیے تو یہ منصب منحوس ثابت ہوا۔

مارفا نووگوراڈ کے ایک رئیس تاجر کی بیٹی تھی۔ وہی نووگوراڈ جس کی ظالم ایوان نے اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ وہی شہر جہاں اس نے قہر کی ناقابلِ بیان داستان رقم کی۔ اسی شہر کی ایک لڑکی سے اس نے بیاہ رچانے کا فیصلہ کیا۔

شادی کے لیے 28 اکتوبر 1571ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ اور تب پُراسرار واقعات کا سلسلہ شروع ہوا۔ لڑکی کا وزن تیزی سے گرنے لگا۔ اس نے ایک دو بار خون کی الٹی کی۔ حالات اتنے بگڑ گئے کہ شاہی طبیب کو معائنے کے لیے آنا پڑا۔ اسے شک تھا کہ لڑکی کو زہر دیا جا رہا ہے۔ اس نے لڑکی کے ماں باپ کے سامنے اس اندیشے کا اظہار کیا۔ اس موقع پر لڑکی کی ماں نے کہا کہ وہ اسے ایک یونانی دوا پلا رہی ہے، تاکہ شادی کے فوراً بعد حمل ٹھہر جائے۔ کیونکہ اس کی بیٹی میں بانجھ پن کے اثرات ہیں۔

وزیر نے فی الفور دوا روکنے کا مشورہ دیا۔ شادی والے روز مارفا کے چہرے پر بہت سا میک اپ تھوپا گیا، تاکہ وہ بیمار نظر نہ آئے، مگر سچ تو یہی تھا کہ وہ صاحبِ فراش تھی۔ حجلۂ عروسی میں اس نے خون کی قے کی۔ چند روز بعد اس کی موت ہو گئی۔

یہ تیسرا موقع تھا، جب ایوان کو اپنی ملکہ کو قبر میں اتارنا پڑا اور اس بار بھی شاہی طبیب نے یہی انکشاف کیا کہ ملکہ کو زہر دیا گیا ہے۔ ایوان غصے سے پھٹ پڑا۔ اس نے کئی ملازمین اور محافظوں کو سازش کے الزام میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اُن میں اس کی سابق بیوی کا بھائی میکائل ٹیمجرک بھی شامل تھا۔

خون کی ہولی کھیلنے کے فوراً بعد وہ ظالم پھر دولہا بننے کی تیاریاں کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ روسی کلیسا کی جانب سے چوتھی شادی کی اجازت نہیں ملے گی۔ اس وقت یہی قانون تھا۔ سو اس نے کلیسا سے رابطہ کرنے کی زحمت نہیں کی۔ اس کی چوتھی بیوی کا نام اینا تھا۔ وہ بھی ایک نواب زادی تھی۔ وہ شادی کے لیے راضی نہیں تھی، مگر خونخوار ایوان کے سامنے انکار کرنے کا مطلب نہ صرف اپنی، بلکہ اپنے پورے خاندان کی موت کو دعوت دینا تھا۔

روس کے مرکزی کلیسا کی بجائے اس نے دیگر مسالک کے پادریوں کی خوشنودی حاصل کر لی تھی، تاکہ کسی نہ کسی طرح شادی کو مذہبی حیثیت دے سکے۔ 1572ء کے وسط میں یہ تقریب ہوئی۔ جلد ہی ایک منحوس انکشاف ہوا۔ اس کی بیوی بانجھ تھی۔ اس نے اینا کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا، مگر طلاق دینے کی بجائے نن بننے پر مجبور کر دیا، تاکہ وہ کسی اور سے شادی نہ کر لے۔ اینا نے سکون کا سانس لیا۔ ایوان کی زہریلی قسمت' چار بیویوں کی جان لے چکی تھی۔ ایک خاموش گرجے میں رہنا بہرحال موت سے بہتر تھا۔

جب ایوان چہارم نے اگلی شادی کی، تو کسی مذہبی رہنما سے اجازت لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ کلیسا نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پادری اعظم نے، جو شادی کے کچھ روز بعد ایوان سے ملا تھا، ایک نجی محفل میں اعتراف کیا کہ وہ انتہائی درشت ہو گیا ہے۔ اور اگر کلیسا کا کوئی نمائندہ سوال اٹھاتا، تو اس کی موت یقینی تھی۔

اس کی بیویوں کی تعداد سے متعلق مورخین کی رائے مختلف ہے۔ البتہ اکثریت آٹھ کی تعداد پر متفق ہے۔ اس کی چھٹی بیوی ویسلیسا تھی، جسے افسانوی شہرت ملی۔ کچھ

حلقوں کا خیال ہے کہ وہ فقط اس کی داشتہ تھی، جو اتنی چہیتی اور لاڈلی تھی کہ محل میں کسی ملکہ کی طرح رہا کرتی۔ کچھ مورخین کا اصرار ہے کہ وسیلیسا نامی کوئی عورت کبھی تھی ہی نہیں۔

وسیلیسا کی افسانوی شہرت کے پیچھے کئی قصے ہیں۔

ایک کہانی یہ ہے کہ وہ دوشیزہ ایک نواب کی بیوہ تھی، مگر جب ایوان نے اس کا رشتہ مانگا، تو اس کے خاندان نے یہ بات چھپائی۔ بعد میں بھانڈا پھوٹ گیا، مگر اس وقت تک عورت بادشاہ کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ سو اس نے وسیلیسا کو قبول کرلیا۔ ایک کہانی یہ بھی ہے کہ شادی کے بعد عورت ایک خوبرو شہزادے کے عشق میں مبتلا ہوگئی تھی۔ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ جلد ایوان کو خبر ہوگئی۔ اس نے اپنی بیوی کی جان تو بخش دی، مگر اس کے عاشق کو بانس میں پُرو دیا۔

واضح رہے کہ روسی شاہی خاندان کے شجرے میں نہ وسیلیسا کا ذکر ملتا ہے، نہ ہی کسی قبرستان میں اس کی قبر ہے۔ موجودہ مورخین کا خیال ہے کہ وہ ایک داشتہ ہی تھی، جس کی چاہت میں ایوان نے اسے ملکہ کا درجہ دے دیا تھا۔

الغرض اس ظالم بادشاہ کی سیاسی زندگی کی طرح ذاتی زندگی بھی بے حد عجیب تھی۔ بلکہ یہ اس کی ذاتی زندگی سے جڑا ایک واقعہ ہی تھا، جو ایوان چہارم کی موت کا سبب بنا۔

☆☆☆

ایوان کی پہلی بیوی سے پانچ بچے پیدا ہوئے، جن میں سے تین اوائل عمری ہی میں انتقال کر گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بددعاؤں کا اثر ہے۔ ایوان نے جن لوگوں پر ظلم ڈھائے ان کی آہیں اس کا پیچھا کر رہی ہیں، مگر پھر انیس ٹیسیا نے دو لڑکوں کو جنم دیا، جو اتنے سخت جان تھے کہ ہر بددعا کا وار سہہ گئے۔ بڑے لڑکے کا نام ایوان اور چھوٹے کا فیوڈور رکھا گیا۔

وہ دونوں باپ کی طرح ظالم تھے۔ انہیں پالتو جانوروں پر ظلم کرنے کا شوق وراثت میں ملا۔ لڑاکے بھی کمال کے تھے۔ وہ کئی جنگوں میں اترے اور فاتح لوٹے۔

بڑا بیٹا ایوان تو دیومالائی طاقتوں کا مالک تھا۔ اس کی تلوار کے سامنے بڑے بڑے سورما ڈھے جاتے۔ اس کی دہاڑ شیر سی تھی۔ وہ عقاب سا تیز تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی اسے شکست نہیں دے سکتا۔ کوئی اسے قتل نہیں کر سکتا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی... قدرت نے اس کا انوکھا انتظام کر رکھا تھا۔ اُس کا قتل اپنے باپ کے ہاتھوں ہونا تھا۔

وہ ایک پُرشکوہ تقریب تھی، جو بادشاہ کی صحت یابی کی خوشی میں منعقد کی گئی۔ شہزادے ایوان کی دوسری بیوی جو بلا کی حسین تھی، اُس روز انتہائی چست اور جذبات کو انگیخت کرنے والا لباس پہنے ہوئی تھی۔ جس کسی کی نظر اُس پر پڑی، وہ بت بن جاتا۔

بادشاہ کو اس کی بے باکی ناگوار گزری۔ اس نے وزیر کے ذریعے لباس تبدیل کرنے کا پیغام بھجوایا، مگر شہزادی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ بلکہ وزیر کو بری طرح جھڑک دیا۔

"اس نے ابھی سے خود کو ملکہ سمجھ لیا ہے۔" بادشاہ نے دانت پیسے۔ "ابھی میں زندہ ہوں۔"

اس نے شہزادی کو طلب کرلیا۔ جوں ہی وہ آرام گاہ میں داخل ہوئی، وہ چھڑی سے اُسے پیٹنے لگا۔ عورت روئی گڑگڑائی، مگر اس پر تو جیسے وحشت سوار تھی۔

"حرافہ، تو خود کو ملکہ سمجھ بیٹھی۔ تیری اوقات ہی کیا ہے۔" وہ مسلسل اُسے پیٹے جا رہا تھا۔ "میں تیری قسمت کا مالک ہوں۔"

چھڑی ہوا کو کاٹتی۔ عورت کے بدن پر پڑی۔ ایک چیخ فضا میں تھراتی۔

وزیر دوڑا دوڑا اندر داخل ہوا۔ آج سے قبل اس نے کبھی ایوان کے سامنے آواز بلند نہیں کی تھی، مگر اس منظر کی وہ تاب نہیں لاسکا۔ شہزادی کے بدن پر نیل پڑ گئے تھے۔ اس نے ایوان کو روکنے کی کوشش کی، تو بادشاہ نے اُسے دھکیل دیا۔ وہ پھر سامنے آگیا اور چلایا۔ "حضور، شہزادی حاملہ ہے۔ چاہے فقیر کی جان لے لیں، مگر اسے بخش دیں۔"

بادشاہ رک گیا۔ کنیزیں شہزادی کو اٹھا کر لے گئیں۔ طبیب دوڑے۔

شہزادے کو بھی خبر ہوگئی۔ وہ اپنے محل پہنچا، جہاں ایک وحشت ناک خبر اس کی منتظر تھی۔ حمل ضائع ہوگیا تھا۔ وہ غصے سے آگ بگولا ہوگیا۔ دوڑا دوڑا دربار میں پہنچا۔ بادشاہ چہرے پر اطمینان سجائے بیٹھا تھا۔ اُس نے بیٹے کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔

"کیا ایوان حیوانیت کا دوسرا نام ہے؟" شہزادہ دہاڑا۔

دربار پر سناٹا چھا گیا۔ آج سے قبل کسی نے یوں ایوان کے سامنے بات نہیں کی تھی۔

"زبان سنبھال کر بات کرو شہزادے ورنہ..." وزیر آگے بڑھا۔ آنکھوں میں التجا تھی۔

شہزادہ اُسے دھکیل کر مغلظات بکنے لگا۔ اُس نے

ایوان کو اُس کے تمام مکروہ جرائم یاد دلائے۔ اُسے ڈاکو، زانی اور قاتل کہہ کر پکارا۔

بادشاہ چھڑی سے زمین بجاتا رہا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ جب زرلوف آگے بڑھا، تو شہزادے نے اُسے دایاں ہاتھ جڑ دیا۔ زرلوف چکرا کر زمین پر آرہا۔

بادشاہ نے زور سے زمین پر چھڑی ماری۔ اب شاہی مورخ میخائل آگے بڑھا۔ اس نے نرم لہجے میں بات کی، مگر شہزادے نے اُس کی داڑھی نوچ لی۔

بادشاہ کی برداشت جواب دے گئی۔ پھر جو کچھ ہوا، اُس کی کوئی توقع نہیں کر رہا تھا۔ بادشاہ نے آگے بڑھ کر چھڑی کی نوک پوری قوت سے شہزادے کے سر میں گھسا دی۔

چھڑی اُس کی کھوپڑی توڑتی ہوئی دماغ تک چلی گئی۔ لمحوں میں شہزادے کی روح پرواز کر گئی۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ دربار سکتے میں تھا۔ نواب غیر یقینی کی حالت میں لحیم شحیم شہزادے کی لاش کو تک رہے تھے۔

سناٹا شاید دیر تک قائم رہتا، اگر دربار میں بادشاہ کی چیخ بلند نہیں ہوتی۔ اس نے چھڑی پھینکی اور آگے بڑھ کر شہزادے سے لپٹ گیا۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا اور لڑکے کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کا لبادہ خون سے تر ہو گیا۔ اس نے ایک اور چیخ ماری اور شہزادے کے بوسے لینے لگا۔ جلد ہی اس کا چہرہ۔ خون میں تر ہو گیا۔

اس کے بال کھڑے ہو گئے تھے۔ آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ بوڑھا اور منحوس معلوم ہو رہا تھا۔ صدمے نے اُسے چاٹ ڈالا۔ اور یہ متوقع تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اس شخص کو قتل کر دیا تھا، جس سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ جس پر وہ فخر کرتا تھا۔ جو اس کا وارث تھا، اس کا اپنا بیٹا تھا۔

ایوان نے اپنے سپوت کو قتل کر ڈالا اور اب اُس کی لاش گود میں لیے سسکیاں لے رہا تھا۔ اور قدرت مسکرا رہی تھی۔ یہی اس کا انتقام تھا۔

☆☆☆

''ہاں، میں نے کئی قتل کیے، مگر میرا مقصد خدا کی مرضی کو پورا کرنا تھا۔ روس کو ایک عظیم ریاست بنانا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ایک حساس انسان ہوں۔''

وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہا تھا اور پادری پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ خونخوار ایوان لفظوں سے کھیل رہا تھا۔ وہ اپنے مظالم کو قدرت کے فیصلوں کی آڑ میں چھپانے کی بھونڈی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے پُراسرار پیش گوئیوں کا تذکرہ کیا، جنھیں وہ خدا کے احکامات سمجھ بیٹھا۔ اُن تحیر خیز مراسلوں کی کہانی، جو اُس کے بہ قول فرشتے اس کے تکیے کے نیچے چھوڑ جاتے۔ وہ پیغامات جو پنچھی صبح اسے انسانی زبان میں سناتے۔

پادری اس کے ہر جھوٹ پر خون کا گھونٹ پی کر خاموش رہتا۔ ایوان بہت خستہ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں باہر کو ابل آئیں۔ صاف لگتا تھا کہ اسے سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ اسے رات میں برے خواب آتے اور وہ کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔

''میں چاہتا ہوں کہ میرے پیارے بیٹے کے لیے دعائیہ تقریبات کا اہتمام کیا جائے، میں پانچ ہزار روبل پیش کرتا ہوں۔''

پادری نے گہرا سانس لیا۔ یہ ایک بھاری رقم تھی۔ آج تک کسی نے اتنا بڑا عطیہ نہیں کیا تھا۔ پادری نے ایک چال چلی۔ ''حضور، کلیسا کو آپ کی صحت کی بھی پروا ہے۔ آپ ہمارے بادشاہ ہیں۔ اور یہ قدرت کا فیصلہ ہے، جس کا مقصد روس کو عظیم ریاست بنانا ہے۔ ہم آپ کے لیے بھی خصوصی دعائیہ تقریبات منعقد کریں گے۔ اگر آپ اجازت...'' اس نے کمال مہارت سے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اوہ ہاں... کیوں نہیں جناب۔ یہ میرے لیے اعزاز ہوگا۔ میں پانچ ہزار روبل مزید بھجوا دوں گا۔''

پادری کا تیر نشانے پر لگا۔ وہ مسکرایا۔ یہ پہلا موقع تھا، جب کسی مذہبی عالم نے ایوان کو چکما دیا تھا۔ خود ایوان کو بھی اس بات کا ادراک تھا، مگر اب وہ بوڑھا اور کمزور ہو گیا تھا۔

اسے ڈراؤنے خواب آتے۔ ان انسانوں کے چہرے دکھائی دیتے، جن کے اس نے سر قلم کیے تھے۔ ان بدنصیبوں کی آوازیں سنائی دیتیں، جنھیں اس نے قلعے کی فصیل سے نیچے پھینکا۔ لاشیں نظر آتیں، جن کے بدن جھلسے ہوتے۔

1581ء میں اس نے اپنے بیٹے کو قتل کیا تھا، جس کے بعد اس کی صحت گرتی چلی گئی۔ اس کے دوسرے بیٹے فیڈرو اوّل کو آگے بڑھ کر ریاست کا نظم و نسق سنبھالنا پڑا۔ ایوان کا زیادہ وقت آرام گاہ میں گزرتا۔ شروع شروع

میں تو نوابین اس کی خیریت پوچھنے آتے، مگر پھر وہ اس مشق سے باز آئے۔ اب وہ اگلے بادشاہ کی خوشامد میں لگ گئے تھے۔ وفاداریاں بدل گئیں۔ ایک روز بوڑھے مورخ کی موت کی خبر آئی۔ بادشاہ نے گہرا سانس لیا۔

''وہ تو پہلے ہی مر گیا تھا۔'' اُس نے دھیرے سے کہا۔ ''اسی دن، جب میرے بیٹے نے اس کی داڑھی نوچی۔''

محاذ سے بری خبریں آرہی تھیں۔ جن مشرقی ریاستوں پر قبضہ کیا گیا تھا، ان کے حکمرانوں نے ایوان کی گرتی صحت سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہاں بغاوت پھوٹ پڑی۔ جب روسی فوجیوں نے چڑھائی کی، تو عثمانی فوج تاتاریوں کے شانہ بشانہ کھڑی ہوگئی۔ روسیوں کو منہ کی کھانی پڑی۔

شہزادے فیڈرو نے اس شکست کی کل ذمے داری سپہ سالار زولوف پر ڈال دی۔ وہ شاید اس کی گردن اڑا دیتا، مگر عین وقت پر بادشاہ کو خبر ہوگئی۔ اس روز وہ چھڑی ٹیکتا ہوا دربار آیا۔ شہزادے پر بہت گرجا۔ نوابین کو گالیاں دیں۔

شہزادے کے تاثرات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ بادشاہ کو گھورتا رہا۔ جب ایوان مغلظات بک چکا، اسے نااہل ٹھہرا چکا، تب شہزادے نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں نااہل ہوں۔ تو اب کیا کیا جائے۔ کیا آپ میری کھوپڑی میں بھی چھڑی گھونپ دیں گے؟''

بادشاہ کانپ گیا۔ چھڑی ہاتھ سے گر گئی۔ وزیر فوراً آگے بڑھا۔ وہ شہزادے کو کونے میں لے گیا۔ سمجھا بجھا کر اسے وہاں سے رخصت کیا۔

بادشاہ جذبات کی شدت سے کانپتا رہا۔ اس کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ پھر اس نے ہمت مجتمع کی۔ سر بلند کر کے اعلان کیا کہ کوئی اسے کمزور نہ سمجھے۔ اب وہ روزانہ دربار سجائے گا۔ تمام فیصلے خود کرے گا۔

شاید قدرت بھی یہی چاہتی تھی۔ جس تخت کے لیے اُس نے ہزاروں معصوموں کا خون بہایا، اُس کی روح قبض کرنے کے لیے اس سے بہتر جگہ اور کیا ہوسکتی ہے۔

18 مارچ 1584ء کو جب وہ اپنے ایک درباری کے ساتھ شطرنج کی بساط بچھائے بیٹھا تھا، اچانک اُسے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ یوں لگا، جیسے کوئی چھڑی سے زمین بجا رہا ہو۔ اُس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے اُس کا بیٹا ایوان کھڑا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ آنکھوں میں استہزا... ہونٹوں پر طنز۔

بادشاہ دہل گیا۔ اس نے اپنی توجہ مہروں پر مرکوز کی، مگر یکدم اُسے دائیں سمت سے ایک چیخ سنائی دی۔ اس نے گردن موڑی۔ ایک فربہ عورت بستر پر پڑی تڑپ رہی تھی۔ اسے زہر دیا گیا تھا۔ ایوان نے پہچان لیا۔ یہ اس کی دوسری بیوی ماریا تھی، جسے عثمانیوں کے حملے کے دنوں میں اس نے خود قتل کیا تھا۔

اچانک چیخوں کا تانتا بندھ گیا۔ اسے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ طبل جنگ بجا۔ کئی سر کٹی لاشیں دربار میں داخل ہوئیں۔ اسے ہولناک قہقہے سنائی دیے۔

اس کی دھڑکن رک گئی۔ یہ باتیں وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا مگر سب سکتے کے عالم میں تھے وہ چیختے چیختے ڈھے گیا۔ وہ زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

دنیا کا ظالم ترین انسان مر چکا تھا اور اس کے ظلم کا شکار بننے والی بدروحیں قہقہے لگا رہی تھیں۔

مورخین متفق ہیں کہ ایوان کو زہر دیا گیا تھا، مگر اس جانور کے لیے اتنی سہل موت کس نے چنی، اس کا کبھی تعین نہیں ہوسکا۔

ابتدائی اعلانات کے مطابق ایوان کی تدفین کی رسوم دس دن جاری رہنی تھیں، مگر عوام کی سرد مہری اور قریبی ریاستوں کے بادشاہوں کی عدم دلچسپی کے باعث انہیں تین دن میں نمٹا دیا گیا۔

جس روز ایوان کو دفنا گیا، اُس روز طوفانی بارش ہوئی۔ قبرستان میں کیچڑ کھڑا ہوگیا۔ کئی نوابوں کی بگھیوں کے پہیے کیچڑ میں پھنس گئے۔ انہیں اس منحوس موسم میں پیدل لوٹنا پڑا۔

ایوان کے بعد اُس کے بے اولاد بیٹے فیڈرو اوّل نے تخت سنبھالا۔ کچھ ہی عرصے بعد فیڈرو کی ذہنی حالت بگڑنے لگی۔ اس کے حواس معطل رہتے۔ ریاستی امور اس کا سالا سنبھالتا۔ یہ زمانہ انتشار سے بھرپور تھا۔ شاید ایوان کو دی جانے والی بددعائیں اس کے بیٹے سے چمٹ گئی تھیں۔ کئی قدرتی آفات آئیں، بیماریاں پھوٹ پڑیں، جنگیں ہوئیں، جنہوں نے روس کی نصف آبادی کو چاٹ لیا۔ شہر لاشوں کے قبرستان بن گئے۔ کئی چھوٹے سرحدی علاقوں نے بغاوت کر کے آزادی حاصل کر لی۔ بدعنوانی عروج پر پہنچ گئی اور ریاست شکست و ریخت کا شکار ہوگئی۔

دسمبر

منظر امام

عیسوی سال کا آخری مہینا' اس مہینے میں ایسے کون کون سے اہم واقعات رونما ہوئے اس پر ایک طائرانہ نظر۔ مختصر الفاظ میں جامع مضمون۔

معلومات کے شائقین کے لیے تحفۂ خاص



یہ سال کا آخری مہینا ہے اور اکتیس دنوں کا ہوتا ہے۔

اس مہینے میں تاریخ میں بے شمار واقعات رونما ہوئے۔ ہم صرف چیدہ چیدہ واقعات کو لے رہے ہیں۔

یکم دسمبر 1948ء کو ایک گیم ''اسکریبل'' پیٹنٹ ہوا۔ ذہن اور زبان دانی کی صلاحیتیں بڑھانے کے لیے یہ کھیل پوری دنیا میں مقبول ہے۔

2 دسمبر۔ امریکا میں روزا پارکس ڈے منایا جاتا ہے۔

اس تاریخ کو ایک موذی مرض ایڈز کا دن بھی منایا جاتا ہے اور اس مرض سے آگاہی دی جاتی ہے۔

1946ء میں ڈیوڈ سیکولری کی پیدائش ہوئی۔ جب کہ 2 دسمبر 1859ء میں جارج سیوائی پیدا ہوا تھا۔ جارج ایک بہت بڑا مصور تھا اس نے اپنی زندگی میں ہی مقبولیت حاصل کرلی تھی۔

3 دسمبر۔ دنیا بھر میں معذوروں کا دن منایا جاتا ہے۔

3 دسمبر 1967ء میں دل کی تبدیلی کا پہلا کامیاب آپریشن کیا گیا تھا۔

3 دسمبر 1621ء میں گیلیو گیلی نے اپنا ٹیلی اسکوپ مکمل کرلیا تھا۔

4 دسمبر اس تاریخ کو امریکا میں نیشنل کوکیز ڈے منایا

جاتا ہے۔ 4 دسمبر 1837ء میں فوٹو گراف متعارف ہوا تھا۔

5 دسمبر 1901ء میں ایک ایسے شخص کی پیدائش ہوئی جس نے دنیا بھر کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ خاص طور پر بچوں کو۔ کون ہے جو والٹ ڈزنی کو نہیں جانتا۔ اس کی پیدائش 5 دسمبر کو ہوئی تھی۔ 1955ء میں منٹگمری جس کا بائیکاٹ کیا گیا۔ (امریکا کی تاریخ کا یہ ایک مشہور واقعہ ہے)۔

6 دسمبر 1865ء میں غلامی کے قانون میں ترمیم کی گئی۔

6 دسمبر 1955ء میں واکس ویگن ٹریڈ مارک ہوا۔ واکس ویگن وہ گاڑی ہے جس کو پیار میں فاکسی بھی کہا جاتا ہے۔ (ایک زمانے میں ہمارے یہاں بھی بہت عام ہوا کرتی تھی لیکن اب غائب ہوتی جارہی ہے)۔

7 دسمبر 1761ء۔ ایک بہت ہی بڑی تخلیق کار کی پیدائش۔ مادام میری تساوہ خاتون ہیں جنہوں نے دنیا کا پہلا ویکس میوزیم بنایا۔ اس قسم کے میوزیم میں دنیا کے مشہور ترین لوگوں کے موی مجسمے رکھے جاتے ہیں۔ اسی تاریخ کو امریکا میں کاٹن کینڈی ڈے منایا جاتا ہے۔

7 دسمبر 1941ء کو امریکا میں مشہور پرل ہاربر کا واقعہ ہوا تھا۔ اس لیے اس تاریخ کو اس کی یاد منائی جاتی ہے۔

8 دسمبر کو ایک مشہور موجد ایلی وٹنی کی پیدائش ہوئی تھی۔ وہ 1785ء میں پیدا ہوا تھا۔

9 دسمبر 1884ء میں بال بیرنگ رولر اسکیٹس متعارف ہوا۔ 1907ء میں کرسمس کا پہلا نشان شائع ہوا۔

10 دسمبر کو انسانی حقوق کا دن منایا جاتا ہے۔

1830ء میں مشہور مصنفہ ایملی ڈکنسن کی پیدائش ہوئی تھی۔

1896ء میں الفریڈ نوبل کی وفات ہوئی۔ اس شخص نے مشہور نوبل پرائز کا اجرا کیا۔

11 دسمبر کو یونی سیف کی سالگرہ منائی جاتی ہے۔ اس ادارے کا قیام 1946ء میں عمل میں آیا تھا۔

11 دسمبر 1620ء میں مہاجرین کی ایک بڑی تعداد پلائی ساؤتھ پہنچ گئی۔

1900ء میں رولنڈ میک نے جوتے بنانے کی مشین بنائی۔

12 دسمبر 1899ء میں گولف کھیلنے کا ٹی متعارف ہوا۔

1901ء میں مارکونی کا ریڈیو سگنل سمندر کراس کرتا ہوا دوسری جگہ پہنچ گیا۔ یہ ایک بہت بڑی سائنسی کامیابی تھی۔

12 دسمبر 1955ء میں ہوور کرافٹ سامنے آیا۔ جو اب دنیا بھر میں عام ہو چکا ہے۔

14 دسمبر 1929ء میں پہلا منی ایچر گالف کورس سامنے آیا۔

1911ء میں ساؤتھ پول دریافت ہوا۔

15 دسمبر۔ انسانی حقوق کا بل منظور ہوا۔

16 دسمبر 1770ء بیتھوون کی پیدائش ہوئی۔ (بیتھوون ایک عظیم موسیقار تھا)۔

17 دسمبر 1903ء رائٹ برادرز کی پہلی پرواز۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنی مسلسل جدوجہد اور ہمت سے کام لے کر انسان کے ہوا میں پرواز کرنے کا خواب پورا کردیا۔

18 دسمبر 1886ء۔ بیس بال (کھیل) کی مشہور شخصیت ٹائی کوب پیدا ہوا۔

1946ء۔ تاریخ کا پہلا ڈراما سیریل ''فار آوے ہل'' کا اختتام ہوا۔

19 دسمبر۔ چارلس ڈکنز کے مشہور ناول ''اے کرسمس کارول'' کی اشاعت ہوئی۔ اسی تاریخ کو مارک ٹوائن نے اشاعت کے لیے اپنی کچھ کتابوں کے حقوق حاصل کرلیے۔

20 دسمبر۔ 1879ء میں بجلی کے بلب کو جلا کر دکھایا گیا۔

21 دسمبر۔ پہلا کراس ورڈز پزل شائع ہوا۔

22 دسمبر۔ 1882ء میں پہلا کرسمس لائٹ فروخت ہوا۔

1714ء میں مرکری تھرمامیٹر ایجاد ہوا۔

23 دسمبر۔ 1879ء میں تھامس ایڈیسن نے ایک میگنیٹو الیکٹرک مشین بنائی۔

24 دسمبر۔ 1968ء اپالو 8 چاند تک پہنچ گیا۔

25 دسمبر۔ کرسمس اور بابائے قوم کا یوم پیدائش۔

27 دسمبر۔ 1945ء میں ورلڈ بینک قائم ہوا۔

28 دسمبر۔ 1869ء میں چیونگم ایجاد ہوا۔

30 دسمبر کو رڈیارڈ کپلنگ کی پیدائش 1865ء میں۔

31 دسمبر سال کا آخری دن۔ اسی دن 1935ء میں مونوپلس گیم کی ابتداء۔

عشق عشق

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی



جب کیوپڈ کا تیر دل کے آر پار ہوتا ہے تو پیار کرنے والے سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ عزت و شہرت، جاہ و جلال کی بھی پروا نہیں کرتے۔ انہیں یاد رہتا ہے تو صرف اور صرف محبوب کا پرتو وہ بھی ایک طاقتور ملک کی ملکہ تھی پھر بھی ایک معمولی سپاہی کے عشق نے اسے تخت و تاج تک بھلا دینے پر اکسا دیا۔

عشق کی فسوں خیزی کا شاخسانہ

شادی کے پیچھے ایک معروف سماجی اور تہذیبی ضرورت پیش نظر ہوتی ہے کہ مرد عورت ایک اٹوٹ رشتے کے بندھن میں بندھ کر کائنات کی بقاء اور بڑھوتری کے فطری اور قدرتی عمل ادا کرتے ہوئے ایک اصول کے تحت زندگی گزارنے کی ابتدا کریں۔ باقاعدہ ایک خاندان کو تشکیل دیں، جو نارمل معیارِ زندگی کے مروجہ اصولوں پر مبنی ہو۔

لیکن...... اگر اس اعلیٰ و افضل بندھن کو مصلحت کی بھینٹ چڑھا دیا جائے تو متذکرہ بالا فطری اصولوں کی نفی ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کا اصل مقصد بھی فوت ہو جاتا ہے۔ بعض سماجی اصطلاحات میں ایسی شادیوں کو شادی نہیں کاروبار کہا

جاتا ہے۔ جب بات بادشاہوں کی ہو تو ان میں ہونے والی شادیوں کی اکثریت سیاسی مصلحتوں پر ہی مبنی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ملکہ کرسچیانا کی شادی، اسپین کے ساتویں بادشاہ فرڈیننڈ کے ساتھ ہوئی اور بڑی دھوم دھام اور شاہانہ شان وشوکت سے ہوئی۔ یہ ایک سیاسی شادی تھی۔ کیونکہ ملکہ کرسچیانا کو فرڈیننڈ سے قطعی محبت نہ تھی، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ملکہ کرسچیانا کی جوانی برباد کر دی گئی۔ اور اس کے ارمانوں کا خون ہوگیا...... تاہم باوجود اس کے کرسچیانا نے خود کو ایک وفادار بیوی اور ذمہ دار ملکہ ثابت کرنے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

بہر طور...... محض چند سالوں بعد ہی فرڈیننڈ کا انتقال ہوگیا۔ اب ملکہ کی گود میں اس کی ایک ہی یادگار، ایک ننھی بیٹی کی صورت میں رہ گئی تھی۔ لہٰذا وہی لڑکی تخت وتاج کی وارث تھی۔ ملکہ اس کی سرپرست کی حیثیت سے حکومت کرنے لگی۔ ملکہ کرسچیانا ابھی جوان تھی۔ اس کے حسن کے چرچے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے سینے میں اور دل میں اب بھی ہزاروں ارمان مچلتے رہتے تھے، مگر وہ محبت سے محروم تھی۔ دوسری طرف سلطنت کی ذمہ داریاں ایسی نہ تھیں جو ملکہ دوسری طرف توجہ دیتی۔ پہلے ہی اس نے اپنی ماضی کی شادی شدہ زندگی ایک باوفا بیوی کی طرح گزاری تھی، اور اب ایک فرض شناس ماں بن کر زندگی گزار رہی تھی۔ مگر کب تک؟ جوان جسم اور آرزوؤں بھرے دل کی ادھوری امنگیں کب چین سے بیٹھنے دیتی ہیں؟ آخر اس پر بھی محبت کے دیوتا کیوپڈ تیر چل ہی گیا۔

☆☆☆

گرمی کا موسم تھا۔ اسپین کے دارالحکومت میڈرڈ سے کچھ فاصلے پر ایک معمولی سپاہی رہتا تھا۔ سڑک کے عین موڑ پر اچانک گاڑی کے پہیوں کی آواز سنائی دی۔ پھر وہ گاڑی بالکل قریب آ گئی جس میں ملکہ اسپین سوار تھی۔

سپاہی بت بن کر رہ گیا۔ تاہم اس نے ملکہ کو دیکھتے ہی اسے فوراً فوجی انداز میں سلام کیا۔ گاڑی آگے نکل گئی مگر ملکہ کا دل پیچھے رہ گیا۔ محبت کا دیوتا اسے اپنے عشق کی زد میں لے چکا تھا۔ کیونکہ وہ غریب سپاہی جب تھوڑا آگے بڑھا تو اس کی نظر ایک خوبصورت ریشمی رومال پر پڑی۔ اس نے جھٹ سے رومال اٹھایا اور دیکھتے ہی جان گیا کہ یہ رومال ملکہ کا ہے مگر ملکہ کی گاڑی آگے نکل چکی تھی۔ سپاہی رومال تھامے گاڑی کے پیچھے دوڑا اور ذرا ہی دیر میں اس نے گاڑی کو جالیا اور نہایت ادب کے ساتھ وہ رومال ملکہ کی خدمت میں پیش

کیا۔ ملکہ نے دھیمی دھیمی آنچ جیسی نگاہوں اور ہلکی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا تو اس کے دل کی کیفیت عجیب سی ہونے لگی...... ایک نامعلوم سی بے قراری تھی جو ارتعاش زدہ وجود میں سرایت کرتی چلی گئی۔ ایسے ہی لمحات میں اس کے دل شگفتہ و بے قرار نے چاہا کہ اس خوبصورت اور خوبرو بھولے بھالے سے سپاہی کے گلے کا ہار بن کر جھول جائے اور اپنے دل ہی نہیں وجود تک میں بھڑکتے ادھوری محبت اور ارمانوں کے خوابیدہ شعلوں کو سرد کر ڈالے۔ مگر اپنے مرتبے اور اپنی ذمہ دارانہ جاہ وحشمت کا احساس ہوتے ہی اسے اپنی اس ازلی خواہش کا گلا گھونٹنا پڑا۔

ملکہ نے سپاہی کا نام پوچھا۔ اس نے سر جھکا کر اپنا نام بتایا۔ ''میونس''

ملکہ کی گاڑی آگے بڑھ گئی۔

اس مختصر سی ملاقات کے بعد ملکہ کی آنکھوں میں رت جگے اتر آئے، نیند کو خواب سے اور خواب کو نیند سے یارانہ رہا۔ وہ تو اب گویا جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگی تھی۔

وہ پوری رات نہ سو سکی تھی۔ ہر وقت اس معمولی اور غریب سپاہی کا چہرہ اس کی شب گزیدہ چشم میں رقصاں رہا۔ خمار محبوبیت اور دل ناداں کے بحر الفت میں وہ ڈبکیاں کھاتی رہی۔ اپنے مرتبے کے بارے میں غور کرنے لگی۔ بالآخر عالم مایوسی میں اس کے لبوں سے نکلا۔

''ناممکن...... ناممکن...... ناممکن......''

غرضیکہ ملکہ نے ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی کہ کسی طرح سپاہی کا خیال دل سے نکال دے۔ مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ کتنی ہی راتیں جاگتی رہی۔ بیقرار رہی۔ آخر جب پیمانہ صبر لبریز ہو کے چھلک پڑا، برداشت کی حدود وقیود دم توڑنے لگی تو اس نے اس سپاہی میونس کے گھر اور خاندان سے متعلق تحقیقات کیں۔

تحقیقات سے ملکہ کرسچیانا کو معلوم ہوا کہ میونس ایک نہایت ہی غریب والدین کی اولاد ہے۔ اس کے کئی بہن اور بھائی تھے۔ اور اس کا باپ کی میڈرڈ کے ایک غریب محلے میں چھوٹی سی دکان چلاتا ہے۔

ملکہ نے ارادہ کیا کہ خود جا کر سپاہی میونس کے خاندان... کا جائزہ اپنی آنکھوں سے لے۔ ملکہ کا یہ بھی خیال تھا کہ اس غریب خاندان کی حالت کسمپرسی کو دیکھ کر...... ممکن ہو اس وجہ سے ہی اس کے دل سے سپاہی میونس کا خیال نکل جائے۔ ظاہر ہے غربت ایک لعنت ہے۔ اور یہ کسے اچھی لگتی ہے؟

سو، چار پانچ ہفتے اس کشمکش کی نذر ہو گئے۔ آخر کار ایک دن ملکہ اپنا بھیس بدل کر میونس کے باپ کی دکان پر جا پہنچی۔

سوئے اتفاق...... میونس کا بوڑھا باپ اس وقت دکان پر موجود نہ تھا جبکہ میونس اپنے باپ کی دکان بند کر رہا تھا۔ ٹھیک ایسے ہی وقت میں میونس کو دیکھ کر ملکہ کے دل میں محبت کا ایک دوسرا تیر آن لگا۔

بس! اس رات سے ملکہ پر نیند حرام ہو گئی۔ جبکہ وہ تو اس خیال سے وہاں گئی تھی کہ میونس کے خاندان والوں کی خراب حالت دیکھ کر اسے میونس سے شاید نفرت ہو جائے گی مگر نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔

ادھر میونس کو یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ ملکہ سے ہم کلام رہا تھا، مگر اس کے باوصف وہ نہایت شرافت اور ادب سے ہی پیش آیا تھا۔ اس وقت میونس کے انداز گفتگو اس قدر قابلِ تعریف تھا کہ ملکہ اس پر فدا ہی ہو گئی۔

دوسرے دن ہی ملکہ اسی طرح اپنا بھیس بدل کر دکان پر آئی۔ اس وقت دکان میں میونس کا باپ بھی موجود تھا۔ مگر بے چارے کے سان و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ وہ ایک عام عورت نہیں بلکہ ایک ملکہ کے سامنے موجود ہے۔ تاہم میونس کا باپ بھی ملکہ سے نہایت عزت و احترام کے ساتھ پیش آیا۔ چنانچہ اس طرح ملکہ میونس کے خاندان سے نفرت کرنے کی بجائے بہت ہی اچھے جذبات اپنے اندر لیے واپس لوٹ آئی۔ اس طرح تیسری بار جب وہ دکان پر گئی تو وہاں سے رخصت ہوتے وقت میونس بھی از راہ احترام، چند قدموں تک اسے چھوڑنے آیا تھا۔ کیونکہ رات کچھ زیادہ اتر آئی تھی اور سڑک پر اندھیرا بھی چھانے لگا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی دونوں ایک لیمپ پوسٹ کی روشنی کے قریب پہنچے تو ملکہ کو جانے کیا سوجھی کہ اس نے یکدم اپنے چہرے سے پردہ ہٹا دیا۔ میونس دم بہ خود سا رہ گیا، مگر ملکہ کو پہچانتے ہی اس نے فوراً اسے فوجی انداز میں سلام کر دیا، اور ملکہ اپنا خوبصورت مرمریں ہاتھ اس کے بازو پہ رکھ کر بولی۔

”میونس! میں اس وقت اکیلی ہوں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔“

ملکہ کرسچیانا نے فقط یہ جملہ ادا کیا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی میونس کا صبر و قرار بھی جاتا رہا۔

ایک غریب سپاہی نے اپنے کانوں سے جو کچھ بھی سنا تھا اس کا تو اسے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ وہ رات اس نے کروٹیں بدلتے ہوئے گزار دی۔

اگلے دن صبح کے وقت وہ اپنی ڈیوٹی پر جانے کی تیاری میں وردی پہن رہا تھا تو اسے اطلاع ملی کہ اسے شاہی فوج کی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا ہے۔ میونس حیران ہو گیا کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ مگر...... اسی دن شام کے وقت اسے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ اب وہ ملکہ کے باڈی گارڈز دستے کا کپتان ہے۔ اسے نسبتاً ایک زیادہ اچھا زیادہ بہتر عہدہ تفویض کر دیا گیا تھا۔

لوگوں میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ اس اچانک تبدیلی کا سبب کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا مگر میونس سب کچھ سمجھ رہا تھا۔ اس لیے اس نے چپ سادھ رکھی تھی۔

☆☆☆

ایک رات جب سارے سپاہی گہری نیند میں خراٹے لے رہے تھے کہ ملکہ باغ میں آئی، میونس نے ملکہ کو دیکھتے ہی فوراً آگے بڑھ کر از راہ احترام اسے سلام کرنا چاہا تو ملکہ نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا اور بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ ”پیارے میونس“ اور پھر دوسرے ہی لمحے ملکہ نے خود کو میونس کی آغوش میں دے دیا۔ ملکہ کی محبت کے سیلاب نے گویا ایک طوفان بلاخیز کی صورت اختیار کر لی۔ وہ میونس کے ساتھ چمٹ گئی۔ میونس پہلے ہی بیقرار تھا۔ ملکہ کے اس طرزِ عمل نے حوصلوں کے بادبانوں کو ہوا دی، اور ایسے ہی وقت میں میونس نے ملکہ کے نرم و نازک لبوں پہ ایک طویل بوسے کی صورت اپنی مہر محبت ثبت کر ڈالی۔

چند ہفتے بعد ملکہ نے اس کے ساتھ شادی کر لی مگر اسے خفیہ رکھا گیا۔ میونس کو ”ڈیوک“ بنایا گیا۔ ادھر لوگوں کو جب ملکہ کرسچیانا کی داستان محبت اور خفیہ شادی کی خبر ملی تو ہر کوئی اپنی اپنی بولیاں بولنے لگا۔

کوئی ملکہ کے حق میں بات کرتا تو کوئی مخالفت میں......

لیکن چند مہینوں بعد ہی اس بحث کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

ملکہ اپنے محبوب میونس کو بادشاہ بنا کر تخت پر بٹھانا چاہتی تھی۔ مگر اسے بادشاہت کی خواہش نہ تھی۔ جب ملکہ کی بیٹی جوان (بالغ) ہو گئی، تو میونس نے ملکہ کو مشورہ دیا کہ اب وہ تخت و تاج اپنی بیٹی کے حوالے کر دے۔ ملکہ تو اپنے محبوب کی ہر بات ماننے کو تیار تھی، لہٰذا اس نے ایسا ہی کیا...... سلطنت کی باگ اپنی بیٹی کے حوالے کر کے وہ خود اپنے محبوب کے ساتھ فرانس چلی گئی۔ جذبہ محبت کے ان دونوں متوالوں نے اپنی بقیہ عمر کا حصہ عشق و محبت اور عیش و نشاط کے جام پیتے ہوئے گزار دیا۔



سراب

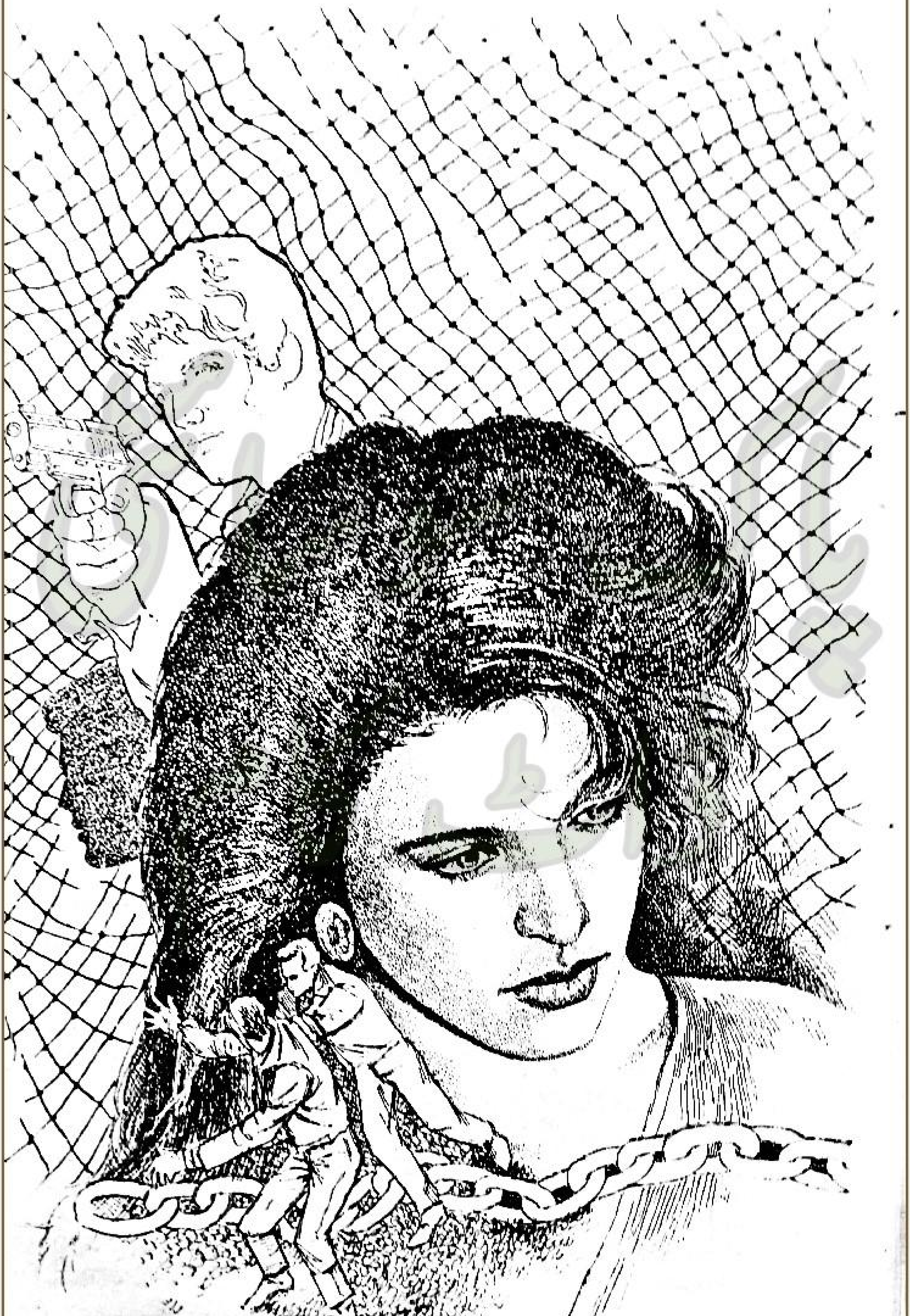
راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر 92

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحرے میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی



(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہوگیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور دیوداشا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ میں دیوداشا کے ہیرے تلاش کرتے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان سے مقابلہ جاری تھا کہ مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آجائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ پھر عبداللہ کی کوٹھی پر۔ ہم وہیں تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زوروسکی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جارہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ مگر شہلا نکل گئی۔ ہم مانسہرہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زوروسکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زوروسکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی تھی میں نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہرروز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے جارہے تھے راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیات اتر کر گیا اور کچھ ایسا کہا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ وہاں اندرونی سازش عروج پر تھی۔ چھوٹے کنور نے سازش کرکے بانو کو اپنے بیڈروم میں بے ہوشی کی حالت میں بلوالیا۔ میں نے برامن پر حملہ کردیا۔ وہ مجھ پر قابو پاتا کہ نشی دل آگیا اور اس نے رامن کو پستول کے نشانے پر لے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ بانو کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ کئی روز کے بعد مجھے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی جس کا اثر نہیں ہوا۔ نائیک اور رامن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پالیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ۔" میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر ہاتھ مارا پستول نکل کر دور جاگرا پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ راج کنور کو لے کر سرحد پار کرگیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کرلیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جارہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے ہیلی کاپٹر لانے کو کہا۔ سنکاری جب ہیلی کاپٹر واپس لا رہا تھا کہ میزائل پھٹ گیا اور ہمارا ذہن تاریک ہوگیا۔ دھماکے سے ہیلی کاپٹر پانی پر گرا تھا مگر ہم سب محفوظ رہے، میں نے سڑک پر پہنچ کر ایک ٹرک کو روکا اور اس پر سوار ہوکر چلا تو بی ایس ایف کے کچھ سپاہیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کو ٹھکانے لگا کر ہم آگے بڑھے اور ایک طیارہ کرائے پر لے کر نئے سفر پر چل پڑے۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کنور کے محل کی ناکابندی کرنے جا پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکی بیتو نے سڑک پر نوکیلی کیلیں بچھادی تھیں۔ گاڑی نزدیک پہنچتے ہی دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو بیتو کے شانے میں

لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کر دیا۔ گاڑی کی تلاشی لی مگر وہاں سعدی کی بجائے کنور تھا۔ ہم محل کی طرف دوڑے کہ ایک ہیلی کاپٹر اتر رہا تھا۔ اس سے سعدی اتری اور اندر چلی گئی۔ میں بیتو کو لے کر ڈاکٹر گپتا کے پاس پہنچا۔ اس نے طبی امداد دے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بہن سیتا کے گھر بھیج دیا۔ سینا کا شوہر ارون اسے حراساں کر رہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیر لیا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی" شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شاہ کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کر دیا۔ مجھے پتا تھا کہ ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا" کنور ہوشیار" سادی کو لے کر چیمبر......" مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کر دیا بیتو مر چکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ کچھ ہی دور چلا تھا کہ میرا پیر ایک بارودی سرنگ پر پڑ گیا۔ وسیم نے آکر اسے ناکارہ کیا پھر ہم کمال کھوکھر کی حویلی میں پہنچے وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی ہم اس مکان کو چھوڑ کر دوسرے مکان میں آئے تو وہاں پہلے سے ایک لڑکا اور لڑکی چھپے ہوئے تھے اسے اتفاق کہیں کہ وہ مرشد کی بیٹی بھتیجا تھے۔ ان کو قید کر کے میں رات میں چھت پر ٹہل رہا تھا کہ دھماکا ہوا اور پک اپ اندر آگئی۔ وہ لوگ فاضلی کو رہا کرانے آئے تھے ہم نے بہ حالت مجبوری اسے رہا کر دیا۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کر دیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کر دیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہو گیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنا لیا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ اندر داخل ہوئے تھے کہ ایک دھماکا ہوا۔

(اب آگے پڑھیں)

دھماکے سے ذرا پہلے آنے والا عظیم الجثہ سایہ مجھ پر چھایا ہوا تھا اور اسی وجہ سے میں بچ گیا تھا۔ دھماکے کے بعد اس کی دبی ہوئی غراہٹ سنائی دی تو مجھے اندازہ ہوا وہ باسو ہے۔ وہ بر وقت آیا اور میرے اور دستی بم کے درمیان حائل ہو گیا۔ اس نے زرہ بکتر نما لباس پہنا ہوا تھا جس نے اسے بم کی تباہ کاری سے محفوظ رکھا لیکن وہ کچھ نہ کچھ زخمی ضرور ہوا تھا یہ بات اس کی غراہٹ سے بھی ظاہر تھی۔ غراہٹ میں اذیت کا عنصر شامل تھا۔ بم دھماکے کے بعد وہ سماع ہال کی طرف سے کی جانے والی فائرنگ سے ڈھال بن گیا تھا۔ گولیاں اس پر برس رہی تھیں اور اچٹ رہی تھیں۔ زندہ بچ جانے کے یقین کے ساتھ ہی میں حرکت میں آگیا تھا اور اپنی رائفل تلاش کر رہا تھا۔ بالآخر وہ کیاری میں مل گئی۔ مگر کیاری اب اپنی اصل شکل میں موجود نہیں رہی تھی۔ دستی بموں کی برسات نے اس کا حشر کر دیا تھا۔ صرف کیاری ہی نہیں وہاں ہر چیز کا حشر ہو گیا تھا۔

جیسے ہی میں باسو کی آڑ میں کھڑا ہوا اس نے گھوم کر سماع ہال کی طرف اپنی خوفناک ساخت کی اور سچ مچ بے پناہ خطرناک مشین گن سے گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ اب تک دونوں جانب سے عام قسم کے خودکار ہتھیاروں اور مشین گنوں سے گولیوں کا تبادلہ ہو رہا تھا مگر اب اس جنگ میں باسو کی مشین گن شامل ہو گئی تھی اور یہ اتنی خوفناک تھی کہ اس کی گولیاں کنکریٹ کی موٹی دیواروں کو پار کر کے ان کے عقب میں موجود دشمنوں کو نشانہ بنا رہی تھیں۔ اس کا شور ایسا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی مگر مجھے سماع ہال کی طرف سے فائرنگ میں فوری کمی سے اندازہ ہو گیا کہ دشمن اس نئے ہتھیار کی تاب نہ لا کر یا تو پسپا ہو گئے تھے یا پھر مارے گئے تھے۔ باسو نہایت مہارت سے ان کھڑکیوں پر گولیاں برسا رہا تھا جہاں سے فائرنگ کی جا رہی تھی۔ یہ اسی کی طاقت تھی جو اتنی بھاری اور تیز جھٹکے والا ہتھیار یوں استعمال کر رہا تھا ایسا صرف فلموں میں دیکھا تھا مگر فلموں میں باڈی بلڈر ہیرو بھی پلاسٹک کے بنے ہتھیار استعمال کرتا ہے۔ باسو اصلی مشین گن چلا رہا تھا۔ اس نے چند برسٹ

میں ہی سماع ہال والوں کو خاموش کرا دیا تھا۔ جیسے ہی مشین گن رکی میں نے باسو سے کہا۔

''تم لوگ کہاں تھے، فاضلی کہاں ہے؟''

اس نے خاموشی سے ہاتھ اٹھا کر کوٹھی کی طرف اشارہ کیا اور مجھ سے بولا۔ ''میرے ساتھ آؤ...... پہلے ان لوگوں کا خاتمہ کرنا ہے۔'' اس کا اشارہ سماع ہال کی طرف تھا۔

''وہاں کون ہے؟''

''میں نہیں جانتا فاضلی نے ان سب کو ختم کرنے کا حکم دیا ہے۔'' باسو نے پہلی بار باقاعدہ گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ ورنہ اب تک میں اسے صرف غراتے یا چند الفاظ میں بات کرتے سنا تھا۔ ''میری آڑ میں رہنا ابھی خطرہ ہے۔''

وہ سماع ہال کی طرف گھوما۔ بجلی بند ہونے اور جنریٹر تباہ ہونے کے باوجود وہاں کہیں کہیں برقی روشنی نظر آرہی تھی۔ یقیناً ان جگہوں پر یو پی ایس کام کر رہے تھے۔ اس جگہ روشنی کی کمی جنریٹر روم میں بھڑکتی اور جابہ جا لگی آگ پوری کر رہی تھی۔ باسو مڑا تو میں نے اس کے بائیں بازو سے خون بہتے دیکھا اسے دستی بم کا کوئی ٹکڑا لگا تھا۔ میں نے اسے آگاہ کیا۔ ''تمہارے بازو سے خون بہہ رہا ہے۔''

''چلو۔'' وہ غرایا اور سماع ہال کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے مشین گن آگے کر رکھی تھی اور میں اس کی آڑ میں تھا۔ درگاہ کی طرف سے فائرنگ تقریباً تھم گئی تھی۔ مگر اکا دکا فائر ہو رہے تھے۔ ملنگ اور اس کے ساتھیوں نے باسو کو دیکھ لیا تھا اس لیے انہوں نے نیچے کی جانے والی فائرنگ روک دی تھی اور اب صرف سماع ہال کی اوپری سمت گولیاں چلا رہے تھے۔ ملبے اور حشر نشر لان سے گزرتے ہوئے ہم سماع ہال کی عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک سامنے سے ایک برسٹ چلا اور گولیاں آکر باسو سے ٹکرائیں مگر اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا البتہ جب اس نے جوابی کارروائی کی تو جس کھڑکی سے برسٹ چلا تھا وہ مع چوکھٹ کے اکھڑ کر اندر جا گری۔ مرنے والوں کی چیخیں باہر تک سنائی دے رہی تھیں۔

باسو جو پہلے دروازے کی طرف جا رہا تھا اس نے رخ بدلا اور اس کھڑکی کی طرف بڑھا۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے میں غیر محفوظ ہوتا جا رہا تھا کیونکہ دائیں بائیں کے ساتھ اوپر کی طرف سے بھی میں نشانے کی زد میں آ رہا تھا۔ اگر کوئی گولی چلاتا تو میں اب باسو کی آڑ میں زیادہ محفوظ نہیں رہا تھا۔ مگر باسو کی دہشت نے کام دکھایا تھا اور ان تمام جگہوں سے فائرنگ کرنے والے پیچھے ہٹ گئے تھے اور جو اب تک نہیں ہٹے تھے انہوں نے ان مرنے والوں سے سبق حاصل کیا تھا جو باسو کا نشانہ بنے تھے۔ کسی طرف سے فائر نہیں ہوا اور ہم آرام سے سماع ہال تک پہنچ گئے۔ عمارت کے نزدیک آتے ہی میں دیوار سے چپک گیا اور باسو نے اندر جھانکا اور مجھ سے کہا۔ ''اندر جاؤ۔''

بھاری مشین گن کے برسٹ نے صرف مرنے والوں کا ہی نہیں بلکہ کمرے کا بھی حشر کر دیا تھا۔ یہاں دو افراد اپنے ہی خون میں غلطاں پڑے تھے یہاں روشنی نہیں تھی مگر باہر سے آتی روشنی کے انعکاس میں سب نظر آرہا تھا۔ میں چوکھٹ پر چڑھ کر اندر کودا۔ کمرا مختصر سا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ آرام کے لیے مخصوص تھا کیونکہ فرش پر سوائے دبیز قالین کے اس کمرے میں اور کچھ نہیں تھا۔ فاضلی نے تاخیر سے سہی لیکن باسو کو یہاں بھیج دیا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کوٹھی کی طرف فیصلہ کن پیش قدمی سے قبل ہر طرح کی مزاحمت ختم کرنا چاہ رہا تھا۔ اسی لیے باسو کو یہاں موجود افراد کو ختم کرنے کا ٹاسک دے کر بھیجا گیا تھا۔ میرے پیچھے باسو بھی اندر آگیا۔ اپنی بھاری جسامت اور زخموں سے قطع نظر اسے چوکھٹ پھلانگنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ باآسانی اندر آگیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''اندر یقیناً اور لوگ ہوں گے۔ مگر اس تاریکی میں ہم خود ان کا شکار بن جائیں گے۔''

جواب میں باسو نے اپنے لباس سے ایک عدد نائٹ ویژن عینک جو سوئمنگ کرنے والی عینک کی طرح تھی نکال کر مجھے تھما دی۔ اسے غالباً ضرورت نہیں تھی اس کے ہیلمٹ کا شیشہ نائٹ ویژن کا کام کر رہا تھا۔ میں نے نائٹ ویژن لگائی اور یک دم ماحول روشن نظر آنے لگا۔ یہاں بھی باسو آگے تھا جیسے ہی اس نے کمرے کے دروازے کو ہاتھ لگایا باہر سے برسٹ چلا اور گولیاں دروازے کو چھلنی کرتی ہوئی آکر باسو کو لگی تھیں وہ ایک بار پھر غرایا۔ ایک گولی اس کی دائیں ران چھیدتی ہوئی گزر گئی تھی اور اب یہاں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ مگر جب باسو نے اپنے زخم کی طرف توجہ نہیں دی تو مجھے بھی فکر نہیں ہوئی۔ وہ بہت جاندار تھا اور اس قسم کے زخم آسانی سے برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے خستہ ہو جانے والے دروازے کو ٹکر ماری اور باہر نکل کر مشین گن کا فائر کھول دیا۔ میں نے اندھا دھند اس کے پیچھے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

میں دیوار سے لگ کر انتظار کرنے لگا اور جب مشین گن کا شور تھما تو میں باہر نکل آیا۔ یہ مرکزی سماع ہال تھا۔ کم

سے کم بیس گز طویل اور بارہ گز چوڑا تھا۔ اس کی چھت بھی کم سے کم پچیس فٹ اونچی تھی جس پر قطاروں میں کوئی درجن بھر فانوس لگے تھے۔ وہاں پنکھے نہیں تھے بلکہ دیواروں پر بڑے سائز کے اسپلٹ لگے ہوئے تھے۔ فرش پر بچھی چاندنی اس وقت خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ وہاں چار افراد کی لاشیں موجود تھیں۔ باسو کی مشین گن کے شکار سے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ باسو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اس کی ران کے زخم سے خون روانی سے بہہ رہا تھا۔ کچھ دیر ساکت رہنے کے بعد اس نے اپنی زرہ کے کسی خانے سے ایک انجکشن کا سیٹ نکالا اور اس میں سے ایک انجکشن الگ کر کے اپنی ران پر اس کی سوئی رکھ کر بٹن دبایا تو گیس کے پریشر سے اس میں پہلے سے موجود دوا باسو کے جسم میں داخل ہو گئی۔ اس نے خالی انجکشن پھینک کر باقی سیٹ واپس رکھ لیا۔ اس میں مزید چار انجکشن تھے۔

ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ باسو کے زخموں سے خون بہنا بند ہو گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شاید خون روکنے والے انجکشن تھے۔ میں نے ان کے بارے میں سنا تھا کہ یہ محاذ جنگ میں اگلے مورچوں پر لڑنے والے فوجیوں کو مہیا کیے جاتے تھے اور عام حالات میں ان کا استعمال ممنوع تھا کیونکہ ان کے سائیڈ ایفکٹس بھی خاصے ہوتے ہیں۔ یہاں حالات جنگ والے تھے اس لیے باسو کا یہ انجکشن استعمال کرنا جائز تھا۔ اس دوران میں، میں سماع ہال کا جائزہ لے رہا تھا۔ سامنے ایک دروازہ تھا اور اس کے دائیں بائیں قطاروں میں کھڑکیاں تھیں۔ دوسری طرف اسی طرح چھوٹے چھوٹے کمروں کی قطار تھی۔ میں نے باری باری سارے کمرے چیک کیے مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ مگر عمارت میں مزاحمت کرنے والے موجود تھے اس کا اندازہ رہ رہ کر ہونے والی فائرنگ سے ہو رہا تھا۔

میں حیران تھا کہ مرشد نے کس قدر مسلح فورس جمع کر رکھی تھی۔ اس کے کم سے کم چالیس آدمی مارے گئے تھے اور اب بھی مزاحمت کرنے والے موجود تھے۔ اس کی کوٹھی میں موجود گارڈز کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان دنوں وہ اپنی حفاظت کے لیے خاص طور سے فکر مند تھا اور حالات نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کی فکر مندی غلط نہیں تھی۔ میں ہال کے دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ باسو نے مجھے روک دیا۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے دروازے کی بجائے ایک کھڑکی کو ٹکر مار کر توڑ دیا۔ یہ نمائشی اور آرائشی کھڑکیاں تھیں جو فکس ہوتی ہیں۔ لکڑی کی جالیوں کے درمیان رنگین منقش شیشے لگے ہوئے تھے۔ کسی عقیدت مند بڑھئی نے بہت محنت سے یہ شاہ کار کھڑکیاں بنائی تھیں۔

کھڑکی توڑ کر باسو دوسری طرف گیا اور پھر اس نے مجھے آنے کا اشارہ کیا۔ یہ چھوٹی سی گیلری تھی اور باہر آتے ہی میں باسو کی عقل مندی کا قائل ہو گیا کیونکہ دروازے پر باہر کی جانب بوبی ٹریپ لگا ہوا تھا اور دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے والا فوری طور پر دنیا سے رخصت ہو جاتا۔ یہ جدید قسم کا بم تھا جو دروازے کے دونوں پٹوں پر چپک گیا تھا اور جب دروازہ کھولنے کی کوشش کی جاتی تو اس کا میکنزم حرکت میں آ جاتا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سماع ہال میں موجود افراد نہ صرف بہت تربیت یافتہ تھے بلکہ وہ جدید قسم کے ہتھیار استعمال کرنے کے ماہر تھے۔ انہوں نے روشنی کے گرنیڈ اور ہینڈ گرنیڈ نہایت مہارت سے استعمال کیے تھے اور اب یہ بوبی ٹریپ تھا۔ گیلری دائیں بائیں عمارت کی پوری لمبائی کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔ اس پر قطاروں میں ویسی ہی کھڑکیاں تھیں اور یہ حصہ درگاہ کے داخلی صحن کی طرف کھلتا تھا۔ میں نے باسو سے دریافت کیا۔

"اب کس طرف جانا ہے؟"

اس نے شانے اچکائے۔ "تم بتاؤ۔"

گویا اسے ٹینک کے طور پر بھیجا گیا تھا اور اس ٹینک کی کمان اب میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے سوچا اور باسو کو پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک سمت بڑھا۔ یہ خاصی پیچیدہ سی عمارت تھی اور میں اس کا نقشہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے وسط میں سماع ہال تھا اس کے دائیں بائیں دوسرے حصے تھے۔ ہال دو منزلہ اونچا تھا مگر دوسرے حصے اتنے اونچے نہیں ہوں گے۔ مجموعی طور پر سماع ہال کی عمارت تین منزلہ تھی۔ اس کا اندازہ مجھے کھڑکیوں سے ہوا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کیا صرف دو افراد اس عمارت کو کلیئر کر سکتے تھے؟ جہاں اب تک سب سے زیادہ مزاحمت سے واسطہ پڑا تھا۔ درجن سے اوپر افراد مارے گئے تھے مگر اب بھی وہاں بہت سے مسلح لوگ موجود تھے۔ سماع ہال کے آخری حصے میں گھومتے ہی ایک کشادہ کھلا لاؤنج ملا۔ یہ عمارت کے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے مل رہا تھا مگر یہاں سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور نہ ہی کھڑکیاں تھیں۔ سامنے قطار میں تین کمرے تھے۔

جیسے ہی میں لاؤنج کے سامنے آیا ایک دروازے کی طرف سے ہلکی سی آہٹ ہوئی اور میری چھٹی حس نے بر وقت خبردار کیا۔ اس طرف سے فائر ہوا تھا مگر میں اس سے

پہلے ہی دیوار کی آڑ لے چکا تھا۔ میں نے جوابی فائر کیا اور دروازے کے عقب سے ایک گھٹی ہوئی چیخ سنائی دی اور پھر دھپ سے گرنے کی آواز آئی مگر میں آگے نہیں گیا۔ مجھے لگا کہ آواز میں بناوٹ تھی اور دھپ کی آواز ایسی تھی جیسے کسی نے دیوار پر ہاتھ مارا ہو۔ میں نے باسو کو سامنے آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے مشین گن اوپر کی تھی کہ میں نے اسے روک دیا۔ ”فائر نہیں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اس شخص کو زندہ پکڑنا ہے۔“

اس نے سر ہلایا اور اطمینان سے لاؤنج میں داخل ہو گیا۔ اداکاری کرنے والے نے اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیا اور اس نے باسو پر فائرنگ کی مگر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ باسو کمرے میں داخل ہوا اور اس بار جو چیخ و پکار سنائی دی اس میں اداکاری کا عنصر شامل نہیں تھا۔ وہ یقیناً باسو کی گرفت میں آگیا تھا اور برے حال سے گزر رہا تھا۔ باقی دو کمرے چیک کر کے میں وہاں پہنچا تو باسو نے اسے اوندھے منہ زمین پر گرا کر اس کی کمر پر پاؤں رکھا ہوا تھا اور اس کی جامہ تلاشی لے رہا تھا۔ اس سے پہلے اسے قابو کرنے کے لیے وہ اس کا بازو توڑ چکا تھا۔ باسو کے ہاتھی نما پاؤں تلے وہ کسمسا بھی نہیں پا رہا تھا اور دبی آواز میں کراہ رہا تھا۔

اپنا کام کر کے باسو نے پاؤں ہٹا لیا اور اسے سیدھا ہونے کا حکم دیا۔ مگر اس سے سیدھا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ غالباً باسو کے وزن سے اس کی ریڑھ کی ہڈی کو بھی نقصان ہوا تھا۔ باسو نے اسے ٹھوکر مار کر سیدھا کیا۔ وہ جوان آدمی تھا صورت سے بدمعاش کی بجائے پڑھا لکھا اور مہذب شخص لگ رہا تھا مگر اس کی اصلیت ایک خودکار رائفل کی صورت میں وہاں موجود تھی۔ میں نیچے جھکا۔

”تم میری آواز سن رہے ہو؟“

جواب میں اس نے ایک بار پھر مکاری سے کام لیا اور یوں پلکیں جھپکانے لگا جیسے اس کا دماغ کام نہیں کر رہا ہو۔ میں گہری سانس لے کر سیدھا ہوا اور باسو سے کہا۔ ”بیکار ہے اسے ختم کر دو۔“

وہ تڑپ کر بولا۔ ”میں...... سن رہا ہوں۔“

”اب آئے ہونا تم راہ راست پر۔“ میں نے جھک کر کہا اور باسو کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے تم بھگت چکے ہو اگر میں اسے اشارہ کر دوں تو یہ خالی ہاتھوں سے تمہاری ہڈیوں کا سرمہ کر دے گا اور تم سوچ سکتے ہو کہ تمہارا کیا حشر ہو گا۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ وہ خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔

”یہاں کتنے لوگ ہیں۔ میرا اشارہ اس عمارت کی طرف ہے؟“

”میں ٹھیک سے نہیں جانتا......“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ باسو نے اس کے ٹوٹے ہوئے ہاتھ پر پاؤں رکھ دیا اور وہ ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح بلبلایا۔ دباؤ چند لمحے جاری رہا تو وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا اور میں نے اس کے منہ پر جوتا رکھ دیا۔ چند لمحے بعد باسو نے پاؤں ہٹایا اور میں نے منہ سے جوتا ہٹایا تو اس نے زاروقطار روتے ہوئے بتایا کہ یہاں اس کے دو درجن ساتھی تھے۔ کچھ اور مشکل مراحل سے گزر کر وہ مزید تعاون پر آمادہ ہوا اور اس نے انکشاف کیا کہ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا تعلق ایک کالعدم دہشت گرد قرار دی جانے والی تنظیم سے تھا اور مرشد نے منہ مانگے داموں ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ سب تربیت یافتہ جنگجو تھے اور ان کے پاس فوجی نوعیت کا اسلحہ بھی تھا۔ یہ میں دیکھ چکا تھا کہ وہ یہ اسلحہ مہارت سے استعمال کر رہے تھے۔ ان دو درجن افراد کے علاوہ یہاں مرشد کے کوئی سات آٹھ ساتھی اور تھے۔ وہ سب بھی لڑنے مرنے والے تھے۔ گویا یہاں تیس سے زیادہ افراد تھے۔

مگر اب وہ تیس نہیں تھے۔ کچھ تو پہلے ہی مارے جا چکے تھے یا زخمی تھے اور باسو کے ہاتھوں بھی کم سے کم چھ افراد مارے گئے تھے۔ فرض کر لیا جائے کہ دشمن کی نصف نفری صاف ہو گئی تھی تب بھی آدھے دشمن باقی تھے اور ہمیں ان سے مقابلہ کرنا تھا۔ اب پتا چلا کہ اس جگہ سے اتنی شدید مزاحمت کیوں ہو رہی تھی۔ اس نے خاصا ہولناک انکشاف کیا تھا۔ اب دہشت گرد کرائے کے گوریلوں کا کردار بھی ادا کرنے لگے تھے اور کوئی بھی منہ مانگے معاوضے پر ان کی خدمات حاصل کر سکتا تھا۔ اس میں اپنے پرائے اور دوست دشمن کی تمیز نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر دہشت گرد کارروائیوں میں بھارتی ساختہ اسلحہ اور امریکی ساختہ آلات استعمال ہوتے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ پیسے کے عوض خودکش حملہ آور بھی مل جاتے ہیں۔ اس کی حالت بہتر ہوئی تھی اور وہ کھڑا ہو سکتا تھا اس لیے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے باہر کی طرف دھکیلا۔

”اب تم آگے رہو گے اور ہماری رہنمائی کرو گے۔“

”میرے ساتھی مجھے مار دیں گے۔“ اس نے مزاحمت کی۔

”دوسری صورت میں ہم مار دیں گے۔“ میں نے

رائفل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ ''تمہارے پاس فیصلہ کرنے کے لیے صرف تین سیکنڈ ہیں، ایک......دو......''

تین کہنے سے پہلے ہی وہ مان گیا تھا۔ میں نے باہر جانے سے قبل اس سے مزید معلومات حاصل کیں۔ پتا چلا کہ سماع ہال کے دوسری طرف سروس ایریا تھا اور وہیں واش روم بھی تھے۔ دوسری منزل پر رہائشی کمرے تھے اور تیسری منزل بھی کمروں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے اکثر رہائش کے لیے مخصوص تھے۔ سب سے زیادہ مزاحمت اسی منزل سے ہو رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ حملہ ہونے کے بعد اس کے اکثر ساتھی اوپر چلے گئے تھے۔ اوپر جانے کا راستہ سروس ایریا سے تھا گویا ہمیں سماع ہال کے دوسری طرف جانا تھا۔ میں اور باسو اسے لے کر روانہ ہوئے۔ باسو گیلری سے گزرتے ہوئے ہمارے آگے ڈھال بنا ہوا تھا۔ جیسے ہی ہم سروس ایریا کے لاؤنج میں داخل ہوئے سیڑھیوں کی طرف سے فائر ہوئے اور گولیاں باسو کے زرہ بکتر پر بے اثر لگیں۔ جواب میں اس کی بھیانک مشین گن نے حملہ آوروں پر قیامت ڈھادی۔ ان کو بچ کر فرار ہونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور وہ سیڑھیوں پر ہی مارے گئے۔ ان کی لاشیں دیکھ کر ہمارے قیدی کی حالت خراب ہوگئی۔ اس نے گھگیا کر کہا۔

''خدا کے لیے مجھے مت مارنا۔''

''خدا کے واسطے مت دو۔'' میں نے اسے آگے دھکیلا۔ ''کبھی تم نے بھی کسی کے منہ سے یہ واسطے سنے ہوں گے۔''

وہ بادل ناخواستہ لرزتے قدموں سے آگے بڑھا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ صرف اس کی خاطر اس کے ساتھی سیز فائر نہیں کریں گے اور وہ بھی مارا جائے گا۔ اس لیے اس کے ذہن میں فرار کا خیال آیا اور اس پر اس نے بڑے بے ڈھنگے پن سے عمل کیا۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسی حرکت کرے گا۔ وہ آگے تھا اور جب سیڑھیاں چڑھ کر وہ گھوم کر اوپر جانے والی جگہ پہنچا جہاں ایک شیشے اور لکڑی کی آرائشی کھڑکی تھی اس نے اچانک چھلانگ لگائی اور فلمی انداز میں کھڑکی توڑ کر باہر نکل گیا۔ عموماً فلموں میں ہیرو کو اسی طرح دشمنوں سے بچتے دکھایا جاتا ہے مگر یہ نہ تو فلم تھی اور نہ وہ ہیرو تھا جب میں نے جھانک کر دیکھا تو وہ ایک منزل نیچے اس طرح گرا تھا کہ کھڑکی کا ایک ٹوٹنے والا شیشہ اس کی گردن میں پیوست ہوگیا اور وہ خرخراتی آوازوں کے درمیان اسے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر جیسے ہی شیشہ اس کی گردن سے نکلا خون کا فوارہ پھوٹا تھا۔ بہ ظاہر اس کے بچنے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

''اوپر چلو۔'' باسو نے آگے جاتے ہوئے کہا۔ اس نے قیدی کے فرار اور اس کی عبرت ناک موت پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ اب ایسا لگ رہا تھا کہ تمام مزاحمت کرنے والے اسی منزل تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ جنگی حکمتِ عملی کے لحاظ سے انہوں نے نہایت احمقانہ حرکت کی تھی۔ اب وہ اس جگہ پھنس گئے تھے اور فرار کے واحد راستے پر ہم موجود تھے۔ باسو آگے تھا اور میں اس کے پیچھے تھا۔ ہم اوپر اسی طرح کے سروس ایریا میں نکلے وہاں واش روم تھے اور ایک لاؤنج کے ساتھ کچن تھا۔ لاؤنج میں چاندنی بچھی تھی۔ سامنے کی طرف سے ایک گیلری دوسری سمت میں جارہی تھی اور سیڑھیاں یہاں سے تیسرے اور آخری فلور کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ میں نے باسو سے کہا۔

''تم گیلری کے دوسری طرف موجود حصہ کلیئر کر کے آؤ جب تک میں یہاں گھات لگائے ہوئے ہوں۔''

وہ سر ہلاتا ہوا اس طرف بڑھ گیا۔ میں نے سیڑھیوں کا جائزہ لیا۔ تاریکی میں وہاں کسی قسم کی سرگرمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کچن کی طرف باہر سے کچھ روشنیاں جھلک رہی تھیں۔ اسی جگہ سے درگاہ والی عمارت پر فائرنگ کی جاتی رہی تھی کیونکہ یہاں جوابی فائرنگ کے آثار نمایاں تھے۔ ایک اوپری کیبنٹ ٹوٹ گئی تھی اور سنک میں گولیوں کے سوراخ تھے۔ سنک کے اوپر لگا نل دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ مجھے شدت کی پیاس لگی ہوئی تھی۔ میں نے جھک کر نل سے پانی پیا اور کچھ اپنے چہرے پر ڈالا تھا۔ اس جگہ کی بجلی بند ہونے سے یہاں شدید حبس اور گھٹن ہوگئی تھی۔ منہ پر ٹھنڈا پانی پڑا تو سکون ملا تھا۔ اسی لمحے گیلری کے دوسری طرف سے باسو کی مشین گن گرجی تھی۔ یقیناً اسے وہاں اپنے شکار مل گئے تھے۔

اوپر والوں نے بھی یہ آواز سن لی تھی کیونکہ ان کی طرف سے ردعمل ہوا تھا اور کوئی چیز اوپر سے گری اور لاؤنج میں آ کر ہلکی سی آواز سے پھٹ گئی اس سے دھواں اور گیس خارج ہو رہی تھی۔ میں سانس روک کر اس کی طرف لپکا اور اسے اٹھا کر کچن کی ٹوٹی کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔ مجھے گیس بم اٹھا کر باہر پھینکنے میں بہ مشکل بیس سیکنڈ لگے ہوں گے۔ لیکن اس کے باوجود لاؤنج میں کچھ گیس جمع ہوگئی تھی۔ یہ آنسو گیس تھی، یہ سانس کے ساتھ آنکھوں پر بھی اثر کرتی تھی۔ میں نے اپنی شرٹ کا دامن پھاڑ کر اسے پانی

سے تر کیا اور اسے منہ پر رکھ کر پھر سانس لی تھی۔ گیس کے اخراج کے لیے میں نے لاتوں سے مار کر عقبی دو کھڑکیاں توڑ دی تھیں۔ دشمن کا یہ حربہ بھی ناکام رہا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ اب اوپر زیادہ لوگ نہیں رہے تھے اور اسی وجہ سے وہ دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ مرشد نے انہیں اپنی حفاظت کے لیے بلایا تھا مگر اس وقت ان کو اپنی جان کے لالے پڑے تھے مرشد کا خیال کہاں سے آتا۔ مجھے خیال آیا کہ انہیں یہیں چھوڑ کر روانہ ہو جانا چاہیے، شاید وہ ہمارے پیچھے آنے اور اس معرکے میں مزید حصہ لینے سے گریز کرتے۔ مگر مجھے معلوم تھا باسو ہر صورت فاضلی کے حکم کی تعمیل کرے گا اور یہاں موجود آخری فرد کے خاتمے تک واپسی کا نام بھی نہیں لے گا۔ اوپر والے اتنی آسانی سے فوت ہونے پر آمادہ نہ ہوتے اور اپنی جان بچانے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کرتے۔ ایک منٹ بعد باسو گیلری کی طرف سے نمودار ہوا اور ماحول کو کسی قدر دھندلا دیکھ کر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''اوپر والوں نے گیس کا بم مارا وہ میں نے باہر پھینک دیا۔''

وہ آرام سے سانس لے رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کا ہیلمٹ گیس ماسک بھی تھا۔ یہ خاصی حیرت انگیز چیز تھی شاید مستقبل کی جنگوں کے لیے تھی جسے اس طرح ٹیسٹ کیا جا رہا تھا۔ باسو سیڑھیوں کی طرف بڑھا مگر جھٹکے سے پیچھے آیا کیونکہ اس بار اوپر سے ہینڈ گرینیڈ آ کر گرا تھا۔ میں تو خیر فوراً کچن کی آڑ میں ہو گیا تھا مگر باسو نے بھی حیرت انگیز تیزی سے ایک ستون کی آڑ لی تھی۔ اگرچہ ستون اس کے دیو ہیکل جسم کو پوری طرح چھپانے سے قاصر تھا مگر پھر بھی خاصی بچت ہو گئی۔ دھماکے نے سیڑھیوں کے آس پاس کی جگہ تباہ کر دی تھی اور وہاں موجود فرنیچر اور فرش پر بچھی چاندنی نے آگ پکڑ لی تھی۔ یہ آگ سرعت سے پھیل رہی تھی۔ جب میں نے کچن سے جھانک کر دیکھا تو باسو سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا اور وہ ہاتھ اوپر کر کے سیڑھیوں کے اوپری حصے میں کچھ رکھ رہا تھا۔ یہ کام کرتے ہی وہ تیزی سے واپس ستون کی آڑ میں آیا اور اس کا انداز دیکھ کر میں بھی واپس کچن میں روپوش ہو گیا۔

اس بار دھماکے نے سیڑھیاں تباہ کر دی تھیں۔ اب اوپر والے نیچے نہیں آ سکتے تھے اور نیچے والے اوپر نہیں جا سکتے تھے۔ مگر میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ باسو کیا کر رہا تھا۔ دھماکا ہوتے ہی وہ تیزی سے کچن میں آیا اور اس نے اپنی جناتی قوت سے گیس کے فولادی پائپ توڑ دیے اور ان سے تیزی کے ساتھ گیس خارج ہونے لگی۔ اب میں سمجھ گیا تھا اور باسو سے پہلے نیچے کی طرف لپکا۔ باسو بھی پیچھے آیا تھا جب ہم نچلی منزل تک پہنچے تو اوپر دھماکا سنائی دیا تھا گیس نے آگ پکڑ لی تھی اور شعلوں کی لپیٹ نیچے تک آئی تھی۔ یہاں بھی باسو نے نچلے کچن میں گیس آزاد کرنے کی کارروائی کی۔ اوپر سے آگ بھڑکنے کی آوازوں کے ساتھ کچھ لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ باسو نے گیس بھرنے کا انتظار کیا اور پھر ایک گرینیڈ پن نکال کر کچن میں رکھا اور ہم ایک کھڑکی توڑ کر اگلے صحن میں باہر نکل آئے تھے اور دیوار کے ساتھ دبک گئے اور گرینیڈ کے دھماکے کو گیس کی موجودگی نے کئی گنا بڑھا دیا تھا۔

اس طرف سے دیوار کا ایک حصہ گر گیا تھا اور اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ دھماکا ہوتے ہی باسو دیوار سے ہٹ گیا اور اس کا منہ اوپر کی طرف تھا۔ اس نے مشین گن چھوڑ کر پستول نکال لیا تھا۔ پھر اس نے اچانک یکے بعد دیگرے کئی فائر کیے اور دو افراد اوپر سے پکے آم کی طرح نیچے گرے تھے انہیں گولیاں لگی تھیں اور رہی سہی کسر گرنے سے پوری ہو گئی۔ سیڑھیاں تباہ ہونے سے اب اوپر پھنسنے والے براہِ راست اترنے کی کوشش کر رہے تھے اور باسو اسی لیے اس طرف نکلا تھا۔ وہ پوری طرح پرعزم تھا کہ ایک آدمی بھی بچ کر نہ جانے پائے۔ اسے معلوم تھا کہ سیڑھیاں تباہ ہونے اور آگ پھیلنے کے بعد اوپر والے کھلی چھت سے نیچے اترنے کی کوشش کریں گے اور وہ ان کے استقبال کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ دو افراد کے مارے جانے کے بعد اوپر سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی تھی مگر میں چھجے تلے اور باسو اپنی زرہ بکتر میں محفوظ تھا۔ اس نے پھر پستول سے جوابی کارروائی کی اور بولا۔ ''وہ عمارت کی چھت پر ہیں ان کو نشانہ بناؤ۔''

پہلے میں سمجھا کہ شاید وہ مجھ سے مخاطب ہے لیکن جلد مجھے احساس ہوا کہ وہ ریڈیو پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ شاید اس نے درگاہ میں موجود افراد سے کہا تھا کیونکہ فوراً ہی درگاہ کی چھت سے جوابی کارروائی شروع ہوئی اور دونوں طرف سے جواب دیا جانے لگا تھا۔ سماع ہال کی عمارت کسی قدر نیچی تھی مگر اس کے اوپر باؤنڈری والی تھی اس لیے مزاحمت کرنے والے بالکل ہی کھلی جگہ نہیں تھے۔ وہ دیوار کی آڑ میں بچ سکتے تھے مگر اب وہ نیچے اترنے کی کوشش نہیں کر سکتے تھے۔ سامنے درگاہ کی عمارت پر ملنگ اینڈ کمپنی موجود تھی اور یہاں باسو موت کے فرشتے کے نمائندے کی حیثیت سے ان

کے استقبال کو بالکل تیار تھا۔ سماع ہال کی عمارت میں لکڑی کا کام بہت زیادہ تھا اور اس لیے وہاں آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ ابتدائی ہدایت کے بعد باسو پھر غرّایا۔

''کوئی کسی طرف سے بچ کر نہ جانے پائے۔''

عقب میں ہم موجود تھے۔ عمارت کے دائیں بائیں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ صرف آگے اور پیچھے سے نکلا جاسکتا تھا۔ سامنے درگاہ کی عمارت تھی اور بہ ظاہر اوپر موجود افراد کے لیے بچ نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا میں نے محسوس کیا کہ یہاں میری اتنی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں دیوار سے لگے لگے مرشد کی رہائشی کوٹھی والے حصے کی طرف بڑھا۔ فی الحال اوپر سے خطرہ نہیں تھا مگر میں نے کھلی جگہ آنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس وقت میں مشن سے زیادہ ذاتی حفاظت کو ترجیح دے رہا تھا۔ میں نے عمارت کے کونے سے جھانکا تو اس طرف تاریکی میں کئی افراد دکھائی دیے وہ مورچہ بند تھے اور کوٹھی کے احاطے سے کی جانے والی فائرنگ کا جواب دے رہے تھے۔ مورچہ بند افراد فاضلی کے تھے اور یقیناً ان میں فاضلی بھی موجود تھا۔ اتفاق سے وہ سب میرے نشانے پر تھے اور مجھے خیال آیا کہ اگر مجھے علم ہوتا کہ ان میں سے فاضلی کون ہے تو میں اس سے چھٹکارا حاصل کرسکتا تھا مگر نائٹ ویژن صرف دکھا رہی تھی چیزوں اور انسانوں کو بہت واضح نہیں کر رہی تھی۔

فاضلی کا دعویٰ تھا کہ اس نے مرشد کے ذرا کا یا باہر سے اس کے لیے مدد آنے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا مگر میں سوچ رہا تھا یہاں جس قسم کا تباہ کن اور شور شرابے والا اسلحہ استعمال ہوا تھا کیا یہ ممکن تھا کہ پولیس اور انتظامیہ کان بند کرکے پڑی رہتی۔ اس وقت ایک بج رہا تھا اور کارروائی شروع ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ یہ وقت اسلام آباد سے پولیس کی آمد کے لیے کافی تھا۔ مگر فی الحال ایسے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے کہ یہاں پولیس آنے والی تھی۔ سماع ہال کی عمارت میں آگ اتنی سرعت سے پھیل رہی تھی کہ اب اس کے شعلے اور تپش کھڑکیوں سے باہر آنے لگی تھی۔ میں نے ذرا پیچھے ہٹ کر اوپری منزل کا جائزہ لیا تو وہاں صورتِ حال زیادہ ابتر دکھائی دی۔ شعلے تقریباً تمام کھڑکیوں سے لپٹے ہوئے تھے کیونکہ یہ سب لکڑی کے کام والی کھڑکیاں تھیں۔ میں فکر مند ہوگیا کیونکہ معاملات اس طرف جارہے تھے کہ حکومتی اداروں کی طرف سے مداخلت لازمی تھی۔ شعلوں کے ساتھ دھواں بھی اٹھ رہا تھا اور یہ خاصی دور سے نظر آتا۔

کوٹھی کے گارڈز اور فاضلی کے آدمیوں کے درمیان فی الحال ہلکی پھلکی چل رہی تھی۔ باسو نے فائرز کیے تو میں چونکا۔ اس نے نیچے آنے کی کوشش کرنے والے ایک اور آدمی کو مار گرایا تھا۔ پھر عمارت کے دوسری طرف سے ایک چیخ سنائی دی اور پھر دھپ کی خوفناک آواز سے نیچے گرا تھا اس نے غالباً آگ سے گھبرا کر چھلانگ لگادی تھی اوپری چھت سے زمین تک کا فاصلہ کم سے کم پینتالیس فٹ تھا اور اگر گرنے والا بچ بھی گیا تھا تو یقیناً اس کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ باسو ملنگ اینڈ پارٹی سے رابطے میں بھی تھا۔ اس نے سر ہلایا اور میری طرف آیا۔ ''اوپر کوئی باقی نہیں رہا ہے۔''

''ممکن ہے کوئی ہو اور چھپ گیا ہو؟''

''تب وہ جل کر مرے گا۔'' باسو نے کہا اور مرشد کی کوٹھی کے احاطے کی طرف بڑھا۔ اس طرف بڑا سا خالی میدان تھا اس میں شاید رش کے دنوں میں گاڑیاں پارک کی جاتی تھیں۔ مشن کا آخری مرحلہ شروع ہونے والا تھا یعنی مرشد کی کوٹھی تک رسائی حاصل کرنا اور بالآخر اسے قابو یا دنیا سے رخصت کرنا۔ میں اس مرحلے میں شامل ہونا چاہتا تھا مگر جب میں نے باسو کے ساتھ جانا چاہا تو اس نے مجھے روک دیا۔ ''تم پیچھے سے درگاہ کی طرف جاؤ۔''

''کیوں؟''

''فاضلی کا حکم ہے۔'' وہ غرّایا۔ ''تم وہاں رک کر اگلے حکم کا انتظار کرو گے۔''

باسو کا انداز بتا رہا تھا کہ مجھے اس کے کہنے پر عمل کرنا ہی تھا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔ میں زیرِ لب فاضلی کو بے نقط سناتا ہوا دوسری طرف مڑ گیا۔ غالباً فاضلی نہیں چاہتا تھا کہ میں مسلح حالت میں اس کے پاس آؤں۔ سماع ہال کی عمارت کے دوسری طرف پہنچا جہاں اوپر سے چھلانگ لگانے والا جانکنی کی کیفیت میں دم توڑ رہا تھا۔ اس کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں اور منہ ناک سے خون جاری تھا۔ اس کی گن اس کے برابر میں پڑی تھی مجھے دیکھ کر اس نے سسکتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے منہ سے سوائے خون کے بلبلوں کے اور کچھ نہیں نکلا تھا۔ اس کے باوجود وہ کچھ کہنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی حالت بہت عبرتناک تھی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ جب وہ بول نہیں پایا تو اس نے اشارے سے مجھے پاس آنے کو کہا۔ میں اس کی طرف جھکا تو مجھے اندازہ ہوا وہ کہہ رہا ہے کہ ''مجھے ماردو۔''

وہ بہت اذیت میں تھا اور اس سے چھٹکارا چاہتا تھا میں نے کہا۔ ''معاف کرنا میں صرف اسے مارتا ہوں جو مجھے

مارنے کی کوشش کرتا ہے ہاں تمہارے لیے یہ کر سکتا ہوں۔"

میں نے کہتے ہوئے اس کے سر پر رائفل کا دستہ مارا اور وہ ساکت ہو گیا۔ اللہ جانے بے ہوش ہوا تھا یا دنیا سے گزر گیا تھا۔ مگر اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا اب وہ اذیت میں نہیں تھا۔ وہ بچتا نہیں لگ رہا تھا اور اچھا تھا کہ بے ہوشی میں دنیا سے رخصت ہو جاتا۔ مزید اذیت سے بچ جاتا۔ میں نے عمارت کے اوپری حصے کی طرف دیکھا۔ اب شعلے اس طرف بھی پہنچ گئے تھے۔ اوپر موجود کسی فرد کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ درگاہ کے اس طرف گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ بہ ظاہر یہ جگہ ایسے ہی چھوڑ دی گئی تھی۔ اس پر برگد، پیپل اور نیم کے بڑے درخت اگ آئے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ درخت درگاہ بننے سے پہلے سے یہاں موجود ہوں اور کیونکہ اس جگہ کی ضرورت نہیں تھی اس لیے ان درختوں کو چھیڑا نہیں گیا تھا۔ درختوں کے پاس درگاہ کی بلند چار دیواری تھی۔ یہ چار دیواری تقریباً بارہ فٹ اونچی تھی اور اس پر اندر باہر اس طرح سے خاردار باڑ لگائی تھی کہ اسے عبور کرنا آسان کام نہیں تھا۔

میں سماع ہال کے کونے تک پہنچا اور جھانک کر درگاہ کی عمارت کی طرف دیکھا تو مجھے ملنگ کے دو ساتھی سامنے نظر آئے تھے وہ بھی آس پاس کا جائزہ لے رہے تھے اور جس طرح بے فکری سے کھلی جگہ پر کھڑے تھے ایسا لگ رہا تھا کہ سماع ہال کی طرف سے مزاحمت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ وہ سگریٹ پی رہے تھے اور آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھنے سے پہلے انہیں آواز دے کر اپنے بارے میں بتایا ورنہ کوئی بھروسا نہیں تھا وہ بھڑک کر مجھ پر فائر کھول دیتے۔ خبردار کر کے میں ان کے پاس پہنچا اور ملنگ کے بارے میں پوچھا۔ ان میں سے ایک نے سر ہلایا۔ "اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

میرا ماتھا ٹھنکا۔ "کیا ہوا وہ زخمی ہے؟"

دوسرے نے بھی گھڑے جیسا سر ہلایا۔ "پیٹ میں دو گولیاں لگی ہیں۔"

"پیٹ میں کیسے لگ گئیں اس نے بلٹ پروف پہنا ہوا تھا؟"

اس پر پہلے نے ذرا کھل کر بتایا کہ گولیاں کہاں لگی تھیں اور اگر ملنگ بچ گیا تو کن امور کے قابل نہیں رہے گا۔ میں نے لاحول پڑھی۔ "تم لوگوں کو اس وقت بھی یہی سوجھ رہی ہے۔ اس کی جان بچانے کے لیے کچھ کیا ہے؟"

"ادھر ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔" اس نے مایوسی سے کہا تو میں اس سے سر کھپانے کی بجائے اندر آیا جہاں ملنگ تقریباً بے ہوشی کی حالت میں مرشد کے باپ اور دادا کے مزار شریف کے پاس پڑا ہوا تھا۔ گولیاں واقعی نازک جگہ لگی تھیں اور انہوں نے اعضا کے چیتھڑے اڑا دیئے تھے۔ خون روانی سے بہہ رہا تھا اور اس کے بے حس ساتھیوں نے خون روکنے کے لیے کچھ نہیں کیا تھا جب کہ ان کے پاس بیک پیک میں مرہم پٹی کا سامان بھی تھا۔ خود ملنگ کی پشت پر بندھے بیگ میں بھی موجود تھا۔ اس مہم سے پہلے انہیں اس بارے میں بتایا تھا۔ میں نے اس کا بیگ اتارا اور اس میں سے خون جذب کرنے والے پیڈز نکال کر ملنگ کے زخم پر رکھے اور ایک آدمی سے کہا۔

"اسے پکڑ کر رکھو۔"

اس نے بادل ناخواستہ پیڈ دبایا تو میں نے اوپر سے ٹیپ لپیٹ دیا۔ زخم کو چھونے پر ملنگ بلبلا کر ہوش میں آ گیا تھا میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارے پاس خون روکنے والا انجکشن ہے جیسا کہ ہاسو کے پاس ہے۔"

"نہیں۔" اس نے نحیف لہجے میں کہا۔ "میرے پاس ایسا کوئی انجکشن نہیں ہے۔"

"تم فاضلی سے رابطہ کر کے اس سے کہو کہ تمہیں وہ انجکشن بھیج دے۔ خون اسی طرح بہتا رہا تو تم مر جاؤ گے۔"

ملنگ کے چہرے پر دہشت نظر آنے لگی۔ اس نے کانپتے ہاتھ سے اپنے بالوں میں چھپے مائک پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ "میں زخمی ہو گیا ہوں گولیاں...... لگی ہیں جی خون بہت بہہ رہا ہے۔"

"ایک منٹ مجھے بات کرنے دو۔" میں نے کہا تو ملنگ نے ریڈیو کا ہیڈ سیٹ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ اصل ریڈیو اس کے لباس میں چھپا ہوا تھا میں نے فاضلی سے کہا۔ "اس کے لیے خون روکنے والا انجکشن بھیج دو ہاسو کے پاس ہے۔"

"وہ صرف ہاسو کے لیے ہے۔" فاضلی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "کسی اور کو نہیں مل سکتا۔"

"یہ تمہارا آدمی ہے اور اگر اس کا زیادہ خون بہہ گیا تو......"

"تو یہ مر جائے گا۔" فاضلی نے میری بات کاٹ کر استہزائیہ انداز میں کہا۔ "آدمی میرا ہے اور فکر تمہیں ہو رہی ہے۔"

"ابھی تمہارا مشن پورا نہیں ہوا ہے اور تمہیں آدمیوں کی ضرورت ہے۔"

"اگر یہ بچ بھی گیا تب بھی بیکار ہے مزید کچھ نہیں کر سکے گا اس لیے اسے چھوڑ دو۔"

"جہنم میں جاؤ۔" میں نے مائک نیچے پھینک دیا۔ ملنگ نے میری یک طرفہ گفتگو سے سمجھ لیا تھا کہ فاضلی نے کیا جواب دیا ہے۔ اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کوئی بات نہیں اسی بات کا تو معاوضہ دیا ہے اس نے۔"

"تمہارے گھر والوں کو چند لاکھ مل جائیں گے اور تم یہاں خون بہنے سے مر جاؤ گے۔"

ملنگ کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔ میں گہری سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں ان معاملات میں غیر ضروری طور پر گھس رہا تھا جب کہ مجھے اپنی گلو خلاصی پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے تھی میں نے وہاں موجود افراد سے پوچھا۔ "اب انچارج کون ہے۔"

اس پر وہ ہنسا جس نے قید خانے سے نکلنے کے بعد میرا پوچھا تھا۔ "انچارج پوچھتا ہے کہ انچارج کون ہے؟"

"بکومت۔" میں نے بدمزگی سے کہا۔ "میں نام نہاد انچارج ہوں پہلے یہ ملنگ تھا اب کون ہے؟"

میرے لہجے پر اس کی آنکھوں میں چمک آئی تھی اور اس نے کاٹ دار انداز میں کہا۔ "مجھے سمجھ لو۔"

"اچھا تو انچارج صاحب اب ہمیں کیا کرنا ہے؟"

"باس کے حکم کا انتظار۔" اس نے جواب دیا۔

"یہاں کتنے آدمی بچے ہیں؟"

یہاں آنے والے سترہ افراد میں سے چھ مارے جا چکے تھے اور ملنگ سمیت تین شدید زخمی تھے یعنی وہ کسی کام کے نہیں رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ لڑنے کے قابل مجھ سمیت نو افراد بچے تھے۔ مگر دوسری طرف مخالف پارٹی میں سے کوئی نہیں بچا تھا۔ پرانا سماع ہال، درگاہ کی عمارت اور نیا سماع ہال تینوں کلیئر ہو چکے تھے۔ اب صرف مرشد کی کوٹھی رہ گئی تھی۔ فاضلی کے ساتھ اب بھی ایک درجن مسلح افراد تھے اور وہ سب محفوظ تھے کیونکہ انہوں نے مار دھاڑ کی کارروائی میں بہت احتیاط سے حصہ لیا تھا۔ سب سے آگے میرا گروپ تھا اس لیے نقصان بھی زیادہ اسی کا ہوا تھا۔ شاید اسی لیے اسے آگے رکھا گیا تھا۔

پھر فاضلی کے پاس ہاسو جیسا خطرناک آدمی تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کا اصل دستہ وہی تھا اور یہ کرائے کے گوریلے تھے۔ ان کے جینے مرنے سے اسے خاص فرق نہیں پڑتا ہاں ان کی طرف سے ذمے داری پوری کرنا لازمی تھا۔ مجھے ان کے ساتھ لگانے کا مقصد یہی تھا کہ میں اپنا تجربہ کام میں لاؤں اور ان کی مدد کروں۔ اس کے باوجود فاضلی نے مجھے نام نہاد انچارج بنایا تھا۔ میرے معاملے میں وہ ذرا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ وہ مجھے ایسی کوئی رعایت نہیں دے رہا تھا جو بعد میں خود اس کے گلے پڑ جائے۔ نئے انچارج کا نام گل جی تھا۔ مجھے اس گل جی کو دیکھ کر افسوس ہوا جو مصور گل جی کے بالکل برعکس تھا۔ قدرت نے اسے معصوم پیدا کیا ہوگا مگر اس نے اپنے کرتوت سے اپنے نقش و نگار خود بنالیے تھے۔ اس نے بتایا کہ ان تینوں مقامات پر دشمن کے کم سے کم ساٹھ آدمی مارے گئے تھے۔

گویا دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں ستر کے قریب افراد اپنی جان ہار چکے تھے۔ مگر فاضلی اور مرشد جیسے لوگوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ وہ ساری دنیا کے انسانوں کے مرنے سے بھی مطمئن ہو سکتے تھے بہ شرط کہ ان کی جان کو خطرہ نہ ہو۔ لیکن اس جنگ میں جو اس وقت یہاں جاری تھی۔ مرشد اور فاضلی میں سے کسی ایک ہی کو زندہ رہنا تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا اور حالات بتا رہے تھے کہ موت کا گھیرا مرشد کے گرد تنگ ہو رہا تھا۔ اب تک ہونے والا جانی نقصان تقریباً تمام ہی مرشد کے آدمیوں کا ہوا تھا۔ درگاہ کی تین اہم ترین عمارتوں پر فاضلی کا قبضہ ہو گیا تھا یا پھر وہ مرشد کے قبضے میں نہیں رہی تھیں۔ اچانک مجھے ان عورتوں کا خیال آیا جو درگاہ والی عمارت کے تہہ خانے میں تھیں۔ میں نے گل جی سے پوچھا۔ "ان کا کیا ہوا؟"

"وہی جو دوسرے لوگوں کا ہوا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

میرا خون کھنچ کر سر میں آ گیا تھا اور میں نے غرا کر پوچھا۔ "کیوں؟ وہ عام عورتیں تھیں اور اس جگہ قید تھیں، پھر انہیں کیوں مارا؟"

"اوہ سر جی، میں نے کب کہا کہ انہیں مار دیا ہے۔" اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "ہو سکتا ہے کوئی تہہ خانے کی طرف گیا ہو اور انہیں مار دیا ہو۔"

"اگر انہیں مار دیا گیا ہوا تو یہ مارنے والے کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا اور تہہ خانے کی طرف بڑھا وہاں مرشد کے ان تین آدمیوں کی لاشیں موجود تھیں۔ جسے میں نے بے ہوش کیا تھا اس کے سر میں بھی کسی نے سوراخ کر دیا تھا۔ مگر مجھے فکر ان عورتوں کی تھی۔ تہہ خانے میں یو پی ایس کام کر رہا تھا اور یہاں روشنی تھی۔ تلاش

کرتا ہوا میں ایک راہداری کے آخری حصے میں پہنچا جہاں ایک چھوٹی سی کوٹھری کا دروازہ تھا اور وہاں تو عورتیں ایک دوسرے سے چمٹ کر بیٹھی تھیں۔ خوف اور گرمی سے وہ پسینے میں نہائی ہوئی لیکن زندہ تھیں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا مگر مجھے دیکھ کر ان کی ہلکی پھلکی چیخیں نکل گئی تھی۔ میرا حلیہ ہی ایسا ہو رہا تھا سر سے پاؤں تک زخموں اور لہو میں ڈوبا ہوا تھا جگہ جگہ جلنے اور گھٹنے کے نشانات تھے۔ چہرہ بھی ان سے خالی نہیں تھا اس لیے میں عورتوں کو بھیانک لگا تھا مگر روشنا نے مجھے شناخت کر لیا اس نے دبی آواز میں رونے والی عورتوں کو خاموش کرایا۔ ''چپ...... چپ یہ اچھا آدمی ہے اسی نے مجھے یہاں بھیجا تھا۔''

''تم لوگ یہیں رہو اور کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند کر لو۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی اوپر مار دھاڑ چل رہی ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہو۔ اپنی جان بچانے کے لیے تمہیں خود کوشش کرنا ہوگی۔''

''ہم ہمیشہ تو یہاں نہیں رہ سکتے۔'' ایک ادھیڑ عمر عورت بولی۔ ویسے وہ سب ہی معمولی صورت کی اور عمر رسیدہ عورتیں تھیں بھی ان کو یہاں یہ کام سونپے گئے تھے ورنہ شاید وہ بھی مرشد اور اس کے گرگوں کی دل بستگی کا سامان بنی ہوتیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ جوانی میں وہ اس مرحلے سے گزر چکی ہوں اور اب بیکار ہوگئی تھیں۔ اس لیے کباڑ کی طرح یہاں تہ خانے میں ڈال دی گئی تھیں۔ جب وہ یہاں آئی یا لائی گئی ہوں گی تو ان کے خاندان گھربار ہوں گے مگر اب ان کا کوئی تھا بھی تو اس نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا ہوگا۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک یہاں رہنے پر مجبور تھیں۔ ان میں صرف روشنا جوان اور خوب صورت تھی اور اس کا تعلق یہاں سے نہیں تھا۔ باقی عورتوں کی نسبت حوصلہ مند بھی تھی۔ حوصلے والی نہ ہوتی تو اتنا خطرہ مول لے کر یہاں تک کیسے آتی؟ اس نے مجھے بتایا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے یہاں دو آدمی آئے تھے تو میں چھپ گئی تھی۔ وہ ان عورتوں کو دیکھ کر چلے گئے۔''

''ہاں ہمیں کچرا قرار دیا تھا۔'' اسی ادھیڑ عمر عورت نے تلخی سے کہا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' روشنا بولی۔ ''وہ پھر آئے اور مجھے یہاں دیکھ لیا تو......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا مگر مکمل خدشہ اس کے لہجے میں موجود تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

''اب کوئی نہیں آئے گا وہ سب اوپر مصروف ہیں۔''

روشنا آگے آئی۔ ''تم اچھے آدمی ہو مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ جب تک میں یہاں سے نکل نہ جاؤں۔''

''تم میرا حلیہ دیکھ رہی ہو۔ موت کتنی ہی بار میرے پاس سے گزری ہے اور آگے بھی گزرتی رہے گی۔ میرے ساتھ رہنے والے اکثر لوگ مارے جاتے ہیں۔ تم یہیں رہو اور تمہیں ڈر کس بات کا ہے؟'' آخری جملہ میں نے بے ساختہ کہا تھا حالانکہ میرا وہ مقصد نہیں تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اس نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

''ہاں مجھے کس بات کا ڈر ہے، میرے پاس کھونے کو ہے ہی کیا؟''

''معاف کرنا میرا یہ مقصد نہیں تھا اور نہ ہی یہ وقت جذباتی ہونے کا ہے، صرف اپنی جان بچانے کا سوچو۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''دروازہ اندر سے بند کر لو۔''

میں کوٹھری سے نکلا اور کچن کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے وہاں بڑے سائز کے کئی فریج دکھائی دیے میں نے ایک چھوٹے فریج کا دروازہ کھولا تو اس میں منرل واٹر اور سوفٹ ڈرنکس سے زیادہ ہارڈ ڈرنکس بھری ہوئی تھیں۔ میں نے لاحول پڑھی اور تلاش کے بعد ایک سوفٹ ڈرنک ٹن مل گیا اور میں نے اسے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ اتنی قتل و غارت گری کرنے اور دیکھنے کے بعد دماغ گرم ہونا لازمی تھا اور مجھے کسی یخ بستہ مشروب کی ضرورت تھی۔ اس ٹن نے مجھے کسی قدر ٹھنڈا کر دیا تھا۔ سیڑھیوں کی طرف سے آہٹ ہوئی اور گل جی دو آدمیوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس نے طنزیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''کیا بات ہے سر جی تم تو یہیں کے ہو کر رہ گئے۔''

''اوپر کیا پوزیشن ہے؟'' میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔ اس نے شانے اچکائے۔

''کوئی پوزیشن نہیں ہے سر جی۔''

وہ عام قسم کے مجرم تھے جو معمولی ذہنی سطح کے حامل تھے اور جانوروں کی طرح ری ایکٹ کرتے تھے۔ وہ کسی سچویشن میں اپنی ذہانت استعمال کرنے کے قابل نہیں تھے۔ میں نے دیکھا کہ مار دھاڑ بند ہونے کے بعد وہ بے پروائی سے بکھرے ہوئے تھے اور ان کی چوکسی ختم ہوگئی تھی ایسے میں اگر اچانک کسی طرف سے مرشد کے آدمی آجاتے تو انہیں اپنا دفاع کرنے میں بھی کچھ وقت لگتا۔ میں نے ان سے کہا۔ ''تم نیچے کیوں آئے ہو، ابھی لڑائی ختم نہیں ہوئی ہے۔''

''ہمارے لیے تو ختم ہوگئی ہے۔'' گل جی نے

کہا۔ ’’نیچے اس لیے آئے ہیں کہ ذرا موج مستی کرلیں۔‘‘

’’موج مستی بعد میں کرلینا اگر بچ گئے تو۔‘‘ میں نے طنز کیا۔ ’’تمہارے گرو نے تمہیں مرنے کے لیے کرائے پر لیا ہے۔‘‘

’’ہوسکتا ہے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’آؤ میرے ساتھ۔‘‘ میں نے اوپر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

’’میں نے کہا نا ہم ذرا موج مستی کرنے آئے ہیں آپ جاؤ... ہم آتے ہیں۔‘‘ گل جی نے ٹھہرے لہجے میں کہا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ یقیناً عورتوں کے چکر میں نیچے آئے تھے۔ وہ اسی درگاہ میں رہتے تھے اور انہیں یہاں موجود عورتوں کے بارے میں علم تھا۔ گل جی میری طرف متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اسے خیال ہو کہ میں اسے منع کروں گا اور پھر اس سے الجھوں گا مگر میں نے سر ہلایا اور خاموشی سے اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے فی الحال نہ الجھنے والی حکمت عملی اپنائی تھی۔ جب دشمن توقع کررہا ہو تو اس سے محاذ آرائی سے گریز کرنا چاہیے۔ وار اس وقت کرو جب وہ اس کی توقع نہ کررہا ہو۔ میں پہلے اوپر والوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تو گل جی کے تقریباً سارے آدمی درگاہ والے ہال میں آچکے تھے۔ ان کی تعداد چار تھی۔ میں نے انہیں گھورا۔

’’تم لوگ یہاں کیا کررہے ہو؟‘‘

’’تو کیا کریں جی کرنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔‘‘ ایک کسمسا کر بولا۔

’’ابھی یہاں مرشد کے آدمی موجود ہیں۔ تم میں سے ایک سامنے رہے اور دو پیچھے جائیں ایک اسی جگہ رہے گا۔‘‘ میں نے ان کو بہ ظاہر کام بانٹا لیکن درحقیقت انہیں بانٹ دیا تھا۔ وہ جانا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ موج مستی میں اپنی باری کا انتظار کررہے تھے مگر میں نے انہیں یقین دلایا کہ جب ان کی باری آئے گی تو انہیں اجازت ملے گی اور تب تک کے لیے وہ باہر رہیں۔ بادل ناخواستہ وہ حرکت میں آئے اور باہر نکل گئے۔ میں نے ملنگ کا معائنہ کیا وہ بے ہوش ہوگیا تھا مگر فی الحال اس کی زندگی کو خطرہ نہیں تھا خون بھی رک گیا تھا۔ اگر وہ بچ جاتا تو اسے آنے والی زندگی میں خاصی محرومیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ اب ہال میں میرے ساتھ صرف ایک آدمی رہ گیا تھا۔ بہ ظاہر وہ ٹہل رہا تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہو۔ شاید گل جی نے اسے کوئی ہدایت کی تھی۔ میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا تھا

حضرت خالدؓ بن ولید عرب کے مشہور قبیلہ بنی مخزوم سے تھے۔ اس قبیلے کے افراد عرب میں خاص درجہ رکھتے تھے۔ نسلوں سے قریش کی سپہ سالاری کا عہدہ اسی خاندان میں تھا۔ آپؓ کے والد کا نام عبدالشمس ابولید تھا جو مکہ کے بڑے بارسوخ شخص تھے۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے ایسے ماحول میں تربیت پائی جہاں شہ سواری اور تلوار چلانے کے داؤ گھات کے سوا اور کسی چیز کا ذکر کم ہی ہوتا تھا۔ وہ بچپن ہی سے نہایت پھرتیلے اور نڈر تھے۔ وہ جب ذرا بڑے ہوئے تو مکہ کے منتخب جوانوں میں شمار ہونے لگے اور جب عملی زندگی میں قدم رکھا... تو آپ کا شمار دنیا کے بڑے بڑے جرنیلوں میں ہونے لگا۔ آپؓ نے اپنی زندگی میں کوئی ایک سو کے قریب جنگوں میں حصہ لیا جن میں ان کی فوج دشمن کی فوج کے مقابلے میں بہت کم ہوتی تھی۔ آپؓ نے ہمیشہ اپنے عہد کا پاس کیا۔ جو کچھ کہا اس پر عمل کرکے دکھایا۔ کیا مجال کسی کام میں بھی ذرا سی کوتاہی ہوجائے۔ ان کے سپاہی ان پر جان چھڑکتے تھے۔ جس جنگ میں وہ شرکت کرتے اس کے متعلق پہلے ہی سے یہ فرض کرلیا جاتا کہ اس میں فتح حاصل ہوگی۔

مرسلہ: شاہد جہانگیر شاہد۔ پشاور

تخت نشین ہونے کے بعد جہانگیر نے جو حکم سب سے پہلے جاری کیا وہ زنجیر عدل کا نصب کرنا تھا کہ اگر کارکنان عدالت، ستم رسیدوں اور مظلوموں سے انصاف میں تغافل برتیں تو مظلوم اور فریادی اس زنجیر عدل تک اپنے آپ کو پہنچا کر اسے ہلائیں تاکہ اس کی آواز سے مجھے آگاہی ہو۔ اس زنجیر کی وضع اور ساخت یہ تھی کہ ایک زنجیر خالص سونے کی بنائی جائے جس کا طول تیس گز ہو اور اس میں ساٹھ گھنٹیاں لگی ہوئی ہوں۔ اس کا وزن چار من ہندوستانی ہو۔ جو بتیس من عراقی کے برابر ہوتا ہے۔ اس کا ایک سرا قلعہ آگرہ کے شاہ برج کے کنگرے میں ہو اور دوسرا سرا دریائے جمنا کے کنارے سنگ میل میں جو پہلے سے گڑا ہوا ہے اس میں باندھیں۔

اقتباس: تزک جہانگیری

انتخاب: شاہد جہانگیر شاہد۔ پشاور

کہ اس نے عقب سے کہا۔

''آپ کہاں جا رہے ہو؟''

میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور سخت لہجے میں بولا۔ ''انچارج میں ہوں یا تم، جو مجھ سے سوال کر رہے ہو؟''

''وہ میں یہاں اکیلا رہ جاؤں گا۔''

''تو تمہیں کوئی کھا نہیں جائے گا تمہارے تین ساتھی یہیں موجود ہیں۔'' میں نے کہا اور سیڑھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے رائفل تھام لی اگرچہ اس کی نال نیچے کی طرف تھی مگر اس کے ہاتھوں کا تناؤ بتا رہا تھا کہ وہ اسے استعمال کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میں کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا اور میں نے سیڑھی پر پہلا قدم رکھا تھا کہ اس نے کہا۔

''آپ نیچے نہیں جا سکتے جی۔''

میں نے مصنوعی حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب؟ کیوں نہیں جا سکتا؟''

''گل جی نے کہا ہے کہ آپ یہاں ہمارے ساتھ رہیں گے۔''

''اوہ اچھا یہ گل جی کا حکم ہے۔'' میں نے نارمل انداز میں کہا اور پلٹ کر واپس آ گیا۔ اس نے سکون کا سانس لیا اور رائفل پر اس کے ہاتھوں کی گرفت نرم پڑ گئی تھی۔ میرے رویے سے وہ دھوکا کھا گیا۔ میں نے پاس جاتے ہی اچانک اس کی گردن پر سامنے سے ہاتھ مارا۔ اس کی سانس رک گئی تھی اور ضرب نے اسے مفلوج کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی قابل ہوتا میں نے رائفل کا دستہ اس کے سر پر رسید کیا اور اس کے گرتے ہی اسے کھینچ کر مزار کے احاطے میں ڈال دیا جہاں وہ اپنے ساتھیوں کی نظروں سے اوجھل تھا جب تک کہ وہ خاص طور سے آ کر یہاں نہ دیکھتے اور پھر میں پھرتی سے نیچے کی طرف بڑھا دبے قدموں سیڑھیاں اتر کر تہ خانے میں آیا تو دور سے عورتوں کے چلانے کی آواز آئی۔ میرا خون کھولنے لگا تھا۔ لیکن جب میں کچن کے پاس پہنچا تو میں نے راہداری میں گل جی کے ایک ساتھی کو چوکس پایا اس نے مجھے دیکھتے ہی رائفل کا رخ میری طرف کر دیا اور غرا کر بولا۔

''یہاں کیوں آئے ہو واپس جاؤ۔''

''یہ عورتیں کیوں چلا رہی ہیں۔''

''عورتوں کا کام ہی چلانا ہے۔ تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا ہے؟''

''اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کروں تو تم کیا کرو گے؟''

''میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے میں واپس جا رہا ہوں۔''

میں پلٹا اور کچن کے پاس سے گزرتے ہوئے جیسے ہی دیوار کی آڑ میں آیا بیلٹ سے پستول نکال کر اس پر لگاتار فائر کیے۔ اس نے شاید سوچا بھی نہیں تھا کہ میں ایسی حرکت کر جاؤں گا اس لیے دوسری گولی نے اس کے سر میں سوراخ کیا تو گرنے سے پہلے وہ مر چکا تھا۔ بلٹ پروف کی وجہ سے میں نے جان کر اس کے سر کا نشانہ لیا تھا۔ فائرنگ کا شور گونجا تو مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ مجھے بے آواز رائفل استعمال کرنی چاہیے تھی مگر جلد بازی میں پستول استعمال کر بیٹھا اور اب اوپر نیچے سب کو پتا چل گیا تھا فوراً ہی عورتوں کے چلانے کی آواز تھم گئی اور گل جی نے چلا کر قادرے سے پوچھا۔ ''قادرے کیا ہوا ہے؟''

مگر قادرے اوپر جا چکا تھا۔ کچھ دیر جاتی تھی کہ جب اوپر والے آ جاتے اور گل جی اپنے دوسرے ساتھی سمیت مجھے اس جگہ گھیر لیتا۔ ابتدائی غلطی کے بعد میں اس کے مداوے کا سوچ رہا تھا۔ پھر میں حرکت میں آیا اور برتن مانجھنے والی موٹی تار سے ایک ٹکڑا نکال کر نزدیکی ساکٹ میں داخل کیا۔ سوئچ آن کرتے ہی شعلہ لپکا اور اس جگہ کی بجلی غائب ہو گئی۔ اپنی کارکردگی پر سر ہلاتے ہوئے میں نے نائٹ ویژن آنکھوں پر کی اور آنے والوں کے استقبال کے لیے تیار ہو گیا۔ اب گل جی کے ساتھی اور اوپر والے بھی چلا چلا کر پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا ہے؟ اپنی جانور فطرت کے ساتھ انہوں نے خطرہ بھانپ لیا تھا۔ قادرے کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے کا مطلب واضح تھا کہ قادرے جواب دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے ایک مناسب جگہ پوزیشن سنبھال لی جہاں سے میں بیک وقت اوپر اور نیچے والوں کو آتے دیکھ سکتا تھا۔ مگر کئی منٹ گزرنے کے باوجود کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ روشنی بند کر کے میں نے ان کے لیے ٹریپ تیار کر لیا تھا۔ وہ اس ٹریپ میں آنے کو تیار نہیں تھے۔

مجھے ان کے ساتھ ساتھ عورتوں کی فکر بھی تھی۔ ان کی آوازیں بند ہو گئی تھیں لیکن وہ گل جی اور اس کے ساتھی کے قبضے میں تھیں۔ میرے کان آہٹوں پر مرکوز تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ سیڑھیوں سے کوئی اتر کر نیچے تک آیا تھا مگر وہ سامنے

نہیں آیا تھا۔ وہ خاموشی سے مجھے گھیر رہے تھے۔ درگاہ مرشد یہ میں میرے لیے ایک اور صبر آزما جنگ شروع ہو گئی تھی۔ میرا مقابلہ پانچ چھٹے ہوئے بدمعاشوں سے تھا اور میں اپنے اعصاب پر قابو رکھ کر ہی اس جنگ میں کامیابی حاصل کر سکتا تھا۔ اچانک کسی عورت کے چلّانے کی آواز آئی۔ اس کے انداز میں اذیت نمایاں تھی۔ پھر گل جی بولا۔ ”شہباز تم میری آواز سن رہے ہو میں نے اس عورت کی گردن پر چاقو رکھا ہوا ہے اگر تم سامنے نہیں آئے تو میں اس کا گلا کاٹ دوں گا۔“

میرے کان گل جی کی طرف مگر اب آنکھیں سیڑھیوں سے آنے والے راستے پر لگی تھیں مجھے لگا جیسے گل جی نے کوئی پلان بنایا ہے اور اب اس پر عمل کیا جا رہا تھا اتنا تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ میں کسی عورت کی خاطر اس کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔ جب کہ پہلے ہی ان عورتوں کی زندگی کا بھروسا نہیں تھا۔ گل جی اور اس کے ساتھی ان کی آبروریزی کے بعد انہیں قتل بھی کر سکتے تھے اور شاید وہ اپنا گھناؤنا جرم چھپانے کے لیے ایسا ہی کرتے۔ میرا اندازہ درست نکلا جب اوپر والوں میں سے ایک نمودار ہوا اس نے رائفل سامنے کی ہوئی تھی اور بہت چوکس تھا مگر اس کی چوکسی اس گولی سے نہ بچا سکی جو میں نے اس کے سر کا نشانہ لے کر چلائی تھی وہ اس کے حلق میں اتر گئی۔ میں بروقت پیچھے ہوا تھا کیونکہ رائفل کی نال پر اس کی انگلی بے ساختہ دب گئی اور دبی آواز میں فائرنگ ہونے لگی۔ میں جس ستون کے پیچھے تھا کئی گولیاں آکر اس پر لگیں۔ گولیوں کے ساتھ ساتھ اس کے خرخرانے کی آوازیں بھی آرہی تھیں اور پھر دونوں آوازیں ایک ساتھ ختم ہو گئیں۔

میں نے جھانک کر دیکھا تو وہ چت پڑا ہوا تھا اور اس کے گردن کے سوراخ سے رہ رہ کر خون ابل رہا تھا۔ اگر وہ مرا نہیں تھا تب بھی خون سے محرومی نے اس کے دماغ کو ناکارہ کر دیا تھا۔ میرا ایک دشمن کم ہو گیا تھا مگر ابھی چار باقی تھے۔ مجھے پہلے بھی اس قسم کی خوش فہمی نہیں تھی کہ یہ لوگ نائٹ ویژن سے محروم تھے۔ ان کے پاس نائٹ ویژن کی موجودگی عین ممکن تھی اور یہ اس مشن کا تقاضہ بھی تھا۔ مرنے والے نے تصدیق کر دی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں پر نائٹ ویژن عینک موجود تھی اور اگر میں بے احتیاطی سے کسی کھلی جگہ ہوتا تو وہ آتے ہی مجھے دیکھ لیتا۔ آڑ میں ہونا مجھے بچا گیا تھا۔ ستون خاصا بڑا تھا کیونکہ ان ہی ستونوں پر درگاہ کی وزنی عمارت کا بوجھ تھا اس لیے ان کا سائز بڑا رکھا گیا تھا۔

واصف علی واصف فرماتے ہیں کہ پاکستان نور ہے اور نور کو زوال نہیں۔ پاکستان میں ایک عظیم روحانی دور آنے والا ہے۔ اسلامی ریاست کا قیام منشائے اسلام ہے۔ حسن محمود نے کتاب ”وفا کا کعبہ“ میں دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ پاکستان کا روحانی اور جسمانی ظہور ہوا ہے اور کتنے ہی بزرگ، ولی اللہ یہ بشارتیں دے رہے ہیں کہ پاکستان امر الٰہی ہے اور دنیائے اسلام کا مرکز بننے والا ہے۔ اسی لیے پوری دنیا کا کفر پاکستان پر ٹوٹ پڑا ہے مگر نقصان پہنچانے والے اس بات سے بے خبر ہیں کہ پاکستان حضرت صالحؑ کی اونٹنی کی طرح اللہ کا معجزہ ہے۔ حضرت صالحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ تم نے اتنا حسد کیا کہ ایک اونٹنی کا پانی پینا گوارا نہ کیا۔ اب اللہ کی طرف سے تین روز بعد عذاب آنے والا ہے۔ اگلے تین دن بعد مالک کی طرف سے آگ آئے گی جس کی تین نشانیاں ہیں، تم سب کے چہروں کا رنگ متغیر ہو جائے گا، پہلے دن زرد، دوسرے دن سرخ اور تیسرے دن سیاہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد اللہ کا عذاب آئے۔ اگر اس دھمکی کی علامت چاہتے ہو تو ابھی جا کر دیکھو اونٹنی کا بچہ پہاڑ کی طرف بھاگا جا رہا ہے اگر اس کو پکڑ سکو تو یہ عذاب سے بچنے کی ایک تدبیر ہے ورنہ اُمید کا پرندہ جال سے نکل چکا ہے۔ جب انہوں نے یہ سنا تو کتے کی طرح بھاگے مگر کوئی شخص بچے تک نہ پہنچ سکا۔ پاک روح جسم کی نفرت سے خدا کی طرف بھاگتی ہے۔ یہ اونٹنی کا بچہ کس کی مثال ہے؟ یہ اس دل کی مثال ہے جس کو تم نے نقصان پہنچایا۔ اگر دل صاف ہو جائے تو عذاب چھٹ جائے گا ورنہ ناامید اور حسرت زدہ رہو گے۔ حضرت صالحؑ کا حکم صحیح ثابت ہوا۔ مہلت ختم ہوئی۔ پہلے ان کے چہرے زرد ہوئے وہ ناامیدی سے ٹھنڈی آہیں بھرنے لگے۔ اگلے دن سرخ ہوا، اُمید اور توبہ کا وقت ختم ہو گیا۔ تیسرے دن سیاہ ہوا اور وہ اونٹنی کی طرح گھٹنوں کے بل آئے قہر کی چوٹ کے منتظر ہو گئے، قہر ٹوٹا اور شہر نیست و نابود ہو گیا۔

پاکستان اللہ کا نور ہے اور حضرت صالحؑ کی اونٹنی ہے۔ یہ معجزہ اس لیے عمل میں آیا ہے کہ ظالموں کو سزا دی جا سکے جو لوگ اور ملک اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ رہے ہیں اور اس کا پانی بند کر رہے ہیں۔ اس کو حقیر سمجھ رہے ہیں۔ اللہ کا قہر ان پر ٹوٹے گا دیکھنا یہ ہے وہ قہر کس شکل میں آسمان سے ظاہر ہوتا ہے۔ اونٹنی کا بچہ پہاڑ کی طرف بھاگ رہا ہے پکڑ سکتے ہو تو پکڑ لو۔

اقتباس: زاویہ..... از اشفاق احمد

مرسلہ: عائشہ انصاری۔ لاہور

اگر یہ چھوٹا ہوتا تو اس کے عقب سے میرے جسم کی حرارت جھلک سکتی تھی اور میں آنے والے کو آڑ میں ہونے کے باوجود دکھائی دیتا۔

میں فکرمند ہو گیا مجھے نائٹ ویژن کا توڑ کرنا تھا۔ کچن میں دیواروں پر ایمرجنسی لائٹس لگی تھیں میں نے ان کا معائنہ کیا۔ یہ مینول تھیں اور تار کی مدد سے بجلی کے نظام سے منسلک تھیں۔ آٹومیٹک حالت میں یہ لائٹ جاتے ہی آن ہو جاتی تھیں مگر اس وقت ان کا سسٹم آف تھا۔ یہ طاقتور ایل ای ڈی لائٹس تھیں اور ایک لائٹ میں کوئی تیس پینتیس ایل ای ڈیز لگی تھیں۔ یہ نہایت جدید قسم کی ایمرجنسی لائٹس تھیں جو ریموٹ سے بھی آن آف کی جاسکتی تھیں۔ خوش قسمتی سے ان کے ریموٹ ان کے ساتھ ہی موجود تھے۔ میں نے کچن کی دونوں لائٹس اتارلیں اور آڑ میں لاکر باری باری انہیں اپنے جسم سے لگا کر آن کر کے دیکھا۔ یہ پوری طرح چارج تھیں اور ان کی روشنی خاصی تیز تھی۔ جسم سے لگا کر اس لیے چیک کیا کہ نائٹ ویژن سے ہلکی سی روشنی بھی ان لوگوں کو فوراً نظر آجاتی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ انہیں علم ہو کہ میرے پاس روشنی کا ذریعہ آگیا تھا۔ میں نے انہیں پاس رکھا اور دوبارہ سکون سے بیٹھ کر مزید کسی وقوعے کا انتظار کرنے لگا۔

گل جی نے اپنی دھمکی کا ردِعمل اپنے ساتھی کی خرخراہٹوں کی صورت میں سن لیا تھا اس لیے اس نے دوبارہ دھمکی دینے کی حماقت نہیں کی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی پلاننگ سے ظاہر تھا کہ ان لوگوں کے پاس ریڈیو تھے اور ان کا آپس میں رابطہ تھا تبھی گل جی نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔ اسے اپنی جان عزیز تھی اس لیے اس نے اپنے ساتھیوں کو استعمال کیا تھا۔ فاضلی نے مکاری سے کام لیتے ہوئے مجھے نائٹ ویژن سے محروم رکھا تھا مگر خدا بھلا کرے باسو کا جس نے مجھے نائٹ ویژن دے دی تھی۔ اب میں اس سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر فاضلی نہیں چاہتا تھا کہ مجھے نائٹ ویژن ملے تو باسو نے مجھے کیسے دی تھی۔ کیا اسے ڈیوڈ شا کی طرف سے کوئی ہدایت تھی کہ وہ بہ وقت ضرورت میری مدد کرے۔ تبھی وہ مجھے بچانے کے لیے جن کی طرح نمودار ہوا تھا اور اس نے مجھے نائٹ ویژن بھی دی تھی۔

اوپر والوں کو اپنے ایک ساتھی کی موت سے عبرت حاصل ہوئی تھی اور اب ان میں سے کوئی آگے آنے کو تیار نہیں تھا جہاں سے براہِ راست میرے نشانے پر آجاتا۔ اس لیے اب میرے پاس موقع تھا میں دبے قدموں اپنی جگہ سے نکلا اور ذرا آگے تک آیا۔ سیڑھیوں کے پاس مجھے حرارت کی جھلک دکھائی دی وہ سیڑھی پر موجود تھے۔ وہاں سے میں کوٹھری کی طرف جانے والی راہداری تک آیا۔ گل جی اور اس کے ساتھی کوٹھری میں تھے اس کا دروازہ ذرا سا کھلا تھا اور اندر سے حرارت کی لہریں باہر آرہی تھیں۔ دونوں جگہ زندہ انسان موجود تھے۔ مجھے ان سے نمٹنا تھا۔ رات کے تین بج چکے تھے اور معرکہ شروع ہوئے تین گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ پولیس اور سرکاری حکام بدستور عنقا تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ فاضلی نے اب تک کوٹھی پر قبضہ کر لیا ہوگا یا مرشد کے آدمی بدستور مزاحمت کر رہے ہوں گے؟ دونوں صورتوں میں میرا جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانا مناسب تھا۔ کلائی پر موجود کڑے کے ہوتے ہوئے ایک ہی طریقہ تھا کہ میں کسی طرح فاضلی پر قابو پالوں یا اس .... انگوٹھی سے نجات حاصل کرلوں۔

لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ میں حرکت میں آؤں یوں بیٹھے رہنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ یہاں سے جانے کے لیے مجھے دو افراد سے نمٹنا تھا اور یہ اتنا مشکل نہیں تھا۔ مشکل یہ تھی کہ پیچھے وہ نو عدد عورتیں پھر گل جی اور اس کے ساتھی کے رحم و کرم پر رہ جاتیں اور وہ رحم نام کی چیز سے نا آشنا تھے۔ وہ انہیں بے آبرو کرتے اور پھر مار دیتے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے فی الحال انہیں اپنے ذہن سے جھٹکنے کا فیصلہ کیا۔ میں آڑ سے نکل کر بلند آہنگ چاپ کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ وہاں موجود دونوں افراد نے یقیناً میری آمد کی اطلاع سن لی تھی۔ وہ الرٹ ہو گئے مگر انہوں نے سوچا نہیں تھا جو میں کرنے جا رہا تھا کچن کی دیوار کی آڑ سے نکلنے سے پہلے میں نے ریموٹ کا بٹن دبایا اور سیڑھیوں کے رخ پر رکھی ہوئی ایمرجنسی لائٹ آن ہو گئی۔ میں نے نائٹ ویژن اتاری اور رائفل سیدھی کیے آگے بڑھا۔ ان کی بوکھلائی آوازیں مجھ تک آرہی تھیں۔

تیز روشنی نے نائٹ ویژن کے ہوتے ہوئے ان کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا تھا اور فی الحال انہیں کچھ نظر نہیں آرہا تھا جب تک وہ اپنی نائٹ ویژن اتارتے میں ان کے سروں پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے ہاتھوں اور پیروں کو نشانہ بناتے ہوئے برسٹ مارا اور وہ سیڑھیوں پر گر کر چیخنے دھاڑنے لگے تھے۔ انہوں نے نائٹ ویژن اتار دی تھی اس لیے میں نے ریموٹ سے ایمرجنسی لائٹ آف کر کے نائٹ ویژن پہن لی اور پھر ان کے ہتھیار ان سے دور کر دیے۔ ایک کے دونوں پاؤں چھلنی ہو گئے تھے اور دوسرے کا ایک پاؤں اور

ایک ہاتھ شدید زخمی تھا۔ وہ شدید تکلیف میں تھے اور میں نے دونوں کے سروں میں ایک ایک گولی مار کر ان کو اس تکلیف سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دی۔ ان کی چیخ و پکار رکی تو عقب سے عورتوں کے چلّانے کی آواز آئی۔ ان کی چیخوں میں خوف اور ہسٹریا کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ تکلیف میں نہیں تھیں۔ شاید گل جی اور اس کا ساتھی انہیں ڈرا دھمکا رہے تھے۔ اچانک رائفل کے برسٹ کی گنگناہٹ سنائی دی اور اس بار چیخنے والی عورتوں کی آوازوں میں کرب شامل تھا۔ گل جی یا اس کے ساتھی نے ان نہتی عورتوں پر فائر کھولا تھا۔

میرے اندر تپش سی بڑھنے لگی تھی۔ یہ گھٹیا لوگ ان بے بس عورتوں پر ظلم کر رہے تھے جو اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتی تھیں اور ان کا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر میں جھٹکے سے مڑا۔ ایمرجنسی لائٹ اٹھائی اور راہداری کی طرف بڑھا جس کے آخر میں کوٹھری تھی۔ میں نے دیوار سے جھانک کر دیکھا تو کوٹھری کا دروازہ بند تھا۔ میں دبے قدموں آگے بڑھا۔ یہ ٹھوس لکڑی کا بنا ہوا دروازہ تھا جس کے اندر باہر کنڈیاں تھیں اور کوئی ایسا رخنہ نہیں تھا جس سے باہر جھانکا جا سکتا۔ جیسے جیسے میں کوٹھری کے پاس جا رہا تھا عورتوں کے رونے اور سسکنے کی آوازیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ جو زخمی تھیں وہ سسک رہی تھیں اور جو بچ گئی تھیں وہ خوف سے رو رہی تھیں۔ گل جی انہیں دبی زبان میں ڈانٹ پھٹکار رہا تھا۔ ناقابلِ اشاعت الفاظ کے ساتھ وہ انہیں دھمکا بھی رہا تھا پھر اس نے اپنے ساتھی کو نوازہ جو باہر نظر رکھنے کی بجائے ان حالات میں بھی عورتوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ دروازے کی طرف آیا تھا کہ میں تیار ہو گیا۔

جیسے ہی اس نے دروازہ ذرا سا کھولا میں نے اس کے عین منہ پر ایمرجنسی لائٹ آن کی۔ روشنی براہِ راست اس کی آنکھوں میں گئی اور اس نے دھاڑ ماری تھی مگر یہ دھاڑ پستول کی گرج میں دب کر رہ گئی تھی۔ میں نے اس کے کھلے منہ میں گولی ماری تھی۔ وہ جھٹکے سے پیچھے گیا اور میں بروقت پیچھے ہوا تھا کیونکہ گل جی نے اندر سے برسٹ مارا اور گولیاں دروازے میں سوراخ کرتی گزر گئی تھیں لیکن میں جوابی برسٹ نہیں مار سکتا تھا۔ اندر عورتیں بھری ہوئی تھیں اور یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں ان کو بچا کر صرف گل جی کو شوٹ کر سکتا۔ عورتوں نے پھر ہسٹریائی انداز میں چلّانا شروع کر دیا تھا اور ان کے شور میں گل جی کی آواز دب گئی تھی وہ کچھ کہہ رہا تھا شاید مجھے دھمکی دے رہا تھا مگر اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ گل جی کے آدمی کو مارتے ہی میں نے ایمرجنسی لائٹ آف کر دی تھی اس وقت میں اسے بٹن سے آن آف کر رہا تھا۔ نائٹ ویژن آنکھوں پر سیٹ کر لی۔

دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ اندر کر کے اوپر کی طرف پستول کر کے فائر کیے۔ اس محدود جگہ گولی کی آواز بہت زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ عورتیں جو کسی قدر چپ ہو گئی تھیں فائرنگ ہوتے ہی انہوں نے ایک بار پھر چیخ و پکار کر کے کمرے کی چھت سر پر اٹھا لی تھی۔ میں گل جی کا صبر آزما رہا تھا اور اس کا صبر جواب دے گیا۔ اس نے جواب میں دروازے کی طرف پورا برسٹ چلایا۔ گولیاں دروازے سے گزر رہی تھیں لیکن میں دیوار کی آڑ میں محفوظ تھا۔ پھر اس کی رائفل خالی ہو گئی اور گنگناہٹ کی جگہ خالی کلک کی آواز آنے لگی۔ میں اسی موقع کا منتظر تھا۔ میں نے نائٹ ویژن اتاری اور دروازے کو لات مارتے ہوئے ایمرجنسی لائٹ آن کر لی۔ میں نے خطرہ مول لیا تھا کیونکہ عین ممکن تھا کہ گل جی نے بھی نائٹ ویژن اتاری ہوئی ہو اور ایمرجنسی لائٹ اس کے لیے لائٹ ٹاور کا کام کرتی اور میں اس کے لیے آسان ہدف ثابت ہوتا مگر ایمرجنسی لائٹ بند ہونے کے بعد اس نے نائٹ ویژن لگائی تھی۔ اس لیے روشنی اس کے حق میں مضر ثابت ہوئی اس سے بچنے کے لیے اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور اس کا دوسرا ہاتھ پستول نکال رہا تھا۔

لیکن اس سے پہلے وہ پستول استعمال کرتا میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کھینچا اور اسے پوری قوت سے ایک طرف دیوار پر دے مارا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے بے اختیار گیا اور دیوار سے ٹکراتے ہوئے اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ عورتیں ایک کونے میں دبکی ہوئی تھیں اور ان میں سے دو فرش پر بے سدھ پڑی تھیں ان کے جسموں سے خون نکل کر فرش پر پھیل رہا تھا ایک کے سینے میں کئی گولیاں لگی تھیں اور دوسری کی کنپٹی میں سوراخ تھا۔ دونوں مر چکی تھیں۔ اشتعال کے عالم میں میں نے اٹھنے کی کوشش کرنے والے گل جی کو اٹھایا اور اس بار اسے دروازے سے باہر پھینک دیا۔ اس کا پستول اور رائفل وہیں گر گئی تھی۔ میں باہر آیا تو گل جی اوندھے منہ ساکت پڑا تھا لیکن میں اس کی مکاری میں آنے والا نہیں تھا۔ وہ اتنا غیرت مند کہاں سے ہو گیا کہ دو چوٹیں کھا کر بے ہوش ہو جاتا۔ میں نے اسے پاؤں سے ٹھوکر ماری تو اس نے تڑپ کر ہاتھ چلایا اور میں پیچھے ہو گیا اس کے ہاتھ میں دبا خنجر میری پنڈلی کو تقریباً چھوتا ہوا گزرا

تھا۔ اس کا ہاتھ آگے نکلا تو میرا پیچھے ہونے والا پاؤں اسپرنگ کی طرف واپس آیا اور اس نے عقب سے کہنی پر بھرپور ٹھوکر ماری۔ کہنی چٹخ گئی۔ گل جی نے بلبلا کر دوسرے ہاتھ سے کہنی تھامی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ میں نے خنجر اٹھا کر اس کی ران میں گھونپ دیا۔ اس نے دل خراش چیخ ماری۔

ایمرجنسی لائٹ کی روشنی باہر تک آرہی تھی۔ نائٹ ویژن کی ضرورت نہیں تھی میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور وہ واویلا مچاتا رہا۔ یہ سورما کچھ دیر پہلے کسی عورت پر اپنی مردانگی آزما رہا تھا۔ میں نے کھینچ کر خنجر نکالا اور اس کی دوسری ران میں گھونپ دیا۔ اس وقت میرے دل میں اس کے لیے اتنا ہی رحم تھا جتنا کسی قسائی کے دل میں بکری کے لیے ہو سکتا ہے۔ بلکہ میں نے غلط کہا قسائی پروفیشنل ہوتا ہے۔ میں مجسم انتقام بنا ہوا تھا۔ راہداری میں اس کا خون پھیل رہا تھا۔ خنجر نے اس کی شریان کاٹ دی تھی اور خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ جب اس کا واویلا کم ہوا بلکہ اس میں چلانے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تو میں نے پوچھا۔ ”کس کے کہنے پر تم نے یہ سب کیا؟“

”فاضلی کے حکم پر۔“ اس نے سسک کر جواب دیا۔

”میرے بارے میں اس نے کیا کہا تھا؟“

”یہی...... اگر تم...... مزاحمت کرو تو...... تمہیں مار دیا جائے۔“ اس نے کہا اور منت سماجت کرنے لگا کہ میں اسے بخش دوں۔ مجھے یہی توقع تھی یہ حکم کے غلام تھے اپنے طور پر ایسا قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔ فاضلی کی نیت پر مجھے شک ہی شک تھا اور اب یہ شک یقین میں بدل گیا تھا کہ وہ مجھے اس جگہ سے زندہ جانے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھا قطع نظر اس کے کہ وہ ڈیوڈ شا سے کچھ وعدے وعید کر کے آیا ہوگا۔ وہ مرشد کی اولاد تھا اور اس نے وہی کیا تھا جو مرشد نے کیا تھا یعنی ڈیوڈ شا کو جوتے کی نوک پر رکھا تھا۔ میں نے گل جی کی تلاشی لی اس کے پاس مزید کوئی ہتھیار نہیں تھا اس سے مطمئن ہو کر میں اندر آیا۔ عورتیں اب مرنے والیوں کا بین کر رہی تھیں۔ میں نے روشنا کو تلاش کیا تو وہ عورتوں کے پیچھے دبی ہوئی نظر آئی۔ یہاں سے صرف اس کے بال دکھائی دے رہے تھے جو بری طرح بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”تم ٹھیک ہو۔“

اس پر وہ یوں سامنے آئی کہ میں اپنے سوال پر شرمندہ ہو گیا۔ اس کا اوپری لباس مکمل طور پر غائب تھا اور اس نے ہاتھوں سے ستر پوشی کی ہوئی تھی۔ میں نے نظریں جھکاتے ہوئے ایک مرنے والی عورت کی چادر اس کے سپرد کی۔ ”معاف کرنا مجھے آنے میں دیر ہوئی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے نم لہجے میں کہا۔ ”آپ نے ٹھیک کہا تھا میرے پاس گنوانے کو کچھ نہیں تھا۔“

اس نے چادر لپیٹ لی تھی اور میں نے موضوع بدل دیا۔ ”میں نے کہا تھا کہ دروازہ اندر سے بند رکھنا۔“

”اس نے کھول دیا تھا۔“ راشنا نے ایک مرنے والی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ گل جی کو جانتی تھی اور سمجھی کہ وہ مدد کے لیے آیا ہے۔“

”تم نے دیکھ لیا کہ اس نے کیسی مدد کی۔“

عورتوں میں دو زخمی تھیں مگر ان کے زخم جان لیوا نہیں تھے انہوں نے خود پٹی کر لی تھی۔ صورت حال بدل گئی تھی اب مجھے اپنی جان بچانی تھی اور اپنے ساتھ ان عورتوں کی جان بھی بچانی تھی۔ روشنا کے ساتھ جو دوسری عورت گل جی کے ساتھی کی دست درازی کا شکار ہوئی تھی اس کا لباس بھی پھٹ گیا تھا۔ میں نے عورتوں سے پوچھا۔ ”تم لوگ یہاں رہتی ہو تو تمہارے پاس کپڑے ہوں گے۔“

”بالکل ہیں جی۔“ ایک عورت بولی۔

میں نے روشنا سے کہا۔ ”ان کے ساتھ جاؤ اور کپڑے پہن کر آؤ اسے بھی لے جاؤ۔“

دوسری عورت پر سکتہ طاری تھا۔ دو عورتیں اسے سہارا دے کر لے گئیں۔ لاشیں اسی کوٹھری میں چھوڑ کر ہم باہر آئے۔ جب تک روشنا اور دوسری عورت ڈھنگ کا لباس پہن کر آتیں میں سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ وہ اتنی دیر سے بھوکی پیاسی قید تھیں اس لیے باہر آتے ہی پانی پر ٹوٹ پڑی تھیں۔ میں نے روشنا سے کہا۔ ”ان کو تم کنٹرول کرو گی اور جب میں تمہیں باہر نکال دوں تو انہیں ساتھ لے جانا۔“

”میں انہیں کیسے لے جا سکتی ہوں۔“ اس نے ذرا اٹک کر کہا۔ میں اس کی بات سمجھ گیا۔

”اپنا ذکر مت کرنا اور ان عورتوں کو بھی سمجھا دینا۔ ان سے کہنا کہ پولیس کے پاس نہ جائیں اپنے گھروں کو جائیں۔ تم اپنے گھر سے نکلی ہی نہیں۔ باقی تمہارا شوہر سب جانتا ہے۔“

اس کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہوا پھر اس نے سر ہلایا۔ ”میں ایسا ہی کروں گی جی۔“

”میرے ساتھ آؤ لیکن بالکل خاموشی سے۔“

ہم تہہ خانے سے نکل کر اوپر آئے سیڑھیوں پر موجود لاشوں نے عورتوں کو خوفزدہ کر دیا۔ اوپر تباہی کے مناظر اس

سے کہیں زیادہ بھیانک تھے۔ عمارت کے اندر باہر جا بہ جا لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں سات عورتوں کے قافلے کے ہمراہ درگاہ کے سامنے والے حصے سے باہر آیا جہاں نئے سماع ہال کی عمارت پوری طرح شعلوں کی لپیٹ میں آچکی تھی۔ پتا نہیں فاضلی اینڈ کمپنی کو میری بغاوت اور یہاں ہونے والی قتل و غارت گری کا علم تھا یا نہیں مگر ان کی طرف سے مداخلت کے آثار نہیں تھے اگر فاضلی جان بھی گیا تھا تو یہ لوگ اتنے اہم نہیں تھے کہ وہ ان کے لیے کمک روانہ کرتا۔

ویسے بھی اس کے پاس محدود افرادی قوت تھی۔ کوٹھی کی طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم بائیں طرف مڑ گئے۔

نئے سماع ہال اور درگاہ کی عمارت کے درمیان کوئی نہیں تھا اور نہ ہی دائیں طرف کوئی نظر آ رہا تھا۔ ہم عمارت کے ساتھ خالی میدان تک پہنچے۔ میں نے احتیاطاً ہر طرف نظر دوڑائی۔ خوش قسمتی سے یہاں بھی کوئی نہیں تھا اور اس کی وجہ تھی۔ میرے ساتھ آنے والے فاضلی کے تمام کرگے جہنم رسید ہو چکے تھے اور اب یہاں صرف فاضلی کے ساتھ آنے والے بچے تھے اور وہ فاضلی کے ساتھ مرشد کی کوٹھی کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتیں اب تک عمارت کی آڑ میں کھڑی تھیں۔ مطمئن ہو کر میں نے مڑ کر اشارہ کیا اور ہم قطار میں چلتے ہوئے درختوں کے جھنڈ تک پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جھنڈ کے پار دیوار میں شاید ایسا کوئی مقام ہو جہاں سے دیوار عبور کی جا سکے۔ درگاہ کے سامنے والے حصے سے نکلنا آسان نہیں تھا اور شاید ممکن بھی نہیں تھا۔ مگر جب میں اندر جانے لگا تو ایک عورت نے مجھے روک دیا۔

''ادھر نہ جاؤ صاحب۔''

''کیوں ادھر کیا ہے؟''

''ادھر زہریلے سانپ ہوتے ہیں۔'' اس نے انکشاف کیا۔

میں رک گیا۔ ''زہریلے سانپ وہ کیسے؟''

''مرشد عالی نے ادھر زہریلے سانپ چھوڑے ہوئے ہیں۔'' عورت نے انکشاف کیا۔ ''ان کی وجہ سے اس طرف کوئی نہیں جاتا ہے اور اگر کوئی غلطی سے بھی چلا جائے تو اسے یہ سانپ ڈس لیتے ہیں وہ منٹوں میں مرجاتا ہے۔''

میں نے اس طویل جھنڈ کو دیکھا تو درگاہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیوار کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔

اس کی چوڑائی تیس گز سے زیادہ نہیں تھی اور لمبائی کوئی پانچ سو گز تھی۔ فی الحال یہ تفتیش کا موقع نہیں تھا کہ میں مرشد کی اس حرکت کا جواز تلاش کرتا کہ اس نے زہریلے سانپ

کیوں چھوڑے تھے۔ شاید اس لیے وہ خود بھی زہر سے بھرا ہوا تھا اور زہریلے جانوروں کی ہم نشینی پسند کرتا تھا۔ اب اسی طرف سے جانا ممکن نہیں تھا۔ میں وہیں سے درگاہ کے سامنے والے حصے کی طرف مڑ گیا۔ یہاں مکمل تاریکی تھی اور صرف مجھے نظر آ رہا تھا۔ میرے پاس دو ایمرجنسی لائٹس تھیں مگر روشنی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے عورتوں سے کہا۔ ''سب ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیں اور ایک پیچھے سے میری قمیص پکڑ لے۔ خاموشی سے میرے پیچھے آنا ہے۔''

روشنانے میری قمیص پکڑ لی اور باقیوں نے درجہ بہ درجہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا اور ہم قطار میں سفر کرنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ نائٹ ویژن سے سانپ بھی نظر آئے گا۔ مگر ایسا نہیں تھا مجھے خیال نہیں آیا کہ سانپ ٹھنڈے خون والے جانور ہوتے ہیں اور ان کے جسم کا درجہ حرارت وہی ہوتا ہے جو ماحول کا ہوتا ہے اس لیے وہ نائٹ ویژن میں الگ سے نظر نہیں آتے ہیں۔ مگر اللہ نے اس کوبرا کو توفیق دی کہ اس نے ہمیں پاس پا کر ڈسنے کی بجائے پھنکار ماری۔ جواب میں عورتوں نے کورس میں سریلی چیخ ماری اور میں نے بوکھلا کر ایمرجنسی لائٹ روشن کر دی۔ مجھ سے صرف دو گز کے فاصلے پر ایک بڑا کوبرا سانپ تیزی سے درختوں کی طرف رینگ رہا تھا۔ غالباً وہ ہوا خوری کے لیے کھلی جگہ نکل آیا تھا اور ہم اس کے سر پر پہنچ گئے۔ عورتیں واپس بھاگنے پر آمادہ تھیں میں نے بڑی مشکل سے انہیں باز رکھا کہ پیچھے زیادہ زہریلے ناگ تھے۔ جو ان کی عزت آبرو کو ڈسنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا۔ ''ہمیں آگے جانا ہے۔''

''ادھر سانپ ہیں۔'' ایک عورت بولی۔

میں نے سوچا اور حکم دیا۔ ''سب زمین پر زور زور سے پاؤں مار کر چلو۔''

''نہیں اس طرح تو سانپ ہماری طرف آجائیں گے۔'' روشنانے ڈر کر کہا۔

''سانپ اور دوسرے کیڑے مکوڑے انسان سے ڈرتے ہیں۔ تم نے دیکھا یہ کوبرا بھی بھاگ رہا تھا۔ جب تم زور سے پاؤں مار کر چلو گی تو یہ ڈر کر بھاگیں گے۔''

خواتین بڑی مشکل سے اس پر تیار ہوئی تھیں کہ وہ زور زور سے پاؤں مار کر چلیں۔ میں نے لائٹ بند کر دی اور اب درختوں سے ذرا فاصلے پر ہو گیا۔ میں خود زمین پر زور سے جوتا رکھ کر چل رہا تھا اور خواتین بھی پاؤں مار کر چل رہی تھیں اس لیے کسی قدر پریڈ جیسی آواز آ رہی تھی۔ لائٹ جلانے اور خواتین کی چیخوں کا آس پاس کوئی ردعمل نہیں ہوا تھا اس لیے میں مطمئن تھا کہ پاؤں مار کر چلنے سے بھی کوئی متوجہ نہیں ہوگا۔ درگاہ کے اگلے حصے میں کچا ہموار میدان تھا۔ بہ ظاہر یہ عام زائرین کے لیے مخصوص تھا۔ نذر نذرانے دے کر ذلت کے ساتھ یہیں سے عرس میں شرکت کر کے واپس چلے جاتے ہوں گے جب کہ خاص زائرین بارگاہ خاص میں شریک ہوتے تھے۔ یہ تو میں نے دیکھ لیا تھا کہ اندرون خانہ یہاں کیا ہوتا تھا اور مجھے اسی کی توقع تھی۔ کیونکہ یہ جھوٹا مزار اور خانقاہ بنا کر اسلام کو بدنام کرنے کی سازش زور شور سے ہو رہی تھی۔ مرشد جیسے جہنمی ہی ایسا کر سکتے تھے۔

درختوں کے آخری سرے تک آ کر اب دائیں جانب مین گیٹ تک صرف دیوار تھی۔ تاریکی میں گیٹ کا ہیولہ دکھائی دے رہا تھا اور نائٹ ویژن سے بہ ظاہر کوئی فرد نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے عورتوں کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور رائفل تھام کر محتاط قدموں سے آگے بڑھا۔ دیوار کے ساتھ میں اس بڑے سے فولادی گیٹ تک آیا تو اسے مقفل پایا۔ اس کے دونوں پٹوں میں چھوٹے دروازے بھی تھے اور وہ بھی اندر سے تالے ڈال کر بند کیے ہوئے تھے۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ یہ عورتیں گیٹ یا دیوار کسی صورت نہیں پھلانگ سکتی تھیں۔ گیٹ کے اوپری حصے میں ایسی ڈیزائن والی کانٹے دار گرل تھی جسے عبور کرنا بہت مشکل تھا۔ فولادی کانٹے انسان کی کھال پھاڑ دیتے۔ تالے بہت بھاری اور مضبوط قسم کے تھے انہیں توڑنا ممکن نہیں تھا اور کسی کاٹنے والی چیز سے بھی بہت مشکل دیر سے کاٹے جاتے۔ مگر اول تو یہاں ایسی کوئی چیز دستیاب نہیں تھی اور دوسرے اگر فولاد کاٹنے والی آری مل بھی جاتی تب بھی میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں واپس آیا اور خواتین کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ فکرمند ہو گئیں اور کئی ایک تو رونے لگی تھیں۔ میں نے کہا۔

''رونے سے کام نہیں چلے گا یہ بتاؤ یہاں سے باہر جانے کا اور کوئی راستہ ہے؟''

''ادھر دیوار کے ساتھ ایک دروازہ ہے۔'' روشنانے درختوں کے جھنڈ کے وسطی حصے کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں ایک بار اس طرف سے آئی تھی۔''

میں چونکا۔ ''وہ کیسے، یہاں سانپ ہوتے ہیں؟''

''مجھے نہیں معلوم جی۔'' اس نے سادگی سے

کہا۔ ”مجید لے کر آیا تھا۔ مجھے تو ابھی معلوم ہوا ہے کہ یہاں سانپ بھی ہوتے ہیں۔ اگر اس وقت معلوم ہوتا تو میں مر کر بھی نہ آتی جی مجھے سانپوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

حالانکہ اسے انسانوں سے ڈرنا چاہیے تھا اس سے زیادہ بڑا موذی کوئی نہیں ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ ان عورتوں کا یہاں سے نکلنا لازمی تھا۔ وہ میرے گلے پڑ گئی تھیں۔ میں جہاں جاتا وہ جلوس کی صورت میں ساتھ ہوتیں اور ان کی وجہ سے میں کچھ کرنے کے قابل نہ رہتا۔ انہیں واپس درگاہ کی عمارت میں پہنچانا بھی ممکن نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ اب فاضلی کے آدمی وہاں آگئے ہوں اور اپنے آدمیوں کے بدلے ان بے گناہ عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں۔ اس کا بھی امکان تھا کہ وہ فاضلی سے بچ جاتیں مگر بعد میں پولیس انہیں لے جاتی اور ان کا کوئی والی وارث بھی نہیں تھا جو انہیں چھڑاتا۔ کچھ غور و فکر کے بعد میں نے مسئلہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ ”اب تم لوگ بتاؤ، یہاں سے نکلنے کا واحد راستہ سانپوں کے درمیان سے گزرتا ہے کیا تم جاسکو گی؟“

”میں تیار ہوں۔“ روشنا بولی۔ ”مجھے سانپ سے ڈر لگتا ہے لیکن یہاں بھی موت ہی ہے۔“

”میں نہیں جاسکتی۔“ ایک عورت نے صاف انکار کیا۔ وہ سب دو حصوں میں بٹ گئی تھیں تین جانے سے انکار کر رہی تھیں اور پانچ جانے کے لیے تیار تھیں۔ میں نے تین سے کہا۔

”ٹھیک ہے اس صورت میں تم یہیں رہو گی میں ان لوگوں کو چھوڑنے جا رہا ہوں۔“

اکیلے رکنے کی بات پر کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ باقی تین بھی تیار ہو گئیں، میں بھی یہی چاہتا تھا اس لیے میں نے یہ بات ذرا دھمکی آمیز انداز میں کہی تھی اور اس کا فوری اثر بھی ہوا۔ ہمارا قافلہ واپس جھنڈ کے وسطی حصے کی طرف چل پڑا۔ ایک درخت کے پاس پہنچ کر روشنا نے کہا۔ ”ہم یہاں سے نکلے تھے۔“

”پکا یاد ہے نا؟“

”ہاں۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔ ”ہم درگاہ والی عمارت سے تھوڑا پہلے نکلے تھے۔ مجھے یاد ہے وہ پیپل کا درخت تھا اور یہاں پیپل کا بس یہی ایک درخت ہے۔“

میں نے دونوں ایمرجنسی لائٹ آن کی اور ان سے کہا۔ ”سب ایک قطار میں چلیں گی اور سانپ دیکھ کر کوئی چیخ نہیں مارے گی۔ چلنے کا وہی طریقہ ہوگا یعنی پاؤں مار کر

اسماعیل بن الحسین جرجانی

زین الدین، ابوالفضائل حسینی ایک طبیب و مصنف جو اسماعیل کے نام سے مشہور تھا۔ 504ھ/1110ء میں وہ خوارزم چلا گیا اور قطب الدین محمد خوارزم شاہ کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ اس نے عربی اور فارسی زبان میں تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اس نے اپنی کتاب ذخیرہ خوارزم شاہی قطب الدین محمد خوارزم شاہ ہی کے نام سے معنون کی ہے۔ اسماعیل نے بعد میں اِتسز ابن محمد کے دربار سے وابستگی اختیار کر لی جس کے حکم سے اس نے ”الخفی العلائی“ کی تصنیف کا کام شروع کیا۔ اس کے بعد میں وہ مرو میں جو اتسز کے حریف سلطان سنجر بن ملک شاہ کا دارالحکومت تھا کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ اسماعیل کی تصانیف میں ”ذخیرہ خوارزم شاہ“ سب سے عمدہ تصنیف ہے۔ اسے فارسی زبان کا غالباً پہلا دائرۃ المعارف کہنا بجا ہو گا۔ اس میں ساڑھے چار لاکھ کے قریب الفاظ ہیں۔ اس کتاب کا عربی اور ترکی کی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ عبرانی میں اس کا خلاصہ ملتا ہے۔ اس تصنیف کے علاوہ اس کی تقریباً ایک درجن کے قریب اور تصانیف ہیں۔ عربی زبان میں دنیا کی بے ثباتی پر اس کا ایک رسالہ ”المنتہ“ ہے۔

مرسلہ: محمد عفان عطاری۔ میرپور خاص

جرم

عربی میں اس کے ایک معنی ذنب (گناہ) کے ہیں۔ قرآن مجید میں مجرمین اور مجرمون کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اسلامی شریعت میں جرم کی سزا کی دو اقسام ہیں۔ 1۔ حد۔ 2۔ تعزیر۔ حد کا پیمانہ اس کے قواعد و ضوابط مقرر ہیں۔ جب کہ تعزیر میں حاکم وقت یا قاضی کی صوابدید کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اسے اختیار ہوتا ہے کہ مختلف جرائم کے لیے کسی قسم کی سزا دی جائے۔ جرمانہ بھی تعزیر کے ضمن آتا ہے۔ فارسی میں جرم بمعنی جرمانہ (تاوان) بھی آتا ہے۔

مرسلہ: نعمان اکبر۔ لاہور

چلنا، سانپ خود دور کر بھاگ جائے گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

سب نے سر ہلایا۔ جان بچانے کے لیے وہ اس جگہ سے گزرنے کو تیار ہو گئی تھیں مگر سب کی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں سب سے آگے تھا اور ایک ایمرجنسی لائٹ میں نے رکھی تھی دوسری روشنا کو دے دی۔ وہ درمیان میں تھی۔ ہم درختوں میں داخل ہوئے تو سب بہت محتاط تھے۔ خواتین سامنے سے زیادہ آس پاس دیکھ رہی تھیں۔ مگر یہ خیال کسی کو نہیں آیا کہ سانپ درختوں پر ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک اچانک گرا اور ایک عورت کی گردن پر گرا۔ اس نے دل خراش چیخ ماری تھی اور بے ساختہ سانپ کو دور جھٹک دیا۔ پہلی چیخ کے بعد اس نے بس نہیں کیا تھا بلکہ مسلسل چلا رہی تھی۔ میں پلٹ کر اس کی طرف آیا اور اسے خاموش کرانے کی کوشش کی مگر جب اس نے ہسٹریائی انداز میں چلّانا جاری رکھا تو مجبوراً مجھے تھپڑ سے کام لینا پڑا۔ دو تھپڑ کھا کر اس کی چیخیں بند ہو گئیں اور اس نے گھگیائے انداز میں کہا۔

"سانپ نے مجھے ڈس لیا ہے۔"

"وہ صرف گرا تھا۔" میں نے کہا۔ "کہاں ڈسا ہے۔"

اس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ سانپ نے اسے ڈسا نہیں تھا اس لیے وہ ڈرے ڈرے انداز میں ہنس دی۔ "نہیں ڈسا جی۔"

"اب جلدی چلو یہاں سے۔" میں نے کہا اور وہ سب تقریباً دوڑنے کے انداز میں چل پڑیں۔ میں نے روکا نہیں کیونکہ اس وقت ہمارا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ہی مناسب تھا۔ اس بار کسی سانپ نے راستہ نہیں کاٹا اور ایک منٹ سے بھی پہلے ہم دیوار کے پاس نکلے۔ روشنا کو ٹھیک سے یاد نہیں تھا مجید اسے گھما پھرا کر لایا تھا شاید اسے علم تھا کہ سانپ کہاں کہاں ہوتے ہیں؟ اور کون سا راستہ محفوظ ہے۔ دروازے تک کچھ فاصلہ اور طے کرنا پڑا۔ یہ بھی فولادی دروازہ تھا مگر اس پر لگا ہوا تالا عام قسم کا تھا۔ میں نے اس میں رائفل کی نال پھنسائی اور جھٹکا تو وہ ٹوٹ گیا اور دروازہ کھل گیا تھا۔ پٹ کھلتے ہی خواتین نے عجلت میں نکلنے کی کوشش کی اور کسی قدر پھنس کر اور رگڑ کھا کر وہ نکل بھی گئیں۔ انہیں چوٹیں آئی تھیں لیکن اس کی پروا نہیں تھی۔ اندر صرف روشنا رہ گئی تھی۔ اس نے کہا۔ "آپ بھی چلیں۔"

تب مجھے یاد آیا کہ میری کلائی پر ایک کڑا تھا اور اگر میں یہاں سے باہر نکلا اور فاصلے سے پانچ سو گز سے زیادہ دور گیا تو اس کڑے کا میکنزم حرکت میں آجائے گا اور اس میں بھرا ہوا مہلک زہر مجھے چشم زدن میں موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ "میں نہیں جا سکتا، تم جاؤ اور ان عورتوں کی مدد کرنا ان کا باہر شاید کوئی نہیں ہے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

"مجھے یاد رکھو یا نہ رکھو لیکن یہ بات ضرور یاد رکھنا کہ تاریک راہوں پر چلنے والے اچانک ہی انجام کا شکار ہوتے ہیں اور ان کو واپسی کا موقع نہیں ملتا ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ تم کو ایک موقع مل رہا ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ اگر اپنی فطرت پر صبر نہیں کر سکتیں تو بہتر ہے شوہر سے طلاق لے لو مگر تاریکی میں گناہ کے ساتھی مت تلاش کرو۔ اس کا انجام میں نے اس دنیا میں برا ہی دیکھا اور دوسری دنیا کا حساب تو تمہیں پتا ہوگا؟"

اس کا رنگ سرخ ہوا تھا مگر اس نے سر ہلایا اور باہر نکل گئی۔ اس کے پاس لائٹ تھی اور وہ اندھیرے میں اس کی مدد سے راستہ تلاش کر سکتی تھی۔ میں واپس چل پڑا لیکن میں جھنڈ سے فوری نکلنے کی بجائے دیوار کے ساتھ ساتھ درگاہ کے عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ یہاں درخت اتنے گھنے اور ان کے تنے پاس پاس تھے کہ درگاہ کے کسی حصے سے روشنی نظر آنا مشکل تھا اس لیے میں بے فکری سے نائٹ ویژن کی بجائے لائٹ کی روشنی پر انحصار کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے اس سفر میں میں نے کئی سانپ دیکھے اور یہ سب نہایت زہریلے قسم کے سانپ تھے۔ ایک شاید ناگن تھی سفید رنگ پر ہلکی سرمئی رنگ کی دھاریاں تھیں اور وہ بلاشبہ نہایت حسین تھی۔ مگر اس کی ہلاکت خیزی میں شبہ نہیں تھا۔ جب میں اپنے اندازے کے مطابق سابق سماع ہال کے سامنے پہنچ گیا تو میں نے رخ بدل دیا اور اب میں جھنڈ سے باہر آ رہا تھا۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے آخری بار راستے کا معائنہ کر کے ایمرجنسی لائٹ بند کر دی اور آگے بڑھا۔

ایک محاورہ ہے کہ جہاں پر سمٹے جال وہیں قفس ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا جب میں اپنے طور پر بچ کر نکل رہا تھا تب میرے بائیں پاؤں میں درد کی شدید لہر اٹھی اور میں نے جلدی سے لائٹ آن کی تو ایک درمیانے سائز کا سانپ لہراتا ہوا تیزی سے جا رہا تھا۔ ایک لمحے پہلے تک وہ میرے سامنے نہیں تھا اور ایک لمحے بعد وہ مجھے ڈس کر جا چکا تھا۔ خوف کی ایک لہر سی میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے بتایا کہ مجھے سانپ سے ڈر لگتا ہے۔ میں نے

بیٹھ کر پنڈلی سے پتلون اوپر کی تو دو سوراخوں سے سیاہ خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ دونوں سوراخوں کے درمیان فاصلہ دیکھ کر میری تشویش بڑھ گئی کیونکہ اس سے پتا چل رہا تھا کہ سانپ بڑے سائز کا تھا اور سانپ جتنا بڑا ہوتا ہے اس میں اتنا ہی زیادہ زہر ہوتا ہے۔ میرے پاس چاقو نہیں تھا ورنہ میں اس کی مدد سے کٹ لگا کر خون بہا دیتا اور زہر کا اثر کم ہو جاتا۔ میں نے رائفل کی اسٹریپ اتاری اسے کس کر زخم سے ذرا اوپر باندھ لیا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کو مجھے چکر آیا تھا، مگر فوراً ہی سنبھل گیا۔ میں نے ابتدائی خوف پر قابو پا لیا تھا۔

''شہباز میاں قسمت میں کیا لکھوا کر آئے ہو۔'' میں نے خود سے کہا۔ ''ابھی ایک مصیبت سے نکلتے نہیں ہو کہ دوسری آفت آلیتی ہے۔''

میری زندگی میں یہ دوسرا واقعہ تھا جب مجھے کسی زہریلے سانپ نے ڈسا تھا۔ پہلی بار کوبرا نسل کے سانپ نے ڈسا تھا اور اوشا کے باپ سدھو نے علاج کے نام پر مجھے پھر ڈسا تھا۔ بچ میں ویسے ہی گیا تھا اور مجھے یقین ہے کہ یہ سب حکیم قادس کی دی ہوئی معجزاتی دواؤں کا اثر تھا جو زہریلے ترین سانپ کا زہر بھی مجھ پر اثر انداز نہیں ہو سکا تھا۔ مگر ان دواؤں کے استعمال کو بہت دن گزر چکے تھے اور ضروری نہیں تھا کہ ان کا اثر اب تک باقی ہو اس لیے مجھے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی اور اس سے پہلے مجھے اپنے زخم پر کٹ لگانا تھا۔ میں جھنڈ سے باہر نکلا تو درگاہ کی عمارت دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس کے آس پاس بیشمار ٹوٹے شیشے بکھرے تھے اور میں ان سے کام لے سکتا تھا۔ میں لنگڑاتا ہوا عمارت کی طرف بڑھا۔ تیز حرکت سے گریز کر رہا تھا جس سے دورانِ خون میں تیزی آتی اور زہر زیادہ تیزی سے پھیلتا۔ اس کے باوجود جب میں درگاہ کی عمارت کے پاس پہنچا تو میرے ذہن پر غنودگی سی چھانے لگی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس سانپ کا زہر سلانے والا تھا۔ یہ زہر دماغ کے ان حصوں کو ناکارہ کر دیتا ہے جو دل کی دھڑکن اور سانس لینے کے عمل کو قابو کرتے ہیں۔ نتیجے میں دل اور سانس رک جاتے ہیں اور آدمی مر جاتا ہے۔ یہ زہر اذیت دینے کی بجائے ذہن پر سکون سا طاری کرتا ہے۔

عمارت کے سامنے شیشے ہی شیشے بکھرے تھے مجھے لائٹ آن کر کے ایک موزوں ٹکڑا تلاش کرنا پڑا اور میں نے اس کی نوک سے سانپ کے کاٹے کی جگہ کو چیرنا شروع کر دیا۔ درد کی ایک تیز لہر کے ساتھ ہی سیاہ خون کا فوارہ سا اچھلا

جرندہ ایک شہر۔ ہسپانیہ کے اسی نام کے صوبے کا صدر مقام۔ ولایت قطلونیہ کے چار صدر مقامات میں سے ایک۔ ابتداء میں یہ ایبیریا کا ایک گاؤں تھا جسے بعد میں رومیوں نے ترقی دے کر ایک شہر کی حیثیت دی۔ یہ شہر سمندر سے 25 کلومیٹر دور جبل البرانس کے بیرونی دامن میں ایک چھوٹے سے ٹیلے پر واقع ہے۔ جو تیر اور اونا کی ندیوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ شہر چونکہ فرانس اور اسپین کے مشرقی راستے پر واقع ہے۔ اس لیے اس کی جائے وقوع دفاعی نقطہ نظر سے بہت زیادہ اہم ہے۔ اس کو مختلف ادوار میں مسلسل حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نام محاصروں کا شہر بن گیا۔ اس شہر پر باری باری تو طوں، عربوں، ہسپانیہ کے سرحدی فرانکوں اور قطلونی ارغونیوں کا قبضہ ہوا اور رفتہ رفتہ اس نے ایک بڑے جنگی قلعے کی شکل اختیار کر لی۔ جب عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر کی قیادت میں مسلمانوں نے حملے شروع کیے تو انہوں نے جبل البرانس کے دامن کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ جرندہ بھی ان مقبوضات میں شامل تھا۔

مرسلہ: نعمان اکبر۔ لاہور

تھا۔ درد نے ذہن پر چھاتی غنودگی کو بھی عارضی طور پر ختم کر دیا تھا۔ ذرا دیر بعد خون بہنے کی رفتار سست ہو گئی اور اس کا رنگ بھی بدلنے لگا تھا۔ یہ کسی قدر سرخ ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ زہر کم ہوا تھا۔ میں نے ایک بار پھر کٹ لگایا اور خون دوبارہ روانی سے بہنا شروع ہو گیا۔ زہر جتنا نکل جاتا میرے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا۔ اس بار بھی خون ایک منٹ بعد رک گیا۔ دونوں بار کٹ لگانے پر کوئی پاؤ بھر خون نکلا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سارا زہر نکل گیا تھا یقیناً زہر کا ایک حصہ میرے خون میں اب تک موجود تھا۔ میں کھڑا ہوا تو ہلکا سا چکر آیا تھا مگر اس کے بعد میں سنبھل گیا اور اب خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اگر مجھے کہیں سے سیاہ تلخ کافی یا چائے مل جاتی تو یہ غنودگی بھگانے میں اکسیر ہوتی مگر یہاں دونوں چیزوں کی دستیابی کا امکان نہیں تھا۔

میں واپس درختوں کی طرف آیا مگر ان سے دور رہ کر پرانے ساع ہال کی طرف بڑھا یہاں کوئی سرگرمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ حیرت انگیز طور مرشد کی کوٹھی کی طرف خاموشی تھی اور ابھی تاریکی بجلی بحال نہیں ہوئی تھی کیونکہ تمام روشنیاں بند تھیں۔ میں نے بڑے گیٹ کے رخنوں سے ساع ہال کے اندر جھانکا۔ نائٹ ویژن سے جہاں تک دکھائی دے رہا تھا وہاں کوئی نہیں تھا البتہ چند چوہے کونے کھدروں میں موجود تھے اور اپنی جسمانی حرارت کی وجہ سے دکھائی دے رہے

تھے۔ میں اندر داخل ہوا۔ تھبی حصے میں خاموشی تھی۔ میں نے اس کے دروازے سے جھانکا تو وہ عمارت بھی خاموش دکھائی دی جس میں سرنگ نکل رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا فاضلی نے اس طرف کسی کو چھوڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ظاہر ہے اسے عقب میں کسی سے خطرہ نہیں تھا جو خطرہ تھا وہ اندر موجود لوگوں سے تھا اور ان میں سے اکثر فنا کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی فاضلی نے کوئی ایسا بندوبست بھی کیا تھا کہ اب تک پولیس یہاں نہیں آئی تھی۔ ورنہ اتنی فائرنگ، دھماکوں، روشنی کے گرینیڈ چلنے اور پھر نئے سماع ہال کی عمارت کو لگنے والی آگ کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی رپورٹ نہ کرتا۔

دیکھا جائے تو میرے فرار کے لیے اس سے زیادہ سازگار حالات دشمن کی قید میں کبھی میسر نہیں آئے تھے مگر دشمن نے ایک کڑا پہنا کر مجھے اپنا اسیر بنا لیا تھا اور میں چاہتا بھی تو یہاں سے نہیں جا سکتا تھا۔ بلکہ میں تو سرنگ تک بھی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ اس صورت میں پانچ سو گز کی حد ختم نہ ہو جائے اور میں کڑے میں موجود پوٹاشیم سانائیڈ کا شکار ہو جاؤں۔ کوٹھی یہاں سے کوئی ڈھائی سو گز کے فاصلے پر تھی لیکن خود فاضلی کہاں تھا میں اس سے بے خبر تھا۔ ممکن تھا کہ وہ جان کر کسی جگہ چلا جاتا کہ پانچ سو گز کی حد آ جاتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اچانک ہال کے اندر کچھ روشنیاں جل اٹھیں۔ ان کی روشنی اس وسیع اور تاریک ہال کو روشن کرنے سے قاصر تھی مگر اس سے مجھے پتا چل گیا درگاہ کی بجلی بحال ہو گئی ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ فاضلی نے مرشد یا کم سے کم اس کی کوٹھی پر غلبہ پا لیا تھا اور مرشد اگر اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا تب بھی وہ دفاعی پوزیشن میں چلا گیا تھا اور اب حالات فاضلی کے کنٹرول میں تھے۔ نہ جانے کیوں یہ سوچ کر ہی میرا دل ڈوبنے سا لگا تھا۔

فاضلی اور مرشد دونوں میرے بدترین دشمن تھے۔ یہ میری اور بہت سے مظلوموں کی خوش قسمتی کہ وہ دونوں آپس میں لڑنے لگے۔ یہ اژدہے اور مگرمچھ کی لڑائی تھی جو ہارتا خلق خدا ایک موذی سے محفوظ ہو جاتی تھی مگر اس وقت مجھے فاضلی کا حالات پر حاوی ہو جانا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ کیونکہ میں اس کا قیدی تھا اور وہ جتنا مضبوط ہوتا میری رہائی اور زندگی کے امکانات اتنے ہی کم ہوتے جاتے۔ کل جی نے تصدیق کی تھی کہ فاضلی میرے لیے قاتلانہ عزائم رکھتا تھا اور مجھے اس طرح دنیا سے رخصت کرنا چاہتا تھا کہ براہِ راست اس پر الزام نہ آئے۔ ایسے میں اس کی کامیابی میرے لیے مزید مشکلات کا پیغام لا سکتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں میں کیا کر سکتا تھا۔ میں آزاد تھا اور میرے پاس اسلحہ بھی تھا۔ میں فاضلی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا جب تک میں اس تک نہ پہنچ جاتا اور اس کے آدمی یقیناً میری راہ میں حائل ہوتے۔

فاضلی کے آدمیوں سے مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں ان میں کمی کی کوشش کروں۔ فاضلی اور مرشد جیسے لوگ کرائے کے قاتلوں پر اکڑتے تھے ان میں کمی ہوتی تو یقیناً ان کی اکڑ میں بھی کمی آتی۔ ایک راہ سمجھ میں آتے ہی میں حرکت میں آ گیا۔ میں جتنی دیر ساکت رہا تھا ذہن پر غنودگی کا دباؤ بڑھ رہا تھا اور اب مجھے حرکت میں آ جانا تھا تاکہ میں غنودگی سے لڑ سکوں چلنے سے پاؤں کے زخم میں ٹیسیں اٹھتی تھیں اور یہ جگانے میں معاون ثابت ہو رہی تھیں۔ میں پرانے سماع ہال سے نکلا اور صحن سے ہوتا ہوا مرشد کی کوٹھی کی طرف بڑھا۔ لیکن میں دیوار کے ساتھ ساتھ تھا اور تاریک حصوں سے گزر رہا تھا۔ اب اس طرف فاضلی کے مورچہ بند آدمی نظر نہیں آ رہے تھے۔ نائٹ ویژن کی ضرورت نہیں تھی مگر روشنی مجھے گراں گزر رہی تھی خاص طور سے مرشد کی کوٹھی کی چار دیواری پر بہت طاقت والی سرچ لائٹس روشن تھیں۔ اس کے پاس جانے والا کوئی شخص نگرانی کرنے والوں سے بچ نہیں سکتا تھا۔ اگرچہ وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ فاضلی کے آدمی وہاں موجود ہوں گے۔ کم سے کم کوٹھی کا احاطہ ان سے خالی نہیں ہو گا۔ دوسرے لفظوں میں فاضلی تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔

اس طرف سے اندر جانا ممکن نہیں تھا۔ کوٹھی میں داخلے کا راستہ سامنے سے تھا مگر اس طرف فاضلی کے آدمی ہوتے۔ کچھ دیر غور کے بعد میں نے درگاہ کے عقبی حصے کا رخ کیا۔ یہاں زمین پر سبزیاں اور پھلدار درخت تھے اور یہ سب یقیناً مرشد اور اس کے اہلِ خانہ کے لیے تھا۔ سنگتروں کے باغ سے گزرتا ہوا میں مرشد کی کوٹھی کے عقبی حصے میں آیا۔ یہاں بھی اس کی چار دیواری بلند اور خاردار باڑ سے ڈھکی تھی۔ اسے عبور کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں پلٹ کر باغ میں آیا۔ ذرا سی جستجو کے بعد مجھے مالی کی کوٹھری مل گئی اور وہاں سے ایک سیڑھی مل گئی۔ بانس کی بنی یہ سیڑھی ہلکی پھلکی تھی میں اسے با آسانی کوٹھی کی دیوار تک لے آیا۔ کوٹھری میں ہی مجھے شاخیں کاٹنے والا ایک پاور کٹر مل گیا تھا جس سے فولادی تار بھی کاٹی جا سکتی تھی۔ سیڑھی دیوار کے ساتھ لگا کر میں اوپر پہنچا اور پہلے ایک فولادی اوزار تاروں پر مارا

مگر کوئی ردِعمل نہیں ہوا۔ شاید ان تاروں میں بجلی تھی تو اسے فاضلی کے آدمیوں نے منقطع کر دیا تھا۔ اس کے باوجود میں نے ہچکچاتے ہوئے پاور کٹر سے وائر چھیڑی اور جب مجھے بجلی کا جھٹکا نہیں لگا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

یہ کٹر معمولی طاقت سے کہیں زیادہ مضبوط اور موٹی اشیا کو کاٹنے کے لیے بنایا گیا تھا اس لیے اس نے باآسانی وائر کاٹ دی۔ پانچ منٹ میں میں نے اتنی جگہ بنالی کہ دیوار کے دوسری طرف جا سکتا تھا مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ اس بارہ فٹ اونچی دیوار کے دوسری طرف کیسے اترتا۔ اس طرف لان تھا اور دیوار کے ساتھ پھولدار پودوں کے تختے تھے۔ مجھے ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا۔ میں نے کٹر دوسری طرف پھینک دیا۔ گھاس میں گرنے سے بہت ہلکی سی آواز آئی تھی اور میں رائفل سنبھال کر کچھ دیر انتظار کرتا رہا کہ کہیں ایک دو کتے پہریداری پر معمور تھے تو وہ آجائیں تو پہلے میں ان سے نمٹ لوں مگر کسی طرف سے کوئی ردِعمل نہیں ہوا۔ میں نے رائفل بھی نیچے پھینکی اور دوسری طرف لٹک گیا۔ جب زمین میرے پیروں سے پانچ فٹ نیچے رہ گئی تو میں نے دیوار کا کنارہ چھوڑ دیا۔ میں پودوں پر گرا اور کوئی چوٹ نہیں آئی مگر ٹانگ کے زخم میں شدید ٹیس اٹھی تھی۔ میں کچھ دیر کے لیے بیٹھا رہ گیا اور پھر ہمت کرکے اٹھا۔

مرشد کی کوٹھی زیادہ بڑی نہیں تھی یہ شاید ایک کنال کے رقبے پر بنی تھی اور دو منزلہ تھی لیکن جس احاطے میں یہ کوٹھی تھی وہ کم سے کم دس ہزار گز یا ایک ہیکٹر رقبے پر محیط تھا۔ اس رقبے کا بیشتر حصہ سرسبز لان اور درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ عقبی لان بھی خاصا بڑا تھا اور اس کے دائیں کونے میں ایک نیلگوں ٹائل والا سوئمنگ پول نظر آ رہا تھا۔ پول کے اندر لائٹس آن تھیں اور یہ باہر تک آکر ماحول کو عجیب سی جھلملاتی روشنی سے منور کر رہی تھیں۔ احاطے کے اندر بھی روشنی کا بھرپور بندوبست تھا اور اگر کوئی اس طرف آنکلتا یا کوٹھی کی کسی کھڑکی سے جھانک لیتا تو میں اسے صاف نظر آتا۔ کوٹھی کے عقب کی طرف کھلنے والی بیشتر کھڑکیاں تاریک تھیں یا ان کو تاریک دکھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر احاطے کے اندر بھی خاموشی اور سکون تھا۔ مجھے تعجب ہوا کیا فاضلی حالات پر قابو پاکر معہ ساتھیوں کے سو گیا تھا یا سب نے اجتماعی خودکشی کرلی تھی اور اب یہاں کوئی زندہ فرد نہیں تھا۔ مگر ایسا ممکن نہیں تھا فاضلی خودکشی کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

کوٹھی کے عقبی حصے سے اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور اوپری منزل کا ٹیرس اس قسم کا تھا کہ اس تک رسائی بھی ناممکن تھی جب تک رسی یا سیڑھی کا سہارا نہ لیا جاتا۔ میں نے آگے بڑھنے کے لیے دائیں طرف کا انتخاب کیا اور سوئمنگ پول کی طرف آیا۔ یہ کوٹھی کے عقبی اور دائیں حصے میں واقع تھا۔ پول خاصا بڑا تھا تاہم اسے اولمپک سائز تو نہیں کہہ سکتے مگر یہ کوٹھیوں اور بنگلوں میں پائے جانے والے مروجہ پولز سے خاصا بڑا تھا۔ مرشد نے نہ جانے صرف کوٹھی کی زینت بڑھانے کے لیے بنوایا تھا یا پھر اسے یا اس کے اہلِ خانہ کو تیراکی کا شوق تھا۔ میں پول کے پاس آیا تو اس کے اندر موجود لائٹس یوں مدھم ہوئیں جیسے ان کے سامنے کوئی چیز آگئی ہو۔ پول میں کوئی تھا۔ میں چوکنا ہو گیا اور احتیاط سے آگے بڑھا اور پول میں جھانکا۔ ایک لمحے کو مجھے اپنی آنکھوں پر شبہ ہوا۔ لیکن پول میں تقریباً نصف درجن افراد زیرِ آب تیراکی کر رہے تھے۔ یہ صرف ایک لمحے کے لیے لگا تھا اور میں رائفل سیدھی کرنے جا رہا تھا کہ مجھے احساس ہوا کہ وہ زندہ نہیں تھے بلکہ یہ چھ افراد کی لاشیں تھیں جنہیں قتل کر کے سوئمنگ پول میں ڈال دیا تھا۔ ان کی لاشیں تیر رہی تھیں۔

غور کرنے پر مجھے احساس ہوا کہ وہ سب عام افراد تھے۔ شاید مرشد کے مرید تھے جنہیں اس نے اسلحہ تھما کر یہاں حفاظت کے لیے رکھا تھا اور وہ سب فاضلی کا نشانہ بن گئے تھے۔ ان کے خون سے پول کا پانی کسی قدر سرخ ہوا تھا مگر یہ سرخی اتنی نہیں تھی ایسا لگ رہا تھا لاشیں مرنے کے کچھ دیر بعد یہاں ڈالی گئی تھیں۔ پول کے آس پاس جگہ جگہ چھوٹے قد کے آرائشی درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو کوٹھی کے اگلے حصے تک چلا گیا تھا۔ درخت چھوٹے تھے لیکن یہ ایک بندے کو چھپانے کے لیے کافی تھے میں ان کی آڑ میں آگے بڑھنے لگا۔ دیوار سے اترتے ہوئے پاؤں میں ٹیس آئی تو غنودگی کا حملہ پسپا ہوا تھا مگر اب میں پھر غنودگی محسوس کر رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کہیں لیٹوں اور سو جاؤں۔ مگر میں جانتا تھا کہ یہ نیند ہمیشہ کی بھی ہو سکتی تھی۔

وسطی اور جنوبی پنجاب میں مختلف اقسام کے زہریلے سانپ بہت زیادہ ملتے ہیں لیکن پنڈی اور اس کے نواح میں سانپ بہت زیادہ نہیں پائے جاتے ہیں اور ان کی بیشتر اقسام زہریلی نہیں ہوتی ہیں۔ مرشد نے یہ زہریلے سانپ خاص طور سے حاصل کر کے یہاں چھوڑے تھے۔ ممکنہ طور پر ان کی خوراک کا خیال رکھا جاتا ہوگا تاکہ یہ تندرست اور توانا رہیں اور مرشد کے لیے چوکیداری کا فرض انجام دیتے

رہیں۔ ایک سانپ نے اپنا کارِ منصبی بہ خوبی انجام دیا تھا۔اس کا زہر اب مجھے سلانے پر آمادہ تھا اور میں جاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ایک درخت کی آڑ سے جب میں کوٹھی کا معائنہ کر رہا تھا تو مجھے ایسا چکر آیا کہ میں تقریباً گر گیا۔ غنودگی سے لڑتے ہوئے جب میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے خود کو ایک گھٹنے اور ہاتھ کے بل زمین پر ٹکے پایا۔نہ جانے میں گرنے سے کیسے بچا تھا؟ شاید گر جاتا تو سو جاتا۔سر جھٹک کر میں دوبارہ کھڑا ہو گیا اور کوٹھی کے اگلے حصے کی طرف بڑھا۔

یہ حصہ پورچ اور کراٹا باڑ سے ڈھکے لان پر مشتمل تھا۔پورچ تک آنے کے لیے بل کھاتا ہوا ڈرائیو وے تھا جس کے دونوں طرف کراٹا باڑ لگا کر لان کی پردہ پوشی کی گئی تھی۔آنے اور جانے کے لیے الگ الگ راستے تھے اور دونوں آکر اس نیم دائرے نما وسیع کار پورچ میں مل رہے تھے جس میں کم سے کم نصف درجن گاڑیاں پارک کی جاسکتی تھیں۔اس وقت بھی وہاں دو اعلیٰ درجے کی نہایت قیمتی کاریں موجود تھیں۔پورچ کے نزدیک آنے پر مجھے وہاں موجود افراد کا احساس ہوا تھا۔کم سے کم دو افراد آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔زبان پنجابی اور لہجہ دیہاتی اور نچلے درجے کے افراد کا سا تھا۔میں نے کان لگا کر سنا ایک کہہ رہا تھا۔”روجے بھاگ چل ورنہ ہم بھی مارے جائیں گے۔“

”بھاگ کر کدھر جائیں؟“ روجے نے سوال کیا۔”یہ لوگ سیدھے ہمارے گھر آئیں گے اور جب ہم نہیں ملیں گے تو ہمارے گھر والوں کا کیا ہوگا؟“

”پر یار مجھے ڈر لگ رہا ہے انہوں نے تو کسی کو نہیں چھوڑا۔جس نے ہتھیار نہیں ڈالے اسے بھی مار دیا اور جس نے ہتھیار ڈالے اسے بھی مار دیا۔“

ان لوگوں کا تعلق غالباً مرشد سے تھا اور وہ فاضلی اینڈ پارٹی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ فاضلی اور اس کے آدمیوں نے یہاں موجود ہر فرد کا خاتمہ کر دیا تھا۔چھ افراد کی لاشیں میں پول میں دیکھ چکا تھا اور باقی لاشیں پتا نہیں کہاں تھیں؟ اس سے ایک سوال اور میرے ذہن میں آیا کہ فاضلی یوں اندھا دھند قتل و غارت گری کیوں کر رہا تھا۔اس کی دشمنی مرشد سے اور اس کے خاص آدمیوں سے تھی ان عام لوگوں کا قتل عام بلا جواز تھا۔یہ لوگ درگاہ میں کام کرتے تھے اور فاضلی ان سے کام لے سکتا تھا یا اگر اسے کوئی خدشہ تھا تو وہ انہیں نکال کر دوسرے آدمی لے آتا۔انہیں مارنے کی ضرورت نہیں

تھی۔اس سوال کا جواب بھی روجے نے دیا۔اس نے کہا۔”وہ پاگل ہو رہا ہے،کوٹھی سے ہونے والی فائرنگ میں اس کے تین آدمی مارے گئے اور اسی لیے ہر آدمی کو مار رہا ہے۔“

”ہاں پتا نہیں ہم کیسے بچ گئے،پر مجھے لگ رہا ہے ابھی اس کے آدمی آئیں گے اور ہمیں بھی مار دیں گے۔“ دوسرا روہانسے لہجے میں بولا۔”میں تو ایک معمولی سا مالی ہوں۔“

”میں کھانا بناتا ہوں۔“ روجے نے کہا۔”ہمارا تو کوئی قصور نہیں ہے۔“

”اس کے ساتھ جو وہ خوفناک آدمی ہے۔اسی نے سب سے زیادہ لوگوں کو مارا ہے۔“

ان کی باتیں سننے کے لیے میں ذرا گھوم کر ایک کراٹا باڑ کے پیچھے آگیا جو پورچ کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور وہ دونوں وہیں موجود تھے۔کوٹھی پر حملے فاضلی کے تین آدمی مارے گئے تھے اور اس نے طیش میں آکر کوٹھی میں موجود ہر فرد کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔اس کے آدمیوں نے چن چن کر سب کو مارا تھا۔جو کہیں چھپ گئے تھے ان کو تلاش کر کے گولی ماری۔یہ دونوں فاضلی کے قدموں میں گر گئے تھے اور رو دھو کر فی الحال اپنی جان بچالی تھی مگر انہیں خدشہ تھا کہ فاضلی انہیں بھی نہیں بخشے گا اور مجھے یقین تھا کہ وہ انہیں مار دے گا۔وہ دونوں اس قتل عام کے عینی گواہ تھے جو فاضلی کے حکم پر وہاں ہوا تھا۔اس قتل و غارت گری میں سائلنسر والی رائفلیں استعمال ہوئی تھیں اس لیے کوٹھی سے باہر پتا نہیں چلا کہ اندر کیا ہوا تھا۔میں جس باڑ کے پاس کھڑا تھا اس طرف سات افراد کی لاشیں پڑی تھیں اور ان میں ایک عورت بھی تھی۔یہ بھی عام یا خاص ملازم تھے۔

ان لوگوں کی گفتگو سے مجھے خیال آیا کہ فاضلی سب کو اس لیے مروا رہا تھا کہ کوئی عینی گواہ باقی نہ رہے جو بعد میں اس کارروائی کے بارے میں کہیں بتا سکے۔مرشد خاندان کا کچھ پتا نہیں تھا اور خود مرشد کا بھی پتا نہیں تھا۔اگر وہ فاضلی کے ہتھے چڑھا ہوگا تو زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ بھی مارا گیا تھا۔فاضلی اسے مارنے ہی تو آیا تھا اور اس چکر میں سو سے اوپر افراد اپنی جانوں سے گئے تھے۔ذہن پر چھاتی غنودگی سے بچنے کے لیے میں نے ایک بار پھر اپنا زخم کریدا تھا۔اب خون سرخ ہی آرہا تھا اس کا مطلب تھا کہ باقی ماندہ زہر دماغ تک رسائی حاصل کر کے اپنا کام کر رہا تھا۔اگر یہ ایک حد سے زیادہ ہوتا تو مجھے ہمیشہ کی نیند سلا دیتا اور اگر کم ہوتا تو

امکان تھا کہ میں بچ جاؤں۔ میں شاہ کوبرا کے زہر سے بھی بچ گیا تھا مگر اس میں کچھ دخل سدھو کی کوششوں کا بھی تھا۔ اس نے مجھے بعض جڑی بوٹیاں استعمال کرائی تھیں اور پھر اس وقت میں نے حکیم قادس کی دوائیاں بھی تازہ تازہ نوش فرمائی ہوئی تھیں۔ اس بات کو خاصا عرصہ گزر گیا تھا۔ اس لیے یہ کہنا مشکل تھا کہ اب ان دواؤں کا اثر باقی تھا یا نہیں اور وہ زہر کو ناکارہ بنا سکتی تھیں؟

اچانک درگاہ کے سامنے والے حصے سے کسی گاڑی کے انجن کی تیز آواز آئی تھی۔ میں نے ذرا اچک کر دیکھا یہ ایک بند وین تھی جو تیزی سے ڈرائیو وے کی طرف آ رہی تھی۔ مجھ سمیت تمام افراد سرنگ کے راستے اور پیدل آئے تھے۔ پھر یہ کون ہو سکتے تھے۔ اگر فاضلی کے آدمی گاڑی میں آتے تو وہ سرنگ والے راستے سے آ سکتے تھے مگر پھر مجھے خیال آیا کہ سرنگ کا آخری حصہ اتنا نہیں کھلا تھا کہ اس سے کوئی گاڑی اندر آ سکتی۔ یہ گاڑی یقیناً سامنے والے حصے سے اندر داخل ہوئی تھی۔ مین گیٹ لاک تھا مگر کسی نے لاک کھول دیا ہوگا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ وین میرے پاس سے گزر کر پورچ میں رکی۔ اگلے حصے سے دو آدمی اترے اور پھر انہوں نے اس کا عقبی دروازہ کھولا فوراً کسی لڑکی کی چیخوں اور آدمی کے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ وین کے عقبی حصے سے بھی پانچ آدمی نکلے تھے ایک نے ایک لڑکی کو دبوچ رکھا تھا اور اس کا انداز بہت گھٹیا تھا۔ وہ اسے قابو کرنے سے زیادہ اس سے جسمانی حظ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ باقی دو نے ایک لڑکے کو قابو کیا ہوا تھا جو خود کو چھڑانے کی ازحد کوشش کر رہا تھا۔

لڑکی رومانہ تھی اور لڑکا راشد تھا۔ میرا دل ایک لمحے کو رکا تھا۔ اگر وہ یہاں آ گئے تھے تو میرے ساتھی کہاں تھے؟ اگر انہوں نے کسی ڈیل کے تحت انہیں نہیں چھوڑا تھا تو پھر حویلی میں کیا ہوا تھا؟ فاضلی کے آدمیوں نے انہیں کیسے حاصل کیا تھا؟ یہ سوالات لمحے میں میرے ذہن میں گونجے اور ایک اشتعال اور دہشت کی لہر نے میرے وجود پر قبضہ کر لیا اس کے بعد میں نے جو کیا وہ جیسے خود بہ خود ہوا تھا۔ میں نے رائفل بلند کی اور اسے سنگل موڈ پر کر کے پہلے اسے شوٹ کیا جس نے راشد کو پکڑ رکھا تھا وہ سامنے اور کھلا نشانہ تھا۔ گولی اس کے سینے میں اتری اور وہ ڈکرایا۔ اس سے پہلے کہ دوسرے صورتِ حال کو سمجھتے میں نے دوسرے کو بھی نشانہ بنایا۔ وین سے آگے سے اترنے والے دونوں افراد نے صورتِ حال کو سمجھ لیا تھا ایک چلایا۔ ”وہ ادھر باڑ کے پیچھے ہے۔“

انہوں نے بیک وقت اپنے پستول نکالے اور میری طرف اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے مگر میں ان کی فائرنگ سے بے نیاز اس شخص کو نشانہ بنا رہا تھا جس نے رومانہ کو بہت مستی میں پکڑ رکھا تھا اور اپنے ساتھیوں کو مرتے دیکھ کر اس کی ساری مستی ہوا ہو گئی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور وہ وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا اور اسی عالم میں گولی نے اس کے سر میں سوراخ کر دیا۔ اس کا لہو اچھل کر رومانہ پر گیا اور اس نے چیخ ماری۔ وہ دیوانہ وار اپنے چہرے پر آنے والا خون صاف کر رہی تھی اور پھر اچانک وہ کوٹھی کی طرف بھاگی۔ راشد جو حیران پریشان کھڑا تھا رومانہ کو بھاگتے دیکھ کر اس کے پیچھے لپکا۔ میں نے چلا کر انہیں رکنے کے لیے کہا مگر فائرنگ کے شور میں میری آواز ان تک نہیں پہنچی تھی یا پہنچی بھی تو انہوں نے اسے قابل توجہ نہیں سمجھا تھا۔

گولیاں میرے آس پاس سے گزر رہی تھیں مگر ابھی تک کوئی مجھے چھونے میں ناکام رہی تھی۔ البتہ ان دونوں کو مزید موقع ملتا تو وہ مجھے نشانہ بنا ہی لیتے اب تک وہ بدحواسی میں فائرنگ کر رہے تھے اور انہوں نے ڈھنگ سے نشانہ لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے رائفل کو آٹومیٹک موڈ پر کرتے ہوئے ان دونوں پر ایک طویل برسٹ مارا اور وہ چھلنی ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے گرتے ہی وہاں سناٹا چھا گیا۔ میں نے باڑ پھلانگی اور راشد کو آواز دی۔ درمیان میں وین اور دوسری گاڑیاں تھیں۔ وہ دونوں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ وین سے اترنے والے پانچ میں سے تین مارے جا چکے تھے اور دو زندہ تھے۔ ان میں سے ایک نے خودکشی کر لی اس نے اپنا پستول نکالا جو اسے نہیں نکالنا چاہیے تھا اور میں نے میگزین میں بچ جانے والی گولیاں اس پر چلا دیں۔ آخری آدمی بے ہوش تھا اور جانکنی میں تھا کیونکہ اس کا سینہ سانس لینے کی کوشش میں اچھل رہا تھا۔ میں آگے بڑھا تو روجے اور اس کا ساتھی پورچ کے کونے میں دبکے ہوئے تھے مجھے دیکھ کر روجے گھگیایا۔

”خدا کے لیے ہمیں نہ مارنا۔“

”وہ لڑکا اور لڑکی کہاں گئے ہیں؟“ میں نے پوچھا میرا انہیں مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر میں نے رائفل کو دھمکانے والے انداز میں سامنے ہی رکھا تھا۔ ان دونوں نے اپنے ہاتھ اوپر کر رکھے تھے۔ دوسرا بولا۔

”وہ جی اندر چلے گئے ہیں۔ رومانہ بی بی اور راشد

صاحب۔“

گویا وہ انہیں جانتے تھے اور کیسے نہیں جانتے، ایک مرشد کی دختر تھی اور دوسرا اس کا بھتیجا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ”یہاں سے چلے جاؤ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو۔“

”ہم کہاں جائیں جی؟“ روجے نے پوچھا۔

”اپنے گھر جاؤ اگر فاضلی بعد میں پوچھے تو کہہ دینا کہ ایک آدمی نے حملہ کیا تھا اور تم ڈر کر بھاگ گئے تھے۔“

انہوں نے سر ہلایا اور سچ مچ دوڑ لگا دی۔ ان کا رخ سامنے والے حصے کی طرف تھا۔ میں نے پلٹ کر دین کی طرف دیکھا۔ اس کے پاس پانچ افراد پڑے تھے یعنی یہاں مزید پانچ لاشوں کا اضافہ ہوگیا تھا۔ میں اندر کی طرف بڑھا اور جب برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو مجھے لگا جیسے میرے قدم منوں وزنی ہو رہے ہوں۔ میری رگ وپے میں جیسے سستی اور تھکاوٹ سرایت کر رہی تھی۔ جیسے تیسے میں اس شاندار برآمدے میں آیا جہاں ایک طرف ماربل کی میز کے گرد دھات اور فائبر کی کرسیاں رکھی تھیں۔ یہاں تین دروازے تھے ایک بڑا دروازہ جو دو پٹ کا تھا اور اس کے دائیں بائیں ذرا فاصلے پر دو چھوٹے دروازے تھے اور یہ سب کل کی مضبوط ترین لکڑی کے بنے تھے اور ان پر دودھیا رنگ کی پالش تھی۔ اس کوٹھی کی ایک ایک چیز سے امارت ٹپک رہی تھی۔ درمیان والا دروازہ کھلا ہوا تھا مگر میں اس سے اندر نہیں گیا۔ رومانہ اور راشد کو اندر گئے ہوئے مشکل سے ایک منٹ ہوا تھا مگر اب ان کی آواز نہیں آرہی تھی۔

کیا وہ فاضلی کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے یا صورت حال بھانپتے ہوئے کہیں خاموش ہو کر دبکے ہوئے تھے؟ یہ ناممکن تھا کہ اندر موجود افراد کو باہر ہونے والے ہنگامے کا علم نہ ہوا ہو۔ میری رائفل بے آواز تھی مگر دین والوں کے پستول بے آواز نہیں تھے۔ فائرنگ کی آواز اندر تک پہنچی ہوگی۔ ایسے میں منہ اٹھائے سامنے والے دروازے سے جانا عقل مندی نہیں تھی۔ غنودگی کا اثر میری سوچنے کی صلاحیت پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا اور مجھے فیصلہ کرنے میں ذرا دیر لگی کہ مجھے دائیں طرف سے جانا چاہیے یا بائیں طرف سے۔ بالآخر میں بائیں طرف بڑھا۔ یہاں بھی مارا ماری کے آثار نمایاں تھے دیواروں پر گولیوں کے نشانات تھے اور کئی جگہوں پر اچھا خاصا خون پھیلا ہوا تھا ایک جگہ خون کے ساتھ مغز کا کچھ حصہ بھی پڑا تھا۔ گولی نے کسی کا دماغ نکال دیا تھا۔ یہ سب دیکھتے ہوئے مجھے متلی کا احساس ہوا اور پھر میں نے بے ساختہ جھکتے ہوئے الٹی کر دی تھی۔

پیٹ سے پانی نکلا تھا کیونکہ کچھ کھائے ہوئے مجھے خاصی دیر ہوگئی تھی اور میں نے یہاں صرف پانی اور کولڈ ڈرنک پی تھی۔ الٹی کر کے مجھے سکون سا محسوس ہوا تھا اور ذہن پر چھائی غنودگی بھی کم ہونے لگی تھی۔ شاید زہر کا کچھ حصہ الٹی کے ساتھ نکل گیا تھا۔ چند گہری سانسیں لے کر میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا مگر دروازہ... اندر سے بند تھا۔

اس مضبوط دروازے کو ہلانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اب اندر جانے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ میں نے رائفل کی نال لاک پر رکھ کر فائر کرنا چاہا مگر رائفل کلک کر کے رہ گئی۔ اس کا میگزین خالی ہوگیا تھا۔ میں نے دوسرا میگزین نکالنا چاہا تو پتا چلا کہ میرے پاس کوئی میگزین نہیں رہا تھا وہ اس ہنگامہ آرائی میں کہیں گر گیا تھا کیونکہ میں نے دو ہی استعمال کیے تھے اور ایک باقی تھا۔ مجھے کسی اور کے میگزین لینے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اب میرے پاس صرف ایک پستول اور اس کا ایک فاضل میگزین تھا۔ میں نے رائفل نیچے ڈال دی اور پستول کی نال تالے پر رکھ کر فائر کیا۔ دھماکے کے ساتھ تالے کے انجر پنجر ڈھیلے ہوگئے اور اس بار لٹو گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔

میں اندر داخل ہوا۔ یہ ایک چھوٹا سا ہال وے تھا۔ یعنی ہال نما راہداری، جس میں کچھ فرنیچر بھی تھا دیواروں پر آرٹ اور فن کے اعلیٰ نمونے آویزاں تھے۔ فرش پر دبیز قالین تھا اور ہال وے کے ایک طرف قطار سے کمرے تھے۔ ان کی تعداد چار تھی۔ یہاں فانوس روشن تھے اور ایک ایک چیز واضح نظر آرہی تھی۔ کچھ دیر میں گن لیتا رہا مگر وہاں خاموشی تھی۔ پھر میں دبے قدموں ایک کمرے تک آیا اس کا دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ لاک نکلا۔ دوسرا اور پھر تیسرا کمرا بھی لاک تھا۔ ہال وے آگے جا کر گھوم رہا تھا۔ میں نے چوتھا دروازہ چیک نہیں کیا اور اس کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور کسی نے مجھے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ میں بالکل تیار نہیں تھا اس لیے بے اختیار کھنچا چلا گیا اور کسی نے آگے ٹانگ اڑائی تو منہ کے بل زمین پر گیا۔ اگر فرش پر دبیز قالین نہ ہوتا تو مجھے تارے نظر آجاتے مگر اب بھی چکر ضرور آیا تھا اور اس سے فائدہ اٹھا کر وہاں موجود دو افراد نے مجھے قابو کرنے کی کوشش کی تھی۔ البتہ ان کا انداز اناڑیانہ تھا۔ ایک نے میرا بازو پکڑ کر پیچھے کھینچا اور دوسرے نے دوسرا بازو پکڑا اور انہوں نے خود مجھے اٹھا دیا۔ حالانکہ ان کو

چاہیے تھا مجھے گرا کر قابو کرتے۔ کھڑے ہوتے ہی میں نے ایک کے منہ پر کہنی ماری اور اس نے چلا کر اپنی والدہ کو یاد کیا۔

”ہائے ماں جی۔“

”ماں کے......“ دوسرے نے تپ کر غلط انداز میں اس کی والدہ کو یاد کیا۔ ”ٹھیک سے پکڑ...... ہائے۔“

اس دوران میں، میں دوسرے کے گھٹنے پر اپنے بائیں پاؤں کی ایڑی مار چکا تھا اور جملے کے آخر میں ہائے اسی کی وجہ سے نکلی تھی۔ کہنی کا وار زیادہ شدید تھا اور پہلے والے کے سامنے کے دانت جواب دے گئے تھے۔ اس نے مشتعل ہو کر میری شان میں مدح سرائی کی تو اس کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آیا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا اس لیے مجھے آسانی ہوئی اور میں نے دونوں کے ہاتھ پکڑ کر انہیں یوں چکر دیئے کہ میں خود درمیان میں تھا اور وہ میرے گرد گھوم رہے تھے۔ وہ حرکت کرنے پر مجبور تھے ورنہ ان کی کہنیاں اپنے جوڑوں سے نکل جاتیں پھر میں نے انہیں بیک وقت چھوڑا۔ ان میں سے ایک تقریباً اڑ کر ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے سے ٹکرایا اور اس کے ساتھ چکنا چور ہو گیا۔ کم سے کم اس کی چیخ و پکار سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ دوسرے کو جو اصل میں پہلا تھا اور اپنے کچھ دانتوں سے محروم ہو چکا تھا۔ میں نے مزید ایک چکر دے کر کونے میں رکھے لیمپ کی طرف پھینکا اور وہ اس کے ساتھ نیچے گرا۔

اس دوران میں پہلا والا کھڑا ہو گیا تھا اور اس نے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے بدستور چیخیں نکل رہی تھی۔ میں نے اس کے پیٹ پر لات ماری تو وہ پھر ڈریسنگ ٹیبل کے ملبے پر جا گرا۔ لیمپ کے ساتھ گرنے والا کچھ دیر تو لیمپ کی طرح بجھا پڑا رہا پھر حرکت میں آیا مگر اس کی حرکت سلو موشن میں تھی۔ میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا جس سے اس کی حرکت میں خاطر خواہ تیزی آ گئی۔ اسے چکر دیا تو تصادم سے پہلے ہی اس نے ہو ہو کی آواز نکالی اس بار میں نے اسے اس کے ساتھی پر پھینکا اور اس سے ٹکرا کر وہ لمبا ہوا تو ایک ہی صف میں دونوں پڑے تھے۔ تب میں نے پہلی بار ڈریسنگ ٹیبل سے ٹکرانے والے کا منہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر خون ہی خون تھا اور آنکھوں میں شیشے گھپ گئے تھے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے نہ جانے وہ کیسے ٹکرایا تھا کہ شیشے ٹوٹ کر اس کی آنکھوں میں گھس گئے تھے اور وہ اسی لیے چیخ و پکار کر رہا تھا۔

مگر مجھے اس پر ذرا بھی ترس نہیں آیا۔ وہ یہاں میری دعوت کے لیے نہیں بیٹھے تھے۔ انہوں نے جس طرح حملہ کیا اس سے لگ رہا تھا وہ میرے خاتمے کے مشن پر تھے۔

میں نے دانتوں سے محروم شخص کو کھینچ کر کھڑا کیا اور اس کی تلاشی لی۔ وہ جھول رہا تھا اور درحقیقت دونوں ہی بہت کم حوصلہ ثابت ہوئے تھے۔ اتنی مار پیٹ معمولی بات تھی اور وہ اسی میں بے حال ہو گئے تھے۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور دوسرا بھی خالی تھا۔ میں نے اسے تھپڑ مارا۔ ”کون ہو تم؟“

جواب میں اس کے منہ سے جو نکلا وہ کچھ یوں تھا۔ ”میں...... زی...... زامی...... زوں۔“

میں نے جواب واضح کرنے کو کہا مگر ہر بار اس نے وہی زے کی بولی بولی اور میں پچھتایا کہ اسے دانتوں سے کیوں محروم کیا۔ مجبوراً مجھے اندھے ہو جانے والے سے رجوع کرنا پڑا اس سے پہلے میں نے بے دانت کے منہ پر ایک گھونسا رسید کر کے اسے لٹا دیا یقیناً اس کے مزید کچھ دانت اسے داغ مفارقت دے گئے تھے۔ زخمی اب کراہ رہا تھا۔ میں نے اسے کھڑا کیا اور اس کی بھی تلاشی لی۔ اس کے پاس سے ایک عدد کھٹکے والا چاقو نکل آیا جو بٹن دبانے سے کھلتا تھا۔ انہیں نہتا پا کر مجھے پہلی بار شبہ ہوا کہ وہ فاضلی کے آدمی نہیں تھے بلکہ مرشد کے ملازم تھے اور قتل و غارت گری کے بعد یہاں چھپ گئے تھے۔ جلد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ بے دانت اصل میں مرشد کا حقہ بردار تھا اور آنکھوں سے محروم ہو جانے والا مالشیہ تھا۔ مرشد جب رات بھر کچے پکے گوشت کے ساتھ ام حرام سے شغل کر کے بے حال اور بکھرا ہوا ہو جاتا تو یہ مالشیہ ہی تھا جو اس کی زبردست مالش کر کے اسے دوبارہ کسی قابل بناتا تھا۔

حقہ بردار کا کام نازک مگر آسان تھا۔ وہ مرشد کے لیے خاص تمباکو بلینڈ کر کے حقے میں جماتا تھا۔ مالشیے نے بتایا کہ جب کوٹھی پر حملہ ہوا تو وہ اس کمرے میں چھپ گئے تھے۔ بہت دیر بعد فائر کی آواز آئی اور میں اندر داخل ہوا تو انہوں نے مجھ پر قابو پا کر یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا مگر بدقسمتی سے وہ خود میرے قابو میں آ گئے تھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے غلط لوگوں پر ہاتھ اٹھایا مگر یہ وقت افسوس کا نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس سے مزید معلومات حاصل کرنا جاری رکھی۔ وہ عام سا ملازم تھا ورنہ اتنی آسانی سے مجھے یہ سب نہ بتاتا ویسے اسے اپنی آنکھوں کی بہت فکر تھی۔ وہ ہر سوال کا جواب دے کر آخر میں یہ ضرور پوچھتا تھا کہ اس کی آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی اور میں ہر بار اسے تسلی دیتا تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس سے حاصل شدہ معلومات سے یہ بات

سامنے آئی کہ مرشد نے اپنے تمام اہل خانہ کو شہر میں مرشد ہاؤس بھیج دیا تھا۔

یہاں مرشد خود صرف چند ملازمین اور بے شمار مسلح افراد کے ساتھ تھا۔ درگاہ اور کوٹھی میں کام کرنے والے سو کے قریب ملازمین کو چھٹی دے کر گھر بھیج دیا گیا تھا اور یہاں مشکل سے دو درجن ملازم تھے۔ ان کے علاوہ وہ مرشد کے تیس سے پینتیس خاص محافظ اور ان سے زیادہ باہر سے منگوائے ہوئے مسلح افراد تھے۔ رو کے جانے والے ملازم محرم راز تھے اور وہ بھی مسلح تھے۔ میں نے سن کر کسی قدر اطمینان محسوس کیا تھا۔ یعنی یہاں کوئی ایسا فرد نہیں تھا جو عام ہو۔ میرے دل پر وہ بوجھ کم ہونے لگا جو اتنی اموات دیکھ کر فطری طور پر آ گیا تھا۔ کچھ بے گناہ بھی مارے گئے تھے مگر زیادہ تر اسی انجام کے مستحق تھے۔ وہ اب تک شرافت سے جواب دے رہا تھا پھر اس نے اپنی آنکھوں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی اور اس میں چبھے شیشے ہاتھ پر لگے تو وہ چیخ اٹھا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”یہ شیشے ہیں جو تمہاری آنکھوں میں اتر گئے ہیں۔“ میں نے اسے آگاہ کیا مگر میری توجہ اس کی طرف نہیں بلکہ باہر سے آنے والی آہٹوں پر تھی۔ میں اس سے بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا کیونکہ میرے ذہن میں تھا کہ آس پاس فاضلی کے کرگے موجود ہوں گے۔ اسے بھی آہستہ آواز نکالنے کو کہا تھا اسی لیے میں باہر سے آنے والی آوازیں سننے میں کامیاب رہا۔ وہ چپ ہوا تو باہر سے کسی کے بولنے کی آواز آئی اور میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے تڑپ کر ہاتھ ہٹانا چاہا مگر میں نے اسے جکڑ لیا۔ اس بار میں نے واضح کسی کو بولتے سنا تھا۔ میں نے اس کے کان میں کہا۔ ”شش...... باہر کوئی ہے اب آواز مت نکالنا...... ورنہ دونوں مارے جائیں گے۔“

مگر وہ جس طرح مچل رہا تھا اگر میں اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیتا تو اس نے لازمی واویلا کرنا تھا۔ زخمی ہونے سے زیادہ آنکھوں سے محرومی کے صدمے نے اس کے حواس گم کر دیے تھے۔ میری بات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تو خطرہ محسوس کر کے میں نے اسے خاموش کرنے کے لیے اس کے سر پر ایک ہاتھ مارا۔ وہ ڈھیلا ہوا تھا مگر اس کی مزاحمت ختم نہیں ہوئی تھی۔ البتہ دوسرے ہاتھ پر وہ بے سدھ ہو گیا۔ اسے زمین پر ڈال کر میں دروازے کے پاس آیا اور کان لگا کر سنا تو باہر دو افراد سرگوشیوں میں محو گفتگو تھے۔

البتہ ان کی سرگوشیاں بھی اتنا بلند تھیں کہ مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ایک کہہ رہا تھا۔ ”آواز اسی کمرے سے آئی ہے۔“

”اب کیوں نہیں آ رہی ہے؟“ دوسرے نے سوال کیا۔

”شاید اندر موجود لوگوں نے ہماری آواز سن لی ہے۔“

”تو اتنی زور سے بولنے کی کیا ضرورت تھی؟“ دوسرے نے اپنا طارق عزیز شو جاری رکھا یعنی سوالات کرتا رہا۔

”اپنی بکواس بند کر۔“ پہلے نے کہا۔ ”دروازہ کھول۔“

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اب مجھے ذرا شبہ نہیں تھا کہ باہر موجود دونوں افراد فاضلی کے آدمی تھے۔ میں نے پستول سیدھا کیا اور یکے بعد دیگرے کئی گولیاں اندازے سے چلائیں۔ جواب میں ایک چیخ سنائی دی تھی۔ چوتھی گولی چلاتے ہی میں دیوار کی آڑ میں ہو گیا اور فوراً ہی باہر سے برسٹ دروازے کو چھلنی کرتا اندر آیا اور بے سدھ پڑے بے دانت کے حقہ بردار کو چھلنی کر گیا۔ وہ بے ہوشی میں ہلکا سا تڑپ کر ساکت ہو گیا۔ مالشیے کو میں نے ذرا ہٹا کر لٹایا تھا اس لیے وہ بچ گیا۔ فائرنگ کرنے والے نے اس زاویے سے گولیاں چلائی تھیں کہ گولیاں میری مخالف سمت میں گئی تھیں اور مجھے لگا کہ وہ اب دوسری طرف سے فائرنگ کرے گا تا کہ کمرے کا زیادہ سے زیادہ حصہ کور کر سکے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے فرش پر قلابازی کھائی اور دوسری طرف چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے پھر برسٹ چلا اور اس بار گولیاں اس طرف آئیں جہاں میں دیوار سے دبکا ہوا تھا۔ بچنے والا نہایت شاطر تھا اور اس نے درست قدم اٹھایا تھا۔

جیسے ہی اس نے فائرنگ روکی میں نے ہاتھ آگے کر کے اندازے سے اس طرف دو فائر کیے۔ اس بار بھی چیخ سن کر میرا دل باغ باغ نہیں ہوا کیونکہ وہ اپنی عیاری ثابت کر چکا تھا اس لیے میں دروازے کے سامنے آنے کی بجائے پیچھے ہٹا اور پھر نیچے گرنے والا گولی کا خول اٹھا کر دروازے پر مارا ہلکا سا کھٹکا ہوا اور باہر سے اس نے بھرپور برسٹ چلایا۔ وہ صرف سامنے ہی نہیں بلکہ دائیں بائیں بھی فائر کر رہا تھا۔ اس کا شکار اندھا ہو جانے والا مالشیہ ہوا تھا وہ اٹھ رہا تھا کہ فائرنگ کی زد میں آ گیا اور دل خراش چیخ کے ساتھ دوبارہ لیٹ گیا۔ فائرنگ کرنے والے نے ایک گالی

دی اور دروازے پر لات مار کر اندر آیا۔ اس نے آتے ہی اندر پڑے دو افراد پر پھر برسٹ مارا حالانکہ وہ پہلے ہی دنیا سے گزر چکے تھے۔ میری موجودگی کا اسے ذرا تاخیر سے احساس ہوا اور پھر وہ منجمد ہوگیا۔ میں نے پستول تان رکھا تھا اور بالکل ساکت تھا میں نے آہستہ سے کہا۔

"رائفل نیچے رکھ کر دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا، آگے تمہاری مرضی ہے۔"

میں نے کہا نا وہ عیار تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ مجھ سے نہیں جیت سکے گا جب تک وہ رائفل کا رخ میری طرف کرے گا میں اسے شوٹ کر چکا ہوں گا۔ بادل ناخواستہ اس نے سر ہلایا اور آہستہ سے جھک کر رائفل نیچے رکھ دی اور دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ میں نے اگلا حکم دیا۔ "دونوں ہاتھ دروازے پر رکھو اور پاؤں پھیلا لو۔"

اس نے اس بار بھی حکم کی تعمیل کی۔ دروازہ بند ہوگیا تھا اور وہ اس پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ میں نے اس کی تلاشی لی اور اس کی قمیص سے ایک عدد پستول اور نکل آیا۔ اس کے پاس بھی وہی سائلنسر والی رائفل تھی اس لیے اس کا شور نہ ہونے کے برابر تھا البتہ میرے پستول کا شور خاصا تھا اور اس کی آواز یقیناً کوٹھی کے دوسرے حصوں تک گئی ہوگی۔ اس کی تلاشی لیتے ہی میں نے اس کی گدی پر پستول کا دستہ مارا۔ ضرب ہلکی رکھی تھی اس لیے وہ کراہ کر گرا مگر بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک تو وہ میری سفاکی کا اندازہ لگا لے دوسرے مزاحمت کے قابل نہ رہے۔ میں نے اسے سیدھا کیا اور دو زوردار تھپڑ رسید کیے۔ اس کے حواس ٹھکانے آگئے اور اس نے احتجاج کیا۔ "مجھے کیوں مار رہے ہو؟"

"صرف یہ بتانے کے لیے کہ میں کتنا رحم دل ہوں فاضلی کا آدمی ہونے کے باوجود تم کو قتل نہیں کیا۔" میں نے کہا اور پستول کی نال اس کے ماتھے پر رکھ دی۔ "لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں قتل کر نہیں سکتا۔"

اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور ان میں دہشت نمایاں نظر آنے لگی۔ "کک...... کیا چاہتے ہو؟"

"فاضلی کہاں ہے اور مرشد کس حال میں ہے۔"

"وہ دونوں اوپری منزل پر ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"تم دونوں کے علاوہ فاضلی کے اور کتنے آدمی ہیں۔"

"سات آدمی ہیں۔" اس بار بھی وہ جلدی سے بولا۔

"آٹھواں وہی ہے دیو۔"

اس کا اشارہ باسو کی طرف تھا۔ مجھے جان کر تعجب ہوا کہ مرشد زندہ تھا۔ "فاضلی نے مرشد کو کیوں زندہ رکھا ہوا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم میری اور صورت کی ڈیوٹی یہاں نیچے تھی۔"

صورت اس کا ساتھی تھا اور وہ باہر چت پڑا ہوا تھا۔ گولی اتفاق سے اس کے دل سے ذرا نیچے لگی تھی اور وہ ایک چیخ کے بعد ختم ہوگیا تھا۔ "نیچے اور کتنے لوگ ہیں؟"

"دو اور ہیں وہ پیچھے کی طرف ہوتے ہیں۔"

گویا اوپر فاضلی کے ساتھ پانچ آدمی تھے اور چھٹا باسو تھا جو اکیلا درجن کے برابر تھا۔ "تم جانتے ہو یہاں مرشد کی بیٹی اور اس کا بھتیجا آئے ہیں۔"

اس نے سر ہلایا۔ "ہم نے انہیں قابو کر کے اوپر پہنچا دیا تھا۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ گویا رومانہ اور راشد فاضلی کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ فاضلی مرشد کے ساتھ اس کے سارے خاندان کا خاتمہ بھی چاہتا تھا سوائے اپنے کیونکہ وہ بھی اسی خاندان کا ایک ان لکھا حصہ تھا۔ جب ڈیوڈ شا نے بلاواسطہ فاضلی کی یہ خواہش مجھ تک پہنچائی تب میں اسے محض ایک انتقامی جنون سمجھا تھا لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ فاضلی کسی مقصد کے تحت رومانہ اور راشد کو اپنے قبضے میں چاہ رہا تھا اور وہ کامیاب رہا تھا۔ میں نے جلد بازی میں انہیں لانے والوں کو دنیا سے رخصت کر دیا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی بچ جاتا تو وہ بتا سکتا تھا کہ انہوں نے رومانہ اور راشد کو کیسے حاصل کیا تھا؟ پھر رومانہ ہسٹریا کا شکار ہو کر کوٹھی کی طرف بھاگی تھی اس کا ردعمل فطری تھا ہر انسان مشکل وقت میں اپنی جائے پناہ یعنی اپنے گھر کی طرف جاتا ہے۔ اسے علم نہیں تھا کہ اس کا گھر اس کے لیے جائے پناہ کی بجائے عقوبت خانہ بننے والا تھا۔

مجھے ایک بار پھر شدت سے اپنے ساتھیوں کی سلامتی کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ اگرچہ وہ تر نوالہ نہیں تھے مگر فاضلی نے جو خوفناک میزائل مجھے دکھایا تھا وہ کسی ناگہانی آفت کی طرح نازل ہوتا تو وہ لوگ بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا اور اچانک میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں لہرا کر گر رہا ہوں اور میں نے اپنی ساری قوت ارادی اس پر مرکوز کر دی کہ مجھے گرنا نہیں ہے ساکت رہنا ہے۔ مگر شاید یہ ممکن نہیں تھا۔ اس بار زہر کا حملہ خطرناک اور طاقتور تھا۔ میں نے شاید سانس روک لی تھی

اور پھر جس طرح اچانک اندھیرا چھایا تھا اسی طرح اچانک ختم بھی ہوگیا اور میں نے خود کو اسی حالت میں پا کر خدا کا شکر ادا کیا ورنہ یہ عیار دشمن اب تک میرا کام تمام کر چکا ہوتا۔ میں اس پر جھکا ہوا تھا اور پستول اس کے ماتھے پر رکھا ہوا تھا۔ البتہ وہ الجھ گیا تھا شاید اس نے میری کیفیت میں تغیر بھانپ لیا تھا مگر یہ نہیں جان سکا کہ میں بالکل اندھا ہو گیا تھا۔ میں نے پستول کی نال اس کے ماتھے سے ہٹائی اور اچانک گھما کر اسے اس کی کنپٹی پر رسید کیا۔ اس کا سر گھوما اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس سے پہلے میں بے ہوش یا ناکارہ ہو جاتا اسے بے ضرر کرنا لازمی تھا۔ میں اٹھا اور بڑی مشکل سے اٹھا مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے جسم سے جان نکل گئی ہو۔

میں نے اس کی رائفل قالین سے اٹھائی۔ اس کا ایک اضافی میگزین اس کے لباس میں تھا وہ بھی نکال لیا اور پھر دروازے کے پاس آکر باہر کی سن گن لی۔ بہ ظاہر وہاں سناٹا تھا مگر یہ سناٹا غیر فطری تھا کیونکہ فائرز کی آواز نیچے موجود مزید دو افراد نے لازمی سن لی تھی اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے ساتھی کہاں گئے تھے؟ اس لیے وہ اب اسی طرف آئے ہوں گے اور باہر گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔ دشمن کو بے خبر کرنے کے لیے میں نے آزمودہ طریقہ آزمایا اور ٹوٹ جانے والے ٹیبل لیمپ کا تار کھینچ کر چاقو سے اس کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اس کے دونوں سرے چھیلے اور پھر کمرے کے سوئچ بورڈ کے ساکٹ میں ڈال کر بٹن دبایا تو شعلہ لپکا اور کمرا تاریک ہو گیا۔ میں نے نائٹ ویژن آنکھوں پر کی اور ذرا سا دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ وہاں بھی تاریکی تھی یعنی اس جگہ کا فیوز ایک ہی تھا۔ البتہ عمارت کے دوسرے حصوں میں الگ فیوز ہی ہوتے۔ شاید اس جگہ کی وائرنگ پرانی تھی ورنہ اب تو ایسا فیوز سسٹم آ گیا ہے کہ ہر کمرے کا الگ فیوز ہوتا ہے اور کسی خرابی یا شارٹ ہونے کی صورت صرف اسی کا فیوز اڑتا ہے۔

میں باہر آیا ہال وے کے آخری حصے میں روشنی جھلک رہی تھی اور یہ عام روشنی نہیں بلکہ نائٹ ویژن سے نظر آنے والی انفرا ریڈ شعاعیں تھیں۔ اس کا مطلب تھا اس طرف کوئی زندہ فرد موجود تھا جس کا جسم حرارت خارج کر رہا تھا۔ میں دبے قدموں اس طرف بڑھا تو کوئی دبی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”ادھر روشنی بند ہو گئی ہے جی..... نہیں جی پوری جگہ کی بند ہوئی ہے۔“

دوسری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بولنے والا شاید ریڈیو پر کسی کو اطلاع دے رہا تھا۔ میں نے کونے سے جھانک کر دیکھا تو ایک شخص دیوار سے ٹکا ہوا تھا اس کے ہاتھ میں رائفل تھی مگر اس کی توجہ نہیں تھی اور تاریکی میں اسے نظر بھی کہاں آتا۔ میں نے رائفل سیدھی کی اور اس کے سامنے آیا تھا۔ شاید اس کی چھٹی حس نے اسے چونکایا اور اس نے جلدی سے رائفل سیدھی کرنا چاہی لیکن اس سے پہلے میں گولی چلا چکا تھا۔ میں نے اس کے دائیں بازو کا نشانہ لیا تھا مگر گولی بازو چھیدتی ہوئی جسم میں اتر گئی۔ اس نے ایک جھٹکا لیا اور دیوار کے ساتھ پھسلتا ہوا نیچے گر گیا۔ میں نے لات مار کر اس کی رائفل دور پھینک دی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور بہ ظاہر وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے کان پر لگا ہوا ریڈیو اتارا یہ جدید قسم کا چھوٹا سا ریڈیو تھا جو کان میں فٹ ہو جاتا تھا اس کی رینج زیادہ نہیں تھی۔ میں نے کان سے لگایا مگر دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ریڈیو پھینک کر میں سیدھا ہوا تو پھر چکر آیا تھا اور مجھے دیوار کا سہارا لینا پڑا تھا ورنہ اس بار شاید میں گر جاتا۔

دیوار کے سہارے آگے بڑھا۔ ابھی مجھے نیچے ایک فرد سے اور نمٹنا تھا تب ہی میں اوپر جا سکتا تھا۔ صورتِ حال خاصی مشکل تھی میں پہلے ہی فاضلی کا قیدی تھا اور اب مجھے سانپ نے بھی ڈس لیا تھا اس کا زہر مجھے ناکارہ کر رہا تھا اور مجھے سات مسلح افراد سے نمٹ کر فاضلی کو قابو کرنا تھا تاکہ یہاں سے نکل سکوں۔ بہ ظاہر یہ ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کے برابر لگ رہا تھا۔ مگر اپنی جدوجہد کے دوران ہی میں نے ایک سبق اچھی طرح سیکھ لیا تھا کہ مجھے حالات اور امکانات سے قطع نظر عمل کرنا چاہیے۔ آگے راہیں نکالنے والا اوپر بیٹھا تھا۔ یعنی کسی بھی حال میں مایوس ہو کر جدوجہد ترک نہیں کرنی ہے۔ ویسے بھی میں پختہ دل سے مایوسی کو کفر سمجھتا ہوں۔ اس لیے اس حال میں بھی فاضلی تک پہنچنے اور اسے قابو کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ہال وے اس طرف گھومنے کے بعد تنگ سی راہداری کی صورت اختیار کر گیا تھا اس کے دونوں طرف کمرے تھے۔ آخری حصے میں ایک لاؤنج جیسا نظر آ رہا تھا اور وہاں ہلکی روشنی تھی۔ فیوز صرف اسی حصے کا اڑا تھا۔ میں راہداری کے وسط میں تھا کہ دوسرا فرد اچانک ہی لاؤنج کی طرف سے نمودار ہوا اور میں نے عجلت میں اس پر فائر کیا۔ اسی وجہ سے وہ بچ گیا۔ اس نے مجھے دیکھا نہیں تھا۔ مگر فائر نے اسے چونکایا اور وہ تیزی سے واپس آڑ میں گیا تھا۔ اپنی حماقت کا احساس ہوتے ہی میں عجلت میں پسپا ہوا کیونکہ یہاں چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ بچنے کے بعد وہ چند سیکنڈ بعد واپس

آیا اور اس نے راہداری میں رائفل کر کے برسٹ چلایا۔ میں اس سے پہلے ہی گر گیا تھا اور گولیاں میرے اوپر سے گزریں اور کچھ میرے آس پاس فرش پر لگی تھیں اس نے اندھی فائرنگ کی تھی کیونکہ وہ خود آڑ میں تھا۔ اس نے صرف ہاتھ نکال کر اندازے سے برسٹ مارا تھا۔

میں لیٹے لیٹے پیچھے کی طرف سرکا۔ پیچھے جانے کے دوران پہلے آدمی سے ٹکرایا جو دیوار سے لگا بیٹھا تھا میں اس کے دوسری طرف چلا گیا اور اس کی آڑ میں دوسرے برسٹ سے بچ گیا۔ چند گولیاں اسے لگی تھیں اور اس نے جھٹکا لیا مگر ہلا نہیں۔ پتا نہیں وہ زندہ تھا یا مر گیا تھا۔ اتنی گولیاں لگنے کے بعد اس کا بچنا مشکل ہی تھا۔ یہاں ہر فرد یکے بعد دیگرے موت کا شکار ہو رہا تھا اور چند ایک خوش نصیب تھے جو زندہ بچے تھے۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ میں اس کی آڑ میں ہی پیچھے سرکا اور پھر ہال وے میں آ گیا۔ ایک بار پھر میں بچا کیونکہ میری طرف سے جواب نہ پا کر اس نے سامنے آ کر اس بار سیدھی فائرنگ کی۔ جیسے ہی وہ رکا میں نے اسی کے انداز میں رائفل آڑ سے نکال کر اندھا برسٹ مارا۔ میری طرح وہ بھی بچ گیا اور تیزی سے آڑ میں ہو گیا۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے جسم کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہو۔ رگوں میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ ہاتھ اور پاؤں سن کی سی کیفیت میں تھے۔ میری حالت اس شرابی کی سی تھی جس نے اوقات سے زیادہ پی لی ہو۔ سر گھوم رہا تھا اور حواس قابو سے باہر ہو رہے تھے۔ یہ شاید زہر کا مزید کوئی اثر تھا کیونکہ اب تک اس نے سوائے نیند طاری کرنے کے مجھے اور کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔ یہ بھی تکلیف نہیں تھی بلکہ بے چینی تھی جو گرمائش اور سنسناہٹ کے ساتھ جسم میں پھیل رہی تھی۔ آنکھوں کے آگے ہال وے کی دیواریں اور وہاں رکھا ہوا سامان متحرک ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اسی طرح بیٹھا رہا تو سو جاؤں گا یا حواس کھو بیٹھوں گا۔

اس لیے میں کھڑا ہو گیا اور ہال وے کی دوسری طرف بڑھا اس کا ایک دروازہ یقیناً کوٹھی کے مرکزی دروازے کی طرف کھل رہا تھا اور اس طرف نہ جانے کیا تھا۔ فاضلی کے آدمی ریڈیو سے آپس میں منسلک تھے اس کا مطلب تھا کہ اوپر والوں کو نیچے جاری جنگ کا علم ہو گیا تھا اور ان کی طرف سے مزید کمک روانہ کر دی گئی ہو گی۔ یہ امکان بھی تھا کہ اس دروازے کے باہر فاضلی کے گرگے گھات لگائے بیٹھے ہوں کہ میں نمودار ہوں اور وہ میرے جسم میں چند مزید سوراخوں کا اضافہ کر دیں۔ اب فاضلی واضح طور پر میرے خاتمے پر تل گیا تھا۔ اس لیے میں اسی دروازے سے باہر آیا جس سے اندر داخل ہوا تھا۔ کھلی فضا میں آنے کے بعد بے چینی کا احساس کم ہوا تھا مگر جسم کی گرمی بڑھ رہی تھی اور سنسناہٹ کچھ زیادہ ہی ہوتی جا رہی تھی۔ یہ ایسی سنسناہٹ تھی کہ میں ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے چھوتا تو ہلکا سا کرنٹ لگتا تھا۔ نہ جانے یہ زہر کا اثر تھا یا کیا تھا؟

برآمدے میں ماربل ٹیبل پر ایک منرل واٹر کی بوتل رکھی تھی پہلے میں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا مگر اب اندر کی آگ سے گھبرا کر میں نے اسے اٹھایا اور منہ سے لگا کر اس وقت تک پیتا رہا جب تک آخری قطرہ بھی حلق سے نہیں اتر گیا تھا۔ تقریباً پون لیٹر پانی پی کر مجھے سکون ملا تھا اور اندر ابھرتی آگ میں کمی محسوس ہوئی تھی۔ ہاتھ پیروں کی سنسناہٹ بھی کم ہوئی تھی۔ میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔ چند گہرے سانس لے کر میں مرکزی دروازے سے چھوٹے دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ بھی لاک تھا اور اسے بھی کھولنے کے لیے گولی کا سہارا لینا پڑا۔ البتہ اب میرے پاس خاموش رائفل تھی اس لیے یہ کام خاموشی سے ہو گیا۔ میں اندر داخل ہوا تو یہ ایک بڑی نشست گاہ ثابت ہوئی تھی۔ شاندار قسم کے صوفوں اور فرنیچر سے مزین یہ جگہ خالی تھی۔ یہاں ہلکی روشنی کے قمقمے روشن تھے اور کچھ خوابناک سا ماحول تھا یا پھر میری جو کیفیت تھی تو مجھے خواب ناک لگ رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا وہیں کسی دبیز صوفے پر گر جاؤں اور سو جاؤں۔

اس دلی خواہش کو رد کرنے کے لیے میں خود کو خبردار کر رہا تھا کہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے اور مجھے کھوتا بننے سے گریز کرنا چاہیے۔ مجھے خود سے لڑنا پڑ رہا تھا اور جب میں نے خود سے لڑائی کی تو مجھے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ نفس سے لڑنے کو جہاد اکبر کیوں کہا جاتا ہے۔ میں آگے بڑھا تو میرے قدم لڑکھڑانے لگے تھے۔ پاؤں جیسے بے جان ہوئے جا رہے تھے۔ ایک صوفے کے پاس سے گزرتے ہوئے میں کچھ زیادہ ہی لڑکھڑایا اور پھر صوفے پر گرا۔ وہاں سے میں لڑھک کر قالین پر آ گیا۔ رائفل کی نال گلاس ٹاپ ٹیبل سے ٹکرائی اور خاصی بلند آواز آئی تھی۔ اس آواز نے دشمن کی رہنمائی کی اور وہ نشست گاہ کی طرف آیا تھا۔ مجھ میں کھڑے ہونے کی تاب نہیں تھی رائفل اٹھانا بھی دشوار لگ رہا تھا۔ دشمن اندر آیا تو کسی چیز سے ٹکرایا اور اس نے بھی اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ دشمن سر پر آ گیا تھا اور میں ہاتھ

پاؤں پھیلائے بے بس پڑا تھا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا صوفے کی دوسری طرف سے نمودار ہوا اور اس نے مجھے دیکھتے ہی رائفل کا رخ میری طرف کر دیا۔ ایک لمحے کو مجھے لگا کہ وہ ابھی فائر کھول دے گا۔ مگر اس نے اس کی بجائے ریڈیو پر کہا۔

''وہ مل گیا ہے ادھر یوں پڑا ہے جیسے بے ہوش ہو۔'' اس نے دوسری طرف سے جواب سنا اور سر ہلایا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''چل بھئی تیرا وقت پورا ہو گیا ہے، تیار ہو جا مرنے کے......''

اس کا جملہ منہ میں تھا کہ صوفے کے ساتھ لگے میرے ہاتھ میں دبے پستول سے فائر ہوا اور گولی صوفے کو چیرتی ہوئی اس کے جسم میں پیوست ہو گئی۔ اسے میری رائفل دکھائی دی تھی اس لیے وہ فطری طور پر مطمئن ہو گیا تھا اور اس نے سوچا نہیں کہ میرے چھپے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہو سکتا ہے۔ اسے اسی کا خمیازہ بھگتنا پڑا تھا۔ گولی کے جھٹکے سے وہ پیچھے گیا۔ اس نے بے ساختہ رائفل کا ٹریگر دبایا اور برسٹ چلا مگر رائفل کا رخ اوپر کی طرف ہو گیا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے اس پر پورا میگزین خالی کر دیا۔ ہر فائر کے ساتھ وہ جھٹکے سے پیچھے جاتا تھا اور ہر بار اس کی رائفل برسٹ مارتی تھی اور اس کا نشانہ نشست گاہ کی چھت اور فانوس بن رہے تھے میرے آس پاس ٹوٹے شیشوں کی بارش ہو رہی تھی۔ میں نے چہرہ چھپا لیا تھا۔

آخری گولی کے ساتھ ہی اس کی رائفل خالی ہو گئی اور وہ دھپ سے نیچے گرا تو اس کا جسم روح سے خالی ہو چکا تھا۔ وہ صوفے کے دوسری طرف تھا اور میں اسے دیکھنے سے قاصر تھا مگر وہ جس طرح گرا تھا مجھے یقین ہو گیا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ میں کچھ دیر لیٹا رہا پھر ہمت کر کے اٹھنے لگا تھا کہ نشست گاہ کے دروازے پر ایک دیو قامت سایا نمودار ہوا اور میں کراہ کر رہ گیا۔ بالآخر فاضلی نے اپنی فوج کا سب سے خطرناک ہتھیار بھیج دیا تھا میری سرکوبی کے لیے۔ میرا پستول خالی ہو گیا تھا اور مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ میں اس کا میگزین بدل سکتا اسی طرح رائفل اٹھانے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ پھر اس کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ باسو پر گولی اسی طرح بے اثر تھی جیسے مردناداں پر کلام نرم و نازک۔ باسو نے اندر آ کر میرا جائزہ لیا اور پاس آیا۔ میں پھر لیٹ گیا تھا کیونکہ میرا سر شدت سے چکرانے لگا تھا مجھے لگا جیسے باسو گھومتا ہوا میری طرف آیا ہے۔ اس نے جھک کر مجھے دیکھا اور پھر نتھنے سکیڑ کر کچھ سونگھا اور زیرِ لب بولا۔

''اسنیک پوائزن...... تمہیں سانپ نے کاٹا ہے؟''

اس نے سوال نہیں کیا تھا بلکہ تجزیہ کیا تھا کہ مجھے سانپ نے کاٹا ہے اس کے باوجود میں نے جواب دینے کی کوشش کی تھی کہ یک لخت تاریکی مکمل ہو گئی اور مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ بالآخر زہر نے مجھ پر غلبہ پا لیا تھا۔ مگر یہ غلبہ عارضی تھا چند منٹ بعد میں ہوش میں آنے لگا۔ میں اسی جگہ پڑا ہوا تھا اور باسو میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرے جسم کی حدت کم ہو رہی ہو اور ذہن پر چھائی غنودگی تیزی سے چھٹ رہی تھی۔ زہر کا اثر زائل ہو رہا تھا مگر کیسے؟ دو منٹ بعد میں اٹھ بیٹھا اور خود کو خاصا بہتر محسوس کرنے لگا تھا میں نے باسو کی طرف دیکھا اور بولنے والا تھا کہ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اپنی زرہ بکتر سے ایک گیس سرنج نکال کر دکھائی۔ اس نے اشارے سے بتایا کہ اس نے مجھے یہ انجکشن لگایا تھا یقیناً اس میں اینٹی ڈوٹ تھا یعنی سانپ کے زہر کا تریاق اور اسی وجہ سے میں اتنی تیزی سے ٹھیک ہوا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑ کر اٹھایا اور مخصوص لہجے میں غرا کر بولا۔ ''چلو۔''

ذہنی طور پر چاق و چوبند ہونے کے باوجود جسمانی کمزوری باقی تھی باسو کے سہارے کے باوجود میں لڑکھڑا گیا تھا اور اگر اس نے پکڑ نہ رکھا ہوتا تو میں گر جاتا۔ میری حالت دیکھتے ہوئے اس نے مجھے اٹھا کر اپنے شانے پر لاد لیا اور چل پڑا۔ اس کا رخ کوٹھی کے اوپر حصے کی طرف تھا۔ دنیا کو الٹے ہو کر دیکھنا ایک منفرد اور کسی قدر احمقانہ تجربہ ہوتا ہے میں اس وقت اسی تجربے سے گزر رہا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر آیا جہاں وسیع و عریض لاؤنج میں ساری پارٹی موجود تھی۔ فاضلی اپنے مسلح گرگوں کے ساتھ تھا اور ان کی تعداد اب پانچ رہ گئی تھی۔ ایک طرف کرسیوں پر مرشد، رومانہ اور راشد بندھے بیٹھے تھے اور ان کے سامنے فاضلی کسی فلمی ولن کی شان سے صوفے پر براجمان تھا اور شغل مے نوشی کر رہا تھا۔ جب باسو نے مجھے نیچے ڈالا تو اس نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ ''یہ زندہ ہے؟''

''مرنے والا ہے اسے سانپ نے کاٹ لیا ہے۔'' باسو نے بے پروائی سے کہا تو میں فوری طور پر بے سدھ نظر آنے لگا۔ فاضلی اٹھ کر میری طرف آیا اور اس نے بھی میرے جسم سے آتی بو محسوس کر لی تھی۔ اس نے اتنے قریب آنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ مجھے کرنٹ لگ جاتا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ورنہ وہ کرنٹ بھی بڑا روح فرسا

تھا۔ فاضلی نے سر ہلایا۔

"اسے سانپ نے کاٹا ہے۔ یہ یقیناً درختوں کی طرف گیا ہوگا۔ مگر یہ بچا ہوا کیسے ہے وہاں پایا جانے والا ہر سانپ اتنا زہریلا ہے کہ آدمی منٹوں میں مرجاتا ہے۔ کیوں میں نے ٹھیک کہا نا؟" فاضلی نے مرشد کی طرف دیکھا۔

"یہ غلط ہے۔" مرشد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں نے جو سانپ پالے ان میں تم سے زہریلا کوئی نہیں ہے۔"

"ہاں کیونکہ میری رگوں میں تمہارا خون ہے۔" فاضلی بولا۔

مرشد کی زرتار قبا غائب تھی اور وہ اس وقت سادہ شلوار کرتے میں ملبوس تھا۔ اس کے بال جو سلیقے سے بنے ہوتے تھے اس وقت بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر چوٹوں کے نشانات تھے۔ اس کے دائیں شانے سے کرتہ خون سے رنگین ہورہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مرشد نے بہ نفس نفیس لڑائی میں حصہ لیا تھا اور بہادری سے لڑکر گرفتار ہوا تھا۔ مرشد خوفزدہ نہیں تھا یا تھا تو ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اس کے برعکس رومانہ اور راشد کا خوف سے برا حال تھا۔ خاص طور سے رومانہ کا حسین چہرہ بگڑ گیا تھا اور مسلسل رونے سے اس کی آنکھوں کے گرد ورم آگیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ فاضلی کو انہیں قابو کیے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ مرشد نے کہا۔

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں تمہیں قتل کرنا چاہتا ہوں۔" فاضلی نے بلا جھجک کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے میں کوئی لاوارث آدمی ہوں جو تم مجھے قتل کردوگے اور کوئی نہیں پوچھے گا۔"

"کیوں نہیں پوچھے گا لیکن ان نامعلوم قاتلوں سے جو کبھی نہیں ملیں گے اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو سب مجھ سے تعزیت کریں گے اور میں بھی تمہاری یاد میں مگرمچھ کی طرح آنسو بہاؤں گا۔ بہرحال مجھ سے کوئی نہیں پوچھے گا۔" فاضلی نے یقین سے کہا۔ "میں تمہیں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا لیکن اس سے پہلے میں تم سے کچھ کاغذات پر سائن لینا چاہتا ہوں۔"

"اور تمہارا خیال ہے میں سائن کردوں گا؟" مرشد نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ "کیا میں اتنا ہی احمق ہوں۔"

"تم کروگے۔" فاضلی اطمینان سے بولا۔ "ویسے کیا تم جاننا نہیں چاہوگے کہ میں تم سے کن کاغذات پر سائن کراؤں گا؟"

فاضلی کے دو آدمی سیڑھیوں کے پاس تھے اور باقی تین ہمارے آس پاس موجود تھے۔ میں ان تینوں سے فاصلے پر قالین پر پڑا تھا اور باسو میرے سر پر موجود تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اس نے میری جان کیوں بچائی تھی۔ جب اس کا عارضی آقا میری جان لینے کے درپے تھا اور اس وقت بھی مجھے زندہ پاکر اس نے مایوسی کا اظہار کیا تھا اور اگر با سانپ کے زہر سے میری متوقع فوتگی کا اعلان نہ کرتا تو شا وہ مجھے اپنے ہاتھ سے شوٹ کردیتا۔ مگر یہ ظاہر تھا کہ با اپنے اصل آقا کی ہدایت کاری کے مطابق میرا تحفظ کر ر تھا۔ اس لیے اس نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ جب میں فوت نہیں ہوں گا تو فاضلی کا کیا ردعمل ہوگا اور اگر وہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کرے گا تو باسو کا کیا ردعمل ہوگا؟ اس کا جواب آنے والا وقت ہی دے سکتا تھا۔ یعنی میرے لیے انتظار کرو اور دیکھو کی پالیسی کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ مرشد نے پہلے کی طرح سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم مجھ سے میری جائیداد اور دولت کی ملکیت کے کاغذات سائن کراؤگے۔"

"بالکل اور ساتھ میں ایک وصیت نامہ بھی ہوگا جس کی رو سے میں گدی کا جانشین ہوں گا۔"

مرشد نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوئی گدی پر تمہارا حق تسلیم نہیں کرے گا۔"

"بالکل مانیں گے۔" فاضلی نے عیاری سے کہا۔ "اس کے لیے ایک پوری کہانی تیار کی گئی ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ جب میں اعلیٰ حضرت مرشد علی کے گھر پیدا ہوا تو بعض الہامی اشاروں پر مجھے اس غریب مرید جوڑے کے حوالے کردیا گیا تاکہ میری پرورش غریبوں میں ہو اور میں بچپن سے غریب پرور بنوں۔ الہامی اشارے پر یہ بات سب سے چھپائی گئی اور اب وقت آگیا ہے کہ اسے ظاہر کیا جائے۔ کیا خیال ہے تمہارے جاہل عقیدت مند یہ سن کر لوٹ پوٹ نہیں ہوجائیں گے۔ تم بھی تو انہیں ایسی ہی کہانیوں سے بے وقوف بناتے آئے ہو۔"

مرشد خاموش رہا تھا لیکن میں فاضلی سے متفق ہوگیا تھا۔ اس ملک میں جعلی پیروں فقیروں کا بزنس اسی وجہ سے چل رہا ہے کہ عوام عقل کی بجائے اندھی عقیدت اور جذبات سے کام لیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا دین تو سراسر عقل کا ہے۔ اس میں اندھی عقیدت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فاضلی کا دعویٰ بالکل تسلیم کیا جاتا، جب کہ درگاہ کا ہر فرد اسے مرشد کے معتمد خاص کی حیثیت سے جانتا تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ گدی پر قابض ہوتا تو طاقت بھی اس کے ہاتھ

میں ہوتی اور پھر کون اس کے سامنے کھڑا ہو سکتا تھا۔ مرشد کی طرح خود کو ناگزیر سمجھنے والے ہر انسان کے لیے اس میں عبرت تھی کہ انسان اپنی زندگی میں چاہے زمین آسمان ایک کر دے مرتے ہی اس کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ مرشد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم کہانی بنا لو گے لیکن خود کو میری اولاد کیسے تسلیم کراؤ گے؟“

”بہت آسانی سے، ڈی این اے ٹیسٹ اسی لیے تو ہوتا ہے کہ آدمی کے ماں باپ کا پتا چل جائے۔“

گویا فاضلی نے ساری تیاری کر لی تھی۔ مرشد کا چہرہ ستا گیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس گفتگو میں مداخلت کروں مگر میں تو مار گزیدہ بنا ہوا تھا اس لیے خاموش رہنا ہی مناسب تھا۔ مرشد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”یہاں جو قتل و غارت گری ہوئی ہے اس کا کیا جواب دو گے؟“

”مجھے جواب دینے کی کیا ضرورت ہے، کہانی یہ ہوگی کہ دہشت گردوں نے درگاہ پر حملہ کیا اور تم سمیت سب کو ٹھکانے لگا دیا۔ یہاں وہ ٹولہ موجود ہے جسے تم نے اپنی حفاظت کے لیے بلوایا تھا اور اس کا تعلق ایک کالعدم دہشت گرد تنظیم سے ہے۔ وہ حملہ آور شمار ہوں گے۔ میں زخمی ہونے کے باوجود بچ جاؤں گا کوئی مجھ پر شک نہیں کرے گا۔ جب میں تمہارا جانشین بنوں گا تو آج تمہارے وفادار ہیں وہ فوراً پٹری بدل کر میرے وفادار بن جائیں گے۔ پولیس انکوائری کی رپورٹ میری مرضی کے مطابق بنے گی اور تم شاید جان گئے ہو کہ میری پشت پر کون ہے۔“

”ڈیوڈ شا۔“ مرشد نے حقارت سے کہا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو وہ ہمیشہ یہاں تمہاری پشت پناہی کے لیے موجود رہے گا۔“

”نہیں لیکن جب تک میں مضبوط ہو جاؤں گا۔“ فاضلی نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے ڈیوڈ شا کی حیثیت کی نفی سے گریز کیا کیونکہ یہاں باسو موجود تھا۔

”پھر بھی میرے بچے موجود ہیں تم ان کے ہوتے ہوئے جائیداد اور گدی پر قبضہ نہیں کر سکتے ہو۔“

”کیوں بچوں کی سی بات کر رہے ہو جب میں نے تمہارے سارے چچازادوں کو معہ خاندان کے ختم کر دیا ہے تو یہ چند بچے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ میں ان کو آرام سے ایک ایک کر کے ختم کر دوں گا۔“

بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ فاضلی صورت حال پر حاوی ہو گیا تھا مگر مرشد نے ابھی حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ ”اگر میں سائن کرنے سے انکار دوں تو؟“

اس پر فاضلی نے معنی خیز نظروں سے رومانہ اور راشد کی طرف دیکھا۔ ”میں نے انہیں کس لیے حاصل کیا ہے اور بڑی مشکل سے حاصل کیا ہے۔ شہباز کے ساتھیوں کو بہت چکر دیئے تب کہیں جا کر انہوں نے اس جوڑے کو میرے حوالے کیا۔“

فاضلی کی بات نے میرے اندر موجود بے چینی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ راشد اور رومانہ فاضلی کے ہاتھ میرے ساتھیوں سے کسی ڈیل کی صورت میں لگے تھے۔ اینٹی ڈوٹ دینے سے میری حالت ہر گزرتے لمحے بہتر ہو رہی تھی۔ جسم کی گرمی اور سنسناہٹ ختم ہو گئی تھی۔ ذہن پر طاری ہونے والی غنودگی سرے سے غائب تھی اور اب مجھے لگ رہا تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں بھی میرے قابو میں آتے جا رہے ہیں۔ شاید پندرہ بیس منٹ میں اس قابل ہو جاتا کہ کسی ہنگامہ آرائی میں حصہ لے سکتا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ مرشد اپنی بیٹی اور داماد کی طرف سے بے پروا نظر آ رہا تھا اس نے ایک بار بھی ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ فاضلی کی بات پر اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میرا ان دونوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”تعلق تو ہے۔“ فاضلی نے کہا اور رومانہ کی طرف بڑھا اس نے رومانہ کا چہرہ اپنے ہاتھ میں جکڑ کر مرشد کی طرف گھمایا۔ ”یہ تمہاری جوان اور حسین بیٹی ہے۔ اگر تمہارے سامنے اس کے ساتھ کوئی برا سلوک ہو تو تمہارے دل کو تکلیف تو ہوگی۔“

رومانہ مچل رہی تھی مگر اس سے اپنا منہ نہیں چھڑا سکتی تھی۔ فاضلی نے خود اسے چھوڑا اور پھر وہ راشد کی طرف بڑھا اور اچانک اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ اس کا منہ گھوم گیا اور ہونٹوں سے خون بہہ نکلا تھا۔ رومانہ نے چیخ ماری تھی۔ فاضلی ہنسا۔ ”یہ تمہارا عزیز بھتیجا ہے۔ تمہارے دل میں اس کے لیے بھی کچھ نہ کچھ جگہ تو ہوگی۔“

”یہ دونوں میرے مجرم ہیں اور میرے آدمی انہیں تلاش کر رہے تھے۔ اگر یہ مل جاتے تو اب تک کسی نامعلوم قبر میں دفن ہو چکے ہوتے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ انہیں شہباز نے پناہ دی ہوئی ہے۔“

”واقعی؟“ فاضلی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ”تم واقعی ان کے ساتھ یہ سلوک کرتے؟“

”میں نے کہا نا میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے تم ان کے ساتھ جو چاہے کرو۔“ مرشد کا لہجہ مزید سخت ہو گیا مگر مجھے

لگا اس سختی کے اندر کہیں کچھ اور بھی تھا۔ دوسرے فاضلی نے رومانہ کے لیے جس طرح کے الفاظ استعمال کیے تھے میرے اندر ایک خیال سر سرانے لگا۔ مگر میری عقل اسے مسترد کر رہی تھی کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کوئی کتنا ہی شیطان کیوں نہ ہو جائے اپنی بہن کو بری نظر سے کیسے دیکھ سکتا ہے۔ رومانہ اس کی سوتیلی بہن تھی بے شک یہ رشتہ قانونی نہیں تھا۔ فاضلی نے پھر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"کچھ بھی کروں اور بے شک تمہارے سامنے کروں۔"

"ذلیل......" راشد نے تڑپ کر کہا۔ "اپنا گندہ منہ بند رکھ۔"

فاضلی نے اس کا جواب یوں دیا کہ پے در پے راشد کے منہ پر کئی مکے رسید کیے اور صحیح معنوں میں اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ وہ ذرا نازک نوجوان تھا اور اس کے لیے یہ چند مکے بھی بہت تھے۔ مگر وہ حوصلے سے برداشت کرتا رہا اور رومانہ چلّا رہی تھی۔ مرشد البتہ خاموش تھا اور اس کا چہرہ مزید ستا گیا تھا۔ فاضلی نے اپنا ہاتھ روکا اور پھر راشد کی شرٹ سے ہاتھ پر لگنے والا اس کا خون صاف کیا۔ اس نے اطمینان سے مرشد کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اب کیا کہتے ہو ویسے تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں کس حد تک جا سکتا ہوں۔"

"ہاں مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔" مرشد نے کہا۔ "لیکن میں تمہاری بات نہیں مانوں گا۔ میں نے کہا نا تم ان کے ساتھ جو چاہے کرو۔"

فاضلی سفاک انداز میں مسکرایا۔ "میری بھی یہی خواہش ہے کہ تم اتنی آسانی سے نہ مانو۔"

"کیا کرو گے تم ان دونوں کو مار دو گے؟" مرشد حقارت سے بولا۔ "پھر مجھے مار دو گے؟"

"ارادہ تو یہی ہے لیکن اتنی آسانی سے نہیں۔" فاضلی بولا۔ "پہلے میں تمہارے سامنے تمہاری بیٹی کو بے آبرو کروں گا۔"

"کتے کے بچے۔" راشد چلّایا اور رومانہ دہشت زدہ انداز میں رونے لگی۔ میں نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"فاضلی مجھے اندازہ نہیں تھا تم اس قدر ذلیل اور شیطان صفت شخص نکلو گے۔"

"تعجب ہے۔" اس نے مصنوعی حیرت کے ساتھ کہا۔ "میری ولدیت کے بارے میں جان کر بھی تم میرے بارے میں ایسا خیال رکھتے تھے؟"

ابوالحسن علی احمد بن محمد ابن مسکویہ پہلا مسلمان تھا جس نے نظریۂ ارتقا کو مبسوط انداز میں پیش کیا۔ ابن مسکویہ (وفات 1030ء) کی معرکتہ الآرا تصنیف "تہذیب الاخلاق" افلاطون اور ارسطو کے فلسفے کو نئی نہج پر لے جاتی ہے۔ ابن مسکویہ نے فلسفے میں اخلاق کو داخل کیا تا کہ فلسفی گمراہ اور ملحد نہ ہو جائے۔ ابن مسکویہ سے پہلے عثمان عمر الجاحظ (وفات 869) ایک ماہر حیاتیات نے یہی نظریہ پیش کیا تھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ انسان پہلے معدنیات کی صورت میں تھا پھر نباتات میں آیا۔ اس کے بعد حیوانات کی صورت اختیار کی اور پھر بڑی جدوجہد کے بعد انسان بنا۔

اقتباس: تناظرات اسلامی سائنس از ڈاکٹر عطش درانی

"ہاں اس کے باوجود خیال نہیں آیا۔ کاش کہ میں تمہیں قتل کر سکتا۔"

"تم نہیں میں تمہیں قتل کروں گا۔" اس نے کہا۔ "میں نے طریقہ بھی سوچ لیا ہے۔"

"انسان سوچتا بہت کچھ ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو اوپر والا چاہتا ہے۔" میری بات پر اس نے بھنویں سکیڑ کر مجھے دیکھا اور کسی قدر مشکوک لہجے میں بولا۔

"کیا بات ہے تم میں بڑا دم خم نظر آ رہا ہے۔ بہ ظاہر تو تم قریب المرگ تھے۔" وہ کہتے ہوئے میرے قریب آیا اور اس نے جائزہ لیا۔ "تمہیں اب پسینا بھی نہیں آ رہا ہے۔"

میں نے جواب دینے سے گریز کیا۔ فاضلی نے باسو سے پوچھا۔ "تم کہہ رہے تھے اسے سانپ نے کاٹا ہے اور یہ مر جائے گا اسے یہاں آئے ہوئے دس منٹ سے اوپر ہو گئے ہیں اور اب تک اس کے مرنے کے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے یہ میرے اور تمہارے اندازے سے زیادہ سخت جان ہو۔" باسو نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "شاید سانپ ٹھیک سے ڈس نہ سکا ہو۔"

فاضلی کی آنکھوں میں شک نمایاں تھا پھر اس نے مکارانہ انداز میں کہا۔ "اچھی بات ہے یہ اتنی جلدی نہ مرے اور بہت کچھ دیکھ کر میرے ہاتھوں مارا جائے۔ مجھے دنیا میں کسی شخص کو قتل کرنے کی اتنی خواہش نہیں ہے جتنی اس شخص کو قتل کرنے کی ہے۔"

"فاطمہ مرشد کے بارے میں تم ایسے ہی خیالات رکھتے ہو۔" میں نے کہا۔ اس نے مرشد کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کچھ بھی صحیح لیکن ہے تو میرا باپ، اس وقت بھی مجھے اس پر رحم آرہا ہے لیکن شہباز ملک تمہارے لیے میرے اندر صرف ایک ہی جذبہ ہے۔"

راشد جو کچھ دیر پہلے تک فاضلی کو گالیاں دے رہا تھا اب گھبرایا ہوا لگ رہا تھا اس نے فاضلی سے کہا۔ "سنو، مرشد ٹھیک کہہ رہا ہے اگر اس کا بس چلے تو ہمیں اپنے ہاتھ سے مار کر اپنے کتوں کو کھلا دے۔"

"تب میں بھی یہی کروں گا۔" فاضلی ہنسا۔ "اپنے باپ کی آخری خواہش سمجھ لو۔"

وہ رومانہ کی طرف بڑھا تو وہ چلّانے لگی تھی۔ جب اس کے منہ پر خون گرا تھا تب وہ جیسے حواس کھو بیٹھی تھی اور اس وقت بھی وہ اسی طرح جنونی ہو رہی تھی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا وہ اپنے باپ کے کیے کی سزا بھگتنے جا رہی تھی۔ فاضلی اسے کھولنے لگا۔ جیسے ہی وہ آزاد ہوئی اس نے فاضلی کا منہ نوچنے کی کوشش کی مگر ایک تھپڑ کھا کر واپس کرسی پر گری تھی۔ فاضلی نے ذرا لحاظ نہیں کیا کہ وہ بہت نازک سی لڑکی تھی۔ راشد پھر چلّانے اور گالیاں دینے لگا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو باسو نے اپنا بھاری ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا اس کی آنکھوں میں اشارہ تھا کہ میں خاموش رہوں۔

لیکن میرے سامنے ایک عورت کی بے حرمتی ہو اور بے شک وہ میرے بدترین دشمن کی بیٹی کیوں نہ ہو، مجھ سے یہ قطعی برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے مرشد سے کہا۔ "تمہارا مقدر موت ہے اور تمہارا یہ ناجائز بیٹا کسی کو نہیں چھوڑے گا۔ پھر کیوں ذلت کے ساتھ مر رہے ہو۔ اگر تمہارے نزدیک اپنی کوئی عزت نہیں ہے تو اپنی بیٹی کو تو عزت سے مرنے دو۔"

"تم اسے نہیں جانتے۔" مرشد نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اگر میں نے سائن بھی کر دیے تب بھی یہ یہی سب کرے گا۔"

"لعنت ہو تم پر ایک امکان پر تم یہ سب برداشت کرنے کو تیار ہو گئے ہو جسے کوئی باپ برداشت نہیں کر سکتا۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

فاضلی نے رومانہ کو بے رحمی سے نیچے گرایا اور اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا لاؤنج کے وسط میں موجود کاؤچ کی طرف لے جانے لگا۔ اس نے رومانہ کو کاؤچ پر دھکا دیا اور مرشد سے بولا۔ "شاید تم تیار ہو، لیکن یہ شو بہت طویل ہوگا اس میں میرے بعد یہ سب بھی حصہ لیں گے۔" اس نے اپنے آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "شو اس وقت تک جاری رہے گا جب تک تم مان نہیں جاتے یا پھر یہ مر نہیں جاتی۔"

فاضلی کسی شیطان کی طرح ننگا ہو کر سامنے آگیا تھا۔ انسان اپنے وجود کے نہاں خانوں میں کس قدر گندہ اور بے غیرت ہو سکتا ہے آج میں اس کی انتہا دیکھ رہا تھا۔ میں انتہائی شدت سے خواہش کر رہا تھا کہ اللہ مجھے ایک موقع دے اور میں آنِ واحد میں اس شخص کو جہنم رسید کر دوں۔ مگر میں مجبور تھا۔ جب میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو فاضلی کے دو آدمیوں کی گنوں کا رخ میری طرف ہو گیا تھا اور اس وقت وہ میری طرف سے پوری طرح چوکنا تھے۔ پھر باسو کا ہاتھ میرے شانے پر کسی چٹان کی طرح جما ہوا تھا۔ مرشد کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات تھے وہ شدید اندرونی کشمکش کا شکار تھا۔ اچانک رومانہ چلّائی۔ "پاپا......"

فاضلی ہنسا۔ "تمہاری لاڈلی بیٹی نے تمہیں پکارا ہے جو تمہارے منہ پر کالک مل کر بھاگ گئی تھی۔"

"فاضلی میں تیار ہوں۔" مرشد نے کہا۔ "لیکن میری ایک شرط ہے رومانہ کو جانے دو۔"

فاضلی نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہرگز نہیں، اسی کی موجودگی میں تم سائن کرو گے۔ ورنہ تم بعد میں مکر سکتے ہو۔"

"میں نے سائن کر دیے اور تم نے پھر بھی یہی سب کیا تو......؟"

"تو مجبور تم ہو میں نہیں۔" فاضلی بولا۔ "اور یہ سائن بھی میرے لیے بیکار ہیں میں خود کر سکتا ہوں اور کوئی اسے چیلنج نہیں کرے گا۔"

"تب تم میرے سائن کیوں چاہتے ہو؟"

"اپنی تسکین کے لیے۔" فاضلی نے بلا جھجک کہا۔ "میں تمہیں اپنے سامنے جھکا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اب اس سے زیادہ اور کیا جھکوں۔" مرشد تلخی سے بولا۔ "میرے ہاتھ کھولو میں سائن کے لیے تیار ہوں۔"

فاضلی کے اشارے پر اس کے ایک گرگے نے مرشد کے ہاتھ کھول دیے۔ اس کے سامنے ایک چھوٹی میز لا کر رکھی اور فاضلی نے وصیت نامے اور ملکیت کے کاغذات کی فائل معہ پین اس کے سامنے رکھ دی۔ مرشد نے فائل کھولی۔

"مجھے بتاؤ کہاں سائن کرنے ہیں۔"

"ایک یہاں؟" فاضلی نے انگلی رکھی۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ مرشد کی رضامندی سے خوش نہیں تھا غالباً

وہ چاہتا تھا کہ مرشد مزاحمت کرے اور وہ مرشد کو ذلیل کرنے کے لیے رومانہ کو بے آبرو کرے۔ مرشد نے خاموشی سے سائن کر دیئے۔ فاضلی نے صفحے پلٹے اور پھر ایک جگہ انگلی رکھی۔ "اب یہاں سائن کرو۔"

اس وقت مرشد نے جو کیا وہ میں نے کیا بہت چوکس فاضلی نے بھی نہیں سوچا تھا۔ اس نے اچانک پین فاضلی کی آنکھ میں گھسانے کی کوشش کی۔ یہ دھات کا بنا ہوا اعلیٰ درجے کا بال پوائنٹ تھا۔ اگر مرشد کا نشانہ ٹھیک بیٹھتا تو فاضلی شدید زخمی ہو جاتا اور وہ مر بھی سکتا تھا کیونکہ آنکھ کے صرف دو انچ پیچھے دماغ ہوتا ہے مگر اس کی بدقسمتی کہ اس کا نشانہ درست نہیں بیٹھا اور بال پین کی نوک فاضلی کی آنکھ کے پاس رخسار کو چیرتی چلی گئی۔ وہ بچنے کی کوشش میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا تھا۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی اور اس نے بے ساختہ ہاتھ زخم پر رکھا جس سے خون پھوٹ رہا تھا۔ مرشد اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ صرف اس کے ہاتھ آزاد تھے اور جسم کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ فاضلی کے ایک آدمی نے عقب سے اس کے سر پر ہلکی ضرب لگائی اور پھر اس سے بال پین چھین لیا جسے مرشد نے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تھا۔ فاضلی کا ایک آدمی اسے اٹھانے کے لیے آیا تو فاضلی نے خود اٹھتے ہوئے اسے تھپڑ مارا۔ یہ کمہار کا غصہ گدھے پر نکالنے والی بات تھی۔ پھر وہ آگے آیا اور جھولتے مرشد کے چہرے پر پوری قوت سے تھپڑ مارنے لگا۔ ہر تھپڑ پر مرشد کا چہرہ گھوم جاتا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے پر نئے زخم نمایاں ہو گئے۔

بہ ظاہر میں بے بس تھا کیونکہ باسو کے قبضے میں تھا میرے بائیں شانے پر اس کی گرفت سخت تھی۔ میں بہت زور لگاتا تو شاید اس کی گرفت سے نکل جاتا مگر اس دوران میں دوسروں اور خود باسو کو میرے خلاف کارروائی کا موقع مل جاتا۔ اس کا رویہ میری سمجھ سے بالاتر تھا ایک طرف وہ فاضلی کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا اور مجھے اس کے معاملات میں مداخلت سے باز رکھے ہوئے تھا تو دوسری طرف وہ میرا فیور بھی کر رہا تھا۔ مرشد کے حملے اور پھر فاضلی کی جوابی کارروائی میں تقریباً سب کی توجہ ان کی طرف ہو گئی تھی۔ باسو تک بہت دل چسپی سے مرشد کی مرمت کا منظر دیکھ رہے تھے۔ صرف رومانہ اس معاملے میں ناخوش تھی۔ فاضلی کے جو آدمی مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے اب ان کی نظر بھی مجھ پر نہیں تھی۔ اس لیے جب میں نے باسو کے ران سے بندھے ہولسٹر سے اس کا پستول نکالا تو فوری طور پر کسی کو پتا نہیں چلا۔

یہ خاصا وزنی اور خوفناک پستول تھا جو شاید خاص طور سے باسو جیسے دیو قامت کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا۔ بہر حال میں اسے استعمال کر سکتا تھا۔ فاضلی کے ساتھ ہی اس کا گرگا کھڑا تھا اور وہی میرے لیے سب سے بڑا خطرہ تھا اس لیے میں نے پہلے اسے ہی نشانہ بنایا۔ خوفناک دھماکے کے ساتھ اس کا سر تقریباً غائب ہو گیا اور اس کا خون اور مغز اچھل کر فاضلی اور مرشد پر گرا تھا۔ وہ گرا تو میں نے اسے پیچھے کھڑے دوسرے شخص کو نشانہ بنایا گولی نے اس کا بایاں شانہ اڑا دیا تھا۔ پستول سچ مچ بھی خوفناک تھا اس کی گولی ہلاکت خیزی میں شاٹ گن جیسی تھی۔ باسو چونکا اور اس نے میرا شانہ چھوڑ کر مجھ سے پستول چھیننے کی کوشش کی مگر میں اس کی ٹانگوں کے درمیان گر گیا۔ اس اثنا میں فاضلی کے باقی آدمیوں نے مجھ پر فائر کھول دیا۔ یہ اور بات تھی کہ گولیاں باسو کے جسم پر لگیں اور زرہ بکتر سے اچٹ گئیں۔ وہ اب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا اور مجھے قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ فائرنگ کے خلاف میری ڈھال بھی بنا ہوا تھا۔

فاضلی کے ایک آدمی نے گھوم کر مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی کہ میں نے اسے شوٹ کر دیا۔ گولی نے اس کے پیٹ اور سینے کے سنگم پر کوئی چھ انچ کا سوراخ کر دیا تھا اور وہ تیورا کر گرا تھا۔ باسو مجھے قابو کرنے کی کوشش کے ساتھ اپنا بچاؤ بھی کر رہا تھا کیونکہ اس نے ہیلمٹ کا شیشہ ہٹایا ہوا تھا اور اس کا چہرہ غیر محفوظ تھا۔ ساتھ ہی وہ دھاڑ کر فائرنگ بند کرنے کو کہہ رہا تھا۔ میں اس کی ٹانگوں میں اس طرح پھنسا ہوا تھا کہ وہ مجھے قابو نہیں کر پا رہا تھا۔ اسی دوران میں مجھے موقع ملا اور میں نے ایک طرف جاتے فاضلی پر فائر کیا مگر وہ عین موقع پر جھک گیا اور قضا اس کے ایک آدمی کی آئی تھی۔ وہ اس کے عین پیچھے تھا۔ فاضلی غائب تھا میں نے اندازے سے اس طرف باقی ماندہ گولیاں چلا دیں جہاں فاضلی گرا تھا۔ البتہ یہ خیال رکھا کہ رومانہ زد میں نہ آئے۔ اپنے چار ساتھیوں کی موت پر پانچواں آدمی دیوانہ ہو گیا تھا اور اندھا دھند برسٹ مار رہا تھا اگر باسو میری ڈھال نہ ہوتا تو اب تک میں چھلنی ہو چکا ہوتا۔

پھر باسو نے اچانک میرے سر پر ہاتھ مارا اور اس ضرب نے مجھے ناک آؤٹ کر دیا۔ ضرب شدید نہیں تھی اگر باسو پوری قوت استعمال کرتا تو میرا سر ٹوٹ جاتا مگر اس نے ناپ تول کر ضرب لگائی تھی۔ میں زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا

تھا مجھے ہوش آیا تو ہاسو میرے سر پر موجود تھا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پشت پر پلاسٹک کی کس جانے والی ڈوری سے باندھ دیئے تھے۔ فاضلی پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا اور اس کی گالیوں کا ہدف میں تھا۔ میں سر جھٹک کر اٹھا تو فاضلی میز کے ساتھ کھڑا بوتل سے براہِ راست شراب اپنے حرام وجود میں اتار رہا تھا۔ ہر گھونٹ کے ساتھ وہ مجھے گالیاں دیتا تھا۔ اس کے زخم سے بہنے والا خون اس کی شرٹ تک آ رہا تھا مگر اسے پروا نہیں تھی۔ اس کا پانچواں ساتھی جو اپنے حواس کھو بیٹھا تھا ایک طرف بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ شاید اسے ہاسو نے بے ہوش کیا تھا۔ رومانہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ مرشد اور راشد پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر فاضلی میری طرف آیا اور جھک کر زہریلے لہجے میں بولا۔

''بس یہی کر سکتے تھے تم؟''

''نہیں تمہیں بھی کتے کی موت مار دیا ہوتا اگر مجھے ایک لمحہ اور ملتا تو تم اس وقت جہنم میں ہوتے۔''

''لیکن تم مجھے مار نہیں سکے۔'' اس کا لہجہ فاتحانہ ہو گیا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تمہیں میں ماروں گا اور میں نے طریقہ بھی سوچ لیا ہے۔ میں نے اس کی حد پچاس گز کر دی ہے۔'' اس نے کڑے کی طرف اشارہ کیا۔ ''جیسے ہی تم مجھ سے پچاس گز دور جاؤ اس میں بھرا زہر تمہارے جسم میں اتر جائے گا اور اس بار تم بچ گے نہیں۔''

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''میری موت اسی طرح لکھی ہو۔''

''اور جب تم مرو گے اس وقت میں اسے پامال کر رہا ہوں گا۔'' اس نے رومانہ کی طرف دیکھا۔

''تم شیطان سے پست انسان ہو یہ تمہاری بہن ہے۔''

''تم نے کہہ دیا کہ میں شیطان سے بھی گیا گزرا ہوں تو تم مجھ سے کیا توقع کرتے ہو۔'' فاضلی نے کہا اور پلٹ کر مرشد کی طرف گیا۔ ''بس چند منٹ اور پھر میں تمہیں اس دنیا کی ہر تکلیف سے آزاد کر دوں گا۔''

''ہاسو مجھے کھول دو۔'' میں نے اپنی طبیعت پر جبر کر کے التجا کی۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ فاضلی شیطانی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ''یہ میرے حکم کا غلام ہے میں اسے جو کہوں گا یہ وہی کرے گا کیوں ہاسو؟''

ہاسو نے پھر سر ہلایا۔ جیسے فاضلی کی بات کی تصدیق کر رہا ہو۔ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ''تب وہ تمہارا نام نہاد آقا مجھ سے کیا چاہتا ہے کیا وہ میری لاش کو لے کر جائے گا۔''

فاضلی ہنسا۔ ''تم نے ٹھیک کہا وہ تمہاری لاش لے جائے گا اسی لیے اس نے مجھے اجازت دی ہے کہ تم کو قتل کر دوں۔''

میں دنگ رہ گیا۔ ڈیوڈ شا نے یہ راستہ نکالا تھا۔ بے اختیار میرے منہ سے اس کی شان میں ناگفتنی نکل گئی تھیں۔ فاضلی پھر ہنسا اور ہاسو سے بولا۔ ''اسے کوٹھی سے باہر لے جاؤ، کم سے کم پچاس گز دور۔''

ہاسو نے مجھے شانے سے پکڑ کر اٹھایا اور سیڑھیوں کی طرف دھکیلا میں نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن اس کی جناتی قوت کے سامنے میری ایک نہ چلی اور وہ مجھے سیڑھیوں تک لے آیا۔ تب فاضلی رومانہ کی طرف بڑھا۔ راشد چلانے لگا تھا۔ سیڑھیوں سے نیچے آتے ہوئے میں نے مرشد کی آواز سنی وہ فاضلی سے التجا کر رہا تھا کہ وہ اسے مار دے لیکن اس کی بیٹی کو چھوڑ دے۔ میں اب ہاسو کو گالیاں دے رہا تھا جو مجھے موت کی طرف دھکیل رہا تھا۔ مگر گولیوں کی طرح اس پر میری گالیاں بھی اثر نہیں کر رہی تھیں۔ وہ مجھے نیچے لایا اور پھر کوٹھی سے باہر لے جانے لگا۔ جب اس نے مجھے برآمدے سے نیچے دھکیلا تو میں ذہنی طور پر مرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا اور میں نے ہاسو سے کہا۔ ''ٹھیک ہے مجھے موت قبول ہے لیکن تم اس لڑکی کو بچا سکتے ہو۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے فاضلی کے معاملے میں مداخلت سے منع کیا گیا ہے۔''

میں نے گہری سانس لی اور آگے بڑھا اب ہاسو کو مجھے دھکیلنا نہیں پڑ رہا تھا۔ ہم پورچ میں آئے یہاں سے کوٹھی کے اوپری لاؤنج کا فاصلہ شاید پچاس گز تھا۔ میں جیسے ہی پورچ کے وسط تک پہنچا میری کلائی میں بندھے کڑے میں کچھ حرکت ہوئی اور ایک تیز چبھن سی محسوس ہوئی تھی۔ فوراً میرا سر چکرایا اور میں نیچے گر گیا۔ تب میں نے ڈرائیو وے سے ایک گاڑی کو آتے دیکھا۔ وہ رکی اور اس سے وسیم اور عبداللہ اترے تھے۔ میرے ساتھی آ گئے تھے لیکن انہوں نے آنے میں ذرا تاخیر کر دی تھی۔ ان سے پہلے فرشتۂ اجل مجھے لینے آ گیا تھا میری آنکھیں دھندلا رہی تھیں اور جسم سے جیسے جان نکل رہی تھی میں نے دل میں کہا۔ ''الوداع میرے دوستو اب میدانِ حشر میں ملاقات ہو گی۔''

ذہن تاریک ہوا اور موت کا سناٹا چھا گیا تھا۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(محمد عمران جونانی کراچی کا جواب)

عائشہ اختر.........حیدرآباد

رہتے ہیں بے خبر جو آئینِ جستجو سے
ہر مرحلے پہ بازی الفت کی ہارتے ہیں

(اکبر علی چنیوٹ کا جواب)

شاہد جہانگیر شاہد.........پشاور

شہتوت کا رس تھا نہ غزالوں کے پرے تھے
اس بار بھی میں جشن میں تاخیر سے پہنچا

(محمد عقیل چٹھہ حافظ آباد کا جواب)

مرزا ہادی بیگ.........لطیف آباد

ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فراز
رات تو رات ہم دن میں بھی جلاتے ہیں چراغ

نعمت اللہ.........پشاور

اب کون سے موسم سے کوئی آس لگائے
برسات میں بھی یاد نہ جب ان کو ہم آئے

(نصرت جاوید خان کراچی کا جواب)

نعمان اصغر عطاری.........شارجہ یو اے ای

دیارِ غیر میں یہ پوچھنا ہی پڑ گیا اگر
بلا کر بے وطن کو رہنے دیتے ہیں یہاں کب تک

اصغر علی.........کراچی

دل سے کب اک ذہن اک دل ایک جاں سمجھا ہے تو
دوست ہم کو دور ہی سے ہم زباں سمجھا

(مرزا ہادی بیگ حیدرآباد کا جواب)

ماہ رخ.........لطیف آباد

وقت ہی بے مہر تھا حالات ہی بے فیض تھے
کون سا غم تھا جو محسن ہم نے اپنایا نہ تھا

(فاروق شاہد کراچی کا جواب)

نادیہ افضل.........شاہ پور

اکھڑی ہوئی سانسوں نے جو آثار بتائے
لوگوں نے مرے چہرے سے محسوس کیے ہیں

فاروق بٹ.........جھنگ صدر

اس قیامت کے زمانے میں گویے کا الاپ
جھنگ والوں کے لیے حشر کی انگڑائی ہے

نعمان اشرف.........کراچی

آؤ کچھ دیر اندھیرے سے یوں ہی جی بہلے
رنگ پھیکا ہے چراغوں کا سحر ہو شاید

عطرت حسام.........کراچی

اے ہم نفسو آؤ کہ اب ہم سے اکیلے
جشن اپنی تباہی کا منایا نہیں جاتا

(انیل کمار دسوانی سکھر کا جواب)

فاروق صادق.........کراچی

یارب ترے کرم کی کوئی انتہا نہیں ہے
تابع ہمیں کیا ہے شہِ نامدار کا

(ابرار نفیس حیدرآباد کا جواب)

طلعت جبیں.........لاہور

میں تمہارا تھا مگر دنیا کا بن کر رہ گیا
جب یہاں سے جاؤں پھر ہو کر تمہارا جاؤں میں

(منشی محمد عزیز مئے لڈن کا جواب)

آفاق احمد.........ڈی آئی خان

بدلنا ہی پڑے گا اب نظام میکدہ ساقی
ہزاروں رند ہیں دو ایک پیمانے سے کیا ہوگا

احمد توحید خان.......... کراچی

بجا ہے دیر و حرم کا بھی احترام مگر
خیال عظمتِ انساں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(شاہد جہانگیر شاہد پشاور کا جواب)

ارتضیٰ انیس.......... کراچی

یہ بھی نہ ہو جسارت پرواز کی سزا
طائر کبھی اڑا تو تہہ دام آگیا

(فاروق شاہد کراچی کا جواب)

سعید احمد چاند.......... کراچی

وہ رضا جس کو غزل میں تھی آپ ہی کی پھبن
واقعہ تھا ایک زمانے میں اب افسانہ ہوا

(نورین اسلم کا جواب)

محمد عمران جونانی.......... کراچی

یک لخت جو گرا تو جڑیں تک نکل آئیں
وہ پیڑ جسے آندھی میں کبھی ہلتے نہیں دیکھا

(نورین تبسم سکھر کا جواب)

منشی محمد عزیز مے لڈن.......... وہاڑی

آنکھوں کے دریچوں سے ذرا جھانک کے دیکھو
دروازۂ دل پہ کوئی مہمان کھڑا ہے

(نسیم اختر نیازی لالہ موسیٰ کا جواب)

عباس ملتانی.......... ملتان

نہ گلِ زخم کوئی اب ہے نہ گلدستہ مہر
خواب تنہائی کو مہکائے چلے جاتے ہیں

محمد مدثر عزیز مے لڈن.......... وہاڑی

نگاہوں کے تصادم سے یہ کیسا انقلاب آیا
اِدھر آنکھوں نے جرأت کی، اُدھر رخ پر نقاب آیا

اصغر رضوی.......... سکھر

برگ نئی کامنی من موہنی کنج کامنی
شعلہ رخ، شمشاد قامت فرش لب شاداب رنگ

(اکرم علی بھٹو میر پور خاص کا جواب)

سعید احمد چوہان لڈن.......... وہاڑی

تجھ کو کہاں چھپائیں کہ دل پر گرفت ہو
آنکھوں کو کیا کریں کہ وہی خواب دیکھنا

(بلقیس قمر جھنگ کا جواب)

عبدالرحمٰن.......... چک WB89

انہی کے سائے میں پھر آج دو دھڑکتے دل
خموش ہونٹوں سے کچھ کہنے سننے آئے ہیں

(نصرت جاوید کراچی کا جواب)

منشی عبدالرزاق تبسم.......... لڈن

دل محو انتظار ہے آنکھیں ہیں فرشِ راہ
آؤ تو کبھی چاہنے والوں کے شہر میں

(عاشق حسین خان پور کا جواب)

عنایت علی.......... کراچی

سیلِ عمرِ رواں کا ہر قطرہ
سیلِ عمرِ رواں میں ڈوب گیا

نیاز کھوسو.......... حب بلوچستان

ساتھ پھرتے ہیں غریب الوطن کے سائے
اپنی ہستی ہے نہ اپنوں میں نہ بیگانوں میں

(عارف محمود سانگھڑ کا جواب)

نسرین مجتبیٰ.......... لاہور

حال کا لمحہ ماضی کی ایک ایک صدی پر بھاری ہے
کیا جانے کس آنے والے دور کی یہ تیاری ہے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش
109
30 دسمبر 2014ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات ہمیں 30 دسمبر 2014ء تک علمی آزمائش 109 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کرلیں
69
(شعر الگ کاغذ پر ہے)

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی۔ 74200

علمی آزمائش۔ 109

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

سرگزشت کے قاری ''یک علمی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 دسمبر 2014ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

اس نے کلکتہ کے ایک زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ بچپن سے ہی اسے ڈراما اسٹیج کرنے کا شوق تھا۔ خود ہی لکھتا پھر اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ مل کر گھر ہی کے ایک بڑے دالان میں اسے پیش کرتا، کچھ اور بڑا ہوا تو اسے شاعری کا شوق ہوا۔ اس صنف سخن میں اس نے اتنی مہارت حاصل کی کہ اس کے مجموعہ کلام پر نوبل انعام دیا گیا۔

علمی آزمائش 107 کا جواب

خلیج عقبہ کے شمال میں زمین کے ایک بڑے حصے پر غاصبانہ قبضہ کر کے بسایا گیا ملک جہاں دنیا کی سب سے سازشی قوم آباد ہے۔ اس نے پہلے سازش سے ایک بڑا رقبہ حاصل کیا پھر 1967ء میں پڑوس کے کئی ممالک پر ایک ساتھ حملہ کر کے ان ممالک کی زمینوں پر قبضہ کر لیا اور آج بھی وہ اپنے تمام پڑوسی ممالک کو آنکھیں دکھاتا رہتا ہے۔ اس ملک کا نام اسرائیل ہے۔

انعام یافتگان

1- حکیم اللہ اچکزئی۔ ڈی جی خان 2- ارباز کاظمی۔ کوئٹہ 3- صابرہ خاتون۔ اسلام آباد
4- نوازش علی قادری۔ کراچی 5- نوید احسن۔ لاہور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔
کراچی سے علی رضا، سید محمد ذکی، ناعمہ تحریم، ماہ رخ، ناہید نعیم، سید عزیز الدین، ماسٹر عبدالغنی، محمد احمد، یاسین خان، اکبر علی رئیسانی، ہارون محمد، ارشد علی، فتحیاب خان، محمد فیضان، امروز اسلم ملک، ثاقب سجاد، محمد عاقب جنید، سید محمد احسن نواز، عبدالخالق چوہدری، عبدالقادر، یاسمین ملک، فرزانہ مصطفیٰ، کائنات مرزا، شاہینہ اسلم چوہدری،

روایت خان' کلثوم شہزاد' سرفراز اکرم خان' عنبرین شاہد' محمد اسلم' خواجہ خیر محمد، انیس بھٹو، نواز سلیم کھوکھر، فہیم بٹ، مہوش علی خان، عنبرین اختر، منظر حسن، اسرار احمد، قیام الدین انصاری، فرحین بشیر، سعید اللہ مروت، وردہ بتول، تنویر حسین، صوفی تبسم، فیروز رحمانی، خاقان احمد، عنایت گجر، سبطین سید، فرحت عباس۔ لاہور سے شہزاد جاوید، نعمان شہزاد، نیاز چوہان، عبدالخالق چوہان، نواز کبیر، کائنات مرزا، احمد علی بٹ، یاسمین فرحت، توصیف باری، بشریٰ اصغر' صفدر ملک' ارشد محمد ولی' صبیحہ نواز۔ کھاریاں سے: شعیب اقبال۔ طاہر پورہ' بہاولپور سے: شاہ رخ ہاشمی۔ کوٹلی' مصباح الرضا، فہد علی، کاظم علی، عباس رضا، آل پنجتن، نعیم عباس، اقبال اصغر۔ ملتان سے ڈاکٹر محمد خالد، مسعود اعوان، محمد معین الدین چشتی، محمد افتخار، رخسانہ یاسمین، گل باز خان، خالد آفریدی، خالد حسن، احمد یار، نصیر احمد، قیام الدین، فوزیہ اختر، الطاف گوہر، ذکیہ حسن، نفیسہ جمال، مظہر قادری، ارشد آفاق۔ رحیم یار خان سے حضور بخش کنول (خان پور) خالد ظہور، عتیق الرحمن، قیام الدین، ماسٹر فیض الحسن، فلک شیر، ثنا مرزا، کوکب حسن، نوشین ملک، شمروز خان، عقیل احسن، حبیب الرحمن، اصغر بیگ۔ ساہیوال سے صوفی مبارک علی، ساجدہ عندلیب' فاخر حسین' مصباح الرضا' بشریٰ فرحان، فہیم عباس۔ شیخوپورہ سے معیب بٹ، ندا ممتاز، ثریا فاطمہ، ممتاز خان، عقیل احمد۔ جہلم سے نعمت اللہ، ابرار شیخ، کنیز کبریٰ، جاوید الحسن، تقی عثمان۔ مظفر آباد سے نیاز ملک، نوشین بھٹ، زونا حسن، اشفاق کیانی۔ حیدرآباد سے انعام اللہ فرحت، قاضی ریاض الحسن، اقبال چشتی، کائنات گجر، عباس زیدی، سفیر احمد، سید علی سید، گل باز، نواز بلوچ، امتیاز حسین، نسیم کھوکھر، رمیش دیو دانی، ارشد کوکب۔ پشاور سے شیر نواز گل، خاقان خان، خالد آفریدی، قیام بنگش۔ بہاولنگر سے امتیاز شاہین، اطہر احمد لاشاری، عنایت علی، صغریٰ بیگم، کلیم الدین احمد، ارباب خان، افضل ابڑو، نیاز احمد، فرید عباسی، ذکیہ امتیاز، حسین محمد، انعام الحسن۔ بہاول پور سے منور علی، سر اکرم ملک، مہوش خان، بلقیس فرحت، زاہد خان، نواز کھوکھر، فہیم بٹ، نواز علی، سندس خان۔ کوئٹہ سے نعیم خان، اکبر خان، ذیشان فتح اللہ، فصیح الدین، نواز بلوچ، افتخار الدین، حکیم الدین احمد، عبدالقادر، غلام پنجتن چنگیزی، کلیم اختر، عنایت اللہ، فاطمہ خالق، سید محمد رضا کاظمی، خاقان خان، انتخاب حسین۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ، خاقان خان، ظفر گریوال، نعمان بٹ، فرحت لغاری۔ خانیوال سے راؤ مظہر الیاس (رحمان گڑھ) ارباب حسین، شمیم الدین، عباس خان، راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، احمد یار، فصاحت حسین زیدی، اکبر علی، عباس بٹ، حوریہ مجاہد خان، زنوبیہ، شیریں فاطمہ، عنایت حسین، فیض بھٹ، حکیم الدین شمس، طہر علی خان، عثمان مہر۔ کوہاٹ سے عجب خان، ابرار اچکزئی، فدا حسین طوری، نعمت خان، ارشاد کوہاٹی۔ جامشورو سے نیاز ملکھانی، کلیم اختر، انیس بھٹو، زیب حسن، مجاہد علی۔ نور افضل خان خٹک' مجید الرحمن' ثانیہ فرید' مسز یمین نصیر۔ ڈی جی خان سے ارشد علی، غالب حسن، فتح محمد خان، نیاز خان۔ مظفر گڑھ سے ارباب رضا، فاخرہ یاسین، غلام مصطفی، عندلیب احمد۔ محسن اختر بلوچ' سعید احمد چاند' سید عزیز الدین' نہال قیوم' شکیل اشرف' ساجد حمید' وجاہت' اسد علی' عبدالرؤف کھتری' دانش قریشی' وکیل عثمان' نشا خان' میر جاوید' ظفر سلطان' بلقیس عثمانی' سعید حیدر' امجم' اعتبار علی' رابعہ اختر' پروین بھٹو۔ ڈی جی خان سے سعدیہ گل، جمیل چیمہ، شمس اصغر۔ ڈی آئی خان سے محمد اکبر، عابد علی، رخسانہ اکمل، مدیحہ ناز، ساجد علی سلمانہ فردوس' خلیل احمد صدیقی' زونی۔ سرگودھا سے اقرار سلطان، شمائلہ سلطان۔ سیالکوٹ سے اشرف خان، دروغہ خان، احمد جاوید، شکیل خانزادہ۔ جھنگ سے فہد علی، عدنان رفیع، کاظم علی سعید، مغیص احمد، نادر شاہ۔ تلہ گنگ سے تنویر حسین، فصاحت عثمان۔ شادی پور سے انعام الحق۔ شجاع آباد سے نیاز احمد قریشی، غلام حسین زیدی، نذر حسین زیدی۔ مظفر گڑھ نواں شہر سے: محمد سجاد راجپوت۔ وزیر آباد سے: توقیر اشرف۔ طٰہٰ یاسین' نسرین رانا' توقیر جمالی' نزہت پروین' مسکان بھٹو۔ آزاد کشمیر سے: پروفیسر خالد جاوید۔ ڈڈیال ضلع میرپور آزاد کشمیر سے: محمد ہارون۔

بیرون ملک پاکستان سے سلمان فردوس، زونی کشمیری (العین)، ساجد علی پاکستانی (دمام)، میر صادق، کنیز زینب، اشرف زیدی (شارجہ)، سعادت علی خان (ہمبرگ)، سلطان منگریو (اوہاما)، روشن خان (اومان)، زاہد علی (عمان سعودیہ)

بہروپیا

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
یہ میری اپنی نہیں میری ایک دوست ارم کی سرگزشت ہے۔ اس نے زندگی کو کیسے برتا۔ حالات نے اسے کس کس طرح چکر پھیریاں دیں یہی کچھ میں نے اس سرگزشت میں بیان کیا ہے تاکہ لوگ سبق حاصل کرسکیں۔

امیمہ سلیم
(کراچی)

ارم کالج سے لوٹی تو وہ پسینے میں تر تھی۔ چہرہ دھوپ کی تمازت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے کتابیں ایک طرف پھینکیں، چپل اتاری اور فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی اور گلاس کا تکلف کیے بغیر بوتل سے ہی منہ لگا لیا۔

وہاں سے دوبارہ کمرے میں آئی تو آمنہ بیگم نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”ارے تم کب آئیں اور تمہارا منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟“

”امی، گرمی دیکھ رہی ہیں آپ اس پر بسوں کے دھکے اور گھر سے بس اسٹاپ اور پھر بس اسٹاپ سے کالج تک پیدل چلنا...... آپ لوگوں کو تو ذرا احساس نہیں ہے۔“

”اپنے باپ سے کہو کہ وہ تمہارے لیے کسی شان دار گاڑی کا بندوبست کردیں، تم اتنی ننھی بچی نہیں ہو کہ تمہیں حالات کا علم نہ ہو۔“

”تو میں کیا کروں؟“ ارم جھنجلا کر بولی۔ ”اسی طرح گرمی اور دھوپ میں جھلستی رہوں۔ دھوپ میں جل جل کر میرا تو رنگ بھی کالا پڑ گیا ہے۔“ پھر وہ چھت کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”ایک یہ صدیوں پرانا پنکھا ہے، اس سے تو برائے نام ہوا بھی نہیں نکلتی۔ ابو کم سے کم ایک اسپلٹ تو لگوا ہی سکتے ہیں نا۔“

”اور بجلی کا جو بل آئے گا وہ کون دے گا؟“ آمنہ بیگم تلخی سے بولیں۔ ”تمہیں تو کسی بادشاہ کے محل میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ مہارانی کے مزاج ہی نہیں ملتے، اپنی خوب صورتی کا اتنا ہی خیال ہے تو کالج چھوڑ دو اور گھر بیٹھو۔“ آمنہ بیگم بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔

”اونہہ، کالج چھوڑ دو اور گھر بیٹھو۔“ ارم نے ماں کی نقل اتاری۔ ”میری بھی کیا زندگی ہے۔ نہ اچھا کھانے کو ہے نہ پہننے کو۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترسنا پڑتا ہے۔“ وہ بیڈ پر ڈھے گئی۔

احمد صاحب کسی سرکاری ادارے میں آفس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ان کی قلیل آمدنی میں جو کچھ ہو رہا تھا وہی غنیمت تھا۔ وہ تو شکر ہے مکان اپنا تھا ورنہ شاید ان لوگوں کو فاقے کرنا پڑتے۔ آمنہ بیگم بہت سلیقہ شعار اور سگھڑ خاتون تھیں۔ اس قلیل آمدنی میں انہوں نے ارم سے بڑی دو بیٹیوں رابعہ اور سعدیہ کی شادیاں بھی کی تھیں۔ نہ صرف شادیاں کی تھیں بلکہ انہیں حتی المقدور تعلیم بھی دلائی تھی۔ وہ دونوں صابر و شاکر لڑکیاں تھیں۔



اگر وہ بھی ارم کی طرح ناشکری ہوتیں تو احمد صاحب اور آمنہ بیگم کی زندگی حرام ہو جاتی۔

اب انہیں ارم کی شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے کمیٹی بھی ڈال رکھی تھی۔ اس کمیٹی کی وجہ سے گھر میں تنگ دستی مزید بڑھ گئی تھی کیونکہ احمد صاحب کی تنخواہ کا ایک معقول حصہ کمیٹی میں چلا جاتا تھا۔

انہیں اب اپنے اکلوتے بیٹے ناصر سے ہی امید تھی کہ پڑھ لکھ کر وہی گھر کے حالات بدل سکتا تھا۔ ناصر انجینئرنگ کر رہا تھا۔ وہ انتہائی محنتی اور ذہین لڑکا تھا۔ این ای ڈی تک بھی اپنی محنت اور ذہانت ہی سے پہنچا تھا۔ وہ اب بھی اپنے تعلیمی اخراجات ٹیوشنز پڑھا کر پورے کرتا تھا اور صبح کا نکلا رات گئے گھر میں داخل ہوتا تھا۔

ارم سب سے چھوٹی تھی، اس لیے بڑی بہنوں، باپ اور بھائی کے لاڈ میں بگڑ گئی تھی۔ آمنہ بیگم چاہتی تھیں کہ جلد از جلد ارم کی شادی ہوتا کہ وہ بھی سکون کا سانس لے سکیں۔

ساری دوپہر سونے کے بعد ارم اپنے کمرے سے نکلی تو خاصی تروتازہ نظر آ رہی تھی۔ یوں بھی وہ بہت پرکشش اور خوب صورت لڑکی تھی۔ وہ اکثر شکوہ کرتی تھی کہ اللہ نے اگر مجھے شکل وصورت اچھی دی تھی تو میرے نصیب بھی اچھے بناتا۔

کمرے سے نکل کر برآمدے میں پڑے ہوئے تخت پر بیٹھ گئی۔ آمنہ بیگم نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ دیا۔ ایک پلیٹ میں تھوڑے سے پاپڑ بھی تھے۔

''امی، کیا آپ روز روز یہ پاپڑ اور پکوڑے سامنے رکھ دیتی ہیں؟'' اس نے ناگواری سے کہا۔

''جو مل رہا ہے اسے بھی غنیمت جانو اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ لاکھوں، کروڑوں لوگ تو ایسے ہیں جنہیں دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں ہے اور تم......''

''امی پلیز۔'' ارم نے ماں کی بات کاٹ دی۔ ''اب پھر سے اپنا لیکچر شروع مت کر دیجیے گا۔'' اس نے چائے کا مگ اٹھا لیا۔

اسی وقت احمد صاحب گھر میں داخل ہوئے۔ وہ چہرے سے تھکے تھکے نظر آ رہے تھے۔ سر کے تمام بال سفید ہو چکے تھے۔ ان کی عمر پچپن سال کے لگ بھگ تھی لیکن وہ دیکھنے میں اپنی عمر سے دس سال بڑے لگتے تھے۔

ارم نے وہیں سے انہیں سلام کیا۔ ''السلام علیکم ابو۔''

''وعلیکم السلام۔'' وہ اس کے سلام کا جواب دے کر وہیں تخت پر بیٹھ گئے اور جوتے اتارنے لگے۔ آمنہ بیگم فوراً ان کی چپل لے آئیں۔

وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ ''آج تو کچھ زیادہ ہی تھکن ہوگئی۔ بسوں میں اتنا رش تھا کہ ان میں پاؤں رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی اتنی تھکن دفتر میں نہیں ہوتی جتنی آنے جانے میں ہوتی ہے۔'' وہ یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ وہاں سے کپڑے بدل کر باہر نکلے اور صحن میں لگے ہوئے واش بیسن کے سامنے کھڑے ہو کر منہ دھونے لگے۔ آمنہ بیگم ان کے لیے بھی چائے اور پاپڑ لے آئیں۔

انہوں نے پاپڑ کھاتے ہوئے کہا۔ ''واہ کیا زبردست پاپڑ بناتی ہو تم، مزہ آ گیا۔''

ارم کو شفقت چچا یاد آئے۔ وہ احمد صاحب کے کزن تھے۔ خاصے آسودہ حال تھے۔ طارق روڈ پر ان کی اپنی گارمنٹس کی بہت بڑی دکان تھی۔ وہ احمد صاحب سے عمر میں بڑے تھے لیکن ان سے دس سال چھوٹے لگتے تھے۔

احمد صاحب اکثر ان کے گھر جاتے تھے۔ شام کی چائے پر ان کے گھر میں بہت اہتمام ہوتا تھا۔ سموسے، پکوڑیاں، دہی بڑے، گرم گرم جلیبیاں۔ وہ اکثر سوچتی تھی کہ امی بتاتی ہیں کہ شفقت چچا بھی پہلے ملازمت کرتے تھے لیکن پھر انہوں نے ملازمت چھوڑ کر اپنا کاروبار شروع کر لیا۔ اس میں اللہ نے ایسی برکت دی کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کروڑپتی ہو گئے لیکن ارم یہ نہیں جانتی تھی کہ شفقت چچا کی آمدنی میں اللہ کی برکت سے زیادہ ان کی اپنی حرکت کا دخل تھا۔ وہ پی ڈبلیو ڈی میں سپروائزر تھے۔ وہاں انہوں نے دل کھول کر پیسا بنایا پھر ملازمت چھوڑ کر اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ ان کی صرف چار بیٹیاں تھیں، بیٹا کوئی نہیں تھا ورنہ امی کو خوش فہمی تھی کہ اگر ان کا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ ارم کو ضرور اپنی بہو بناتے۔

''وہ کیا زینت بہن آئی تھی؟'' احمد صاحب نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے پوچھا۔

ارم وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اب اس کی شادی کا موضوع زیر بحث آنے والا ہے۔ زینت خالہ کا کام رشتے لگانا تھا پھر ارم کو محلے کے ان چھچھورے اور نکمے لڑکوں کا خیال آیا جو اس کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ وہ صرف آتے جاتے ارم کو گھورتے تھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے ارم، ناصر کی بہن ہے۔ ناصر سے محلے کا ہر لڑکا ڈرتا تھا۔ یہ نہیں ہے کہ وہ محلے کا دادا تھا یا اس کا تعلق کسی گینگ سے تھا۔ ہاں وہ غصے کا بہت تیز تھا۔ نڈر بھی تھا اور دو سال پہلے محلے میں پیدا ہونے والے ایک خود ساختہ بدمعاش کو دھول چٹا چکا تھا۔ ناصر سے مار کھانے کے بعد اس بدمعاش نے وہ محلہ چھوڑ دیا تھا کیونکہ ناصر نے اس کی دہشت ہی ختم کر ڈالی تھی۔

ارم، ناصر کو کچھ نہیں بتاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر میں نے بھولے سے بھی کسی لڑکے کی شکایت کر دی تو ناصر اس کے ہاتھ پیر توڑ دے گا۔

راشد بھی اس کے حسن کا اسیر تھا۔ وہ ان ہی کے محلے میں رہتا تھا لیکن اس نے کبھی ارم کے راستے میں کھڑے ہو کر اسے نہ تو گھورا تھا، نہ کبھی اس کا پیچھا کیا تھا۔ پولی ٹیکنیک سے ڈپلوما کرنے کے بعد وہ کسی انجینئرنگ فرم میں ملازمت کرتا تھا۔ ارم بھی اس کا احترام کرتی تھی۔ وہ ارم کے نزدیک سے سر جھکا کر اور نظریں نیچی کر کے گزر جاتا تھا۔ ناصر سے بھی اس کی دوستی تھی لیکن اب وہ ان کے گھر کبھی کبھار آتا تھا ورنہ اس کا بچپن تو ناصر کے ساتھ کھیلتے ہی گزرا تھا اور وہ آزادانہ ان کے گھر بھی آتا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ارم بہت چھوٹی تھی اور رابعہ اور سعدیہ، ناصر سے خاصی بڑی تھیں۔

اس دن ارم کالج سے واپس آئی تو وہ خالہ شاہدہ کو گھر میں دیکھ کر چونکی۔ خالہ شاہدہ راشد کی امی تھیں۔ وہ کبھی کبھار زینت بیگم کے پاس آجایا کرتی تھیں۔

ارم انہیں سلام کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

فوراً ہی زینت بیگم نے اسے آواز دی۔ ''ارم، ادھر آؤ۔''

وہ کمرے سے باہر نکلی تو خالہ شاہدہ مسکرا کر بولیں۔

''بیٹا، تم تو بالکل غیر ہو گئی ہو۔ تمہاری امی تو نہیں نکلتیں وقت نہیں ملتا انہیں تم تو کبھی آسکتی ہو۔''

''جی خالہ...... بس وہ کالج سے آنے کے بعد کہیں آنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ میں کسی چھٹی والے دن آؤں گی۔''

وہ خالہ شاہدہ کے پاس وہیں تخت پر بیٹھ گئی اور بے تکلف ہو کر ان سے باتیں کرنے لگی۔ خالہ شاہدہ کچھ دیر بیٹھ کر وہاں سے چلی گئیں۔

ان کی آمد کا عقدہ تو اس وقت کھلا جب احمد صاحب آفس سے لوٹے۔

وہ چائے پینے کے لیے حسبِ معمول برآمدے میں پڑے ہوئے تخت پر بیٹھ گئے۔ ارم اپنے کمرے میں پرانی سی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے بال سلجھا رہی تھی لیکن اسے احمد صاحب اور زینت بیگم کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

''آج شاہدہ بہن آئی تھیں۔'' زینت بیگم نے ان کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔'' احمد صاحب نے صرف اتنا ہی کہا۔

''یہ نہیں پوچھیں گے کہ وہ کیوں آئی تھیں؟ وہ ارم کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔'' زینت بیگم نے نسبتاً دھیمے لہجے میں کہا لیکن ارم نے سن لیا۔ وہ سنگ کر رہ گئی۔

''ارم کا رشتہ......؟'' احمد صاحب نے پوچھا۔

''ہاں بھئی، راشد ماشاءاللہ ڈپلوما کرنے کے بعد بہت

ابھی ملازمت کر رہا ہے۔''

''ہاں لڑکا تو محنتی، ذہین اور شریف ہے۔'' احمد صاحب نے کہا۔'' دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ محلے کا ہر شخص اس کی شرافت کی مثالیں دیتا ہے۔''

''تو پھر میں شاہدہ بہن کو ہاں کر دوں؟'' زینت بیگم کے چہرے پر آسودگی بکھری ہوئی تھی۔

''اتنی جلدی مت کرو۔'' احمد صاحب نے کہا۔'' تم تو ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتی ہو۔ بھئی پہلے ناصر سے مشورہ کرلو۔ رابعہ اور سعدیہ کو بھی بلالو۔ ان کی بھی رائے لے لو پھر سب سے بڑھ کر ارم کی مرضی تو معلوم کرو۔''

''ارم کی طرف سے آپ بے فکر رہیں۔'' زینت بیگم نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔'' وہ منہ پھٹ ضرور ہے لیکن اب ایسی بھی نہیں ہے کہ ہماری بات ماننے سے انکار کر دے گی۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔''

''اتنا تو مجھے بھی یقین ہے کہ ارم ہمارے فیصلے کا احترام کرے گی لیکن پھر بھی تم رابعہ، سعدیہ اور ناصر سے مشورہ کرلو۔''

''آپ کہتے ہیں تو یہ بھی کرلوں گی۔ ویسے بھی کل اتوار ہے۔ رابعہ اور سعدیہ آجائیں۔ ان سے بھی مشورہ کرلوں گی۔ ان کے تو سامنے کا بچہ ہے۔ دیکھا بھالا ہے وہ بھی خوش ہو جائیں گی۔''

ارم دل ہی دل میں کھول رہی تھی۔ وہ راشد سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ راشد اسے بھلا کیا دیتا وہی زندگی جو وہ اب تک گزار رہی تھی۔ وہی ایک سو بیس گز کا چھوٹا سا مکان، وہی شب و روز، راشد پڑھا لکھا تھا، ذہین تھا، خوب رو اور خوش لباس تھا لیکن زندگی محض دیانت اور خوش لباسی کے سہارے تو نہیں گزاری جا سکتی۔

ارم تو کسی ایسے شخص سے شادی کرنا چاہتی تھی جو دنیا کی ہر نعمت کو پلک جھپکتے میں اس کی جھولی میں ڈال دے، اسے اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات، چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے یوں ترسنا نہ پڑے۔ اس نے بھی فیصلہ کرلیا کہ وہ امی، ابو کے اس فیصلے کے خلاف ڈٹ جائے گی۔

دوسرے دن ناہید کے گھر سے واپسی پر راشد سے اس کا سامنا ہوا تو ارم نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ وہ گھر میں داخل ہوئی تو رابعہ باجی اور سعدیہ باجی موجود تھیں۔ ان کے آنے پر ارم کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ خاص طور پر رابعہ باجی کی تین سالہ بیٹی نورین اور سعدیہ باجی کا ننھا وکی تو اس کی جان تھا لیکن آج بہنوں کو دیکھ کر بھی اسے بہت برا لگا۔ وہ جانتی تھی کہ ان کی آمد کا مقصد کیا ہے؟

ناصر باہر جانے لگا تو زینت بیگم نے اسے روک لیا اور بولیں۔'' مجھے تم سے ایک ضروری مشورہ کرنا ہے، ادھر کمرے میں چل دیے۔''

ناصر نے چونک کر زینت بیگم کو دیکھا اور بولا۔'' کیسا مشورہ امی؟'' وہ وہیں ان کے پاس تخت پر بیٹھ گیا۔'' جی بولیں۔''

''تم تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔'' زینت بیگم نے منہ بنایا۔

''ایسی کیا بات ہے امی؟'' ناصر نے کہا۔'' اچھا میں ابھی ایک گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔''

''ایک گھنٹے میں آجانا، تمہاری بہنوں کو واپس بھی جانا ہے۔''

ارم اپنے کمرے میں بیٹھی کھولتی رہی۔ احمد صاحب چھٹی والے دن ناشتے کے بعد اخبار لے کر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ اس وقت بھی اپنے کمرے میں بیٹھے اخبار ہی پڑھ رہے تھے۔

اسی وقت نورین اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور ارم سے بولی۔'' خالہ کیا آپ مجھ سے کٹی ہیں؟''

''نہیں گڑیا۔'' ارم نے اسے اپنی گود میں بٹھالیا۔

''میں تم سے کٹی ہو ہی نہیں سکتی۔ تم تو اتنی پیاری ہو۔''

''آپ بھی بہت پیاری ہیں خالہ۔'' نورین نے معصومیت سے کہا۔'' مگر آج آپ نے مجھے ٹافی نہیں دی ناں، مجھ سے کوئی بات بھی نہیں کی۔''

''ارے میں اپنی گڑیا کو ابھی ٹافیاں دیتی ہوں۔ تم ایسا کرو وکی کو بھی بلالاؤ۔'' پھر وہ دونوں بچوں کے ساتھ ایسی مگن ہوئی کہ اپنا غصہ ہی بھول گئی۔

رابعہ باجی اس کے کمرے میں داخل ہو کر بولیں۔ ''ہاں بھئی، بھانجی، بھانجے کے سامنے ہماری تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ جب سے میں آئی ہوں تم اپنے کمرے میں بند ہو۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے باجی۔'' ارم جلدی سے بولی۔'' نورین کی باتیں ہی ختم نہیں ہو رہی تھیں۔''

''یہ تو گھنٹوں اسی طرح میرا دماغ چاٹتی رہتی ہے۔''

اسی وقت زینت بیگم نے رابعہ کو آواز دی تو وہ اٹھ کر چلی گئیں۔ ارم نے سوچا، شاید بھیا آگئے ہیں۔ اب امی کے

بند کمرے میں اجلاس ہوگا۔ وہ جانتی تھی کہ رابعہ باجی اور سعدیہ آپی دونوں امی کے فیصلے کی مخالفت نہیں کریں گی۔ وہ دونوں تو راشد کی تعریف ہی کریں گی۔ ناصر بھی راشد کو پسند کرتا تھا۔ وہ سب یہی رائے دیتے کہ لڑکا بہت اچھا ہے آپ ہاں کردیں۔ رہے ابو تو وہ ایک طرح سے اپنی رائے دے چکے تھے۔

وہ اجلاس آدھے گھنٹے میں ہی ختم ہوگیا۔ گھر کا ہر فرد خوش نظر آرہا تھا پھر سعدیہ آپی اس کے کمرے میں آئیں اور بولیں۔ ''ارم، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''آپی، آپ تو آتے ہی ابو کے کمرے میں گھس گئیں۔ اتنے دن بعد تو آپ آئی ہیں۔ مجھے بھی آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔''

''لیکن پہلے تم میری بات سن لو۔'' آپی نے ہنس کر کہا۔ ''تم یہ بتاؤ، راشد تمہیں کیسا لگتا ہے؟'' آپی کی آواز دھیمی ہوگئی۔

''کون راشد آپی؟'' ارم انجان بن کر بولی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ فیصلہ کن گھڑی آن پہنچی تھی۔

''یہ اپنا راشد۔'' آپی نے یوں کہا جیسے راشد ان کا بھائی یا بیٹا ہو۔ ''خالہ شاہدہ کا بیٹا۔''

''یہ اچانک آپ کو راشد بھائی کا خیال کیسے آگیا؟ بہت اچھے ہیں۔ پورا محلہ ان کی تعریف کرتا ہے۔'' ارم نے سنبھل کر جواب دیا۔

''اصل میں خالہ شاہدہ تمہیں اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔''

''سوری آپی۔'' ارم سرد مہری سے بولی۔ ''میں ان کی بہو نہیں بننا چاہتی۔''

آپی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''لیکن ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ راشد تمہیں اچھا لگتا ہے؟''

''اچھا لگنے کا یہ مطلب تو نہیں آپی کہ میں اس سے شادی بھی کرلوں۔''

زینت بیگم اور رابعہ شاید اس کمرے کے نزدیک ہی تھیں۔ وہ دونوں ایک ساتھ اندر آگئیں۔ زینت بیگم کے چہرے پر برہمی تھی۔ وہ درشت لہجے میں بولیں۔ ''تم اب اتنی منہ پھٹ ہوگئی ہو کہ اپنی شادی کے معاملے میں بھی بے حیائی سے منہ پھاڑ کر بول رہی ہو۔ کیا خرابی ہے راشد میں؟''

''امی میں نے کب کہا کہ راشد بھائی میں کوئی خرابی ہے۔'' ارم نے کہا۔ ''لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ میں ان سے شادی کرلوں۔''

''ہاں، تمہارے لیے تو کوئی شہزادہ اترے گا آسمان سے۔'' زینت بیگم بھڑک کر بولیں۔

''امی آپ غصہ مت کریں۔'' سعدیہ نے کہا۔ ''یہ ذہنی طور پر ابھی تک بچی ہی ہے۔ میں سمجھاؤں گی اسے۔'' زینت بیگم بکتی جھکتی باہر نکل گئیں۔

ان کے جانے کے بعد سعدیہ نے کہا۔ ''دیکھو ارم، زندگی کے فیصلے یوں بغیر سوچے سمجھے نہیں کیے جاتے۔ اچھی طرح سوچو، سمجھو پھر کوئی فیصلہ کرو۔ ہمیں دیکھو، ہماری سسرال کتنی بڑی ہے۔ ہم تو اس میں بھی گزارہ کررہے ہیں۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ راشد اکلوتا ہے۔ نہ نندیں نہ دیور پورے گھر پر تم ہی راج کروگی۔ خالہ شاہدہ بھی عادت کی بہت اچھی ہیں۔ تم تو انہیں بچپن سے جانتی ہو اور خالہ تو بے چاری نہ لینے میں نہ دینے میں۔''

''آپ کی سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں آپی۔'' ارم نے کہا۔ ''لیکن میں راشد سے شادی نہیں کروں گی۔''

''کیوں نہیں کروگی؟'' سعدیہ کو بھی غصہ آگیا۔ ''آخر کوئی وجہ بھی تو ہو، کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟'' سعدیہ تلخ لہجے میں بولی۔ ''اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتادو۔ میں تمہاری شادی وہاں کروادوں گی۔''

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں آپی۔'' ارم نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''پھر تمہارے انکار کی کیا وجہ ہے؟'' سعدیہ نے پوچھا۔

''بس میں راشد سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' ارم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ سعدیہ مایوس ہوکر کمرے سے نکل گئی۔

گھر میں عجیب سی کشیدگی پھیل گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سعدیہ اس کے پاس آئی۔ اس نے بھی ارم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن ارم نے اس کی بھی ایک نہ مانی۔ وہ بھی غصے میں پیر پٹختی کمرے سے باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد ارم کو معلوم ہوا کہ اس کی دونوں بہنیں جارہی ہیں۔ اسے اپنی بہنوں سے بہت محبت تھی۔ وہ تڑپ کر اپنے کمرے سے باہر نکلی اور بولی۔ ''آپ لوگ اتنی جلدی کیوں جارہی ہیں؟ کھانا کھا کر جائیے گا۔ آپ کے

سسرال والے کہیں گے کہ......"

"بک بک مت کرو۔" رابعہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ ارم کو تو اس نے گودوں میں کھلایا تھا۔

"باجی۔ آپ میری بات تو سنیں۔ آپی آپ ہی انہیں سمجھائیں۔" ارم نے سعدیہ سے کہا۔

"تم نے مجھے بہت عزت دی ہے جو میں باجی کو سمجھاؤں۔"

اسی وقت احمد صاحب اپنے کمرے سے نکلے اور سعدیہ اور رابعہ سے بولے۔ "یہ تم لوگ کیا بچوں والی حرکتیں کر رہی ہو۔ کھانا کھا کر جانا۔" وہ دونوں خاموشی سے بیٹھ گئیں۔

کھانے کے لیے سب بیٹھے تو ناصر نے پوچھا۔ "ارم کہاں ہے؟"

"پڑی ہوگی اپنے کمرے میں۔" زینت بیگم تلخی سے بولیں۔

"یہ آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟" ناصر نے تلخی سے کہا۔ "اگر وہ راشد سے شادی کرنا نہیں چاہتی تو کیوں اسے مجبور کر رہی ہیں؟" پھر وہ رابعہ سے بولا۔ "آپی، آپ ارم کو لے کر آئیں فضول میں اتنی سی بات کا بتنگڑ بنا دیا۔"

"یہ اتنی سی بات ہے؟" زینت بیگم تڑخ کر بولیں۔

"امی پلیز، آپ خاموش ہو جائیں۔" رابعہ نے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ ناصر ابھی کھانا چھوڑ کر اٹھ جائے گا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں ارم کو لے کر آتی ہوں۔"

وہ جا کر ارم کو لے آئی پھر زینت بیگم نے اس سلسلے میں ارم سے کوئی بات نہیں کی۔ شاید ناصر نے انہیں سختی سے منع کر دیا تھا کہ اب ارم سے کوئی بھی بات مت کیجیے گا۔

دوسرے دن تک سب کچھ نارمل ہو گیا۔ ارم کالج چلی گئی۔ دوپہر کے وقت شاہدہ پھر آ گئی اور رسمی باتوں کے بعد بولی۔ "ہاں، بہن، تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"ارے، بہن، ارم تو ابھی پڑھ رہی ہے۔"

"ہاں، میں جانتی ہوں کہ وہ پڑھ رہی ہے۔" شاہدہ خوش دلی سے بولیں۔ "میں کون سا کل شادی کو کہہ رہی ہوں۔ میں تو صرف یہ پوچھ رہی ہوں کہ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"بہن سچ پوچھو تو ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ ارم پڑھائی سے فارغ ہو جائے تو کچھ سوچوں گی۔"

شاہدہ ان کی باتوں سے سمجھ گئیں کہ وہ ٹال مٹول سے کام لے رہی ہیں۔ اس نے بھی مزید بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور موضوع بدل دیا پھر وہ مزید کچھ دیر رکی اور زینت بیگم پر ظاہر کیے بغیر اٹھ گئی کہ اسے ان کا جواب ناگوار گزرا ہے۔

مزید دو مہینے گزر گئے۔ گھر کا ماحول پہلے کی طرح خوشگوار تھا۔ ناصر کا فائنل سمسٹر چل رہا تھا اس لیے وہ دن رات پڑھنے میں مصروف رہتا۔ اس نے کچھ دن کے لیے ٹیوشنز سے بھی چھٹی کر لی تھی۔

احمد صاحب، ہفتے پندرہ دن میں اپنے چچا زاد شفقت کے گھر جایا کرتے تھے۔ اکثر شفقت چچا بھی آ جایا کرتے تھے۔

ایک اتوار کو وہ شفقت چچا کے گھر جانے لگے تو ارم اور زینت بیگم کو بھی ساتھ لے گئے۔ شفقت چچا کی دو بیٹیوں کی تو شادیاں ہو چکی تھیں تیسری کی بھی بات پکی ہو گئی تھی۔

وہ احمد صاحب کو دیکھتے ہی خوش ہو کر بولے۔ "یار احمد تم بھی موقعے سے آئے ہو۔ اگر تم نہ آتے تو مجھے خود آنا پڑتا۔"

زینت بیگم وہیں موجود تھیں۔ ارم، ان کی سب سے چھوٹی بیٹی شہلا کے ساتھ لان میں چلی گئی۔

"ایسا کیا خاص کام آ پڑا مجھ سے؟" احمد صاحب ہنس کر بولے۔

"بھئی ارم کے لیے میری نظروں میں ایک بہت اچھا رشتہ ہے۔" انہوں نے کہا تو زینت بیگم نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"لڑکے کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اس کے والد کا انتقال ہوا ہے۔ ماں بہت پہلے انتقال کر گئی تھی۔ لڑکا امریکا میں رہتا ہے لیکن کاروبار کے سلسلے میں پاکستان آتا رہتا ہے۔"

"لڑکا کیا بزنس کرتا ہے؟" احمد صاحب نے پوچھا۔

"یاسر کے بہت سے بزنس ہیں۔" شفقت چچا نے کہا۔ "امریکا کی دو تین ریاستوں میں اس کے سپر اسٹور ہیں اور گڈز اور گارمنٹس کا بزنس ہے۔ اسی سلسلے میں وہ پاکستان آیا ہے۔ اب وہ ٹیکساس میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل بنا رہا ہے۔"

"اتنا دولت مند لڑکا بھلا ہماری بیٹی سے شادی کیوں کرنے لگا؟" احمد صاحب کے چہرے پر مایوسی تھی۔ "وہ

اپنے ہی طبقے کی کسی امیر کبیر لڑکی سے شادی کرے گا۔''

''یاسر اپنی کلاس میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' شفقت چچا نے کہا۔'' وہ خاصا مذہبی ہے اور کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے جو باشرع اور صوم صلوٰۃ کی پابند ہو۔ ایسی لڑکی امریکا تو کیا اب پاکستان کے اعلیٰ طبقے میں بھی نہیں ملتی۔ امیر کبیر لڑکی تو چھوڑو اب متوسط خاندان کی کوئی لڑکی بھی یہ پابندیاں برداشت نہیں کرسکتی۔''

''ہاں یہ تو آپ درست کہہ رہے ہیں بھائی۔'' احمد صاحب نے کہا۔

''اب اگر ارم وہ تمام پابندیاں برداشت کرسکے تو میں لڑکے سے بات کروں؟'' شفقت چچا نے پوچھا۔'' اگر شہلا کی بات پکی نہ ہوگئی ہوتی تو میں شہلا کی شادی وہاں کردیتا۔''

''بھائی صاحب۔'' زینت بیگم نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔'' کیا آپ اس رشتے سے مطمئن ہیں؟''

''میں تو مطمئن ہوں۔'' شفقت چچا نے کہا۔'' پھر جن صاحب نے یہ رشتہ بتایا ہے انہیں میں برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ بھی کاروبار کرتے ہیں اور انتہائی کھرے آدمی ہیں۔''

''آپ یاسر سے مل چکے ہیں؟'' زینت بیگم نے پوچھا۔

''ہاں، میری بھی اس سے ملاقات ہوچکی ہے۔ وہ بہت سلجھا ہوا، بردبار اور کم گو ہے۔ باشرع اور صوم صلوٰۃ کا پابند ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں شرعی احکامات کا خیال رکھتا ہے۔''

''تو پھر آپ کسی روز اسے بلالیں۔ ویسے اس کا کوئی رشتے دار تو پاکستان میں ہوگا؟''

''ہاں یاسر کی ایک کزن اسلام آباد میں رہتی ہے۔ اس کے شوہر وہاں کسی اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔'' شفقت چچا نے کہا۔'' ویسے تم لوگ اپنے طور پر بھی معلومات کرلینا۔ میں مزید معلومات کرلوں گا۔ ابھی تو جتنا میرے علم میں تھا میں نے بتادیا۔''

یاسر سے ملاقات کے لیے آنے والی اتوار کا دن مناسب تھا۔ شفقت چچا نے کہا کہ وہ لڑکے سے معلوم کرکے بتائیں گے کہ وہ کب وقت نکال سکتا ہے۔

احمد صاحب وہاں سے لوٹے تو بہت مسرور تھے۔ ان کے برعکس زینت بیگم فکرمند تھیں۔ انہوں نے کہا۔'' اب لڑکے کی حیثیت کے مطابق ہمیں جہیز دینا پڑے گا اور شادی کسی بڑے ہوٹل میں کرنا پڑے گی۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' احمد صاحب نے کہا۔'' میں اگر اپنے دفتر سے گریجویٹی اور فنڈ لے بھی لوں تو زیادہ سے زیادہ تین چار لاکھ کا بندوبست ہوجائے گا۔''

''ایک لاکھ میرے پاس بھی ہیں۔'' زینت بیگم نے کہا۔'' اور مزید ایک لاکھ کی کمیٹی نکلنے والی ہے۔ کچھ رقم میں رابعہ اور سعدیہ سے قرض لے لوں گی۔''

''تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے ارم کی بات پکی ہوچکی ہو پہلے یاسر سے مل لو۔ ارم کے خیالات معلوم کرلو پھر کچھ سوچنا۔''

رات گئے ناصر واپس آیا تو زینت بیگم نے اس سے بھی مشورہ کیا۔ اس نے کہا۔'' امی ایسے رشتے مجھے تو فراڈ لگتے ہیں۔ ارب پتی اور امیر کبیر لڑکا کسی عام سی لڑکی سے کیوں شادی کرے گا؟''

''بیٹا یہ شفقت بھائی نے بتایا ہے۔'' زینت بیگم نے کہا۔'' ان ہی کا کوئی جاننے والا ہے۔ وہ تو یہ کہہ رہے تھے کہ اگر شہلا کی بات پکی نہ ہوگئی ہوتی تو وہ اس کی شادی یاسر کے ساتھ کردیتے۔''

''شفقت چچا غیر ذمے دارانہ بات نہیں کرسکتے۔'' ناصر نے کہا۔'' لیکن پھر بھی سوچ سمجھ لیں۔ ہمیں اپنے طور پر بھی معلومات کرنا پڑے گی۔''

''بیٹا، وہ تو تم کروگے۔'' زینت بیگم نے کہا۔

''آپ نے ارم سے پوچھا؟'' ناصر نے کھانا ختم کرکے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اس سے بھی اب تم ہی بات کرنا۔'' زینت بیگم نے ناگواری سے کہا۔

''چلیں میں ہی بات کرلوں گا۔'' ناصر ہنس کر بولا۔

دوسرے دن ناصر کا آخری پیپر تھا۔ وہ امتحان دے کر سیدھا گھر آگیا۔ ارم بھی کالج سے آچکی تھی۔ وہ ارم کے کمرے میں چلا گیا۔

''ارے بھیا آج آپ دن کے اجالے میں کیسے نظر آرہے ہیں؟'' ارم ہنس کر بولی۔

''تو کیا مجھے چمگادڑ سمجھتی ہے یا چھپکلی؟'' ناصر نے مصنوعی غصے سے کہا پھر بولا۔'' تیرے ہاتھ کی چائے پیے بہت دن ہوگئے۔ آج مجھے ذرا اچھی سی چائے پلادے۔''

''اچھا، آپ اپنے کمرے میں چلیں میں چائے لے کر آتی ہوں۔''

ناصر نے اپنے لیے اوپر ایک کمرا بنالیا تھا۔ وہ اوپر

جا کر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ارم چائے لے آئی۔ وہ واپس جانے لگی تو ناصر نے کہا۔ ''بیٹھو، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''کیا بات ہے بھیا؟'' ارم نے ہنس کر پوچھا۔ ''اس وقت تو آپ بہت سنجیدہ نظر آرہے ہیں؟''

''بات ہی سنجیدگی کی ہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''شفقت چچا نے تمہارے لیے ایک رشتہ بتایا ہے۔'' ناصر نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔ ''لڑکا امریکا میں رہتا ہے اس کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ امریکا میں کئی سپر اسٹورز ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا لیدر گڈز اور گارمنٹس کا بزنس بھی ہے۔ اس کے والدین انتقال کر چکے ہیں۔ بہن بھائی کوئی نہیں ہے۔ تم بتاؤ تم اس رشتے پر راضی ہو؟''

ارم کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اسے کچھ کچھ اندازہ تو تھا کہ امی اور ابو دھیمی آواز میں کیا باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس نے سر جھکا کر کہا۔ ''بھیا اگر آپ کو یہ رشتہ پسند ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

''ہاں ایک اہم بات تو میں بتانا ہی بھول گیا۔ یاسر انتہائی مذہبی ہے۔ وہ خلافِ شرع کوئی کام بھی نہیں کرتا۔ تمہیں بھی نماز روزے کی پابندی کرنا ہوگی۔ شرعی پردہ کرنا ہوگا۔ ٹی وی، فلمیں اور میوزک سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔ اگر تم ان پابندیوں کو قبول کر سکتی ہو تو بات آگے بڑھے گی۔''

''مجھے فلموں اور گھومنے پھرنے کا کب شوق ہے۔'' ارم نے کہا۔ ''ایک ٹی وی ہی تو دیکھتی ہوں۔ وہ بھی نہیں دیکھوں گی۔ جہاں تک پردے کا تعلق ہے تو مجھے بھی بے پردہ پھرنے کا شوق نہیں ہے۔ ہمارے کالج میں بھی ایسی لڑکیاں ہیں جن کی شکلیں آج تک میں نے بھی نہیں دیکھیں۔''

''پھر بھی اچھی طرح سوچ لو۔'' ناصر نے کہا۔

''آپ نے سوچ لیا میرے لیے یہی کافی ہے۔''

ارم نے جواب دیا۔

ناصر کو ارم کے جواب سے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ ارم نے اس کے تمام خدشات دور کر دیے تھے۔ رابعہ اور سعدیہ کی طرح اسے بھی یہی شبہ تھا کہ ممکن ہے ارم کسی اور کو پسند کرتی ہو۔ اس لیے اس نے راشد کے رشتے سے انکار کیا ہے۔

اس نے احمد صاحب اور زینت بیگم کو یہ خوشخبری سنا دی کہ ارم کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں اور وہ تمام پابندیاں قبول کرنے کو بھی تیار ہے۔

زینت بیگم نے فوراً شفقت چچا کو ٹیلی فون کیا اور انہیں بتایا کہ آپ لڑکے کو بلا لیں۔ ہمیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

شفقت چچا نے بتایا کہ یاسر سے میری بات ہوئی تھی۔ وہ اتوار کے دن آنے کو راضی ہے۔ میں نے اسے اپنے گھر بلا لیا ہے۔ آپ لوگ بھی ارم کو لے کر یہیں آجائیں۔ اگر رابعہ اور سعدیہ لڑکے کو دیکھنا چاہتی ہیں تو انہیں بھی بلا لیجیے گا۔

''بھائی صاحب۔'' زینت بیگم نے کہا۔ ''ارم کو پہلی ہی ملاقات میں یاسر کے سامنے لے جانا تو مناسب نہیں ہوگا؟''

''کیسی باتیں کرتی ہیں بھابی۔'' شفقت چچا نے کہا۔ ''لڑکا خود بھی یہ پسند نہیں کرے گا۔ میں نے بتایا تو تھا کہ وہ شرعی احکامات کے معاملے میں بہت سخت ہے۔ آپ لوگ اتوار کو دوپہر تک آجائیں۔ یاسر بھی شام کو پانچ بجے تک آئے گا۔ اس کے ساتھ صمد صاحب، ان کی بیگم اور بیٹی بھی ہوگی۔ صمد ہی نے یہ رشتہ بتایا ہے۔ ان کی بیگم اور بیٹی ارم کو دیکھ بھی لیں گی۔''

اس افراتفری میں انہیں رابعہ اور سعدیہ کا تو خیال ہی نہیں آیا تھا۔ انہوں نے باری باری دونوں کو ٹیلی فون کر کے اس رشتے کے بارے میں بتایا۔

اتوار کو ناشتے کے بعد رابعہ اور سعدیہ بھی آگئیں۔ وہ لوگ دو بجے تک شفقت چچا کے گھر پہنچ گئے۔ شفقت چچا بہادر آباد میں رہتے تھے۔

ٹھیک پانچ بجے صمد صاحب اپنی بیگم، بیٹی اور یاسر کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ یاسر دراز قد اور کسرتی جسم کا نوجوان تھا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے بہت قیمتی شلوار سوٹ پر بیش قیمت واسکٹ پہن رکھی تھی۔

صمد صاحب کی بیگم اور بیٹی نے چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ وہ فوراً ہی گھر کے اندرونی حصے میں چلی گئیں۔

صمد صاحب نے یاسر کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''احمد صاحب! یہ ہیں محمد یاسر کمال اور یاسر یہ شفقت صاحب ہیں۔ ان سے تو آپ پہلے بھی مل چکے ہیں۔ یہ احمد علی صاحب ہیں، لڑکی کے والد۔''

یاسر نے انہیں سلام کیا۔ ''السلام علیکم ورحمتہ اللہ

وبرکاتہ۔''

''وعلیکم السلام، جیتے رہو بیٹا۔'' احمد صاحب نے جواب دیا پھر شفقت صاحب نے ناصر اور اس کے دونوں بہنوئیوں ارشد اور جاوید کا تعارف کروایا۔ یاسر نے انہیں بھی اسی طرح قرأت میں سلام کیا۔

وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ احمد صاحب نے گفتگو کا آغاز کرنے کی خاطر پوچھا۔'' امریکا میں تو اب سردی شروع ہوگئی ہوگی؟''

''جی ہاں، وہاں آج کل اچھی خاصی سردی پڑ رہی ہے۔''

''یاسر صاحب!'' ارم کے بڑے بہنوئی ارشد نے اسے مخاطب کیا۔'' وہاں آپ کا قیام کس شہر میں ہے؟''

''میں زیادہ تر ٹیکساس میں رہتا ہوں۔ ویسے میرا ایک گھر نیویارک میں بھی ہے۔ اصل میں میرا زیادہ بزنس ٹیکساس میں ہے۔''

''کیا بزنس کرتے ہیں آپ؟'' ارم کے چھوٹے بہنوئی نے سوال کیا۔

''وہاں میرے سپر اسٹورز ہیں پھر میں پاکستان اور بنگلا دیش سے لیدر گڈز اور گارمنٹس امپورٹ کرتا ہوں۔ ٹیکساس میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل بھی بنا رہا ہوں۔''

''میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔'' شفقت چچا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ پاکستان کتنے دن کے لیے آئے ہیں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''میں سال میں ایک دفعہ تین مہینے کے لیے پاکستان آتا ہوں۔ کاروبار کا تو بس بہانہ ہے۔ مجھے پاکستان سے محبت ہے، میرے والدین پاکستانی تھے، میرے اجداد نے پاکستان کی جدوجہد آزادی میں حصہ لیا ہے۔ میں امریکا میں پیدا ہوا، وہیں پلا بڑھا لیکن میرا دل پاکستانی ہے۔''

''آپ نے اتنی اچھی اور نستعلیق اردو کہاں سے سیکھی؟'' احمد صاحب نے ستائشی انداز میں کہا۔

''مجھے اردو سکھانے میں دادا جان کا ہاتھ ہے۔ آپ یقین کریں گے کہ امریکا جیسے ملک میں انہوں نے کئی سال مجھے تختی لکھوائی ہے۔''

''تختی؟'' ناصر نے حیرت سے پوچھا۔

یاسر مسکرایا۔'' تختی تو شاید آپ نے بھی نہیں لکھی ہوگی؟''

''جی ہاں، میں اس سعادت سے محروم رہ گیا۔'' ناصر نے مسکرا کر کہا۔

''دادا جان نے مجھے نہ صرف اردو بلکہ فارسی بھی پڑھائی۔ یہ ان ہی کی محنت کا ثمر ہے کہ آج میں امریکا میں رہنے والے دوسرے بچوں کے مقابلے میں نسبتاً بہتر اردو بول لیتا ہوں۔''

''احمد صاحب۔'' صمد صاحب نے کہا۔'' بیٹی کی تعلیم مکمل ہوگئی یا ابھی کچھ باقی ہے؟''

''وہ اس سال انشاءاللہ گریجویشن کرلے گی۔'' احمد صاحب نے جواب دیا۔

اچانک یاسر نے کہا۔'' اوہو باتوں میں عصر کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو مجھے ایک مصلیٰ منگوا دیں گے۔'' اس نے شفقت چچا کو مخاطب کیا تھا۔

''زحمت کیسی؟'' شفقت چچا نے کہا۔'' میں ابھی بندوبست کرتا ہوں۔ اگر آپ وضو کرنا چاہیں تو وضو بھی کرسکتے ہیں۔''

یاسر نے واسکٹ کی اندرونی جیب سے مسواک نکالی اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا پھر اس نے وہیں ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں نماز عصر ادا کی اور کچھ دیر تک کوئی وظیفہ بھی پڑھتا رہا۔

وہ نماز سے فارغ ہوا تو شفقت چچا کا ایک ملازم چائے اور دوسرے لوازمات لے آیا۔

یاسر نے صرف تھوڑی سی نمکو لینے پر اکتفا کیا۔ وہ چائے پیتے ہوئے احمد صاحب سے مخاطب ہوا۔'' آپ کا قیام کہاں ہے؟''

''کراچی کا ایک علاقہ ہے جہانگیر روڈ۔'' احمد صاحب نے جواب دیا۔'' میں وہیں ایک سرکاری کوارٹر میں رہتا ہوں۔''

''آپ نے ناحق زحمت کی۔'' یاسر نے کہا۔'' مجھ سے کہتے تو میں وہیں حاضر ہوجاتا۔''

''زحمت کیسی میاں۔'' شفقت چچا نے ہنس کر کہا۔ ''یہ بھی تو احمد بھائی کا ہی گھر ہے۔''

''یاسر صاحب۔'' ارم کے بڑے بہنوئی ارشد نے پوچھا۔'' آپ کی کوئی کزن اسلام آباد میں بھی مقیم ہیں؟''

''سعدیہ باجی۔'' یاسر نے مسکرا کر کہا۔'' وہ میری فرسٹ کزن تو نہیں ہیں لیکن میرے لیے بہنوں سے بڑھ کر ہیں۔ جہانگیر بھائی وہاں ڈپٹی سیکریٹری ہیں۔''

ارشد ایک دم مرعوب ہوگیا۔ وہ جس ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا تھا، جہانگیر اے خان اس سے پہلے اس کے سیکریٹری تھے۔

''ٹیکساس میں آپ کہاں رہتے ہیں؟'' یاسر نے جیب سے خوب صورت سا وزیٹنگ کارڈ نکالا اور احمد صاحب کو دے دیا۔

''میں نے کارڈ کی پشت پر اپنا پاکستان کا سیل نمبر بھی لکھ دیا ہے۔'' یاسر نے بتایا۔

احمد صاحب تو اس کی شخصیت اور رکھ رکھاؤ سے مرعوب ہوگئے تھے۔ ارشد اور ناصر کرید کرید کر اس سے سوالات کرتے رہے۔

اچانک سیل فون کی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ یاسر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر انتہائی قیمتی سیٹ نکالا اور ان لوگوں سے بولا۔ ''معاف کیجیے گا میں ابھی حاضر ہوا۔''

وہ اٹھ کر وہاں سے کچھ فاصلے پر چلا گیا لیکن اس کی آواز خاصی بلند تھی۔

''السلام علیکم......جی ہاں مجھے یاد ہے......آپ نے ناحق زحمت کی......بہتر ہے۔ میں حسبِ وعدہ سات بجے تک پہنچ جاؤں گا......اللہ حافظ۔'' یاسر دوبارہ ان لوگوں کی طرف آیا اور صمد صاحب سے بولا۔

''انکل میرے خیال میں اب چلنا چاہیے۔'' پھر وہ احمد صاحب سے مخاطب ہوا۔ ''اب مجھے اجازت دیں۔ مجھے اُمید ہے کہ میرا انٹرویو کامیاب رہا ہوگا؟'' وہ مسکرایا۔

''بیٹا انٹرویو کیسا یہ تو ایک دوسرے سے تعارف تھا۔''

''میرا سیل نمبر آپ کے پاس ہے جب چاہیں مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی صمد صاحب بھی کھڑے ہوگئے اور شفقت چچا سے بولے۔ ''ہماری بیگم اور بیٹی سے کہلوا دیجیے کہ چلنے کی تیاری کریں۔''

سب لوگ مہمانوں کو رخصت کرنے کار پورچ تک چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد وہ سب ایک مرتبہ پھر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ مہمان چلے گئے تھے اس لیے ساری خواتین بھی ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ صرف ارم شفقت چچا کی بیٹی کے ساتھ رہ گئی۔

''بھائی صاحب۔'' زینت بیگم نے کہا۔ ''مجھے تو لڑکا بہت پسند آیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

''لڑکا بہ ظاہر تو بہت سلجھا ہوا، پڑھا لکھا اور سمجھ دار لگ رہا تھا۔'' شفقت چچا نے کہا۔ ''لیکن اس سلسلے میں مزید معلومات بھی کرنا پڑیں گی۔ آخر لڑکی کا معاملہ ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' ارم کے بہنوئی ارشد نے کہا۔ ''ویسے لڑکا بہت شریف اور رکھ رکھاؤ والا ہے۔ سادگی پسند بھی ہے۔ اس کے انداز سے بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ارب پتی ہے۔''

''یہی بات تو مجھے کھٹک رہی ہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''اس ارب پتی لڑکے کو اب تک کوئی لڑکی نہیں ملی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس کی عمر بتیس اور پینتیس سال کے درمیان ہوگی۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' ارم کے چھوٹے بہنوئی جاوید نے کہا۔

''تو پھر معلومات کریں ناں۔'' سعدیہ بولی۔

''پاکستان میں یاسر کی رشتے کی ایک بہن بھی تو رہتی ہے۔'' رابعہ نے کہا۔ ''پہلے تو ان سے معلومات کریں۔''

''ہاں میں جہانگیر کو جانتا ہوں۔''

''تو پھر ان ہی سے یاسر کے بارے میں معلوم کریں۔'' رابعہ نے کہا۔ ''کل انہیں ٹیلی فون کرلیں۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو۔'' ارشد نے کہا۔ ''وہ اتنے بڑے افسر ہیں۔ ٹیلی فون پر تو ان سے رابطہ ہونا ہی مشکل ہے جو ہوگیا تو کیا میں ان سے یاسر کے بارے میں معلوم کروں گا اس کے لیے تو مجھے یا کسی اور کو اسلام آباد جانا پڑے گا۔''

''تم مجھے ان کے گھر کا نمبر معلوم کر کے دو۔'' زینت بیگم نے کہا۔ ''میں ٹیلی فون پر یاسر کی بہن سے بات کرلوں گی۔''

''ہاں، یاسر کے وزیٹنگ کارڈ میں اس کا امریکا کا پتا اور ٹیلی فون نمبر بھی تو ہے۔ اس کے دفتر سے بھی اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔''

''یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔'' احمد صاحب نے کہا۔ ''پہلے یہ تو معلوم ہو کہ صمد کی بیگم اور بیٹی کو ہماری ارم پسند بھی آئی ہے یا نہیں؟''

''ارم تو انہیں بہت پسند آئی ہے۔'' زینت بیگم نے کہا۔ ''کہہ رہی تھیں کہ یاسر کو ایسی ہی سیدھی سادی اور خوب صورت لڑکی کی تلاش ہے۔ ہماری طرف سے تو یہ رشتہ پکا سمجھیں۔'' پھر وہ شفقت چچا سے بولیں۔ ''بھائی صاحب! آپ صمد بھائی سے مزید معلوم کیجیے گا یاسر کے متعلق۔''

''وہ تو خیر میں معلوم کرلوں گا پہلے آپ لوگ بھی اچھی

طرح غور کرلیں۔''

شفقت چچا کے گھر پُر تکلف کھانے کے بعد وہ لوگ واپس آگئے۔

ارم بہت خوش نظر آرہی تھی۔ وہ ابھی سے ناصر اور احمد صاحب سے شرمارہی تھی۔ سعدیہ نے بتایا کہ ہمارے ساتھ ساتھ ارم نے بھی لڑکے کو دیکھا تھا۔ اسے بھی یاسر بہت پسند آیا ہے۔

چند دن بعد زینت بیگم نے پھر ارم کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ ''آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ جلدی کوئی فیصلہ کریں۔ اچھے رشتے بار بار نہیں ملتے۔''

''میں تو خود بھی یہی چاہتا ہوں۔'' احمد صاحب نے کہا۔ ''بس مجھے ارشد کا انتظار ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اسلام آباد کے ایک دوست کو جہانگیر کے گھر بھیجے گا پھر ناصر بھی امریکا سے معلومات حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے۔ یاسر تو ابھی یہیں مقیم ہے۔ شفقت بھائی بتا رہے تھے کہ وہ ابھی کم سے کم تین مہینے یہاں رہے گا۔ ویسے بھی یاسر آج کل کاروباری سلسلے میں فیصل آباد گیا ہوا ہے پرسوں تک واپس آئے گا۔''

دوسرے دن ارشد آفس سے سیدھا احمد صاحب کی طرف آگیا۔ اس نے بتایا کہ جہانگیر صاحب، اپنی بیگم کے ساتھ بیرونِ ملک گئے ہوئے ہیں۔ اسی وقت ناصر بھی آگیا۔ اس نے کہا۔ ''ابو میں نے یاسر کے امریکا والے دفتر ٹیلی فون کیا تھا۔ ریسیور کسی لڑکی نے اٹھایا اور یاسر کی فرم کا نام لیا۔ میں نے یاسر کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ باس تو آج کل پاکستان میں ہیں۔ میں نے کہا میں پاکستان سے ہی بول رہا ہوں۔ مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ ان کا ہوٹل کب تک مکمل ہو جائے گا؟ اس نے جواب دیا کہ ہوٹل کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے اب تو فنیچر اور دیگر ساز و سامان کی تیاری ہو رہی ہے۔ ستمبر کے وسط تک ہوٹل کا افتتاح ہو جائے گا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یاسر نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا ہے۔'' زینت بیگم نے خوش ہو کر کہا پھر وہ احمد سے مخاطب ہوئیں۔ ''آپ ٹیلی فون کر کے یاسر کو بلالیں تاکہ اس سے حتمی بات کی جاسکے۔''

☆☆☆

''دیکھئے، میں شادی کے سلسلے میں کسی بھی غیر شرعی رسم کا قائل نہیں ہوں۔'' یاسر نے کہا۔

فیصل آباد سے واپسی پر احمد صاحب نے اسے ٹیلی فون کر کے بلالیا تھا اور پہلے ہی کی طرح وہ لوگ شفقت چچا کے گھر میں بیٹھے تھے۔

''نہ ہی کسی قسم کے جہیز کا قائل ہوں۔ یوں بھی شادی کے بعد میں اپنی بیوی کو امریکا لے جاؤں گا تو میں فالتو سامان کا کیا کروں گا۔ ویسے آپ بیٹی کو کچھ زیور وغیرہ دینا چاہیں تو ضرور دیں۔''

''اب ذرا مہر کی بات بھی کرلیں۔'' صمد صاحب نے کہا۔ ''مہر بھی شرع کے مطابق ہونا چاہیے۔''

ارشد نے کہا۔ ''شرعی طور پر تو لڑکے کی حیثیت کے مطابق مہر رکھا جاتا ہے۔ آپ تو ماشااللہ بہ حیثیت ہیں۔''

یاسر کے چہرے پر لمحے بھر کو ناگواری کا تاثر نمودار ہوا پھر فوراً ہی اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ آگئی جو ہمیشہ اس کے چہرے پر رہتی تھی۔ اس نے ہنس کر کہا۔ ''آپ فرمائیں، مہر کتنا ہونا چاہیے؟ میری حیثیت تو اتنی ہے کہ میں پچاس لاکھ بھی دے سکتا ہوں۔ یوں بھی میں شادی ہمیشہ کے لیے کر رہا ہوں۔ میں خدانخواستہ اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ آپ جتنا چاہیں مہر رکھ سکتے ہیں۔''

''مہر تو بیوی کا حق ہے اور شرعی حکم تو یہ ہے کہ اسے فوری طور پر ادا کر دیا جائے اور شرع کو آپ ہم سے زیادہ جانتے ہوں گے۔''

یاسر کے چہرے پر لمحہ بھر کو پھر ناگواری کا تاثر پیدا ہوا فوراً ہی وہ مسکرا کر بولا۔ ''جی ہاں، بعض مکتبۂ فکر میں یوں بھی ہوتا ہے۔''

''بعض میں نہیں یاسر صاحب۔'' ارشد نے بھی ہنس کر کہا۔ ''یہ تو اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے کہ مہر فوری طور پر ادا کر دو۔''

''آپ نے شاید اپنی اہلیہ کا مہر ادا کر دیا ہوگا؟''

''الحمدللہ!'' ارشد نے جواب دیا۔ ''میں تو پہلے دن ہی اس فرض سے سبک دوش ہو گیا تھا۔''

''ارے، آپ بھی کیا بحث لے کر بیٹھ گئے۔ یاسر بیٹے کی حیثیت تو ماشااللہ بہت زیادہ ہے لیکن میرے خیال میں ایک لاکھ مہر مناسب رہے گا۔''

''چلئے آپ کہتے ہیں تو یہ ہی مناسب ہے۔'' احمد صاحب نے کہا۔

پھر تمام معاملات طے پاگئے۔ اب سے دس سال پہلے ایک لاکھ روپے بھی اچھی خاصی رقم تھی۔ یاسر کسی قسم کی

دھوم دھڑکے کا قائل نہیں تھا۔ وہ بہت سادگی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کی طرف سے صرف صمد صاحب، ان کی بیگم اور بیٹی کے علاوہ یاسر کے دو تین کاروباری دوست شریک ہوئے تھے جو لاہور اور فیصل آباد سے آئے تھے۔

ارم کے دل میں حسرت ہی رہ گئی تھی۔ وہ اپنی چند دوستوں اور ان کے گھر والوں کو مدعو کرنا چاہتی تھی لیکن بلا نہ سکی۔

یاسر نے فوری طور پر گلشن اقبال میں چھوٹا سا ایک بنگلا کرایے پر لے لیا تھا۔ احمد صاحب نے ارم کو خاصی قیمتی زیور کا ایک سیٹ اور دو لاکھ روپے نقد دیے تھے۔ ایک لاکھ روپے اس کی دونوں بہنوں نے دیے تھے۔

ارم رخصت ہوکر یاسر کے گھر پہنچی تو صمد صاحب کی بیگم اور بیٹی نے اس کا استقبال کیا اور اسے حجلۂ عروسی میں پہنچا کر خود بھی وہاں سے رخصت ہوگئیں۔

یاسر حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو ارم روایتی دلہنوں کی طرح سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ یاسر نے ایک نظر اسے دیکھا پھر سرد لہجے میں بولا۔ ”مجھے یہ روایتی چونچلے پسند نہیں ہیں۔ تم اب میری بیوی ہو اور مجھ ہی سے چھپ رہی ہو۔“

ارم نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا وہ یاسر اس یاسر سے بالکل مختلف تھا جسے اس نے اس سے پہلے دیکھا تھا۔

”کپڑے بدلو اور میرے لیے ایک کپ کافی بنا لاؤ۔ میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ یہاں کوئی ملازم تو ہے نہیں۔“

ارم کے سارے ارمان جھاگ کی طرح بیٹھ گئے وہ خاموشی سے اٹھی اور الماری کھول کر شب خوابی کا لباس نکالنے لگی۔

یاسر نے بیڈ پر نیم دراز ہوکر کافی پی۔ ارم اس کے نزدیک ہی بیٹھی ہوئی اسے دیکھتی رہی۔ کافی پی کر اس نے لائٹ آف کردی۔

ارم رات بھر نہ سو سکی۔ اسے رہ رہ کر یاسر کے بدلے ہوئے رویے کا خیال آرہا تھا۔ یاسر بے سدھ ہوکر سو رہا تھا۔ ارم ذرا سونے کی کوشش کرتی بھی تو یاسر کے خراٹوں سے اس کی نیند اڑ جاتی۔

اسی طرح فجر کی اذانیں ہونے لگیں۔ ارم کا خیال تھا کہ اب یاسر نماز کے لیے اٹھے گا۔ جب وہ اسی طرح بے سدھ سوتا رہا تو ارم کو خیال آیا کہ شاید وہ بہت تھک گیا ہے اسی لیے اتنی گہری نیند سو رہا ہے۔ اسے نماز کے لیے اٹھانا چاہیے۔

ارم نے اس کا شانہ آہستہ سے ہلایا اور دھیمے لہجے میں بولی۔ ”یاسر! اٹھ جایئے۔ نماز کا وقت نکلا جارہا ہے۔“ یاسر نے دوسری طرف کروٹ لی اور پھر سو گیا۔

دوسری مرتبہ ارم نے ذرا زور سے اس کا شانہ ہلایا اور بولی۔ ”اٹھیں نماز کا وقت جارہا ہے۔“

”نیند مت خراب کرو۔“ یاسر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”نماز میں قضا پڑھ لوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ پھر سو گیا۔

ارم بھی رات بھر کی جاگی ہوئی تھی نہ جانے اسے کب نیند آگئی۔

اس کی آنکھ تیز آواز سے کھلی۔ یاسر اس کے سامنے کھڑا اسے آوازیں دے رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ یاسر اس وقت نائٹ گاؤن میں تھا۔ اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ”جانتی ہو اس وقت کیا وقت ہوا ہے؟ پونے گیارہ بج رہے ہیں۔ تمہیں اگر دیر تک سونے کی عادت ہے تو اب یہ عادت بدلنا ہوگی۔“ ارم خاموشی سے باتھ روم میں چلی گئی۔

وہ وہاں سے نکلی تو یاسر نے کہا۔ ”آج تو میں باہر سے ناشتا لے آتا ہوں کیونکہ کچن میں کھانے پینے کا سامان نہیں ہے لیکن کل سے تمہیں ناشتا، کھانا خود تیار کرنا ہوگا۔“

اس وقت اطلاعی گھنٹی کی آواز گونجی۔

یاسر نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ”اس وقت کون آگیا؟“ وہ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں داخل ہوا تو ارم نے پوچھا۔ ”کون تھا؟“

”تمہاری بہنیں ہیں، ناشتا لے کر آئی ہیں۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔“

ارم نے گیلے بال اسی طرح سنوار لیے اور جلدی جلدی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔

پشت سے یاسر کی آواز آئی۔ ”ارم، میں ان کے سامنے نہیں جاؤں گا۔ وہ میرے لیے نامحرم ہیں۔“ اس کی بات سے ارم کو دھچکا سا لگا۔ وہ خود کو سنبھالتی ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچی، سعدیہ اور رابعہ کو دیکھ کر مسکراہٹ چہرے پر سجالی۔

ان دونوں نے ارم کو گلے لگایا۔ رابعہ بولی۔ ”ہم لوگوں کو کچھ دیر ہوگئی۔ یاسر تو علی الصبح اٹھنے کے عادی ہوں گے؟“

”ہاں۔“ ارم نے جواب دیا۔ ”لیکن وہ نماز کے بعد پھر سو گئے تھے۔“

''اچھا، اب جلدی سے انہیں بلاؤ۔ ناشتا کرلیں۔'' رابعہ نے کہا۔

''باجی، وہ آپ سے بھی پردہ کررہے ہیں۔ آپ بھی تو ان کے لیے نامحرم ہیں۔''

''ہاں بھئی، یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔ ٹھیک ہے پھر تم دونوں ناشتا کرو، ہم چلتے ہیں۔''

''آپ نے بھی تو ابھی ناشتا نہیں کیا ہوگا؟'' ارم نے کہا۔ ''آپ کچھ دیر تو بیٹھیں۔ میں ناشتا کرکے ابھی آتی ہوں۔''

''نہیں ارم۔'' سعدیہ نے کہا۔ ''ہم پھر کسی وقت آجائیں گے بلکہ رات تو تم خود یاسر کے ساتھ گھر آنا۔''

ارم کے لاکھ روکنے کے باوجود وہ دونوں چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد یاسر ڈرائنگ روم میں آیا اور بولا۔ ''یہ ساری رسمیں ہندوانہ ہیں۔ ناشتا لے کر جانا، لڑکی کو اسی روز اپنے گھر جانا، چوتھی کی دعوت وغیرہ۔ میں رزق کی توہین نہیں کروں گا اس لیے ناشتا کرلیتا ہوں لیکن مجھ سے مزید یہ احمقانہ رسم کو ماننے کی توقع مت رکھنا۔''

وہ ناشتا کرنے لگا۔ رابعہ اور سعدیہ نے ناشتے میں خاصا اہتمام کیا تھا پھر وہ رکشا میں وہاں تک آئی ہوں گی اور میں نے ان سے پانی تک کو نہ پوچھا۔

''ولیمہ کب کریں گے؟'' ارم نے پوچھا۔

''ولیمہ..... ہاں ولیمہ ضرور کروں گا۔ یہ تو عین سنت ہے لیکن اس میں بھی زیادہ لوگ شریک نہیں ہوں گے۔ بس تمہارے گھر والے اور میرے چند دوست۔ میں اسراف بے جا کا قائل نہیں ہوں۔''

''کنجوس۔'' ارم نے دل ہی دل میں کہا۔

ایک ہفتے بعد ہی یاسر کا رویہ بہت تلخ ہوگیا وہ بات بے بات ارم کو جھڑک دیتا۔ اس نے ارم پر پابندی عائد کردی تھی کہ اس کی اجازت کے بغیر اپنے گھر نہیں جائے گی۔ ارم گھر والوں سے خاص طور پر زینت بیگم اور ناصر سے ٹیلی فون پر رابطہ رکھتی تھی۔

یاسر نے گھر میں راشن لاکر بھر دیا تھا۔ وہ زیادہ تر دال چاول کھاتا تھا۔ کبھی کبھار سبزی لے آتا تھا۔ اس طرح گھر میں قید رہ کر ارم نے دو مہینے گزار دیے۔ یاسر گھر سے باہر بہت کم جاتا تھا۔

ارم پر یہ بھی ہولناک سا انکشاف ہوا تھا کہ یاسر پابندی سے نماز نہیں پڑھتا۔ اسے کبھی کبھار تو اس پر غصہ آتا تھا کہ وہ مطلب براری کے لیے مذہب کو استعمال کررہا تھا۔

ارم کے اکاؤنٹ میں پانچ لاکھ روپے تھے اور تقریباً دو لاکھ کا زیور تھا۔ مختلف حیلوں بہانوں سے یاسر اس سے دو لاکھ روپے لے چکا تھا۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ یاسر جیسے ارب پتی کو اس کے پیسوں کی کیا ضرورت پڑگئی؟

اس دن یاسر کہیں نکلا ہوا تھا کہ ناصر آگیا۔ ارم کی حالت دیکھ کر وہ حیران رہ گیا اور بولا۔ ''ارم، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں بھیا۔'' ارم جلدی سے بولی۔

''جھوٹ مت بولو۔'' ناصر نے کہا۔ ''بتاؤ کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں بھیا۔'' ارم نے جواب دیا۔ ''بس مجھے ان پابندیوں کی عادت نہیں تھی اس لیے آپ کو ایسا لگ رہا ہوگا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''بھیا میں اکثر گھر میں اکیلی ہوتی ہوں کبھی کبھی تو یاسر رات کے دو دو بجے گھر آتے ہیں۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ آپ میرا سب زیور بینک لاکر میں رکھوادیں۔ ویسے بھی مجھے اس کی کیا ضرورت ہے؟ کبھی ضرورت پڑی تو لاکر سے نکال لوں گی۔'' اس نے اپنے تمام زیور ناصر کو دے دیے۔

یاسر اس روز بھی رات گئے آیا۔ ارم نے اس سے کھانے کو پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس نے کھانا کھالیا ہے۔

اچانک ارم کی آنکھ کھل گئی۔ یاسر بیڈ پر نہیں تھا۔ وہ باتھ روم میں بھی نہیں تھا۔ ارم کو حیرت تھی کہ وہ اچانک کہاں چلا گیا۔ اس گھر میں تین ہی تو کمرے تھے۔ دو بیڈ روم اور ڈرائنگ روم۔ دوسرا کمرا ابھی تک بالکل خالی تھا۔ ارم ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی تو کھلی ہوئی کھڑکی سے یاسر کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ شاید سیل فون پر کسی سے بات کررہا تھا۔ اپنا نام سن کر ارم ٹھٹک کر رک گئی۔ یاسر کہہ رہا تھا۔

''نہیں یار، اب ارم سے دل بھر گیا ہے۔ میں اگلے ہفتے واپس آرہا ہوں۔ نقصان...... نہیں یار اس ٹرپ میں تو نقصان کی بجائے مجھے فائدہ ہوا ہے۔ ارم کے پاس تین، چار لاکھ روپے نقد اور تقریباً دو لاکھ کا زیور ہے۔ ظاہر ہے یہ سب میرا ہے..... بس اب اگلے ہفتے تم سے امریکا میں ملاقات ہوگی۔ کام تو ٹھیک چل رہا ہے ناں۔ ہاں تو مصروف ہوگا۔ یہاں رات ہے لیکن وہاں تو دن ہوگا۔''

ارم یہ سب سن کر سناٹے میں رہ گئی۔ وہ خاموشی سے بیڈ روم میں آگئی اور آنکھیں بند کرکے لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر

بعد اسے احساس ہوا کہ یاسر بھی آ کر لیٹ گیا ہے۔

وہ تو یاسر کو بہت اچھا سمجھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کچھ ضدی اور چڑچڑا ہے لیکن اسے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اتنا گھٹیا بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے پیسے اور زیور پر نظریں لگائے بیٹھا ہے۔

اب یاسر کے خراٹے گونج رہے تھے۔ ارم نے بہت آہستگی سے اس کا سیل فون اٹھایا اور پھر اپنا سیل فون لے کر باتھ روم میں چلی گئی۔ اس نے پہلے ڈائل کیے جانے والے نمبر دیکھے۔ اس میں آخری کال دو دن پہلے کی گئی تھی لیکن نمبر امریکا کا تھا۔ ارم نے جلدی سے وہ نمبر اپنے سیل فون میں محفوظ کر لیا پھر اس نے موصول ہونے والی کالز کی لسٹ دیکھی۔ آدھا گھنٹا پہلے اس نے امریکا سے اسی نمبر سے کال موصول کی تھی۔ ارم نے اس کے علاوہ بھی ڈائل کیے جانے والے اور موصول ہونے والے نمبروں کو اپنے سیل فون میں محفوظ کیا اور باتھ روم سے نکل آئی۔ اس نے یاسر کا سیل فون وہیں رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا پھر اس نے اپنا سیل فون حسبِ معمول آف کیا اور اسے بیڈ کے نیچے چھپا دیا۔ اس سیل فون کا علم یاسر کو بھی نہیں تھا۔ ارم نے یہ سوچ کر یاسر کو نہیں بتایا تھا کہ مبادا وہ اس میں بھی کوئی شرعی عذر تلاش کر لے اور سیل فون اس سے چھین لے۔

صبح یاسر کا موڈ بہت اچھا تھا۔ اس نے ارم سے کہا۔ ''آج تم ناشتا مت بناؤ میں حلوا پوری لے کر آتا ہوں۔''

ناشتا کرنے کے بعد اس نے سگریٹ سلگائی اور اس کے کش لینے لگا۔ اچانک یاسر کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یاسر نے سیل فون اٹھا کر کان سے لگایا اور بولا۔ ''السلام علیکم کیسے مزاج ہیں...... شکر الحمد اللہ مجھے کچھ دن کی مہلت دے دیں...... اصل میں میرے منیجر نے امریکا سے ابھی تک رقم نہیں بھیجی ہے۔ آپ کی رقم تو برائے نام ہے۔ مجھے تو پارٹی کو ڈیڑھ کروڑ روپے دینا ہے...... اچھا دیکھیں، میں کچھ کرتا ہوں۔'' اس نے سیل فون بند کر کے نئی سگریٹ سلگائی پھر ارم سے بولا۔

''یار مجھے ایک پارٹی کو آج ہی تین لاکھ روپے دینا ہیں...... کل پرسوں تک میرا منیجر مجھے رقم بھیج دے گا تو تمہیں دے دوں گا۔''

''آپ نے پہلے جو پیسے لیے تھے وہ تو اب تک واپس نہیں کیے۔'' ارم ہنس کر بولی۔

''ارے یار فکر کیوں کرتی ہو...... پانچ لاکھ بھی کوئی رقم ہے؟ پرسوں دس لاکھ تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کروا دوں گا۔''

''تو پھر پرسوں تک انتظار کر لیں۔'' ارم نے اس مرتبہ سنجیدگی سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' یاسر کا لہجہ بھی بدل گیا۔

''مطلب یہ کہ میں آپ کو کوئی رقم نہیں دے رہی۔''

''مذاق نہیں کرو ارم۔'' یاسر نے منہ بنا کر کہا۔

''یہ مذاق نہیں ہے۔'' ارم نے کہا۔ ''میرے پاس اب کوئی پیسا نہیں ہے۔ میں نے ابو اور دونوں بہنوں کے پیسے انہیں واپس کر دیے تھے۔ اکاؤنٹ میں جو کچھ تھا وہ آپ لے چکے ہیں۔''

یاسر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا پھر بولا۔ ''اچھا یار، وہ زیور تو ہے نا لاؤ وہی دے دو۔ میں وہ زیور رکھوا کر کہیں سے رقم ادھار لے لوں گا۔ اصل میں جس آدمی کو ادائیگی کرنا ہے وہ بہت گھٹیا ہے، گھر تک پہنچ جائے گا۔''

''وہ زیور بھی میں نے لاکر میں رکھوا دیا تھا۔'' ارم نے کہا۔

''کیوں بکواس کرتی ہو؟'' یاسر بھڑک کر بولا۔ ''سیدھی طرح وہ زیور لے کر آؤ۔''

''میں نے کہا ناں کہ زیور میرے پاس نہیں ہے۔'' ارم نے جواب دیا۔

اچانک یاسر کا ہاتھ اٹھا اور ارم کے چہرے پر پڑا پھر تو یاسر گویا پاگل ہو گیا۔ اس نے تھپڑ، لاتیں، گھونسے مار کر ارم کا حلیہ بگاڑ دیا۔

ارم بھی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ ''میں تمہیں ایک پیسا نہیں دوں گی۔ گھٹیا آدمی۔''

یاسر اسے مار مار کر تھک گیا تو بولا۔ ''میں تو تیرا وہ حشر کروں گا کہ تیرے گھر والے بھی تجھے نہیں پہچانیں گے۔ تو کیا سمجھتی ہے، میں نے تجھے ہمیشہ کے لیے اپنے گلے کا ہار بنا لیا ہے۔ میں تو ہر سال پاکستان آتا ہوں یا انڈیا چلا جاتا ہوں۔ وہاں جا کر شادی کرتا ہوں اور تین مہینے بعد بیوی کو طلاق دے کر واپس چلا جاتا ہوں۔''

ارم سناٹے میں رہ گئی۔ ''تم...... ایسا کیوں کرتے ہو؟''

''اس لیے کہ میں گناہ سے بچنا چاہتا ہوں۔'' یاسر نے مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں کفرانِ نعمت بھی نہیں کر سکتا۔ دنیا بھر میں حسن بکھرا ہوا ہے۔ میں بھی حسن پرست ہوں اور اپنا شوق شرع کی حدود میں رہ کر پورا کرتا ہوں۔

یوں شادی پر مجھے نئی نئی خوب صورت لڑکیاں بھی ملتی ہیں اور میں فائدے میں بھی رہتا ہوں۔ میں تین مہینے بعد طلاق دے کر ان کا حق مہر بھی ان کے حوالے کرتا ہوں لیکن اس سے پہلے دگنا بھی اس سے وصول کر لیتا ہوں۔ کیا سمجھیں؟ تمہارا حق مہر بھی ایک لاکھ روپے ہے۔ میں وہ ایک لاکھ طلاق کے ساتھ ہی تمہارے حوالے کردوں گا اور چلا جاؤں گا لیکن مجھے روپیا اور زیور چاہیے اس سے پہلے میں تمہیں طلاق بھی نہیں دوں گا۔ تم یہیں پڑی سڑتی رہنا۔ میں اگلے ہفتے امریکا جارہا ہوں۔''

''ذلیل آدمی۔'' ارم نے کہا۔ ''تو مذہب کی آڑ میں جو کچھ کررہا ہے یہ بھی گناہ ہے۔ اللہ تجھے بھی معاف نہیں کرے گا اور اب تو میں تجھے ایک پیسا نہیں دوں گی۔''

جواب میں یاسر نے اسے پھر اون کی طرح دھنک کر رکھ دیا اور اسے بیڈ پر پھینک کر بولا۔ ''میں اب جارہا ہوں، دو دن بعد واپس آؤں گا۔ اس وقت تک پانی پی کر گزارہ کرنا۔'' وہ دروازہ بند کرکے باہر نکل گیا۔

ارم جانتی تھی کہ کھانے پینے کا تمام سامان ختم ہو چکا ہے۔ بس تھوڑا بہت چائے کا سامان تھا۔ وہ ایک دو دفعہ چائے ضرور بنا سکتی تھی۔ اگر یاسر دو دن تک واپس نہ آتا تو وہ بھوک سے مرجاتی۔ وہ بمشکل تمام اٹھی اور کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ باہر سے لاک تھا۔ بیڈروم میں جو کھڑکی تھی اس پر بھی مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی سے بھی باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔

اس نے دو گھنٹے تک یاسر کا انتظار کیا۔ اس میں اب ہلنے جلنے کی سکت بھی نہیں تھی کیونکہ یاسر نے اسے اتنی بے رحمی سے مارا تھا کہ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

اچانک اسے اپنے سیل فون کا خیال آیا۔ اس نے گدے کے نیچے سے اپنا سیل فون نکالا اور اسے آن کرکے ناصر کا نمبر ملالیا۔

☆☆☆

''میں نے ابھی اپنے دوست انسپکٹر ساجد کو بلایا ہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''تم سب کچھ حرف بہ حرف اسے بتادینا۔''

اس کا ٹیلی فون موصول ہوتے ہی ناصر اسے وہاں سے اسپتال لے گیا تھا اور اسے طبی امداد دلانے کے بعد گھر لے آیا تھا۔

ارم نے انسپکٹر ساجد کو سب کچھ سچ سچ بتادیا۔ انسپکٹر ساجد نے یاسر کے خلاف مقدمہ درج کرلیا۔ تیسرے دن پولیس نے یاسر کو گرفتار کرلیا۔ اس کی گرفتاری کے بعد بہت سے انکشافات ہوئے۔ یاسر نے اب تک پاکستان میں سات شادیاں کی تھیں اور ارم کے علاوہ سب کو طلاق دے دی تھی۔ اتنی ہی شادیاں اس نے بھارت میں بھی کی تھیں۔ اس کی ایک بیوی اور بچے امریکا میں بھی موجود تھے۔ امریکا میں اس کا چھوٹا سا کاروبار تھا۔ اس کے ایک دوست نے اسے مشورہ دیا کہ سب سے آسان اور محفوظ طریقہ یہی ہے کہ پاکستان اور بھارت یا بنگلا دیش جاکر شادی کرو، دو تین مہینے بعد جب دل بھر جائے تو لڑکی کو طلاق دو، حق مہر اس کے حوالے کرو اور واپس آجاؤ۔

پولیس نے اسے گرفتار کرلیا تو وہ ارم کا طلاق نامہ نہ صرف تیار کروا چکا تھا بلکہ اس پر دستخط بھی کرچکا تھا۔

پولیس کے خوف سے یاسر نے فوراً ہی ایک لاکھ روپے حق مہر اور دو لاکھ روپے ادھار کے ادا کیے۔ وہ دو لاکھ اس نے ارم سے ادھار کے نام پر لیے تھے۔

پولیس نے اسلام آباد میں جہانگیر صاحب سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ یاسر کی مسز جہانگیر سے کوئی رشتے داری نہیں تھی۔ یاسر کا باپ مسز جہانگیر کے گھر میں ڈرائیور تھا۔ یاسر خوب صورت اور ذہین بچہ تھا اس لیے مسز جہانگیر نے اسے بھائی بنالیا تھا لیکن کئی برسوں سے انہیں بھی علم نہیں تھا کہ یاسر کہاں ہے اور کیا کررہا ہے؟ صمد صاحب سے تو وہ کاروباری سلسلے میں ملا تھا۔ ان کی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی ورنہ شاید وہ اپنی ہی بیٹی کی شادی یاسر کے ساتھ کردیتے۔

یوں ارم کو ارشد کا رشتہ ٹھکرانے کی سزا مل گئی تھی اور یہ سزا بہت کڑی اور بھیانک تھی۔ شفقت چچا، احمد صاحب اور ناصر بھی شرمندہ تھے کہ وہ بھی یاسر کی نام نہاد دولت اور شرافت سے مرعوب ہوگئے تھے۔

چھ ماہ بعد شاہدہ خالہ پھر راشد کا رشتہ لے آئیں۔ اس مرتبہ ارم انکار کرسکتی تھی نہ ناصر۔

راشد تو ارم کے لیے اندھیروں میں اُمید کی کرن بن کر آیا تھا۔ ارم بھلا اس موقع کو کیسے گنوا سکتی تھی؟

ہاں، اس نے ایک نیک کام بھی کیا تھا، اس نے اپنی جیسی دوسری لڑکیوں کو یاسر سے بچالیا تھا۔ شاید اسی نیکی کے باعث اس کی زندگی میں پھر سے بہار آگئی تھی۔



نادانی

قابلِ احترام مدیر سرگزشت

سلام تہنیت

اپنی ایک کولیگ کی زبانی یہ قصہ سن کر میں کئی روز تک افسردہ رہی تھی۔ ایسی کہانیاں ہمارے معاشرے میں اکثر جنم لیتی ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم دوسروں کی غلطیوں سے سبق حاصل کریں اور محتاط ہو جائیں۔

دانیہ صدیقی

(کراچی)

''بس یار، کیا بتاؤں میں کتنا تھک گئی ہوں۔ کل رات عذرا خالہ اور ماریہ میری عیدی لے کر آ گئی تھیں تم لوگوں کو تو پتا ہی ہے کہ روزہ رکھ کر تو میرا حشر ہی ہو جاتا ہے۔ کل افطار وغیرہ سے فارغ ہو کر لیٹی ہی تھی کہ وہ دونوں پہنچ گئیں۔ میں تو اٹھ ہی نہیں رہی تھی مگر خالہ میرے کمرے میں آ گئیں اور زبردستی بستر سے اٹھا کر لے گئیں۔ مجھے تو سخت بیزاری ہو رہی تھی لیکن انہوں نے مجھے عیدی کی ایک ایک چیز نکال کر دکھائی اور اس کے بعد کھانا بھی اپنے ساتھ بٹھا کر کھلایا۔ سارا وقت یہی کہتی رہیں کہ سعدیہ بہت کمزور لگ رہی ہے اور نوالے بنا بنا کر میرے منہ میں ٹھونستی رہیں۔'' اتنا کہہ کر سعدیہ نے اپنی بات کا اثر جاننے کے لیے اپنی سہیلیوں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور ان کی آنکھوں میں اپنے لیے رشک و حسد کے جذبات دیکھ کر مطمئن ہوتے ہوئے وہیں سے اپنی بات جوڑی ''میں نے تو امی کو سختی سے منع کر دیا ہے کہ اگلی مرتبہ عذرا خالہ آئیں تو انہیں کوئی بھی بہانہ کر کے ٹال دیجیے گا۔ مجھ سے مل کر تو وہ خوشی سے باؤلی ہی ہو جاتی ہیں۔ جھٹ نظریں

اتارنے لگتی ہیں اور حلق تک کھانا کھلا کر ہی ان کی تسلی ہوتی ہے۔ اُف!!" سعدیہ نے جیسے دل ہی دل میں وہ منظر سوچ کر جھرجھری سی لی۔

زوبیہ نے جل کر کہا" ایک یہ ہیں کہ ان کے نخرے ختم ہونے میں نہیں آتے اور ساس ان کے آگے پیچھے گھومتی ہیں۔ ہماری ساس کو دیکھو، رمضان کا آخری عشرہ آنے کو ہے مگر ابھی تک عیدی کے سلسلے میں ان کا فون تک نہیں آیا۔ تمہاری ساس تو اتنی اچھی ہیں کہ انہوں نے ساری خریداری بھی تمہاری پسند اور معیار کے مطابق کی ہے جبکہ یہ تو لے آئیں گی کچھ بھی اناپ۔۔۔ شناپ اٹھا کر۔ پسند آئے یا نہ آئے مسکرا مسکرا کر ان کے ٹیسٹ کی تعریف بھی کرو اور عید والے دن وہ بے تکا سا جوڑا پہن کر تیار بھی ہو جاؤ۔ اوپر سے ان کے منہ سے اپنے منہ میاں مٹھو والی باتیں بھی سنو۔"

سعدیہ نے ایک ادا سے اپنے بال جھٹکے اور اترا کر بولی "بھئی، یہ تو نصیب نصیب کی بات ہے۔ ایک طرف جبران میری ہر فرمائش کو سر آنکھوں پر رکھتے ہیں تو دوسری طرف میری ساس اور نند ہیں جو مجھے دیکھ دیکھ کے جیتی ہیں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ۔۔۔"

کرن اور زوبیہ اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑیں جبکہ سعدیہ مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے منہ پھلائے بیگ سے شیشہ نکال کر اس میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس دوران میں اس کی پوری کوشش تھی کہ اپنے بائیں ہاتھ کو آگے رکھے تاکہ اس میں پڑی جگمگاتی ہوئی ڈائمنڈ رنگ سب کی نظروں میں آجائے اور ہوا بھی یہی، کرن کی نظر سب سے پہلے اس انگوٹھی پر پڑی اور اس نے جھپٹ کر سعدیہ کا بایاں ہاتھ تھام لیا۔ باقیوں کی نظریں بھی اس انگوٹھی پر پڑ چکی تھیں۔ اب سعدیہ شیشے کو بیگ میں رکھ کر مزے سے بیٹھی ان کی ایکسائٹمنٹ کو انجوائے کر رہی تھی۔ مریم نے حسرت بھرے لہجے میں سعدیہ سے سوال کیا" کہاں سے آئی اتنی قیمتی انگوٹھی، کیا جبران بھائی نے گفٹ کی ہے؟"

اس سے پہلے کہ سعدیہ اس کا کوئی شاندار سا جواب دیتی، میں جو بڑی دیر سے خاموش بیٹھی یہ سارا ڈراما برداشت کر رہی تھی طنزیہ انداز میں سعدیہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی،" ہاں ہاں سعدیہ چھپاؤ نہیں۔ انہیں بھی بتاؤ کہ یہ انگوٹھی کہاں سے آئی؟"

ایک لمحے کو سعدیہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا اور وہ تھوڑا سا ٹھٹکی پھر اگلے ہی لمحے سنبھل کر بولی" لو اس میں چھپانے والی کیا بات ہے۔ ظاہر ہے، یہ میرا عید گفٹ ہے۔ میں تو عذرا خالہ کی پسند کی قدیم انگوٹھی پہنتے پہنتے بور ہو گئی تھی۔ کئی بار جبران سے کہا کہ مجھے اپنی پسند کی نازک سی ڈائمنڈ رنگ چاہیے جسے پہن کر مجھے دوستوں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ آخر کار میری پسند کی انگوٹھی دلوا ہی دی"

میں صبر وضبط کی آخری منزلوں کو چھوتی ہوئی اپنا بیگ تھامے اچانک کھڑی ہو گئی۔ سب نے میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں اپنے غصے کو چھپا کر اور حتی الامکان اپنی آواز کی ترشی پر قابو پاتے ہوئے بولی" بہتر ہوگا کہ ہم لوگ اب گھر چلیں ورنہ یہ نہ ہو کہ جبران بھائی سعدیہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے گرلز کالج کے اندر آ دھمکیں۔" میں نے جان بوجھ کر لفظ جبران پر زور دیتے ہوئے سعدیہ کی جانب دیکھا تھا۔ باقی سب تو اسے میرا مذاق جان کر ہنسنے لگیں جبکہ سعدیہ مجھ سے نظریں چراتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

اس کے بعد ہم سب ایک دوسرے کو الوداع کہتیں روانہ ہو گئیں۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتی اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی جس میں بیٹھا ڈرائیور ہمارا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ سعدیہ میرے ساتھ ہی کالج آتی جاتی تھی اس لیے وہ بھی میرے پیچھے پیچھے لپکتی ہوئی آکر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی چل پڑی اور ہمارا سفر خاموشی سے کٹنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد سعدیہ نے دھیرے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے متوجہ کیا اور خاموشی سے اپنی انگلی سے میری ڈائمنڈ رنگ اتار کر مجھے واپس کر دی جو صبح باتوں باتوں میں اس نے مجھ سے دیکھنے کے بہانے گاڑی میں لی تھی اور بعد میں لیکچرز اٹینڈ کرنے کی مصروفیت میں میں اس سے واپس لینا ہی بھول گئی تھی۔ میں نے چپ چاپ اس سے انگوٹھی واپس لے کر اپنی انگلی میں پہن لی اور اس کے شرمندہ چہرے پر ایک تلخ نگاہ ڈال کر واپس کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ سعدیہ کو اس کے گھر ڈراپ کر کے جب میں اپنے گھر پہنچی تو اس کی حرکت کے بارے میں سوچ سوچ کر غصے کے مارے میرے سر میں شدید درد ہونے لگا تھا۔

سعدیہ کی ڈھٹائیاں یاد کر کے ایک مرتبہ پھر میرا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگا تو میں نے بہتر جانا کہ اس موضوع پر سوچنے کی بجائے میں گزشتہ شام گزرنے والی اپنی سادہ سی سالگرہ کی تقریب یاد کروں جسے راحیل (میرے منگیتر) اور ان کے گھر والوں نے یادگار بنا دی تھی۔ یہ ڈائمنڈ رنگ دراصل میری سالگرہ کا تحفہ تھی جسے راحیل نے بڑے چاؤ سے

سب کے سامنے نہ صرف مجھے وش کی تھی بلکہ بڑے فلمی اسٹائل میں ایک گھٹنا فرش پر ٹیک کر مجھے پہنائی بھی تھی اور ہم دونوں کے گھر والوں نے خوب تالیوں اور ہوٹنگ کے شور میں ہمیں خوشگوار زندگی کی دعائیں دی تھیں۔

راحیل کو سوچتے ہی بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور تھوڑی دیر پہلے کی ساری کوفت اور جھنجلاہٹ اڑن چھو ہو گئی۔ راحیل نہ صرف میرے بچپن کے منگیتر تھے بلکہ میرے سب سے پسندیدہ ماموں کے بیٹے بھی تھے۔ ہماری نسبت بڑوں کے فیصلے سے ہمارے بچپن میں ہی طے پا گئی تھی۔ انگوٹھیوں کا تبادلہ بھی ہوا تھا لیکن اب اس بات کو گزرے بارہ سال کا عرصہ بیت گیا تھا اور اب میں اٹھارہ سال کی جبکہ راحیل ستائیس برس کے ہو چکے تھے۔ قدرتی بات ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ آپ کے اندر جہاں مختلف جسمانی تبدیلیاں آتی ہیں وہیں آپ کے ہاتھ اور پیروں کی ساخت بھی بدل جاتی ہے چنانچہ بارہ برس پہلے پہنائی گئی منگنی کی انگوٹھی مجھے اب کسی طور نہیں آتی تھی اسی لیے راحیل نے اس برس میری سالگرہ کے موقع پر سرپرائز دیتے ہوئے مجھے انگوٹھی پہنا کر بڑوں کے فیصلے پر اپنی چاہت کی مہر لگا دی تھی۔

آج صبح کالج کے لیے تیار ہوتے ہوئے گزشتہ شام کے خمار میں مبتلا، میں بے خیالی میں راحیل کی دی ہوئی انگوٹھی اتارنا بھول گئی (مجھے کالج میں اپنے زیورات کی تشہیر کرنا سخت ناپسند ہے) سعدیہ کی نظر گاڑی میں بیٹھتے ہی میری انگوٹھی پر پڑی اور اس نے فوراً اس سے متعلق سوالات جھاڑ دیے۔ میں نے بھی ترنگ میں آ کر اسے راحیل کی جانب سے اپنی سالگرہ کے سرپرائز کے بارے میں بتا دیا۔ یہ سب بتاتے ہوئے میں بالکل بھول گئی تھی کہ سعدیہ کے سامنے مجھے ایسی کسی بات کا ذکر نہیں کرنا تھا جو اس کے اندر موجود تشنہ آرزوؤں کو بیدار کر دیں۔ ہماری آٹھ سالہ پرانی دوستی تھی اور ایک دوست ہونے کے ناتے اب میں اس کو اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ بعد میں جو کچھ ہوا اس میں بہت حد تک میری ہی غلطی تھی۔ میری زبانی راحیل کی وارفتگی کے قصے سن کر سعدیہ بے چین ہو گئی اور اس نے آج پھر وہی حرکت کر ڈالی جس سے میں ہمیشہ چڑتی تھی۔

وہ عادی تھی شیخیاں بگھارنے کی، اور اس دوران میں وہ فراٹے سے اتنے اعلیٰ درجے کا جھوٹ بولتی کہ میں اس کی سب سے قریبی سہیلی تو کیا اگر فرشتے بھی آ کر اس کے جھوٹ کی گواہی دیں تو لوگ نہ مانیں۔

سعدیہ کو یہ عادت آج سے نہیں بلکہ بچپن سے تھی۔ شروع شروع میں اس نے مجھ پر بھی اپنی امارات جھاڑتے ہوئے رعب جمانے کی کوشش کی پھر رفتہ رفتہ جب اسے علم ہوا کہ میرا تعلق ایک کھاتے پیتے اور امیر گھرانے سے ہے تو وہ ٹھیک ہو گئی بلکہ وقت کے ساتھ جیسے جیسے ہماری دوستی گہری ہوتی چلی گئی مجھے سعدیہ کی اس عادت کے بارے میں مزید اندازہ ہوتا گیا۔

یوں سمجھ لیجیے کہ وہ اپنی تمام تشنہ خواہشات کا مداوا اپنی خیالی دنیا میں کر لیتی تھی جیسے اگر ہمیں اپنی پسندیدہ چیز نہ ملے تو ہم تصور کر لیتے ہیں کہ وہ چیز ہماری قسمت میں ہی نہیں تھی لیکن اس کے برعکس سعدیہ اپنے خیالات میں نہ صرف اس چیز کو اپنی ملکیت تصور کر لیتی تھی بلکہ تمام لوگوں کو باور بھی کرا دیتی کہ فلاں چیز میری ہے اور اپنے لیے ان کے رشک اور حسد کو محسوس کر کے اپنی تسکین کیا کرتی تھی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ عادت ایک دن سعدیہ کو شدید نقصان بھی پہنچا سکتی ہے اس لیے وقتاً فوقتاً اسے سمجھایا کرتی تھی اور زندگی کی حقیقت سے آگاہ کرتی رہتی تھی لیکن وہ میری کسی نصیحت پر بھی کان نہ دھرتی۔

اکثر میں اس کی باتوں سے طیش میں آ کر روٹھ جاتی لیکن وہ مجھے منا کر ہی دم لیتی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ سعدیہ بہت پیار کرنے والی اور صرف اس ایک عادت کو چھوڑ کر فطرتاً بہت اچھی لڑکی تھی۔ اسی لیے ہمارے بیچ دوستی کا رشتہ نہ صرف پھل پھول رہا تھا بلکہ اس میں کافی مضبوطی بھی آ چکی تھی۔

اس نے کالج میں مشہور کر رکھا تھا کہ اس کے والد کسی نجی فرم میں نہایت اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ گھر میں روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ایک بھائی امریکا میں مقیم ہے جو وہاں بزنس مینجمنٹ کا کورس کرنے کے علاوہ ایک بہت بڑی فرم میں چیف اکاؤنٹنٹ ہے اور ہر ماہ باقاعدگی سے ڈالرز کی شکل میں اپنی بہن (سعدیہ) کو ہزاروں کی پاکٹ منی بھجواتا ہے۔ اس کی امی کسی کالج کی پرنسپل ہیں اور وہ لوگ کلفٹن میں واقع اپنے وسیع و عریض بنگلے میں رہتے ہیں جہاں نوکروں کی ایک فوج ہمہ وقت ان کے احکام بجا لانے کے لیے تیار رہتی ہے۔ سال بھر پہلے اس کی منگنی اپنے خالہ زاد بھائی جبران سے ہوئی تھی جو کوڑے کوڑے اس کے پیار میں ڈوبے ہوئے ہیں بلکہ دولت اور امارت میں ان لوگوں سے بھی بڑھ کر ہیں اور اس کی ہونے والی ساس اور نند اس پر جان چھڑکتی ہیں وغیرہ

وغیرہ۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس میں سے صرف آدھی سے بھی کم باتیں ہی درست تھیں اور وہ بھی آدھی آدھی۔ مثلاً سعدیہ کے والد ایک نجی کمپنی میں ایک معمولی عہدے پر کام کرتے تھے اور ان کی آمدنی سے کھینچ تان کر گزارا ہوا کرتا تھا البتہ جب سے عادل بھائی (سعدیہ کے بڑے بھائی) ایک مقامی موبائل کمپنی میں ملازم ہوئے تھے ان لوگوں کا ہاتھ تھوڑا سا کھل گیا تھا اور معاشی حالات میں کافی بہتری آگئی تھی۔ سعدیہ اختر کالونی میں اپنے دادا کے ترکے میں چھوڑے گئے دو سو گز کے بنگلے میں اپنی فیملی کے ساتھ مقیم تھی۔ غنیمت تھا کہ اس کے والد اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے ورنہ وراثت کی تقسیم میں تو اس بنگلے کے بھی حصے ہو جاتے۔ گزشتہ کچھ عرصے سے آمدنی میں اضافے کی خاطر شام کو یہ دونوں بہن بھائی اپنی والدہ کے ساتھ مل کر اپنے گھر میں ٹیوشن سینٹر چلانے لگے تھے۔

جبران نامی اس کے خالہ زاد بھائی کا وجود ضرور تھا اور وہ واقعی کافی امیر کبیر باپ کا بیٹا تھا لیکن وہ سعدیہ کا منگیتر ہرگز نہ تھا بلکہ اس بے چارے کے تو فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہ تھا کہ اس کی یہ کزن کس طرح اس کے نام کو اپنے نام کے ساتھ نتھی کیے گھوم رہی ہے اور اس کے بارے میں کئی رومانوی قصے سنا سنا کر کئی بار اپنی سہیلیوں کو جلا بھی چکی ہے۔ عذرا خالہ اور ماریہ بھی کبھار تہواروں کے موقع پر اپنی قیمتی گاڑی میں جبران کے ساتھ ان کے گھر کا چکر لگا لیا کرتی تھیں اور اس پر بھی ان کے نخرے آسمان کو چھو رہے ہوتے تھے۔ خالو تو کبھی ان کے گھر آنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ یہ لوگ بھی بڑی مشکل سے گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا ان کے گھر بیٹھ کر ناک بھوں چڑھاتے رخصت ہو جاتے اور یہ پگلی نہ صرف یہ کہ جبران کو اپنے دل کا شہزادہ بنا کر اسے چاہنے لگی بلکہ اپنے نام کے ساتھ زبردستی اس کا نام جوڑ کر بے انتہا خوش بھی تھی۔

افطار سے فراغت کے بعد میں امی اور ابو کے ساتھ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے سعدیہ کی آواز آئی۔ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے خاموش ہو گئی لیکن اس اللہ کی بندی نے ڈھیروں معافیاں مانگتے ہوئے مجھے منا کر ہی دم لیا۔ ویسے بھی وہ میری سب سے پیاری سہیلی تھی جس سے زیادہ دیر تک ناراض ہونے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد میں سعدیہ کے چھوڑے گئے کسی چٹکلے پر قہقہے لگا رہی تھی۔

اگلے دن مجھے صبح اٹھنے میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ میں کالج کے لیے جلدی جلدی تیار ہو کر گاڑی میں جا بیٹھی اور ڈرائیور کو تیز رفتاری سے گاڑی چلانے کی ہدایت کی۔ نتیجتاً میں دس منٹ سے بھی قلیل عرصے میں کلفٹن سے سعدیہ کے گھر پہنچ گئی۔

ہارن بجانے پر گیٹ سے سعدیہ کی بجائے عادل بھائی نمودار ہوئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ سعدیہ آج بخار کے باعث کالج نہیں جائے گی۔ مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی کہ کل رات تک تو وہ بالکل ٹھیک تھی اور ہم دونوں نے گھنٹا بھر فون پر گپیں بھی ماری تھیں پھر اچانک بخار کیسے چڑھ گیا۔ مجھے ویسے ہی کالج کے لیے دیر ہو رہی تھی اس لیے میں نے اندر جا کر اس کا حال احوال پوچھنے کی بجائے سیدھے کالج کی راہ لی۔

اس روز اتفاق سے ہمارے گروپ کی تمام لڑکیاں غیر حاضر تھیں اس لیے کسی نے بھی سعدیہ کی غیر حاضری کے بارے میں نہیں پوچھا۔ شام کو میں نے فون پر سعدیہ کی طبیعت دریافت کی تو پتا چلا کہ معمولی سی حرارت تھی جو آرام کرنے کی وجہ سے اب ٹھیک ہو گئی ہے۔ تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد اگلے روز اس نے مجھے اسے پک کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے فون رکھ دیا۔ ہم دونوں اگلی صبح کالج پہنچیں تو گیٹ سے داخل ہونے پر ہماری امینہ سے سلام دعا ہوئی۔ وہ ہمارے ہی ڈپارٹمنٹ کی تھی۔ امینہ نے رسماً سعدیہ سے گزشتہ روز نہ آنے کی وجہ دریافت کی تو سعدیہ نے بے پروائی سے کہا

''ہاں سب خیریت ہی تھی۔ دراصل جبران نے پچھلے ہی ہفتے شوروم سے نئے ماڈل کی کرولا نکلوائی ہے اور تب سے زور دے رہے تھے کہ میں ان کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر چلوں۔ میں رمضان میں کالج آتے جاتے ہی اتنا تھک جاتی ہوں کہ بس، اس لیے ان کے ساتھ جانے کا ٹائم ہی نہیں نکال پا رہی تھی۔ پرسوں شام وہ افطار کے بعد اپنی نئی کار لے کر ہمارے گھر آ دھمکے اور مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ کیا بتاؤں امینہ، کیا زبردست کار ہے۔ اس کی نرم نرم سیٹیں اور اے سی تو لاجواب ہے، بس یوں لگتا ہے جیسے نرم نرم بادلوں پر سوار اڑے جا رہے ہوں۔ ہم لوگ پہلے سی ویو گئے پھر دو گھنٹوں تک پیزا ہٹ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ مجھے شاپنگ کرانے وہاں کی شاندار سی مالز میں لے گئے جہاں میں نے دل کھول کر ان کا بٹوا خالی کرایا۔ پھر ہم لانگ ڈرائیو پر نکل گئے جہاں سے کوئی رات کے ایک بجے ہماری واپسی ہوئی۔ وہ بھی اس لیے کہ میرے گھر سے فون پر فون آنے لگے تھے ورنہ تو جبران کا مجھے چھوڑنے کا موڈ ہی نہیں تھا۔ گھر آ کر تو میں بستر پر پڑ کر ایسے سوئی ہوں کہ مت...

پوچھو! امی سحری کے لیے اٹھاتی رہ گئیں لیکن میں دن کے گیارہ بجے اٹھی ہوں۔" سعدیہ نے اتنا کہہ کر امینہ کی جانب دیکھا اور ایک آنکھ میچتے ہوئے بولی "یار، بغیر سحری کا روزہ الگ رکھنا پڑ گیا لیکن پرسوں جو تفریح کی ہے نا میں نے، اس کے آگے اتنا نقصان تو چلتا ہے۔"

امینہ کی آنکھیں حیرت اور رشک سے پھٹی ہوئی تھیں بڑی مشکل سے اس کے منہ سے نکلا" مزے ہیں یار تمہارے، کتنے اچھے ہیں جبران بھائی۔ کتنا خیال رکھتے ہیں تمہارا!! کاش مجھے بھی جبران بھائی جیسا شوہر ملے۔" امینہ نے آہ بھرتے ہوئے جملہ مکمل کیا تو سعدیہ کی آنکھیں فخر سے چمک اٹھیں اور وہ اٹھلاتی ہوئی آگے چل پڑی۔ میں جانتی تھی کہ اب یہی جھوٹی کہانی وہ گروپ کی دوسری لڑکیوں کو بھی سنا کر اپنی تشفی کرے گی۔ اسے روکنا یا سمجھانا بے کار تھا لیکن پھر بھی میں نے اپنی دوستی کا فرض پورا کرتے ہوئے اسے سمجھانے کی ایک ناکام سی کوشش کرتے ہوئے کہا" تم جبران کے نام کا غلط استعمال کر کے ٹھیک نہیں کر رہی ہو سعدیہ۔ اس طرح تم اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے کوئی مشکل نہ کھڑی کر دو۔ ویسے بھی تم اپنی خالہ اور ان کے گھر والوں کا مزاج اچھی طرح جانتی ہو۔ انہیں اگر ان جھوٹے قصوں کی بھنک بھی مل گئی تو وہ لوگ آسمان سر پر اٹھالیں گے۔"

جواب میں سعدیہ نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں نے کوئی بہت ہی نادانی والی بات کر دی ہو اور قہقہہ مار کر ہنس پڑی" فرح، تم بھی کبھار کتنی احمقوں والی باتیں کرتی ہو۔ بھلا عذرا خالہ کو کس طرح پتا چلے گا کہ میں نے کالج میں ان لوگوں کے متعلق کیا باتیں مشہور کر رکھی ہیں۔ کالج کی باتیں کالج کی حد تک ختم ہو جاتی ہیں۔ یہاں میں کم از کم اپنے خوابوں والی زندگی تو گزار لیتی ہوں، کچھ دیر کے لیے ہی سہی مجھے وہ سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے جس کا میں حقیقی زندگی میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہاں سے گھر جاؤ تو پھر وہی خرچوں کا رونا، معمولی خواہشیں پوری کرنے کے لیے مہینے کی پہلی تاریخ کا انتظار اور اس میں بھی اخراجات کی زیادتی کے سبب امی کا ڈنڈی مارنا، ہوٹلنگ تو دور کی بات، باہر سے بریانی کی پلیٹ منگوانے کے لیے دس دفعہ امی اور بھیا کی منتیں کرنا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے!!! اور تم ہو کہ ہر وقت مجھے نصیحتیں کر کر کے میری ناک میں دم کر دیتی ہو۔ کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں ہے کہ میں اپنی تخیلی دنیا میں رہ کر خوشی کے چند لمحے ہی گزار لوں؟ تمہیں تو شاید اندازہ بھی نہ ہو فرح کہ اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹ کر زندگی کس طرح گزاری جاتی ہے۔"

سعدیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور جوش جذبات کے باعث اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔ میری زبان پر یکا یک تالے پڑ گئے تھے اور اب میں نہ چاہتے ہوئے بھی شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ آئندہ میں کبھی بھی سعدیہ کو نہیں ٹوکوں گی۔ واقعی اس میں حرج ہی کیا تھا۔ اگر وہ بیچاری بے ضرر سا جھوٹ بول کر اپنی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کر رہی تھی تو میرا کیا جاتا تھا۔

اس روز کے بعد میں نے نہ صرف سعدیہ کو سمجھانا چھوڑ دیا بلکہ دوستی کی خاطر اس کی لن ترانیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر اس کا ساتھ دینے لگی۔ ہم لوگ ایک مشہور کالج سے بی ایس سی کر رہی تھیں۔ سعدیہ اور میں تو اسکول کے زمانے کی ساتھی تھیں البتہ گروپ کی باقی لڑکیاں اسی کالج میں آ کر ہماری دوست بنی تھیں اس لیے کوئی بھی سعدیہ کے جھوٹ کا پول نہیں کھول سکتا تھا۔ اس کے اور جبران کی والہانہ محبت کے قصے کالج میں زبان زد عام تھے بلکہ نجانے کہاں سے اس نے جبران کی ایک تصویر بھی حاصل کر لی تھی، جس میں وہ اپنے عالیشان لان میں سفید رنگ کی ایرانی بلی کو ہاتھوں میں تھامے کھڑا تھا اور یقیناً بہت وجیہہ لگ رہا تھا۔ پس منظر میں موجود صاف و شفاف سوئمنگ پول نے اس تصویر کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ لڑکیاں جبران اور اس کے عالیشان مکان کو تصویر میں دیکھ کر آہیں بھر کر رہ جاتیں اور سعدیہ کی قسمت پر رشک کرتیں اور سعدیہ انہیں یوں مرعوب دیکھ کر نہال ہو جاتی۔

عید کے بعد لڑکیوں نے کالج میں عید ملن کا پروگرام رکھ لیا۔ اب سعدیہ کی پریشانی دیکھنے والی تھی کیونکہ اس نے اپنی عید کے جوڑے کے بارے میں خوب ڈینگیں مار رکھی تھیں۔ اب اس بات کو ثابت کرنے کا وقت آ گیا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسی سلسلے میں وہ عید ملن پارٹی سے ایک روز قبل پریشانی کے عالم میں کالج سے واپسی پر میرے ساتھ ہی گھر آ گئی۔ میں اس کی پریشانی سے خوب واقف تھی اور بار بار یہی کہہ رہی تھی کہ اب چکھو مزہ، جھوٹ بولنے کا! اسی پریشانی میں تین بج گئے اور وہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ ابھی تک ہمیں کوئی حل نہیں سوجھا تھا کہ سعدیہ عید ملن میں کیا پہن کر جائے گی۔ ادھر تقریباً سارا کالج تجسس میں مبتلا تھا کہ دیکھیں سعدیہ بی بی کا عید کا جوڑا کیسا ہو گا۔

اچانک وہ جاتے جاتے رک گئی اور ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی" دیکھو ذرا، اپنی پریشانی میں تم سے پوچھنا ہی بھول گئی کہ

کل تم کیا پہنو گی؟''

میں نے الماری سے ہلکی سی کڑھائی والا پشواز نکال کر اسے دکھایا تو وہ حیرت سے بولی''لیکن یہ تو تمہارا عید کا سوٹ نہیں ہے۔ میں عید پر تم سے ملنے آئی تھی تو تم نے وہ بلیو والا جوڑا پہن رکھا تھا جو تمہاری سسرال سے آیا تھا۔'' میں نے کہا

''ہاں، میرا تو عید کا جوڑا وہی تھا جو راحیل اپنی پسند سے لے کر آئے تھے لیکن وہ بہت مہنگا اور قیمتی جوڑا ہے۔ میں نے سوچا کہ اتنا بہترین جوڑا اس طرح معمولی سے کالج فنکشن میں پہن کر جانا بیوقوفی ہے۔ اس لیے میں یہ گرین والا پشواز ہی پہنوں گی۔''

سعدیہ کی آنکھیں اچانک کسی خیال کے تحت جگمگانے لگیں اور اس نے اپنی آواز میں دنیا بھر کی لجاجت سمیٹ کر کہا''فرح، اگر تم مجھے کل کے فنکشن کے لیے وہ بلیو والا جوڑا پہننے کے لیے دے دو تو میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔''

میں تھوڑا سا ہچکچائی تو اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور اس طرح میری منتیں کرنے لگی کہ آخر کار مجھے ماننے ہی بنی۔ میں نے امی سے چھپا کر اسے وہ جوڑا اور اس کے ساتھ کی میچنگ جیولری اور اپنی قیمتی سینڈل دے دی اور وہ خوشی خوشی یہ چیزیں لے کر اپنے گھر چلی گئی۔

اگلے روز فنکشن میں جب سعدیہ میرے ساتھ بن سنور کر کالج پہنچی تو ہر ایک کی نظریں اس پر اور اس کے قیمتی جوڑے پر تھیں۔ وہ کسی تتلی کی طرح اِدھر سے اُدھر داد وصول کرتی ہوئی اڑتی پھر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر زندگی کے رنگ بکھرے ہوئے تھے اور وہ بار بار میری طرف متشکرانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میرے لیے یہی بہت تھا اور میں اس کی خوشی میں بے انتہا خوش تھی۔

میں نہیں جانتی تھی کہ اس طرح خاموش رہ کر اور اس نادان کی حوصلہ افزائی کر کے میں کتنی بڑی غلطی کی مرتکب ہو رہی تھی۔ میں اگر پہلی فرصت میں ہی اس کے گھر والوں کو اس کی بیوقوفیوں کے بارے میں بتا دیتی تو آج حالات مختلف ہوتے اور ہم سب کو اتنا بڑا صدمہ برداشت نہ کرنا پڑتا۔

وقت پر لگا کر اڑتا گیا اور ہم لوگوں کا بی ایس سی مکمل ہو گیا۔ میری شادی میں ابھی ڈیڑھ دو سال کا عرصہ باقی تھا کیونکہ راحیل ان دنوں اسپیشلائز کرنے جرمنی گئے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا گھر پر پڑے پڑے بور ہونے سے بہتر ہے ایم ایس سی کر لیا جائے۔ اپنے ساتھ میں نے سعدیہ کو بھی زبردستی یونیورسٹی میں ایڈمیشن دلوا دیا اور ہم پہلے کی طرح ساتھ آنے جانے لگیں۔ ہمارے گروپ سے ہم دونوں کے علاوہ صرف مریم یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی لیکن ہمارے ڈپارٹمنٹ الگ الگ تھے، کلاسز کا ٹائم اور دن بھی الگ الگ تھے اس لیے کئی کئی دن ملاقات نہیں ہو پاتی تھی۔ زوبیہ کی شادی ہو گئی تھی جبکہ کرن ایک مشہور انگلش میڈیم اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ سعدیہ اب یونیورسٹی میں آ کر کچھ محتاط ہو گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ کالج میں تو اس کی شیخیاں سن کر مرعوب ہونے والیاں بہت تھیں لیکن یونیورسٹی جیسی جگہ پر کوئی خال خال ہی کسی کو گھاس ڈالتا تھا اسی لیے سعدیہ کی پہلے والی لن ترانیوں میں کافی کمی آ گئی تھی مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ مکمل طور پر باز آ گئی تھی۔ ہمارے کالج کی کافی لڑکیوں نے اسی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے رکھا تھا گو ہمارے ڈپارٹمنٹس الگ تھے لیکن اکثر کسی نہ کسی سے ٹکرا ہو جاتا تو وہ سعدیہ سے بڑے اشتیاق سے جبران اور اس کے گھر والوں کی خیریت ضرور پوچھتی۔ سعدیہ تو اب ویسے ہی ان موقعوں کو ترستی تھی، جھٹ سے شروع ہو جاتی اور میں اس کی دروغ گوئی پر تاسف سے سر ہلا کر رہ جاتی۔

اپنی شادی کے متعلق اس نے سب کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ اس کی ہونے والی نند ماریہ ابھی پڑھ رہی ہے۔ عذرا خالہ کا ارادہ اپنے دونوں بچوں کی شادی ساتھ کرنے کا ہے۔ ان کا یہ ماننا ہے کہ ایک بیٹی گھر سے رخصت ہو تو دوسری بیٹی اس کی جگہ لے لے اسی لیے اس کی شادی میں ابھی کچھ عرصہ باقی ہے۔

مجھے کبھی کبھار سعدیہ پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ کتنے فراٹے سے جھوٹ بول کر ایک منٹ میں سامنے والے کو بیوقوف بنا دیتی تھی۔ کالج کے چار سال اس نے اسی طرح جھوٹ بول کر اور شیخیاں بگھارتے گزارے تھے۔ اچنبھے کی بات تو یہ تھی کہ آج تک اس کا کوئی جھوٹ پکڑا نہیں گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے مزید دس جھوٹ بولنے کا فن جانتی تھی۔ اس کی تخیلی پرواز بھی زور و شور سے جاری تھی حالانکہ اب ان کے معاشی حالات بہت اچھے ہو گئے تھے اور وہ لوگ مالی پریشانیوں سے نکل آئے تھے لیکن اب سعدیہ اپنے خوابوں کی دنیا میں رہنے کی اتنی عادی ہو گئی تھی کہ کوشش کے باوجود ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے کالج کے چار سال جو جھوٹ بولتے گزارے تھے ان کو نبھانا بھی ضروری تھا۔ سعدیہ کو جھوٹ بول کر اور اپنے آپ کو سب سے برتر ظاہر

کر کے خوشی ملتی تھی اور میں ہمیشہ کی طرح اس کی خوشی میں خوش تھی۔

یونیورسٹی میں پڑھتے یہ دوسرے سال کی شروعات تھی، جب اچانک راحیل کی جرمنی سے واپسی ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی دونوں گھرانوں میں زور و شور سے شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ ارادہ یہ تھا کہ امتحانوں سے فارغ ہوتے ہی میں پیا دیس سدھار جاؤں گی۔ ان دنوں میں قدرتی طور پر بہت خوش رہنے لگی تھی اور یقیناً اس کا اظہار میری حرکات و سکنات سے ہوتا ہی رہتا تھا۔ میرے پاس پہلے کی طرح سعدیہ سے زیادہ باتیں کرنے کا ٹائم بھی نہیں تھا۔ لیکچرز سے فارغ ہونے پر پایا تو کبھی راحیل کا فون آجاتا یا میں ان کے ساتھ گھومنے نکل جاتی اوپر سے امی کے ساتھ بازار کے چکر الگ لگتے رہتے تھے۔ سعدیہ نے مجھ سے کئی بار میری بے رخی کا شکوہ کیا لیکن میں نے مذاق مذاق میں بات اڑا دی۔ اب میری زندگی کا محور صرف اور صرف راحیل کی ذات تھی۔

پچھلے پندرہ روز سے میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ سعدیہ کچھ پریشان سی رہنے لگی ہے۔ وہ باتیں کرتے کرتے اچانک کہیں گم ہو جاتی اور اس کی آنکھوں میں کچھ نا معلوم سے اندیشے لرزتے رہتے تھے۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اس سے پوچھوں کہ وہ دن بدن کیوں اتنی کمزور ہوتی جا رہی ہے لیکن یا تو لیکچرز کی مصروفیت رہی یا میں راحیل کے ہمراہ کہیں گھومنے نکل گئی۔ اب وہ یونیورسٹی بھی خود سے آنے جانے لگی تھی کیونکہ میرے آنے جانے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا تھا۔ زندگی اک دم سے بہت مصروف ہوگئی تھی۔

حد سے زیادہ مصروفیت اور ساتھ ساتھ پڑھائی کی ٹینشن نے مجھے بالآخر بیمار کر دیا۔ میں شدید بخار میں مبتلا ہو کر پورے تین دن بستر پر پڑی رہی۔ چوتھے روز بخار تو اتر گیا مگر امی نے احتیاطاً مجھے ایک دن اور آرام کرانے کے بعد یونیورسٹی جانے کی اجازت دی۔ اس روز میری ایک ہی کلاس تھی لیکن میرا جانا اس لیے ضروری تھا کہ بیماری کی وجہ سے میرا ویسے ہی چار دنوں کے لیکچرز کا نقصان ہو گیا تھا جن میں سے کچھ بہت اہم تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ مس ہو جانے والے لیکچرز کے اہم پوائنٹس سعدیہ سے پوچھ لوں گی۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں پہنچ کر میں نے سعدیہ کو تلاش کرنے کے لیے ہم لوگوں کے مخصوص ٹھکانے کی جانب نگاہ دوڑائی مگر وہ نظر نہیں آئی۔ امی نے مجھے بتایا تھا کہ میری بیماری کے دوران میں اس کا تین چار مرتبہ فون آیا تھا مگر میں ہر بار سو رہی تھی اس

البیرونی نے نیوٹن سے بہت پہلے کشش ثقل کا نظریہ پیش کیا تھا اور ''پکاردو'' سے سات سو سال قبل زمین کا محیط تقریباً پچیس ہزار میل معلوم کر لیا تھا۔ محمود غزنوی نے خوارزم فتح کیا تو البیرونی کو اس کے دربار میں جانا پڑا۔ البیرونی 1019ء تک غزنہ میں رہا اور محمود کی بنوائی ہوئی رصدگاہ میں فلکیات کا مشاہدہ کرتا رہا۔ محمود کے ساتھ ہی وہ ہندوستان چلا آیا اور سنسکرت سیکھنا شروع کر دی۔ ہندو پنڈت اس کے علم و فضل سے متاثر ہو کر اسے ''ودیا ساگر'' یعنی علم کا سمندر کہتے تھے۔

اقتباس: تناظرات اسلامی سائنس از ڈاکٹر عطش درانی

لیے ہماری بات نہ ہو سکی۔ مجھے کلاس کے لیے دیر ہو رہی تھی اس لیے سعدیہ کو ڈھونڈنے کا ارادہ ترک کر دیا اور کلاس کی جانب چل پڑی۔ مجھے یہ امید تھی کہ شاید وہ مجھے کلاس میں بیٹھی مل جائے لیکن وہ وہاں بھی نہیں تھی۔

میں جب لیکچر اٹینڈ کر کے نکل رہی تھی تو وہ مجھے اچانک سامنے سے آتی نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو ٹھٹکی پھر تیزی سے میری جانب بڑھی۔ جب وہ میرے قریب پہنچی تو میں نے ناراضگی سے استفسار کیا، ''کہاں غائب تھیں تم، کتنی دیر سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔ تم نے لیکچر بھی اٹینڈ نہیں کیا۔ کچھ پتا ہے مسز عابدی نے آج انسانی نفسیات کی ایسی ایسی گتھیاں کھولی ہیں کہ بس مزہ ہی آگیا!'' بولتے بولتے میری نظریں جب سعدیہ کے چہرے پر پوری طرح مرکوز ہوئیں تو میں چونک گئی۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے سیاہ حلقے نمایاں ہو رہے تھے۔ تین چار دنوں ہی میں وہ برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھی۔

میں حیرانی سے بولی ''یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے سعدیہ؟ کہیں نشہ وغیرہ تو نہیں کرنے لگی ہو؟ اپنی شکل دیکھو آئینے میں، کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

جواب میں سعدیہ میری طرف دیکھتے ہوئے تلخی سے مسکرائی اور بولی ''شکر ہے، تمہیں اپنے جھمیلوں سے اتنی فرصت تو ملی کہ میری طرف بھی متوجہ ہو سکو۔''

اس کی بات سن کر میں شرمندہ سی ہو گئی۔ واقعی میں نے آج کل سعدیہ کو اپنی مصروفیات میں الجھ کر بری طرح نظر انداز کر رکھا تھا۔ میں نے گھر جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اسی وقت ڈرائیور کو فون کر کے واپس جانے کا کہہ دیا

اور سعدیہ کے ہمراہ یونیورسٹی کے ایک پُرسکون گوشے کی جانب چل پڑی جہاں بیٹھ کر میں تفصیل سے اس کی پریشانی سن سکتی۔ ابھی ہم دونوں ٹھیک سے بیٹھ بھی نہیں پائے تھے کہ میرا موبائل بج اٹھا۔ میں نے اپنے موبائل میں راحیل کے نمبر کے لیے ایک الگ ٹون مخصوص کر رکھی تھی تاکہ میں کبھی ان کی کال مس نہ کرسکوں۔ اس وقت یہی مخصوص ٹون بج رہی تھی۔ کال ریسیو کرنے پر پتا چلا کہ اس وقت وہ یونیورسٹی کے باہر میرا انتظار کررہے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ آج میری ایک ہی کلاس ہوتی ہے اس لیے وہ مجھے لے جانے کے لیے باہر موجود تھے۔ میں ان کے ساتھ جانے کے لیے فون بند کر کے جلدی جلدی کھڑی ہوگئی تو سعدیہ نے میرا ہاتھ تھام کر لجاجت سے کہا "پلیز فرح، اگر تم آج راحیل بھائی کے ساتھ نہ جاؤ اور میری پریشانی سن لو تو تمہارا احسان ہوگا۔ یقین جانو، میں واقعی بہت پریشان ہوں۔ مجھے کوئی حل بتاؤ ورنہ میں کہیں کچھ کرنہ بیٹھوں۔"

سعدیہ کے منہ سے ایسی بات سن کر میں تھوڑا سا کنفیوز ہوگئی کہ راحیل کے ساتھ جاؤں یا نہ جاؤں لیکن اگلے ہی لمحے راحیل کی محبت بچپن کی دوستی پر غالب آگئی اور میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی سعدیہ سے معذرت کی "سوری یار، اگر راحیل یہاں آنے سے پہلے مجھے فون کرتے تو میں انہیں منع کردیتی لیکن اب تو وہ باہر اتنی دھوپ میں آدھے گھنٹے سے گاڑی میں بیٹھے میرا انتظار کررہے ہیں۔ تم ہی بتاؤ، انہیں اس طرح منع کرتے اچھا تو نہیں لگے گا نا۔"

میری بات سن کر سعدیہ چپ سی ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں پھیلی بے بسی کا تاثر مزید گہرا ہوگیا۔ میں نے اسے گلے سے لگا کر تسلی دیتے ہوئے وعدہ کیا کہ کل میں صرف اسی سے بات کرنے یونیورسٹی آؤں گی۔ ہم لوگ لیکچرز وغیرہ سے فارغ ہو کر پہلے کی طرح دو تین گھنٹے صرف باتیں کریں گے بلکہ میں راحیل کو بھی منع کردوں گی کہ کل وہ مجھے لینے نہ آئیں۔

جواب میں سعدیہ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ صرف یہ جملہ ادا کیا "دعا کرو کہ کل تم اپنا یہ وعدہ نبھا سکو۔"

میں اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے ہنس پڑی اور ایک مرتبہ پھر کل کا وعدہ کر کے چل پڑی۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتی تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ مجھے یوں لگا جیسے سعدیہ نے مجھے آواز دی ہو۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ وہیں کھڑی مجھے حسرت سے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے بسی اور دکھ کے سائے لہرا رہے تھے۔ اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے الوداع کہا تو جواباً میں نے بھی اپنا ہاتھ ہوا میں لہرا کر اسے خدا حافظ کہا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں اپنی پیاری دوست کو آخری مرتبہ دیکھ رہی ہوں تو کبھی اس کو اس حال میں چھوڑ کر نہ جاتی۔

راحیل نے مجھے پانچ بجے کے قریب گھر ڈراپ کردیا تھا۔ گھر آکر میں تھوڑا سا آرام کر کے شام میں ہونے والی اپنی ایک کزن کی منگنی کی تقریب میں شرکت کی تیاریاں کرنے لگی۔ اس دوران میں کئی بار میرے ذہن میں آیا کہ سعدیہ کو فون کر کے اس کی خیریت پوچھ لوں۔ اس کا اترا ہوا چہرہ اور بے بس لگاہیں بار بار مجھے ڈسٹرب کررہی تھیں لیکن مجھے ٹائم ہی نہ مل سکا۔ منگنی سے واپس گھر آتے آتے ایک بج گیا۔ تھکن سے میرا برا حال تھا اس لیے کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے سیدھی اپنے بستر میں گھس گئی۔

رات کے چار بجے میں گہری نیند میں مدہوش تھی کہ امی نے مجھے بری طرح جھنجوڑ کر بیدار کیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھی تو انہوں نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ مجھے یہ اندوہناک خبر سنائی کہ سعدیہ نے خودکشی کرلی ہے۔

میں کتنی ہی دیر تک ناسمجھی کے عالم میں پھٹی پھٹی نگاہوں کے ساتھ ان کا چہرہ تکتی رہی۔ میری آنکھوں کے سامنے اس کی بے بسی کی تصویر بنا چہرہ گھوم رہا تھا اور اس کا وہ آخری جملہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا "دعا کرو کہ کل تم اپنا وعدہ نبھا سکو۔" مجھے اب سمجھ میں آرہا تھا کہ یہ جملہ اس نے کیوں بولا تھا۔

میں اس کی ایک ایک بات یاد کر کے بلک بلک کر رو رہی تھی۔ بمشکل امی اور ابو نے مجھے سنبھالا اور ہم اسی وقت سعدیہ کے گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچے تو ایک کہرام بپا تھا، آنٹی پچھاڑیں کھا رہی تھیں جبکہ انکل گم صم سے ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ خودکشی کا کیس تھا اس لیے اسپتال والے اپنی تسلی کر کے ایک مخصوص طریقہ کار کے تحت ہی انہیں ڈیڈ باڈی حوالے کرتے۔ عادل بھائی اسی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ وہاں پہنچ کر ایک مرتبہ پھر میں صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھی اور سعدیہ کو یاد کر کے بلکنے لگی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر ایسا کیا ہوگیا تھا جس سے خوفزدہ ہو کر سعدیہ نے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا تھا۔

مجھے یہ خلش چین نہیں لینے دے رہی تھی کہ سعدیہ نے مجھ سے بات کرنے کی کتنی التجائیں کی تھیں لیکن میں فرصت نہ

نکال سکی۔ ہوسکتا ہے ہم مل کر ہمیشہ کی طرح اس مسئلے کا بھی حل نکال ہی لیتے۔ ابو نے اپنے تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے جلدی جلدی ساری کارروائیاں مکمل کروائیں۔ مجھے تو اپنے اردگرد کا بھی ہوش نہ تھا کہ کون آرہا ہے اور کون جارہا ہے۔ صبح گیارہ بجے کے قریب پتا چلا کہ آخری دیدار کے لیے سعدیہ کی میت ایمبولینس میں گھر لائی جارہی ہے تو میرے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے، شاید میں اس کا سامنا کرنے کو تیار نہ تھی۔ میری خلش مجھے مارے دے رہی تھی۔ میں نے امی سے کہا کہ مجھے اسی وقت گھر لے چلیں، انہوں نے میری بگڑتی ہوئی حالت دیکھی تو فوراً ابو کو مردانے سے بلوایا اور ہم گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد میں نہیں جانتی کہ میں کب گاڑی میں روتے روتے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔

جب میں ٹھیک طرح سے ہوش میں آئی، تب تک سعدیہ کا سوم بھی گزر چکا تھا۔ ڈاکٹر کے مطابق میرا ہلکی نوعیت کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا جس کے باعث میں تین روز تک اپنے آس پاس سے غافل رہی تھی۔ اس کے بعد مجھے مکمل صحتیاب ہونے میں چند روز لگ گئے۔ امی، ابو اور راحیل کی حتی الامکان یہ کوشش ہوتی کہ مجھے زیادہ سے زیادہ خوش رکھیں۔ اس بیچ مجھے اکثر یہی خیال ستاتا کہ آخر وہ کیا بات تھی جس نے سعدیہ کو اپنی جان لینے پر مجبور کردیا تھا۔ مرنے سے چند گھنٹے پہلے وہ مجھ سے کس پریشانی کا ذکر کرنا چاہ رہی تھی۔ جب اسی طرح کے سوالات میرے ذہن میں گردش کرنے لگتے تو میں بے چین سی ہو جاتی۔

ایک ہفتے بعد مریم مجھ سے ملنے میرے گھر آئی۔ وہ پہلے میرے یونیورسٹی آنے کا انتظار کرتی رہی تھی پھر جب اسے اطلاع ملی کہ میں کمزوری کے باعث مزید ایک ہفتہ نہیں آؤں گی تو وہ خود ہی آ گئی۔ ہم لوگ تھوڑی دیر تک تو سعدیہ کو یاد کر کے آنسو بہاتے رہے پھر مریم نے مجھے ایسی بات بتائی جس کو سن کر میں حیرت سے اچھل پڑی۔ اس نے مجھے بتایا کہ عذرا خالہ کی بیٹی ماریہ اسی کے ڈپارٹمنٹ میں پڑھتی ہے۔

میں نے حیرت سے کہا ”لیکن سعدیہ نے تو کبھی مجھ سے اس بات کا ذکر تک نہیں کیا کہ جبران کی بہن اسی یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔“

جواباً مریم ایک ٹھنڈی سانس بھرتی ہوئی بولی ”سعدیہ خود اس بات سے واقف نہیں تھی کہ ماریہ نے گریجویشن کے بعد وہیں ایڈمیشن لے لیا ہے بلکہ میری اس سے اچھی خاصی دوستی بھی ہے۔ مجھے بھی ایک سال تک اندازہ نہیں ہوا کہ یہ وہی ماریہ ہے جس کو سعدیہ نے ہمارے بلکہ سارے کالج کے سامنے غائبانہ طور پر اپنی ہونے والی نند کہہ کر متعارف کروایا ہوا تھا۔ خود ماریہ بھی سعدیہ کی موجودگی سے واقف نہیں تھی کیونکہ ان لوگوں کا تو سالوں میں ایک بار ملنا ہوتا تھا۔“

میں نے اس بات پر چونک کر مریم کی جانب دیکھا تو وہ افسردگی سے سر ہلاتی ہوئی بولی ”ہاں فرح، ہم سب سعدیہ کے جھوٹ سے واقف ہو چکے تھے بلکہ جھوٹ کھلنے پر سعدیہ کو سب کے سامنے بہت ذلت اٹھانی پڑی تھی اور اس کا خوب تمسخر بھی اڑا تھا۔ میں اگر حقیقت سے واقف ہوتی تو کبھی ایسا نہ ہونے دیتی۔“

میں نے بے چینی سے مریم کی بات کاٹ دی اور بولی ”مگر یہ سب کب ہوا تھا؟ اور یہ جھوٹ کیسے کھلا؟“

مریم اداسی سے بولی ”ماریہ میرے ڈپارٹمنٹ میں ہی پڑھتی تھی لیکن شروع شروع میں میری اس سے کوئی خاص دوستی نہ تھی۔ کچھ عرصے بعد نوٹس کے تبادلے کے سلسلے میں میری اس سے بات چیت ہوئی جو بعد میں اچھی دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ ویسے بھی تم دونوں سے میری ملاقات اب کم ہی ہوتی تھی اس لیے مجھے بھی ماریہ کے روپ میں نئی دوست مل گئی۔ ایک روز وہ مجھے اپنے موبائل میں اپنی سالگرہ کی تصاویر دکھا رہی تھی۔ ان میں سے ایک میں وہ اپنے بھائی کے ہاتھ سے کیک کھا رہی تھی۔ میں نے جبران بھائی کی تصویر تو دیکھ رکھی تھی اس لیے تصویر میں انہیں دیکھ کر میں چونک گئی۔ اس نے مجھے یوں چونکتا دیکھ کر وجہ پوچھی تو میں نے اس سے... پوچھا کہ کیا تمہارے بھائی کا نام جبران ہے؟ اب چونکنے کی باری اس کی تھی کیونکہ وہ تو ان کو ہمیشہ بھیا کہہ کر پکارتی تھی پھر مجھے ان کا نام کیسے پتا چل گیا۔ جب میں نے اس سے اس کی ہونے والی بھابی کا نام پوچھا تو اس نے کسی کومل کا نام لیا جو اس کے والد کے دوست کی بیٹی تھی۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ کیا اس کی خالہ زاد بہن سعدیہ اس کی ہونے والی بھابی نہیں ہے تو وہ ششدر رہ گئی اور شدت سے اس کی نفی کرتے ہوئے مجھ سے پوچھنے لگی کہ میں سعدیہ کو کیسے جانتی ہوں اور کس نے مجھے یہ غلط اطلاع دی ہے کہ سعدیہ اس کی ہونے والی بھابی ہے۔ میں تو ویسے ہی اس معاملے میں گھن چکر سی بن گئی تھی اس لیے اسے بتا دیا کہ یہ بات سعدیہ نے خود مجھے بتائی ہے بلکہ مجھے کیا ہمارا سارا کالج اور اب یونیورسٹی میں بھی کافی لڑکیاں یہ بات جانتی ہیں۔ اپنی صفائی کے لیے میں نے اس کے سامنے اپنی کالج کے زمانے کی ساتھیوں سے یہ بات

پوچھی تو انہوں نے بھی میری تائید کی۔

ماریہ یہ سب سن کر آگ بگولا ہوگئی۔ اس نے مجھ سے سعدیہ کے ڈپارٹمنٹ کا پوچھا لیکن اس روز اتفاق سے سعدیہ جلدی گھر چلی گئی تھی اس لیے ان دونوں کا ٹکراؤ نہ ہوا۔ اگلے روز ہم لیکچرز اٹینڈ کر کے چلی گئی تھیں جبکہ سعدیہ وہیں اپنی ڈپارٹمنٹ کی لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی حسب معمول شیخیاں بگھار رہی تھی کہ میرے ہمراہ ماریہ وہاں پہنچ گئی۔ ماریہ کو اپنے سامنے دیکھ کر سعدیہ کا چہرہ فق ہوگیا اور وہ تیزی سے اپنی.. کتابیں سمیٹتی ہوئی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن ماریہ نے وہاں سے ہلنے کی مہلت نہ دی اور ایک ایک کر کے اب تک کے اس کے بولے گئے تمام جھوٹوں کا پول کھولنے لگی۔ اس نے آدھے گھنٹے تک جی کھول کر سعدیہ کو سب کے سامنے بے عزت کیا اور اسے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر وہ اپنے والدین کے ہمراہ اس کے گھر آ کر معافی نہیں مانگے گی تو وہ عذرا خالہ کے ہمراہ اس کے گھر آ کر نہ صرف خود اس کے والدین سے بات کرے گی بلکہ پورے خاندان کو اس کے کرتوتوں سے آگاہ کر دے گی۔

سعدیہ نے اس کی بہت منتیں کیں لیکن ماریہ غصے سے بپھری وہاں سے رخصت ہوگئی۔ سعدیہ کی عزت خاک میں مل گئی تھی۔ وہ لڑکیاں جن کی آنکھوں میں اس کے لیے چند منٹ پہلے تک عزت و رشک کے جذبات تھے، اب انہی آنکھوں میں اس کے لیے تضحیک اور تمسخر نظر آ رہا تھا۔ غصہ تو مجھے بھی سعدیہ پر بہت آ رہا تھا لیکن دوست ہونے کے ناتے میں اسے سہارا دے کر کینٹین تک لے گئی۔ وہاں بٹھا کر اسے سمجھایا کہ بہتری اسی میں ہے کہ جلد سے جلد اپنے والدین کو اعتماد میں لے کر ساری بات بتا دے ورنہ ماریہ جس مزاج کی لڑکی ہے اس سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اپنی بات پر عمل بھی کر گزرے۔ اس وقت سعدیہ بہت پریشان تھی اور بار بار یہی کہہ رہی تھی کہ وہ اپنے والدین کو کبھی یہ بات نہیں بتا سکتی اور نہ اسے یہ قبول ہے کہ اس کی وجہ سے اس کے والدین عذرا خالہ کے سامنے معافی مانگ کر ذلیل ہوں۔ میرے سمجھانے بجھانے پر بھی وہ نہ مانی اور تھوڑی دیر بعد گھر جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

اتنا بتا کر مریم خاموش ہوگئی۔ میں دم سادھے یہ ساری روداد سن رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ خودکشی سے قبل سعدیہ اس قسم کے شدید دباؤ سے گزر رہی تھی۔ اسی لیے جب میری اس سے آخری بار ملاقات ہوئی تھی تو وہ کسی قبر کے مردے کی مانند نظر آ رہی تھی۔ آخر وہی ہوا جس بات کا دھڑکا مجھے پچھلے تین سالوں سے تھا۔ لیکن مجھے اندازہ نہ تھا کہ جب یہ جھوٹ کھلے گا تو سعدیہ اپنی جان سے چلی جائے گی۔ مریم نے ہی مزید بتایا کہ جس روز سعدیہ نے خودکشی کی تھی، اسی روز رات کو آٹھ بجے اس نے مریم کو بے تحاشا روتے ہوئے فون کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ آج دوپہر کو ماریہ اور عذرا خالہ آئی تھیں۔ دونوں نے اس کو اور اس کے والدین کو اونچی آواز میں خوب بے عزت کیا۔ انہوں نے صاف کہا کہ ایسے ہی لالچی اور ہوس کے مارے والدین ہوتے ہیں جو اپنی بیٹیوں کو پٹیاں پڑھا کر امیر لڑکوں کو پھانسنے کے نت نئے گر سکھاتے ہیں۔ یہاں تو ان کا بیٹا بچ گیا مگر نجانے اور کتنے لڑکے ایسے ہوں گے جن کو پھانس کر سعدیہ گل چھرے اڑاتی ہوگی۔

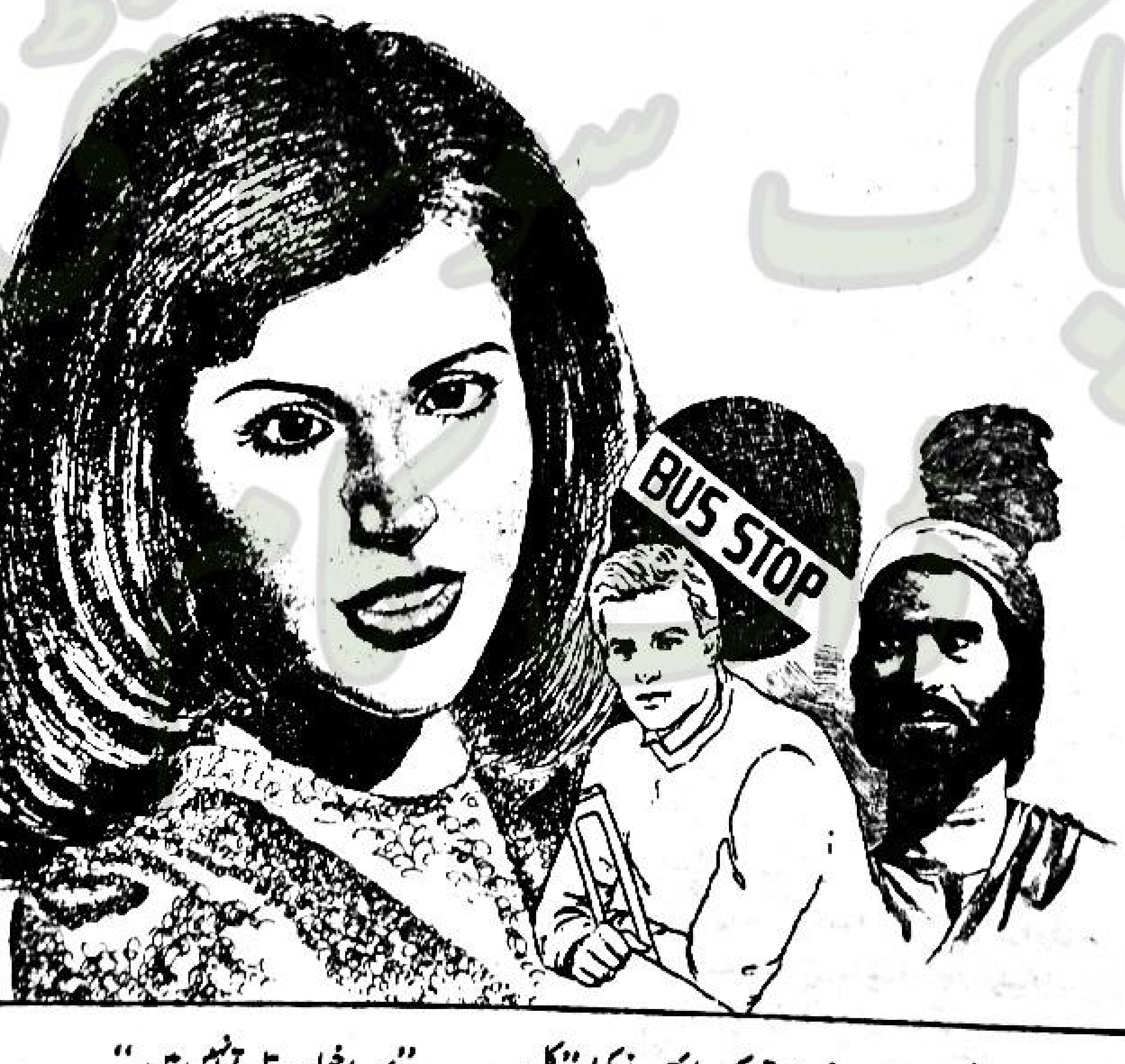
مریم کی زبانی یہ سب سن کر میری کان کی لوئیں تپنے لگی۔ واقعی ماریہ اور عذرا خالہ نے بے عزتی کی انتہا کر دی تھی۔ سعدیہ رو رو کر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے بولتی رہی لیکن انہوں نے ایک نہ سنی بلکہ ماریہ نے تو کمینے پن کی انتہا کرتے ہوئے اس کی الماری سے جبران کی تصویر بھی برآمد کر لی جو اس نے لڑکیوں کے سامنے اپنی دھاک جمانے کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ محلے کے کئی گھروں تک ان کے چیخنے چلانے کی آوازیں گئیں اور انہوں نے بھی سعدیہ کے کردار کے بارے میں جان کر کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔ والدین کی عزت اور اپنے کردار کی دھجیاں اڑتا دیکھ کر اسی رات سعدیہ نے خاموشی سے بھاری مقدار میں جراثیم کش کیمیکل پی کر اس ظالم دنیا سے ناتا توڑ لیا۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ خواب کبھی کبھار اپنے دیکھنے والوں سے قیمت بھی وصول کرتے ہیں۔ میری خوابوں کی ماری دوست کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ بس اس مرتبہ اس کے خوابوں نے اپنی قیمت اس کی جان سے لگائی جو اس پگلی نے ان پر قربان کر دی۔ وہ یقیناً غلطی پر تھی لیکن میرا قصور اس سے بھی بڑا تھا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اس کو خوابوں کی دنیا سے باہر لانے کی بجائے میں یہ سوچ کر خاموش رہی کہ اگر وہ اس میں خوش ہے تو کیا ضرورت ہے کہ اس کو حقیقی زندگی کی تلخیوں سے آگاہ کیا جائے۔ میں یہ بھول گئی تھی کہ خواب بھی ٹوٹتے ضرور ہیں اور جب یہ ٹوٹتے ہیں تو ریزہ ریزہ ہو کر اپنے دیکھنے والوں کو بھی لہولہان کر دیتے ہیں۔

آزمائش

محترم ایڈیٹر
سلام تہنیت!
انسان ایک چہرے پر کئی چہرے سجائے رہتا ہے۔ اس دور میں کسی کو پہچاننا کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنہوں نے میری طرح کبھی دھوکا کھایا ہو۔ اسی وجہ سے میں نے اپنی یہ سرگزشت لکھی ہے کہ لوگ سبق حاصل کریں۔

اسد بخاری
(سرگودھا)



میں روانہ ہونے والا تھا کہ صائقہ نے کہا۔ ''کل رات میں نے اچھا خواب نہیں دیکھا، آپ آج مت جائیں چھٹی کرلیں۔''

''کیا دیکھا ہے؟''

''برے خواب بتاتے نہیں ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن انسان کسی خوف سے دنیا کے کام تو نہیں چھوڑ دیتا۔''

صائقہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اسی لیے پریشان

تھی۔اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔"میں نے دیکھا کہ آپ کسی تاریک سی جگہ قید ہیں اور وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوئے۔آپ بہت پریشان ہیں آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کی ساری عمر کی کمائی داؤ پر لگ گئی ہے۔"

میں ہنسا۔"پگلی میں نے کمایا ہی کیا ہے۔جو ملا وہ خرچ ہوگیا۔یہ گھر بھی ماں باپ کی دین ہے۔باقی تم ہو اور بچے ہو،میری اصل کمائی تو تم لوگ ہی ہو۔"

"پلیز اسد۔" وہ روہانسی ہو گئی۔"آج مت جائیں۔کال کرکے کہہ دیں کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

اللہ نے ہمیں دو بیٹیاں دی ہیں،بڑی رواحہ اسکول جانے لگی تھی اور اس سے چھوٹی عروہ ابھی دو سال کی تھی۔وہ مجھ سے زیادہ قریب بھی تھی۔قریب تو رواحہ بھی تھی مگر عروہ نے ایک طرح سے مجھ پر قبضہ کرلیا تھا اور جب رواحہ میرے پاس آنے کی کوشش کرتی تو وہ اس سے باقاعدہ لڑ پڑتی تھی۔وہ بے چاری شریف تھی اس لیے پیچھے ہٹ جاتی اور انتظار کرتی کہ عروہ اِدھر اُدھر ہو تو میرے پاس آئے۔اس وقت جب صائقہ مجھے روک رہی تھی۔عروہ کے کان بھی کھڑے ہوگئے اور اس نے میرے آس پاس منڈلانا شروع کر دیا۔یہ مخصوص اشارہ تھا کہ میں نہ جاؤں یا اسے بھی لے کر جاؤں۔میں نے اسے گود میں لیا اور پیار کرکے بولا۔"شاید میں رک جاتا مگر آج جانا بہت ضروری ہے۔خان صاحب نے خود کہا ہے کیونکہ معاملہ بڑی وصولی کا ہے۔دو تین پارٹیاں جو ایک مہینے سے پیسے نہیں دے رہی تھیں انہوں نے آج رقم دینی ہے۔تم جانتی ہو خان صاحب سب سے زیادہ بھروسا مجھ پر کرتے ہیں۔اسی لیے انہوں نے کہا کہ میں چھٹی نہ کروں۔"

صائقہ کا چہرہ اتر گیا اور میرا دل رک سا گیا۔ہماری شادی ارینج تھی مگر ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے ان میاں بیوی سے کہیں زیادہ محبت ہے جو شادی سے پہلے محبت کرتے ہیں۔صائقہ کا چہرہ اتر جائے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجائیں یہ مجھ سے برداشت نہ تھا۔میرا دل چاہا رک جاؤں خان صاحب کو کہہ دوں کہ میری طبیعت خراب ہے۔مگر پھر مجھے خیال آیا کہ آج کوئی بھی سیلز آفیسر دستیاب نہیں ہوگا۔ہفتے والے دن اکثر نکلے ہوتے ہیں کیونکہ اس کے بعد دو دن کی چھٹی ہو جاتی ہے۔اگر میں نہیں جاتا تو گاڑی بھی نہیں جاتی اور آج کی وصولی رک جاتی اور اس کے بعد وصولی کرنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ادھار کے کام میں لوگ ٹال مٹول بہت کرتے ہیں اور ان سے رقم نکلوانا بھی ایک فن ہے۔اس لیے جب میں نے گہری سانس لی تو صائقہ جو پُرامید نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی کہ شاید میں مان جاؤں اس کے چہرے پر مایوسی آگئی۔

"اچھا۔" اس نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔"میں بار بار نہیں کہوں گی، اللہ آپ کو خیر سے لے جائے اور خیر سے لائے۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔یہ حقیقت تھی کہ صائقہ ایک دو بار اور کہتی تو شاید میں نہ جاتا۔چاہے اس کی پاداش میں مجھے نوکری سے نکال دیا جاتا۔میں نے عروہ کو پیار کرکے صائقہ کے حوالے کیا اور اپنا چھوٹا سا بیگ اٹھا کر گھر سے نکل گیا۔عام طور سے صائقہ دروازہ بند کرکے اندر چلی جاتی تھی مگر اس دن وہ خلافِ معمول باہر تک آئی اور جب تک میں گلی سے نہیں نکل گیا وہ وہیں کھڑی دیکھتی رہی۔میں بس اڈے تک آیا اور خوشاب جانے والی ویگن پر سوار ہو گیا۔میں شاہینوں کے شہر سرگودھا کا باسی ہوں۔یہ ایک چھوٹا شہر ہے۔یہاں لاہور، راولپنڈی اور فیصل آباد جیسی چہل پہل نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ کچھ خاموش اور سکون والا شہر ہے۔البتہ اس خطے کا یہ سب سے بڑا شہر ہے اور یہی سب سے بڑی مارکیٹ بھی ہے اس لیے خوشاب اور میانوالی تک سے لوگ خریداری کے لیے یہاں آتے ہیں۔ان کی وجہ سے بازاروں میں رونق ہوتی ہے۔

کوئی گیارہ سال پہلے میں نے گریجویشن کے بعد تعلیمی سلسلہ چھوڑ دیا اور ملازمت کی تلاش شروع کردی۔ان ہی دنوں اتفاق سے میانوالی کی ایک آئل سپلائی کمپنی میں سیلزمین کی نوکری آئی تھی۔میں نے بھی اپلائی کیا اور خوش قسمتی سے کامیاب رہا۔خان آئل ٹریڈرز دکانوں پر مختلف طرح کے مشین آئل سپلائی کرتی تھی۔کمپنی کی اپنی گاڑیاں تھیں جو آئل لے کر جاتی تھیں۔ہر گاڑی کے ساتھ تین بندے ہوتے ہیں۔ایک ڈرائیور،ایک لوڈر اور ایک انچارج۔انچارج کا کام بل بنانا تھا اور لوڈر اس کے مطابق مختلف دکانوں اور آئل ڈپوز پر آئل اتارتا تھا۔آغاز میں تو میں آفس میں کام کرتا رہا لیکن جلد مجھے گاڑی کے ساتھ بہ طور انچارج بھیجا جانے لگا۔یہ اس بات کی نشانی تھی کہ کمپنی کے مالک اسماعیل خان صاحب کو میری

صلاحیت اور دیانت پر اعتماد ہو گیا تھا۔ ان ہی دنوں میری شادی بھی ہوئی تھی۔

ہمارے ملک میں آدمی کو دو طرف سے سکون ہو تو سمجھ لیں کہ اس کی زندگی جنت ہے۔ ایک گھر کی طرف سے سکھ ہو تو اللہ کے کرم سے صائقہ سے شادی کے بعد مجھے یہ سکھ ملا اور دوسرے روزگار بغیر پریشانی کے حاصل ہو تو اس کمپنی میں مجھے یہ بھی حاصل ہوا تھا۔ شروع میں کچھ مسئلے ہوئے، میں کام سیکھ رہا تھا۔ سیلز اور مارکیٹنگ کا کام تجربے سے آتا ہے اور اس میں تعلیم بس ایک حد تک ہی رہنمائی کرتی ہے۔ چند سال میں میں نے اس پر عبور حاصل کر لیا تو خان صاحب کے اعتماد کے ساتھ عہدہ اور تنخواہ بھی بڑھی تھی۔ جب گاڑی کے ساتھ جانا شروع کیا تو مزید بہتری آئی تھی۔ آفس جاب کے مقابلے میں یہ کام ذرا مشکل اور رسکی تھا۔ کیونکہ ہمارے پاس لاکھوں کا کیش ہوتا تھا اور راستے میں لوٹ مار کا خطرہ لگا ہی رہتا تھا مگر اللہ کا شکر ہے اب تک میرے ساتھ ایسی کوئی واردات نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ کمپنی کی کئی گاڑیاں لٹ چکی تھیں۔

اس کام میں آسانی یہ تھی کہ تقریباً چھتیس گھنٹے کی ڈیوٹی کے بعد دو دن کا آف مل جاتا تھا۔ عام طور سے واپسی میں اتنا وقت لگ ہی جاتا تھا۔ کیونکہ ہمارا روٹ اور گاہک تقریباً طے شدہ ہوتے تھے۔ وہ فون پر ہیڈ آفس آرڈر لکھواتے۔ اس کے مطابق گودام سے گاڑی لوڈ ہو کر نکلتی اور خوشاب تک آتی تھی۔ وہاں میں گاڑی جوائن کر لیتا اور پھر ہم آئل دیتے وصولی کرتے ہوئے شام تک جہلم پہنچ جاتے تھے۔ رات وہیں رکتے اور پھر اگلی صبح باقی رہ جانے والے آرڈر پورے کر کے عام طور سے دوپہر تک جوہر آباد سے ہوتے ہوئے واپس خوشاب پہنچ جاتے۔ وہاں میں گاڑی میں ڈیزل بھرواتا اور اس کے بعد گاڑی مجھے چھوڑ کر واپس میانوالی چلی جاتی تھی۔ میں دوبارہ ویگن لے کر سرگودھا آ جاتا۔ آنے والے دو دن مجھے چھٹی ملتی تھی۔ اس کے بعد پھر اسی طرح چھتیس گھنٹے کی ڈیوٹی ہوتی تھی اور پھر دو دن کی چھٹی مل جاتی۔

چند سال گزرے تو یہ روٹ اور اس پر آنے والے متعلقہ لوگ ہمیں جاننے لگے تھے۔ گاہک تو خیر جانتے ہی تھے مگر جہاں ہم رات کو رکتے اور جہاں کھانا کھاتے تھے وہ بھی ہم سے اچھی طرح واقف ہو گئے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مجھ سے اچھی طرح واقف ہو گئے۔ باقی ڈرائیور اور لوڈر مختلف وجوہات کی بنا پر دو تین بار بدل چکے تھے۔ آخر میں ہم جس پیٹرول پمپ سے ڈیزل بھرواتے وہاں نزدیک ہی مسجد تھی۔ ظہر اور اگر جمعہ ہو تو جمعے کی نماز ہم وہیں پڑھتے تھے۔ میں ڈرائیور کو پمپ پر ڈیزل بھرواتا چھوڑ کر مسجد چلا جاتا اور نماز پڑھ کر واپسی میں ادائیگی کرتا۔ کیش کا حساب پہلے ہی کیا جا چکا ہوتا تھا۔ وہ گاڑی کے ساتھ ہی میانوالی جاتا تھا۔ اس پیٹرول پمپ اور مسجد کے لوگ بھی مجھے جاننے لگے تھے۔

جب میں نے گاڑی کے ساتھ جانا شروع کیا تو میرے ساتھ نعمت اللہ نامی نوجوان بہ طور ڈرائیور اور سراج نامی لوڈر تھا۔ پھر سراج نوکری چھوڑ کر چلا گیا اور اس کی جگہ عظیم آ گیا۔ یہ بھی نوجوان تھا۔ جو واقعہ میں بیان کرنے جا رہا ہوں۔ یہ آج سے کوئی پانچ سال پہلے کا ہے اور اس کا اہم کردار عظیم ہے۔ اس سے ایک سال پہلے ڈرائیور نعمت اللہ نے نوکری چھوڑ دی مگر اس نے اپنے ماموں عارف اللہ کو سفارش کر کے ڈرائیور رکھوا دیا۔ دونوں کا تعلق میانوالی سے تھا۔ عارف ادھیڑ عمر اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا شخص تھا۔ وہ کم بولتا تھا مگر اس کی وجہ سے مجھے کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا اس لیے ہم جلد آپس میں سیٹ ہو گئے اور ذہنی ہم آہنگی کی وجہ کام میں جو آسانی ہوتی ہے وہ عارف کے ساتھ بھی ہونے لگی۔ عارف کے مقابلے میں عظیم ذرا شوقین مزاج اور خوش شکل نوجوان تھا۔ اس کا تعلق میانوالی میں خان صاحب کے فارم، گودام اور زمینوں کے پاس ایک گاؤں سے تھا۔

عظیم جب میرے ساتھ آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اسے عورتوں سے خاص رغبت تھی اگر راستے میں کہیں کوئی عورت یا لڑکی نظر آتی تو... اس کی محویت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ یہ بات مجھے اچھی نہیں لگتی تھی مگر کیونکہ وہ اس سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ گفتگو میں محتاط رہتا تھا۔ اس لیے میں بھی اس کی یہ حرکت نظر انداز کر دیتا تھا۔ میرے ساتھ اس کا افسر ماتحت کا رشتہ تھا اور عارف عمر میں اس سے بڑا تھا۔ مگر وہ ہنسی مذاق کرتا تھا اور لطیفے سناتا تھا۔ اس کی وجہ سے طویل سفر اچھا گزرتا تھا۔ اس لیے میں عظیم کا ٹھرکی پن بھی برداشت کر لیتا تھا ورنہ میں چاہتا تو اسے بدل کر کسی اور کو بہ طور لوڈر ساتھ لے جاتا۔ ایک واقعہ ہوا مگر اول تو عظیم مکر گیا اور دوسرے ہمارے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ ہوا یہ کہ ہم جہلم پہنچے اور ایک دکان پر سپلائی دینے اترے تھے تو عظیم کچھ دیر

تک واپس نہیں آیا۔ میں نے عارف کو بھیجا کہ دیکھ کر آئے تو اس نے واپس آکر کہا۔ ''سر جی وہ تو دکان میں نہیں ہے۔''

میں پریشان ہوگیا۔ کیونکہ وہ ہمارے سامنے ڈرم اتار کر اندر لے گیا تھا اور پھر اسے واپس آنا چاہیے تھا۔ میں اتر کر دکان تک گیا۔ یہ خاصی بڑی اور اس طرح کی دکان تھی کہ گاہک اندر جا کر چیز لیتے تھے۔ میں نے کاؤنٹر پر موجود اس کے مالک سے پوچھا۔ ''میرا لوڈر یہاں آئل آف لوڈ کرنے آیا تھا اور اس نے رقم بھی لینی تھی۔''

''وہ آیا تھا اور رقم لے کر چلا بھی گیا۔'' دکان کے مالک نے بتایا۔ ''اسے تو گئے ہوئے بھی پندرہ منٹ ہونے کو آئے ہیں۔''

میں کچھ دیر کے لیے چکرا گیا کہ وہ کہاں جا سکتا ہے۔ دکان کے دونوں طرف دکانیں تھیں اور ہم سڑک پر موجود تھے۔ اگر وہ کہیں جاتا تو ہماری نظر میں آتا۔ میں گاڑی اکیلی بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا اس لیے میں نے عارف سے کہا۔ ''باری باری دونوں طرف دیکھ کر آؤ۔''

عارف چلا گیا۔ وہ دس منٹ بعد آیا اور اس نے کہا۔ ''اس طرف تو نہیں ہے۔''

پھر وہ دوسری طرف جانے لگا تھا کہ میں نے عقبی آئینے میں عظیم کو آتے دیکھا۔ میں نے عارف کو اشارہ کیا تو وہ مڑ کر اس کے پاس گیا اور پھر دونوں بات کرتے ہوئے آئے۔ عظیم کہہ رہا تھا۔'' میں نے کہاں جانا ہے یہیں تو تھا۔''

''ہم آدھے گھنٹے سے تجھے تلاش کر رہے ہیں اگر یہیں تھا تو پہلے کیوں نظر نہیں آیا۔'' عارف نے سخت لہجے میں کہا۔

''ایسا بھی ہوتا ہے کبھی کبھی۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا اور رقم نکال کر میرے حوالے کی۔

''عارف ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' میں نے رقم گن کر رکھی۔ ''ہم آدھے گھنٹے سے تمہیں تلاش کر رہے تھے۔''

''سر جی مجھے چکر سا آگیا تھا تو ان سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔'' عظیم نے دکان کے برابر والی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ دکان کے اوپر مکان بنے ہوئے تھے اور سیڑھی مکانوں کے لیے تھی۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے عظیم کو اسی طرف سے آتے دیکھا تھا۔

کام نمٹ گیا تھا اس لیے ہم اس ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئے جہاں رات رکتے تھے۔ میں کمرا لیتا تھا جب کہ ڈرائیور اور لوڈر کو چارپائی ملتی تھی۔ وہ چارپائی گاڑی کے ساتھ لگاتے تھے کیونکہ اس میں آئل ہوتا تھا اور اس کی حفاظت بھی کرنی ہوتی تھی۔ کیش میرے پاس ہوتا تھا اور اس کی حفاظت کے لیے کمرا لینا لازمی تھا۔ خان صاحب کی طرف سے ہمیں لگی بندھی رقم خرچ کرنے کی اجازت تھی۔ عام طور سے اخراجات اسی رقم میں پورے ہو جاتے تھے اور جب میں خوشاب میں گاڑی چھوڑتا تو ان اخراجات کا بل بھی ساتھ کر دیتا تھا۔ ہم ہوٹل پہنچے رات کا کھانا کھایا۔ میں تھک گیا تھا اس لیے کمرے میں چلا آیا۔ مگر ابھی آنکھ لگی تھی کہ دروازہ بجا اور میں نے اٹھ کر پوچھا تو باہر سے عارف کی آواز آئی۔ ''اسد صاحب میں ہوں۔''

میں نے دروازہ کھولا۔ ''کیا ہوا عارف؟''

''عظیم غائب ہے اپنی چارپائی پر نہیں ہے۔''

میں فکرمند ہوگیا۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں رقم کی وجہ سے کمرا اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی رقم لے کر باہر جا سکتا تھا اس لیے میں نے عارف سے کہا۔ ''اسے آس پاس دیکھو۔''

''مجھے پتا ہے وہ کہاں گیا ہوگا۔'' عارف نے کہا۔ ''میں ابھی دیکھتا ہوں جا کر۔''

اس سے پہلے میں عارف سے پوچھتا کہ وہ عظیم کو دیکھنے کہاں جا رہا ہے وہ روانہ ہوگیا اور میں نے دروازہ بند کر لیا۔ عارف آدھے گھنٹے بعد آیا تو عظیم اس کے ساتھ تھا اور دونوں جھگڑ رہے تھے۔ عارف کہہ رہا تھا۔'' میں نے تجھے اپنی آنکھوں سے ان سیڑھیوں سے اترتے دیکھا ہے۔''

''چاچا اپنی آنکھوں کا علاج کرا۔'' عظیم نے بدتمیزی سے کہا۔ ''میرا دل گھبرا رہا تھا اس لیے ٹہلنے چلا گیا۔''

''اتنی دور گیا تھا۔''

''ہاں اندھیرے میں پتا نہیں چلا کہ کتنی دور نکل گیا ہوں۔''

وہ دونوں لڑنے لگے اور رات کے اس پہر ان کی آوازیں بلند ہوئیں تو میں نے مداخلت کی۔ ''خاموش ہو جاؤ اور میری بات سنو۔ تم کہاں گئے تھے؟'' میں نے عظیم سے پوچھا۔

''جی میری طبیعت گھبرا رہی تھی اس لیے ٹہلنے چلا گیا۔''

''یہ جھوٹ کہتا ہے جی میں نے اسے آئل والی شاپ کی سیڑھیوں سے اترتے دیکھا تھا۔''

میں چونکا، آج شام بھی یہی ہوا تھا۔ ''ان سیڑھیوں کا کیا چکر ہے؟''

''مجھے کیا پتا سر جی۔'' عظیم نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''اسی سے پوچھیں۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں سختی سے پوچھ سکتا تھا مگر اس میں شور شرابا ہوتا اور ہوٹل والوں پر غلط تاثر جاتا۔ اس لیے میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے اس پر کل بات ہوگی ابھی جا کر سو جاؤ اور اب کوئی ہوٹل سے باہر نہیں جائے گا۔''

وہ دونوں چلے گئے۔ اگلے دن ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ جوہر آباد پہنچ کر میں نے خان صاحب کو کال کی اور معاملہ ان کے سامنے رکھا۔ انہوں نے کہا۔ ''ایسا کرو آج تم بھی گاڑی کے ساتھ آجاؤ۔ پھر ل کر دیکھتے ہیں۔''

میں نے دل میں سوچا کہ میں تو بیکار میں پکڑا گیا۔ اب ایک دن اور گھر سے دور رہوں گا۔ مگر کیا کرتا نوکری کا معاملہ تھا۔ مجھے بھی جانا پڑا۔ ہم خان صاحب کی زمین پر پہنچے۔ ان کے پاس کئی مربع زمین تھی جس پر ان کا فارم بھی تھا اور آئل کا گودام بھی۔ ان کی رہائش کہیں اور تھی اور یہاں فارم اور گودام کے ملازمین رہتے تھے۔ خان صاحب کو ملازموں کا اتنا خیال تھا کہ انہوں نے یہاں بجلی کے لیے سولر پاور سسٹم تک لگوایا ہوا تھا کیونکہ لوڈشیڈنگ بہت زیادہ تھی۔ گرمیوں میں یہ سولہ سترہ گھنٹے تک پہنچ جاتی تھی۔ گودام کے ساتھ ہی چھوٹے دو اور تین کمروں کے کوارٹر تھے جو ملازمین کو دیے ہوئے تھے۔ مگر رہائش صرف بیوی بچوں والے ملازمین کو دی تھی۔ جو چھڑے چھانٹ تھے وہ اپنی رہائش خود رکھتے تھے۔ عظیم اکیلا تھا اور پھر اس کا گاؤں نزدیک ہی تھا۔ وہ گاؤں میں ہی رہتا تھا۔ خان صاحب کے سامنے دفتر میں پیشی ہوئی اور سوال جواب کے ساتھ دوسرے چکر بھی چلتے رہے۔ اسی میں مجھے وہاں شام ہوگئی اور خان صاحب نے کہا۔ ''آج رات یہیں رک جاؤ کل جو گاڑی جائے گی اس میں خوشاب چلے جانا۔''

سردیوں کا آغاز تھا۔ میں نے سوچا کہ بس میں دھکے کھاتے ہوئے کئی گھنٹے میں گھر پہنچوں گا اس سے بہتر ہے کہ آج یہیں رک جاؤں۔ گاڑی میں آرام سے خوشاب تک جاؤں گا اور وہاں سے گھر۔ عظیم اور عارف کا جھگڑا طے نہیں ہوا تھا کیونکہ عظیم اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ عارف اسے تلاش کرتا ہوا آئل شاپ تک گیا تو اسی وقت عظیم اوپر سے اترا اور عارف کو دیکھتے ہی اس نے مخالف سمت میں دوڑ لگادی۔ عارف اس کے پیچھے بھاگا مگر وہ بوڑھا آدمی تھا جوان عظیم اس سے آگے نکل گیا۔ جب عارف پیچھے رہ گیا تو مجبوراً اس نے واپسی کا سفر شروع کیا اور جب ہوٹل کے پاس آیا تو عظیم اسے وہیں ٹہلتا ہوا مل گیا۔ وہ اسے پکڑ کر میرے پاس لے آیا۔ جب کہ عظیم کا کہنا تھا کہ وہ ہوٹل سے نکلا تو اسے اندھیرے میں اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کتنی دور نکل گیا ہے جب وہ واپس آرہا تھا تو اسے عارف ملا مگر اس نے اس پر الزام لگایا اور اسے پکڑ کر میرے پاس لے آیا۔ دونوں اپنی اپنی بات پر قائم تھے۔ خان صاحب نے دونوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر بات ختم کردی اور حکم دیا کہ اب کوئی نہ تو ہوٹل سے باہر جائے گا اور نہ ہی سفر کے دوران گاڑی سے دور رہے گا۔ ہم دفتر سے نکلے تو عارف میرے ساتھ تھا۔ وہ سخت غصے میں تھا کہ عظیم نے اسے جھٹلایا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''آپ دیکھ لینا میں اسے پکڑ کر رہوں گا۔''

''یہ وہاں کیا کرنے گیا تھا؟''

''کسی عورت یا لڑکی کا چکر ہوگا۔'' عارف نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں یہ شوقین بندہ ہے۔''

عارف بھی اسی علاقے کا رہنے والا تھا مگر اس کا گاؤں ذرا دور تھا۔ پھر وہ عمر والا بھی تھا اس لیے خان صاحب نے اسے یہاں رہنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ وہ گودام میں سو جاتا تھا۔ فارم پر ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی جس میں سہولت کی ہر چیز تھی اور بہت اچھا فرنیچر رکھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی خان صاحب کی فیملی بھی یہاں رکنے آتی تو اسی کوٹھی میں ٹھہرتی تھی۔ اسی طرح جو مہمان آتے وہ بھی یہیں رکتے تھے۔ مجھے اس کا ایک کمرا مل گیا۔ موسم ٹھنڈا تھا اس لیے سورج ڈوبتے ہی یہاں سناٹے اور تاریکی کا راج ہوگیا تھا۔ بس کہیں کہیں ضروری روشنیاں جل رہی تھیں۔ گودام کا چوکیدار تھا مگر گودام کوٹھی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ رات کے کھانے کے بعد میں چہل قدمی کے لیے باہر نکلا۔ کھانا خاصا مرغن تھا اور میں نے سیر ہو کر کھایا تھا اس لیے طبیعت میں ذرا گرانی آگئی تھی اسے دور کرنے کے لیے باہر آیا۔ ٹہلتے ہوئے میں باغات تک گیا۔

خان صاحب کی زمین پر اعلیٰ درجے کے گریپ فروٹ کا بڑا سا باغ بھی تھا۔ میں درختوں کے درمیان سے گزر رہا تھا کہ مجھے آگے کسی کے رونے اور گڑگڑانے کی آواز آئی۔ میں پہلے رکا اور سوچا کہ مجھے اس طرف جانا

چاہیے یا نہیں۔ پتا نہیں کیا معاملہ ہو اور خان صاحب اس وقت میری یہاں موجودگی پسند کریں یا نہ کریں۔ پھر میں یہ سوچ کر آگے آیا کہ کوئی ایسا چکر ہوا جس میں مداخلت ٹھیک نہ ہو تو میں خاموشی سے واپس چلا جاؤں گا۔ زمینوں پر شور شرابے اور مار دھاڑ کے چکر چلتے رہتے ہیں۔ میں درختوں کے آخری سرے تک گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ چند افراد نے ایک آدمی کو گھیر رکھا تھا اور وہ اسے مار پیٹ رہے تھے۔ مگر ان کا انداز خطرناک نہیں تھا۔ وہ لات مکے استعمال کر رہے تھے۔ اگر اسے مارنا ہوتا تو ان کے پاس اسلحہ نظر آرہا تھا۔ وہاں کسی قدر روشنی تھی۔ میں نے غور کیا تو پٹنے والے کو فارم کے چوکیدار فضل کے طور پر شناخت کرلیا۔ باقی افراد میرے لیے اجنبی تھے۔ فضل بے چارہ غریب سا آدمی تھا اور وہ خاصا پٹ چکا تھا۔ مجھے ترس آنے لگا۔ اگرچہ تین مسلح افراد کے منہ لگنا بھی مناسب نہیں تھا مگر میں اسے یوں مار کھاتے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے ایک درخت کی آڑ لیتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔ ''کیا ہو رہا ہے یہاں، فضل تو کہاں ہے؟''

فضل چوکیدار کا نام تھا اس نے میری آواز پر بلبلا کر کہا۔ ''دیکھیں جی یہ مجھے مار رہے ہیں۔''

''شرافت، عباس دیکھو کون ہے۔'' میں نے جو نام منہ میں آئے لے کر بولنا شروع کر دیا۔ ''کس کی جرأت ہے کہ اسماعیل خان کی زمین پر آئے۔''

میری اس کارروائی کا فوری اثر ہوا۔ وہ تینوں افراد بھاگے اور تاریکی میں غائب ہو گئے۔ جان چھوٹنے پر فضل دوڑتا ہوا میری طرف آیا اور مجھے اکیلا پا کر حیران ہوا۔ ''باقی لوگ کہاں ہیں جی سب کو بلائیں یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔''

''کون تھے یہ؟''

''قریبی گاؤں کے لوگ ہیں۔ پوری برادری ہے۔'' اس نے ایک برادری کا نام لیا۔ ''بہت ظالم اور ذرا سی بات پر بھڑک جانے والے لوگ ہیں۔''

''تمہیں کیوں مار رہے تھے؟''

''وہ جی عظیم کا کہہ رہے تھے کہ اسے نوکری سے نکال دو ورنہ یہاں رہنے والوں کے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔''

میں حیران ہوا۔ ''وہ عظیم لوڈر کی بات کر رہے ہو؟''

''جی اسی کی بات کر رہا ہوں اس کا گاؤں ان کے گاؤں کے پاس ہی تو ہے۔''

''وہ عظیم کے بارے میں ایسا کیوں کہہ رہے تھے؟'' میں نے پوچھا۔ ''پھر معاملہ عظیم کا ہے تو تمہیں کیوں مار رہے تھے؟''

''پتا نہیں جی۔'' چوکیدار نے دبے لفظوں میں انکار کیا مگر مجھے لگا کہ وہ جانتا ہے۔ میں نے زور دیا تو اس نے اس شرط پر بتانے کا کہا کہ میں نہ تو کسی سے کہوں گا اور نہ ہی اس کا نام لوں گا۔ ''یہ بہت ظالم لوگ ہیں مجھے ہی مار دیں گے۔''

''اب ایسا بھی نہیں ہے تم اصل قصہ بتاؤ۔ میں خان صاحب سے بات کرتا ہوں۔''

تب فضل نے مجھے بتایا کہ عظیم کا ان لوگوں کی کسی لڑکی سے چکر رہا ہے۔ وہ دونوں چھپ کر ملتے تھے۔ عظیم اور لڑکی کے گھر والوں کو پتا نہیں تھا۔ اس دوران میں ان ملاقاتوں کا نتیجہ نکل آیا اور لڑکی اُمید سے ہوگئی۔ اس کے گھر والوں کو پتا چلا تو انہوں نے خاموشی سے اس معاملے کو ختم کیا اور اب وہ عظیم کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ اسے کھل کر تو کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ اس صورت میں ان کی بدنامی ہوتی مگر ان کی کوشش تھی کہ عظیم کو نقصان پہنچائیں یا یہاں سے چلتا کریں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر عظیم کو نوکری سے نکال دیا جاتا تب بھی اس کا کیا جاتا۔ یہ کوئی بہت اچھی جاب تو تھی نہیں اور اسے آسانی سے ایسی ہی دوسری ملازمت مل سکتی تھی۔ فضل کی جان بچ گئی تھی اس لیے وہ چاہتا تھا کہ اب بات خان صاحب تک نہ پہنچائی جائے۔ شاید اسے خطرہ تھا کہ اس صورت میں اس کی نوکری جاسکتی ہے۔ اسے یہاں چوکیداری کے لیے رکھا تھا اور وہ اپنی حفاظت بھی نہیں کرسکتا تھا تو فارم کی حفاظت کیسے کرتا۔ اس نے میری منت ساجت کی تو میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں نہیں کہوں گا لیکن اس صورت میں تم بھی میرا ذکر نہیں کرو گے کہ میں یہاں آیا تھا۔''

دیکھا جائے تو اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔ میں خان صاحب کی کمپنی میں کام کرتا تھا اور ان کا فارم اس سے الگ تھا۔ عظیم میرا ماتحت ضرور تھا مگر اس کے کردار اور افعال کا میں ذمے دار نہیں تھا۔ البتہ مجھے اس پر غصہ ضرور آیا تھا۔ وہ کردار کا اتنا خراب نکلے گا یہ میں نے سوچا نہیں تھا۔ میں واپس آکر سو گیا اور اگلے روز ایک جانے والی گاڑی میں خوشاب تک چلا گیا۔ وہاں سے وین لے کر گھر پہنچ گیا۔ خان صاحب نے مجھے ایک دن کا اوور ٹائم دیا تھا

اس لیے یہ سفر رائیگاں نہیں گیا۔ ایک دن بعد میں دوبارہ کام پڑ گیا تھا۔ لیکن میں نے عظیم سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ البتہ اب میں یہ کرنے لگا کہ جب ہم جہلم پہنچتے تو اس آئل شاپ پر میں خود جاتا تھا اسی طرح ہوٹل میں اسے خبردار کرتا تھا کہ وہ رات کو باہر جانے سے گریز کرے۔ اب مجھے عارف کی بات کا یقین ہو چلا تھا کہ عظیم کسی لڑکی یا عورت کے چکر میں مارکیٹ کے اوپر بنے فلیٹوں میں جاتا تھا۔ یہ بہت سارے فلیٹ تھے اور یہ کہنا مشکل تھا کہ عظیم کہاں جاتا تھا۔ عارف اس کی جاسوسی کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے منع کر دیا۔

"چھوڑو یار اگر اس نے غلط کیا ہے تو خود بھگتے گا۔ ہمارا ہاتھ صاف ہے۔"

عارف مایوس ہوا تھا۔ اصل میں جب عظیم نے اسے جھٹلایا تو وہ بہت طیش میں تھا اور اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح عظیم پکڑا جائے۔ عارف کردار کا پکا تھا اس کا گھر تھا اور بیوی بچے تھے میں نے کبھی اسے کسی عورت کی طرف متوجہ نہیں دیکھا تھا۔ اگر اسے پتا چل جاتا کہ عظیم فارم کے پاس کیا گل کھلا چکا ہے تو شاید وہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتا یا پھر خود نوکری چھوڑ کر چلا جاتا۔ دو تین بار ساتھ جانے کے بعد عظیم اور عارف کے تعلقات بھی بہتر ہو گئے۔ اب وہ ایک دوسرے سے ٹھیک سے بات کرتے تھے مگر ہنسی مذاق بند ہو گیا۔ میں بھی اب عظیم کے ساتھ نارمل ہو گیا تھا۔ بات وہی تھی کہ اپنے کیے کا وہی ذمے دار تھا۔ مگر بعض اوقات آدمی کو دوسرے کا کیا کیسے بھگتنا پڑتا ہے اس کا پتا مجھے کچھ عرصے بعد چل گیا تھا۔

☆☆☆

سردی کے دن تھے اس لیے سب کی خواہش ہوتی تھی کہ جلد از جلد ڈیوٹی پوری کر کے گھر جایا جائے۔ مگر سردیوں میں مختلف اقسام کے آئل کی مانگ بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے کام بڑھ جاتا ہے۔ میں خوشاب سے گاڑی میں بیٹھا اور آرڈر کے مطابق آئل کی سپلائی دیتے اور وصولی کرتے ہوئے ہم جہلم پہنچے۔ وہاں رات رکے اور پھر صبح سویرے روانہ ہوئے۔ خوش قسمتی سے دھند کم تھی ورنہ ہمارا آج کے دن واپس پہنچنا مشکل ہو جاتا۔ دوپہر تک ہم جوہر آباد پہنچے۔ ظہر کا وقت نکل رہا تھا۔ پیٹرول پمپ پر میں نے عارف سے کہا۔ "تم ڈیزل بھرواؤ جب تک میں نماز پڑھ کر آتا ہوں پھر ادائیگی کروں گا۔"

"میں ذرا اس کے لیے جا رہا ہوں۔" عظیم نے چھوٹی انگلی سے مخصوص اشارہ کیا۔

"جلدی آنا۔" میں نے کہا۔ "میں بس فرض پڑھ کر آ رہا ہوں۔ آج دھند کا خطرہ بھی ہے جلد گھر پہنچ جائیں تو اچھا ہے۔"

اس دوران میں عارف نے گاڑی میں ڈیزل بھروانا شروع کر دیا تھا۔ مسجد سڑک پار ہی تھی۔ میں مسجد میں آیا تو اذان ہو چکی تھی اور لوگ آ رہے تھے۔ میں وضو کر کے اندر آیا تو پتا چلا کہ امام صاحب ابھی نہیں آئے ہیں۔ وہ پانچ منٹ بعد آئے تو اقامت کہی گئی اور پھر نماز شروع ہو گئی۔ جب سلام پھیرا اور دعا ہوئی تو میں نے اٹھتے ہوئے دیکھا کہ عارف دو صف پیچھے موجود ہے۔ میں اس کے پاس آیا۔ "تم کیسے آ گئے اور گاڑی کس پر چھوڑ کر آئے ہو؟"

"گاڑی پیٹرول پمپ کے سائیڈ پر روک دی ہے۔ وہاں بندے ہیں وہ دیکھ رہے ہوں گے۔ ابھی ڈیزل کی ادائیگی بھی کرنی ہے۔"

"عظیم کہاں ہے؟" میں نے باہر آتے ہوئے پوچھا۔

"جب تک میں آیا تھا وہ واپس نہیں آیا تھا۔" عارف بولا۔ میں ذرا فکر مند ہو گیا کیونکہ ہمیں گاڑی کو اکیلے چھوڑنے کا حکم نہیں تھا۔ ہم باہر آئے تو میں نے دیکھا کہ گاڑی ایک طرف کھڑی ہے مگر دن کے اوقات میں رش تھا تو پیٹرول پمپ کا کوئی ملازم آس پاس نہیں تھا۔ جب ہم گاڑی کے پاس پہنچے تو اسی وقت عظیم وہاں آ گیا۔ میں نے خفگی سے کہا۔

"تم نے اتنی دیر لگا دی۔ گاڑی دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔"

"چاچا تو تھا جی۔" اس نے عارف کی طرف دیکھا۔

"میں بھی نماز پڑھ رہا تھا۔" عارف نے کہا۔ "آج ڈیزل جلدی بھر گیا تو میں بھی نماز پڑھنے چلا گیا۔"

میں نے کیبن کا دروازہ کھولا تو دونوں سیٹوں کے درمیان کاغذات اور اہم چیزیں رکھنے والا خانہ کھلا ہوا تھا۔ یہ لاک نہیں ہوتا تھا مگر یوں کھلا بھی نہیں ہوتا تھا۔ کاغذات باہر بکھرے ہوئے تھے۔ جب ہم سفر میں ہوتے تھے تو رقم اپنے پاس رکھنے کی بجائے عقبی آئل رکھنے والے حصے کے فرش میں ایک چھوٹے سے لاکر میں رکھتے تھے اور یہ لاک ہوتا تھا اس کی چابی میرے پاس تھی۔ ہم اس پر آئل کے

ڈبے وغیرہ رکھتے تھے تاکہ کسی کو نظر نہ آئے۔ مگر یہ خانہ کھلا دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا اور میں عقبی حصے کی طرف آیا۔ گاڑی کا یہ حصہ اوپر سے چھت اور سائیڈوں سے جالیوں کی مدد سے بند تھا۔ پیچھے کا دروازہ تالا لگا کر بند کیا جاتا تھا مگر جب میں پیچھے آیا تو تالا ٹوٹا ہوا تھا اور صرف اٹکایا ہوا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی پتا چل گیا کہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا تھا۔ ڈبے سرکے ہوئے تھے اور فرش والا خانہ بھی کھلا ہوا تھا۔ اس کا لاک بھی توڑ دیا گیا تھا۔ میں ڈوبتے دل کے ساتھ اندر آیا اور خالی خانے میں جھانکا مگر وہ بالکل خالی نہیں تھا۔ رقم غائب تھی اور اس کی جگہ ایک تہہ کیا ہوا کاغذ رکھا تھا۔ میں نے اسے نکال کر کھولا تو اس پر ٹیڑھی میڑھی لکھائی میں تحریر تھا۔

''تم لوگوں کو بولا تھا عظیم کو نوکری سے نکال دو۔ مگر خان صاحب تم نہیں مانے اب یہ رقم ہم لے جا رہے ہیں۔ یہ ہمارے پاس امانت ہے۔ جب تم عظیم کو نوکری سے نکال دو گے تو یہ رقم واپس مل جائے گی۔''

مجھے ایک لمحے کو چکر سا آ گیا تھا کیونکہ یہ ساڑھے پانچ لاکھ کی رقم تھی۔ اس وقت میری تنخواہ اوور ٹائم اور دوسری چیزیں ملا کر مشکل سے پندرہ ہزار بنتی تھی۔ یہ رقم میری ذمے داری تھی اور اب مجھے ہی اس مشکل کو بھگتنا تھا۔ میں نے خان صاحب کو کال کی اور ان کو ساری بات بتائی۔ وہ ایک لمحے کو چپ ہوئے تھے پھر انہوں نے کہا۔ ''تم وہیں رکو، میں اس علاقے کے تھانے میں کال کر رہا ہوں اور خود بھی آ رہا ہوں۔''

ایک گھنٹے بعد پولیس اور خان صاحب آ چکے تھے۔ ہمیں گاڑی سمیت تھانے لے جایا گیا۔ خان صاحب اندر ایس ایچ او کے پاس چلے گئے۔ ہم تینوں ملزموں کی طرح برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد خان صاحب ایس ایچ او کے ساتھ آئے۔ اس نے خان صاحب سے کہا۔ ''صرف دو دن کے لیے انہیں میرے حوالے کر دیں اگر رقم نہ ملی تو بے شک مجھ سے لینا۔''

یہ سن کر ہمارے ہوش اڑ گئے تھے۔ اگرچہ تھانے آنے کا یہ پہلا تجربہ تھا لیکن ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ وہاں ملزموں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ میرے بچپن میں ہمارے محلے کا ایک آدمی جھگڑے میں تھانے گیا تھا واپسی میں اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ہفتوں تک اس سے سیدھا چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ میں نے خان صاحب سے کہا۔ ''اللہ گواہ ہے کہ ہم نے کچھ نہیں کیا یہ کسی اور کا کام ہے۔ اسی نے رقعہ لکھا ہے۔''

''یہ ان میں سے کسی کا کام ہے۔'' ایس ایچ او نے یقین سے کہا۔ ''آپ ایک بار میری بات مان لیں۔''

''نہیں یہ میرے اعتماد کے لوگ ہیں۔'' خان صاحب نے کہا۔ ''مجھے ایک بار ان سے بات کر لینے دیں۔''

خان صاحب ہمیں تھانے سے لے آئے مگر گھر جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ انہوں نے ہمیں جوہرآباد میں ہی ایک جاننے والے کے پاس ٹھہرایا۔ انہوں نے ہم سے کہا۔ ''جب تک یہ معاملہ صاف نہیں ہو جاتا تم اپنے گھر نہیں جا سکتے۔''

''یعنی جب تک چور نہیں پکڑا جاتا اور رقم نہیں مل جاتی؟'' عظیم نے پوچھا۔

''ہاں۔'' خان صاحب نے صاف کہا۔ ''میری رقم گئی ہے اور وہ مجھے ہر صورت واپس چاہیے۔''

مجھے ایک بار پھر اپنی عافیت خطرے میں نظر آنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''لیکن خان صاحب یہ تو واضح ہے کہ چوری کن لوگوں نے کی ہے۔ پولیس ان سے تفتیش کرے۔''

''میری ایس ایچ او سے بات ہوئی ہے اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ رقعہ صرف دھوکا دینے کے لیے ہے۔ عظیم والی بات میرے علم میں آئی تھی۔ غلطی اس کی ہے لیکن اصل غلطی ان کی لڑکی کی ہے جو رات کی تاریکی میں اس سے ملنے آتی تھی۔ وہ صرف عظیم کو قصوروار نہیں سمجھ سکتے اور وہ مجھے بھی جانتے ہیں۔ جس نے رقم چرائی ہے اس نے بہت ہوشیاری سے اس واقعے کو استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ اصل میں رقم ہی چرائی گئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل، امانت اور عظیم کو نوکری سے نکالنے والی بات جھوٹ ہے اور گمراہ کرنے کے لیے کی گئی ہے۔''

''تب چور کا کیسے پتا چلے گا؟'' عظیم نے پوچھا۔ وہ شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ اسے کیا مجھے بھی علم نہیں تھا کہ خان صاحب اس حقیقت سے واقف ہو چکے ہیں۔ مگر فی الحال مجھے عظیم کی بجائے اپنی پڑی تھی۔ اگر خان صاحب ہمیں پولیس کے حوالے کر دیتے تو وہ چوری قبول کرانے کے لیے ہمارا حشر کر دیتی۔ خان صاحب کے تیوروں سے لگ رہا تھا

کہ وہ اس معاملے کو اتنی آسانی سے چھوڑنے والے نہیں تھے۔ ہر دولت مند کی طرح انہیں بھی اپنی رقم عزیز تھی۔ میں وقت پر گھر نہیں پہنچا تو صائقہ نے پریشان ہو کر کال کی تھی۔ ”آپ کہاں ہیں اب تک کیوں نہیں آئے ہیں؟“

میں نے اسے بتایا کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے اور جب تک رقم نہیں مل جاتی ہمیں یہیں رکنا تھا۔ صائقہ پریشان ہو گئی۔ ”اسی لیے میں آپ کو روک رہی تھی۔ میرا خواب سچا ثابت ہوا نا؟“

”تم فکر مت کرو میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے اس لیے اللہ بچانے والا ہے۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔“

میں نے صائقہ کو تسلی دے کر موبائل بند کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ اس ملازمت کے دوران میں میں نے کبھی اپنے ضمیر کے خلاف کام نہیں کیا۔ مارکیٹنگ کرنے والے عام طور سے کمیشن لیتے ہیں اور آئل کمپنیاں کمیشن دیتی بھی ہیں کیونکہ یہ رواج ہو گیا۔ کمیشن دینے کا طریقہ کار ایسا ہوتا ہے کہ مالکان بھی اعتراض نہیں کرتے ہیں۔ جیسے ایزی لوڈ کرانا یا کیش واؤچر دینا اور یہ پروڈکٹس کے ساتھ ملتے تھے۔ مالکان کا اس سے کچھ لینا دینا نہیں تھا بلکہ ان کو فائدہ ہوتا تھا کہ ان کے بزنس کی پروموشن آئل کمپنیاں خود کرتی ہیں۔ مگر میں نے کبھی ان چیزوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ مجھے یہ اپنے ضمیر کے خلاف لگتا تھا۔ کیونکہ میں جو کام کر رہا تھا مجھے اس کی پوری تنخواہ مل رہی تھی۔ پھر دوسرے فوائد بھی تھے تو میں کمیشن کیوں لیتا چاہے وہ گفٹس کی صورت میں ہو۔ روانہ ہونے سے پہلے خان صاحب نے مجھے الگ بلایا اور مجھ سے کہا۔

”اسد تمہیں ان دونوں میں سے کسی پر شک ہے؟“

”نہیں خان صاحب۔“ میں نے دیانت داری سے کہا۔ ”جیسے آپ مجھ پر بھروسا کرتے ہیں اسی طرح میں ان پر بھروسا کرتا ہوں، میں نے ان کو بھی غلط کام میں ملوث نہیں پایا۔“

”اگر تم چاہو تو میں ان دونوں کو پولیس کے حوالے کر دوں کیونکہ مجھے تم پر پورا اعتبار ہے۔“

”خان صاحب چاہیں تو خود ان کو یا ہم تینوں کو پولیس کے حوالے کر دیں لیکن میں کسی پر شک کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں اور نہ ہی کسی کی صفائی پیش کر سکتا ہوں۔ صرف اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ کام میں نے نہیں کیا ہے۔“

خان صاحب خاموش ہو گئے اور پھر چلے گئے۔ ہم رات کو اسی مکان میں رہے۔ بعد میں پتا چلا کہ ایس ایچ او نے اپنے آدمی لگائے تھے جو مکان کے باہر سے نگرانی کر رہے تھے اگر ہم میں سے کوئی فرار کی کوشش کرتا تو وہ اسے گرفتار کر لیتے۔ مگر کسی نے ایسی کوشش نہیں کی۔ ہمارے سامان کی مکمل تلاشی لی گئی تھی کہ رقم ہم نے کہیں چھپا رکھی ہو تو مل جائے۔ کسی کے پاس سے رقم برآمد نہیں ہوئی۔ صرف میرے پاس پیٹی کیش کی کچھ رقم تھی جو میں نے حساب کے ساتھ خان صاحب کے حوالے کر دی تھی۔ اگلے دن صبح سویرے صائقہ کا فون آیا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ میں کب واپس آؤں گا مگر مجھے خود علم نہیں تھا کہ میں کب واپس جاؤں گا۔ میرے پاس سوائے اُمیدوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں مایوسی سے بچ رہا تھا مگر صائقہ عورت تھی۔ وہ رونے لگی۔ آنسوؤں کے درمیان مجھے بتایا۔ ”بچیاں بہت بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ عروہ تو مچل رہی ہے کہ بابا کو بلاؤ۔“

میرے دل کو بھی کچھ ہونے لگا تھا۔ مجھے گھر اور بچیاں بہت یاد آرہی تھیں۔ صائقہ سے بات کر کے فون بند کیا تھا کہ خان صاحب آ گئے۔ وہ بہت سنجیدہ تھے اور انہوں نے مجھے ایک طرف بلا کر کہا۔ ”میں نے معلوم کیا ہے۔ گاؤں والوں نے انکار کیا ہے کہ ان کی طرف سے ایسی کوئی کارروائی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنی بدنامی کے خوف سے یہ بات اچھالی نہیں تو اب وہ ایسی حرکت کیوں کریں گے جس سے ان کی سراسر بدنامی ہو سکتی ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ دھوکا ہو سکتا ہے کیونکہ گاڑی میں کیش کے خانے کا علم صرف چند افراد کو ہوتا ہے۔ وہ لوگ کسی صورت نہیں جان سکتے کہ کیش خانہ کہاں ہے۔“

”اس لیے ایس ایچ او کو بھی یقین ہے کہ یہ اندر کے آدمی کا کام ہے۔“

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔ ”تب آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

خان صاحب نے عارف اور عظیم کو بھی بلایا اور کہا۔ ”تم تینوں کے پاس آج شام تک کی مہلت ہے اس کے بعد میں تمہیں پولیس کے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“

میں نے حوصلے سے کہا۔ ”ٹھیک ہے آپ کا نقصان ہوا ہے اور آپ کا حق ہے ہر طرح سے اپنی تسلی کریں۔ باقی اللہ مالک ہے۔“

خان صاحب چلے گئے اور تب ہمیں پتا چلا کہ مکان کے باہر پولیس والے موجود تھے۔ انہوں نے خبردار کر دیا کہ ہم میں سے کوئی مکان سے نکلنے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ اسے اسی وقت گرفتار کر لیا جائے گا۔ شام تک میں اُمید و یاس کی کیفیت میں رہا کہ شاید اصل چور پکڑا جائے یا معلوم ہو جائے کہ یہ کس کا کام ہے تو ہماری گلوخلاصی ہو۔ مگر ایسا نہ ہوا اور شام کو تھانے سے ہمارا بلاوا آ گیا۔ اس روز مجھے احساس ہوا کہ ذلت کیا ہوتی ہے؟ ہم تینوں سر جھکائے پولیس والوں کے ساتھ جا رہے تھے اور لوگ ہمیں دیکھ رہے تھے اگرچہ ہمیں ہتھکڑیاں نہیں لگی تھیں مگر جس طرح سے پولیس نے ہمیں گھیرے میں لیا ہوا تھا اس سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ہمیں ملزم کی حیثیت سے تھانے لے جایا جا رہا ہے۔ ہمیں ایس ایچ او کے پاس لے جایا گیا تو وہاں خان صاحب موجود تھے۔ ان کے ساتھ میرا بھائی امجد بھی وہاں موجود تھا۔ وہ مجھ سے گلے ملا اور تسلی دی۔

"تم فکر مت کرو یار میں جانتا ہوں تم چور نہیں ہو سکتے اور میں کوشش کر رہا ہوں کوئی سفارش تلاش کروں۔"

اب تک میں خوف زدہ تھا اور فکر سے برا حال تھا لیکن جب امجد نے یہ کہا تو مجھے خیال آیا۔ "نہیں کسی سفارش کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیوں میں تمہیں ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔" امجد بے تاب ہو گیا تھا۔

"یار خان صاحب کو اپنی تسلی کرنے دو۔ میں چور نہیں ہوں اس لیے میرا ضمیر مطمئن ہے لیکن اگر میں کسی سفارش سے چھوٹ گیا تو ساری عمر خود سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں رہوں گا۔ دوسرے بھی مجھے چور سمجھیں گے۔"

امجد نے بہت زور دیا۔ خان صاحب بھی چپ اور فکر مند تھے۔ ہمارا ان کا برسوں کا ساتھ تھا اور وہ ہمیں جانتے تھے مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ ان کی رقم غائب ہوئی تھی۔ انہیں حق تھا کہ اسے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ امجد نے ان سے بات کرنا چاہی کہ ان کی منت سماجت کرے لیکن میں نے اسے بھی روک دیا۔ "ایک بار ان کو اپنی تسلی کر لینے دو، میرے ساتھ جو گزرے گی بھگت لوں گا۔"

امجد مایوس ہو کر چلا گیا مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی سی کوشش ضرور کرے گا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ خان صاحب نے ایک بار ہم سے کہا۔ "دیکھو ابھی معاملہ میرے ہاتھ میں ہے۔ جس نے چوری کی ہے وہ قبول کر لے میں اسے یہاں سے لے جاؤں گا۔ نوکری سے بھی نہیں نکالوں گا اور نہ ہی کسی کو پتا چلے گا۔"

خان صاحب کی پیشکش بتا رہی تھی کہ ہمیں پولیس کے حوالے کرتے ہوئے ان کا دل دکھ رہا تھا۔ وہ بہت مجبور ہو کر یہ قدم اٹھا رہے تھے۔ ہم خاموش رہے تو ایس ایچ او نے ایک سپاہی سے کہا۔ "اوئے انہیں لے کر حوالات میں ڈال دو۔" پھر اس نے ہم سے کہا۔ "تم تینوں کے پاس رات تک کی مہلت ہے تب تک سوچ لو اور اگر دل مانے تو اقرار کر لو۔ میں خان صاحب کی وجہ سے چھوڑ دوں گا۔ لیکن ایک بار تفتیش میں آئے تو پھر جیل پہنچا کر دم لوں گا۔"

"آپ جیسے چاہیں تسلی کر لیں۔" میں نے کہا۔

ہمیں حوالات میں ڈال دیا گیا۔ جب ہمیں اندر دھکیلا گیا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میں بے گناہ تھا مگر اس وقت لگ رہا تھا میرا سارا کیریئر تباہ ہو گیا۔ میں نوکری سے تو جاؤں گا ہی۔ اس کے بعد مجھے کوئی نوکری بھی نہیں دے گا۔ بے شک مجھے سزا نہیں ہو گی لیکن یہ سزا کیا کم ہو گی کہ لوگوں کی نظروں میں ساری عمر کا مجرم بن جاؤں۔ کبھی کسی سے نظر ملا کر بات نہیں کر سکوں گا۔ کل میری بچی کا رزلٹ تھا اور ہمیں اسکول جانا تھا کہ وہاں تقریب تھی۔ مگر اب صرف صائقہ جاتی اور اکیلے رواحہ کا رزلٹ لے کر آتی۔ عارف اور عظیم بھی میری طرح خوفزدہ تھے۔ آنے والے وقت کا خوف ہمیں لرزا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد رات کا کھانا آیا تو ہم نے بہ مشکل چند لقمے لیے تھے۔ کسی سے کھایا ہی نہیں جا رہا تھا۔ ان لوگوں نے مہربانی کی تھی کہ میرا موبائل نہیں لیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس پر صائقہ کی کال آئی۔ وہ رو رہی تھی۔

"اسد میرا دل ڈوب رہا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ میں مر جاؤں گی۔"

"حوصلہ رکھو۔" میں نے بہ مشکل کہا۔ "اگر تم حوصلہ ہار دو گی تو بچوں کو کون دیکھے گا؟"

"بس اسی خیال نے سنبھالا ہوا ہے۔ لیکن اسد یہ آپ کو چھوڑ دیں۔ اگر خان صاحب کو رقم دینی ہے تو ہم اپنا سب بیچ دیں گے۔ ضرورت پڑی تو ادھار لے لیں گے۔"

"صائقہ اگر مجھے اس طرح آزاد ہونا ہوتا تو میں امجد کی بات مان لیتا۔ مگر میں اپنے اوپر داغ لے کر نہیں رہ سکتا۔ تم صبر کرو اور جو مجھ پر گزرے گی میں صبر کروں گا۔"

"میں کیا کروں؟"

’’تم اللہ سے دعا کرو۔ اس وقت بس یہی ایک چیز ہمارے کام آسکتی ہے۔ میں بھی اسی سے مانگ رہا ہوں۔‘‘

’’اسد......‘‘ صائقہ نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ لاک اپ کا دروازہ کھلا اور ایک سپاہی نے اندر دیکھ کر مجھے اشارہ کیا۔

’’چل بھئی تمہاری پیشی ہے۔‘‘

’’صائقہ میں پھر بات کروں گا ابھی میری طلبی ہوئی ہے۔‘‘

’’اللہ حافظ۔‘‘ وہ بولی۔

میں موبائل بند کرکے سپاہی کے ساتھ روانہ ہوا۔ وہ مجھے تھانے کے عقبی حصے میں ایک کمرے میں لے آیا۔ وہاں تاریکی اور وحشت تھی۔ ایس ایچ او کے ساتھ تومند شخص صرف شلوار میں موجود تھا۔ اس نے خوفناک نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ’’سر جی اجازت ہے؟‘‘

’’ایک منٹ رک جاؤ۔‘‘ ایس ایچ او نے کہا اور مجھ سے پوچھا۔ ’’اسد عباس تم ایک شریف آدمی ہو۔ غلطی آدمی سے ہو جاتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم تھانے کے عذاب سے گزرو۔ اس لیے اگر تم مان لو تو بچ جاؤ گے۔ بات ختم ہو جائے گی۔‘‘

’’ایس ایچ او صاحب، میں جو سچ ہے وہ بتا چکا ہوں۔ آپ اپنا کام کریں۔ اللہ میری مدد کرنے والا ہے۔‘‘

ایس ایچ او نے گہری سانس لی۔ ’’جیسی تمہاری مرضی، بعد میں مجھ سے شکایت مت کرنا۔ میں بہت سخت تھانیدار ہوں۔ میں نے کبھی کسی کو اتنی مہلت نہیں دی۔‘‘

ایس ایچ او کے اشارے پر جلاد حرکت میں آگیا اس نے مجھے کپڑے اتار کر نیچے لیٹ جانے کو کہا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی اور نیچے لیٹ گیا۔ اس کے بعد عذاب کا جو دور شروع ہوا۔ وہ اللہ کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ سننے اور دیکھنے میں اور خود سے بھگتنے میں جو فرق ہے وہ فرق اس رات میں نے جانا۔ شاید میں ایک یا ڈیڑھ گھنٹے اس عذاب خانے میں رہا مگر مجھے لگا جیسے میں نے پوری رات وہاں گزار دی اور یہ رات عام راتوں سے بہت طویل تھی۔ میں اذیت سے چلا رہا تھا اور دہائیاں دے رہا تھا کہ میں بے قصور ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ جب مجھے بالکل ہوش نہیں رہا تو عذاب تھما اور مجھے اٹھا کر لاک اپ میں لا پھینکا گیا۔ میرے بعد باری باری عارف اور عظیم کی باری آئی۔ مجھے تو ہوش ہی نہیں تھا وہ بھی بے ہوش آئے اور لاک اپ میں پھینک دیئے گئے۔

مجھے ہوش آیا تو تکلیف کی شدت بے چین کیے دے رہی تھی۔ عارف اور عظیم کی حالت مجھ سے زیادہ بری تھی۔

یہ دن اسی تکلیف اور بے چینی میں گزرا۔ سکون کے واحد لمحات وہ تھے جب صائقہ اور بچیوں سے بات کی۔ میری کوشش تھی کہ میری تکلیف کا اظہار آواز سے نہ ہو لیکن صائقہ میرا لہجہ پہچانتی تھی۔ وہ تڑپ گئی تھی مگر بچیوں کی وجہ سے کھل کر پوچھ اور رو بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ مجھے تسلی دیتی رہی اور میں اسے تسلی دیتا رہا۔ ایک دن پہلے خوف نے بھوک مار دی تھی اور کچھ کھایا نہیں جا رہا تھا تو آج تکلیف سے کھایا نہیں جا رہا۔ بس پانی پی رہے تھے۔ دوپہر میں ہمیں کچھ دوائیاں دی گئیں۔ انہیں کھایا تو ذرا سکون آیا تھا۔ شاید پین کلر تھیں۔ مگر شام ہوتے ہی دل پھر سے بیٹھنے لگا۔ دوائیاں لینے کے بعد وہ دونوں بھی اٹھ بیٹھے تھے میں نے عارف اور عظیم سے کہا۔ ’’میں نہیں جانتا کہ چور کون ہے لیکن میں یہ کام نہیں کرسکتا کیونکہ گاڑی کے پاس جب تک رہا تم دونوں کے ساتھ رہا اور تمہارے سامنے مسجد گیا تھا۔ پھر عارف کے ساتھ واپس آیا۔ گاڑی کے پاس یا تو تم اکیلے تھے یا پھر عظیم۔‘‘

’’میں دیر سے آیا تھا اور آپ لوگوں کے سامنے آیا تھا۔‘‘ عظیم نے یاد دلایا۔

’’ہمیں کیا پتا کہ تم پہلے آئے تھے یا نہیں۔‘‘ عارف بولا۔ ’’میں تو ڈیزل بھروا کر اور گاڑی سائیڈ میں کھڑی کرکے مسجد چلا گیا تھا۔‘‘

’’دیکھو میں چاہتا تو یہ سب پولیس والوں کو بتا کر اپنی جان بچا سکتا تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ ہم تینوں اس غفلت کے ذمے دار ہیں۔ بنیادی ذمّے داری تو میری تھی۔ تم دونوں نے بھی رات تھانے میں گزار لی ہے۔ ہماری جو بدنامی ہونا تھی وہ ہوگئی۔ لیکن اب جو عذاب آنے والا ہے اس سے بچنا ہے۔‘‘

وہ دونوں خاموش رہے۔ میں نے ڈھکے چھپے انداز میں ان سے کہا تھا کہ وہ اگر چور ہیں تو اقرار کرلیں ورنہ ہمارے ساتھ جو ہوگا وہ بہت برا ہوگا۔ ان کی خاموشی بتا رہی تھی کہ وہ یا تو میری طرح بے گناہ تھے یا پھر اقرار نہیں کر رہے تھے۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا کہ اب جو ہونا تھا وہ بھگتنا ہی تھا اور ایسا ہی ہوا۔ آنے والی رات پہلے سے بڑھ کر تھی۔ صرف تکلیف نہیں تھی بلکہ ایسی تکلیف تھی جو بے ہوش ہونے بھی نہیں دے رہی تھی۔ میں بہ مشکل چل کر اس عذاب خانے میں آیا تھا مگر واپسی میں ہوش کے باوجود چلا

نہیں جا رہا تھا۔ دو سپاہی بازوؤں سے پکڑ کر لاک اپ میں ڈال کر گئے۔ میری حالت دیکھ کر عظیم نے رونا شروع کر دیا۔ اسے میرا دکھ نہیں تھا وہ اپنے خوف سے رو رہا تھا کہ کچھ دیر میں اس کی بھی یہی حالت ہونے والی تھی۔ میں رو نہیں رہا تھا لیکن کراہ رہا تھا اور دل ہی دل میں اس شخص کو برا بھلا کہہ رہا تھا جس کے کیے کا سب کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔

یہ بھی ہو سکتا تھا کہ چور سرے سے کوئی اور فرد ہو۔ وہ اس وقت رقم سے عیش کر رہا ہو اور اس کی جگہ ہم سزا پا رہے تھے۔ تکلیف تھی کہ ہر گزرتے لمحے بڑھ رہی تھی حالانکہ اب تو کوئی جلاد بھی نہیں تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے جسم کی ایک ایک ہڈی ٹوٹ گئی ہو اور ایک ایک بوٹی کچل دی گئی ہو۔ سانس لینا بھی محال لگ رہا تھا۔ ایسے میں انسان کو بس اللہ یاد آتا ہے مجھے بھی وہی یاد آ رہا تھا اور میں دل ہی دل میں اس سے دعا کر رہا تھا کہ چور پکڑا جائے یا نہ پکڑا جائے تو وہ مجھے اس عذاب سے بچا لے۔ یہ رات جاگتے اور کراہتے گزری۔ جب ذرا ہمت آتی تو منہ سے آواز نکلتی تھی ورنہ آواز بھی نہیں نکلتی تھی۔ کئی بار تو ایسا لگا کہ بس موت کا فرشتہ آ گیا ہے۔ میں گھبرا کر کلمہ طیبہ پڑھنے لگتا۔ مگر ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ صبح ہوئی تو دن کی روشنی سے خوشی کی بجائے ایک خوف سا دل میں آیا کہ جب یہ روشنی ڈھل جائے گی اور رات ہو گی اس کے بعد پھر عذاب کا دور آئے گا۔

دو دن ہو گئے تھے۔ جسمانی تکلیف تو تھی ہی ساتھ ہی کچھ نہ کھانے سے اب کمزوری بھی محسوس ہو رہی تھی۔ سانس لینے کے لیے بھی باقاعدہ زور لگانا پڑتا تھا۔ دو قدم اٹھ کر چلتے تو ہانپنے لگتے تھے۔ اس وقت مجھے لگا کہ میں تیسری رات یہ عذاب برداشت نہیں کر سکوں گا۔ میں دنیا سے گزر جاؤں گا۔ صائقہ بیوہ اور میری بچیاں یتیم تو ہوں گی ساتھ ہی انہیں میرے حوالے سے دنیا کے طعنے ساری عمر سننا پڑیں گے۔ وہ مر مر کر زندگی گزاریں گی۔ یہ سوچ کر ہی میری حالت عجیب سی ہو گئی اور میں نے اس وقت بہت گڑگڑا کر اللہ سے دعا کی کہ مجھے اور میرے بیوی بچوں کو اس آزمائش سے بچائے۔ میں اس کی رضا میں راضی تھا مگر ہمیں اس ذلت سے بچائے جو بہ ظاہر ہمارا مقدر لگ رہی تھی۔ دعا کر کے میرے دل پر آنے والا بوجھ ہلکا ہوا تھا مگر خوف برقرار تھا۔ صبح ہم نے چائے اور پاپوں سے ناشتا کیا۔ میں نے مشکل سے دو پاپے کھائے تھے۔ دوپہر میں دال چاول دیے گئے جو بس گزارے لائق تھے اور انہیں بھی مشکل سے زہر مار کیا۔ اب

بھوکے رہنا دشوار تھا۔ اس حالت میں بھی پیٹ نے اپنا حصہ مانگنا شروع کر دیا تھا۔

شام کے قریب ہم تینوں ہی سہمے پڑے تھے۔ ہماری حالت قربانی کے جانوروں کی سی ہو رہی تھی جنہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قربانی کا وقت آ رہا ہے مگر وہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ سوائے بے بسی سے اپنی باری کا انتظار کرنے کے۔ خلاف توقع اچانک ہی لاک اپ کا دروازہ کھلا اور سپاہی نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا تو مجھے لگا کہ میری مانگی دعا فوری قبول نہیں ہوئی تھی آج دن میں بھی اسی قیامت سے گزرنا پڑے گا جو دو راتوں سے مقدر بنی ہوئی تھی۔ مرتا کیا نہ کرتا، من من بھر کے پیروں کے ساتھ باہر آیا اور سر جھکائے سپاہی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ مگر خلاف توقع وہ مجھے عقبی کمرے کی بجائے سامنے ایس ایچ او کے کمرے کی طرف لایا اور اس نے چک اٹھا کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں اندر داخل ہوا تو ایس ایچ او کے ساتھ خان صاحب بھی بیٹھے تھے اور میری حالت دیکھ کر وہ بے ساختہ کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ ”اسد کیسے ہو؟“ الفاظ سے زیادہ ان کے بدلے لہجے سے مجھے لگا کہ حالات میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ میں نے پھیکے انداز میں کہا۔ ”آپ کے سامنے ہوں۔“

شاید خان صاحب کو شرمندگی کی وجہ سے بتانے میں دشواری پیش آ رہی تھی اس لیے ایس ایچ او نے کہا۔ ”مبارک ہو اسد صاحب، چور مل گیا ہے۔“

اللہ مجھے معاف کرے اگر مجھے اس وقت اطلاع ملتی کہ ان صعوبتوں کے بدلے مجھے جنت مل گئی تو شاید میں اتنا خوش نہ ہوتا جتنا چور ملنے کا سن کر خوش ہوا تھا۔ اذیت برداشت کر لینے کے بعد اب مجھے یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ کہیں سو پیاز کے بعد سو جوتے بھی نہ کھانے پڑیں۔ یعنی چوری کے الزام میں تھانے میں بند ہو کر مار کھانے کے بعد ساری عمر چور ہونے کا طعنہ نہ سننا پڑے۔ اس لیے جب یہ سنا کہ چور پکڑا گیا ہے تو کچھ دیر تو مارے خوشی کے مجھ سے بولا نہیں گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور نظر دھندلا گئی۔ پھر میں نے بہ مشکل کہا۔ ”کون ہے وہ بدبخت جس نے یہ کام کیا اور سزا مجھے ملی۔“

”تم بیٹھو۔“ خان صاحب نے مجھے بازو سے پکڑ کر کرسی پر بٹھایا اور ایس ایچ او سے کہا۔ ”سپاہی سے چائے اور کھانے کو کچھ منگوائیں۔“

ایس ایچ او خان صاحب کا نیاز مند بنا ہوا تھا اس نے فوری سپاہی کو بلا کر حکم دیا۔ وہ چائے اور بسکٹ لینے چلا گیا اس کے جانے کے بعد خان صاحب نے انکشاف کیا۔ ''چور عارف اللہ ہے۔''

میں حیران رہ گیا تھا۔ ''عارف، مگر اس نے تو کچھ قبول کر نہیں دیا۔ پھر کیسے پتا چلا کہ وہی چور ہے؟''

''یہ نیک کام اس کے بھانجے نعمت اللہ نے کیا ہے۔'' خان صاحب نے بتایا اور پھر پوری داستان سنائی جس کا خلاصہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆

خان صاحب کا دل نہیں مان رہا تھا کہ چور ہم تینوں میں سے کوئی ہو سکتا ہے۔ خاص طور سے وہ میرے بارے میں کنفرم تھے کہ چوری میں نے نہیں کی ہے۔ البتہ عارف اور عظیم پر ان کا شک تھا۔ اس لیے انہوں نے ایس ایچ او کی بات مان لی اور ہمیں اس کے حوالے کر دیا۔ واپس جاتے ہوئے خان صاحب نے وہ رقعہ لے لیا جو گاڑی میں ملا تھا اور بہ ظاہر وہ عظیم کے دشمنوں نے لکھا تھا۔ واپس جا کر خان صاحب نے سب سے پہلے اپنے تمام ملازموں کی ہینڈ رائٹنگ کا نمونہ حاصل کیا اور اس کا موازنہ اس رقعے کی تحریر سے کیا مگر کسی کی تحریر نہیں ملی تھی۔ پھر خان صاحب نے ان لوگوں کو بلوایا جو ان کے پاس کام کرتے تھے مگر اب چھوڑ چکے تھے ان میں نعمت اللہ بھی شامل تھا وہ ملازمت کے لیے سرگودھا میں تھا اس لیے اسے آنے میں ایک دن لگا اور خان صاحب نے اس سے بھی تحریر لی۔ تب نعمت نے پوچھا کہ وہ کیوں تحریر لے رہے ہیں۔ نعمت کو یہ تو معلوم تھا کہ اس کا ماموں چوری کے الزام میں تھانے میں بند ہے لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس سلسلے میں کوئی رقعہ بھی ملوث تھا۔ خان صاحب نے اسے بتایا کہ چوری کے بعد گاڑی سے ایک رقعہ ملا تھا اور اس میں کیا تحریر تھا؟ انہوں نے نعمت سے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ رقعہ دھوکا دینے کے لیے لکھا گیا ہے اور اصل چور میرے آدمیوں میں سے کوئی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں خان صاحب کیونکہ صرف چند لوگوں کو پتا ہے کہ رقم رکھنے کا خانہ کہاں ہوتا ہے۔''

''بس اسی لیے میں نے ان تینوں کو پولیس کے حوالے تو کر دیا مگر مجھے یقین نہیں آ رہا کہ چور ان میں سے کوئی ہے اس لیے اب میں دیکھ رہا ہوں کہ رقعے کی تحریر کس سے ملتی ہے۔''

نعمت پڑھا لکھا اور ہوشیار آدمی تھا۔ چاہتا تو ڈرائیوری سے اچھی ملازمت حاصل کر سکتا تھا مگر اسے ڈرائیونگ کا شوق تھا اس لیے یہ کام کر رہا تھا۔ اس نے خان صاحب سے کہا۔ ''آپ مجھے دکھائیں گے میں اکثر لوگوں کی لکھائی پہچانتا ہوں۔''

خان صاحب نے اسے رقعہ دکھایا تو وہ چونکا اور اس نے کہا۔ ''مجھے یہ لکھائی پہچانی ہوئی لگ رہی ہے۔ لیکن پہلے مجھے ذرا دیکھنے دیں پھر میں آپ کو بتاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے اگر تم نے چور پکڑوا دیا تو میری طرف سے تمہیں انعام ملے گا۔ جب چاہو میری ملازمت میں واپس آجاؤ۔''

''نہیں خان صاحب میں یہ کام کسی لالچ میں نہیں کروں گا بلکہ میں چاہتا ہوں کہ اصل چور پکڑے جائیں اور بے گناہ چھوٹ جائیں۔'' نعمت نے سنجیدگی سے کہا۔ اس نے رقعے کی فوٹو کاپی کرائی اور روانہ ہو گیا۔ وہ سیدھا گھر گیا اور اس نے ماں سے کہا کہ عارف اسے جو خط لکھتا رہا تھا وہ کہاں ہیں؟ عارف کسی زمانے میں لاہور میں بھی کام کرتا رہا تھا اور وہاں سے اپنے بہن بھائیوں کو خط لکھتا تھا۔ یہ بتا دوں کہ جب ہم پہلی بار تھانے آئے تو ایس ایچ او نے سب کا طرز تحریر لیا تھا اور کسی کا طرز تحریر رقعے والی تحریر سے نہیں ملا تھا۔ عارف کے بارے میں سب جانتے تھے کہ وہ معمولی پڑھا لکھا شخص ہے اس لیے جب اس نے لکھائی بگاڑ کر کی تو کسی کو شک نہیں ہوا۔ ورنہ وہ وہیں پکڑا جاتا۔ مگر قسمت دیکھیں اسے پکڑا بھی کس نے؟ اس کے سگے بھانجے نے۔ اس نے ماں سے عارف اللہ کے خطوط لے کر جب ان کی لکھائی کا رقعے کی تحریر سے موازنہ کیا تو فوراً اصلیت سامنے آ گئی۔ رقعہ سو فیصد عارف کا لکھا ہوا تھا۔

نعمت آج کل کے نوجوانوں کی طرح لاابالی اور منفی ذہن کا نہیں تھا بلکہ وہ حلال کمانے پر یقین رکھتا تھا۔ میں نے جتنا عرصہ بھی اس کے ساتھ گزارا مجھے اس میں کوئی خرابی یا اخلاقی برائی نظر نہیں آئی۔ اپنی ڈیوٹی پوری ذمے داری سے کرتا اور دوسرے لوگوں کا خیال بھی رکھتا تھا۔ اس معاملے میں اپنے پرائے کا لحاظ نہیں کرتا تھا اس لیے میں بھی اس کا بہت خیال رکھتا تھا اور اس کے ساتھ اچھا کرتا تھا۔ یہ بات ثابت ہو جانے کے بعد کہ عارف ہی چور تھا اس نے اس بات کا خیال کیے بغیر کہ وہ اس کا سگا ماموں ہے یہ خطوط لے جا کر خان صاحب کو دے دیے۔ انہوں نے دیکھا تو وہ

بھی جان گئے کہ رقعہ کس نے لکھا اور چوری کس نے کی ہے۔ انہوں نے اسی وقت عارف کے خاندان والوں کو طلب کرلیا۔ نعمت کو اس معاملے سے دور رکھنے کے لیے انہوں نے کہا کہ انہوں نے خود تفتیش کی ہے اور رقعے کی تحریر عارف کی ثابت ہوئی ہے۔ دوسری صورت میں خاندان نعمت کے خلاف بھی ہوسکتا تھا۔

خان صاحب نے اسی وقت کال کرکے ایس ایچ او کو بتا دیا کہ اصل چور سامنے آگیا ہے اور وہ ہمیں مزید تفتیش کا نشانہ نہ بنائے۔ خان صاحب ثبوت لے کر تھانے آئے اور انہوں نے ایس ایچ او کو دکھائے۔ اس نے بھی تسلیم کیا کہ دونوں لکھائیاں ایک ہی فرد کی ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے طلب کیا۔ میرے بعد عارف اور عظیم کو بھی طلب کیا گیا۔ جب عارف کے سامنے دونوں تحریریں رکھیں تو اس کے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں رہا۔ خان صاحب نے غصے سے کہا۔ ”ذلیل شخص یہ تم نے کیا اور اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی پھنسوایا۔“

”یہ اس طرح نہیں مانے گا۔“ ایس ایچ او نے کڑک کر کہا۔ ”ابھی اسے پیچ والا رگڑا دیا جائے گا تو یہ سب مانے گا۔“

”جی یہ میرا کام ہے۔“ عارف نے مردہ لہجے میں کہا۔ ”ان دونوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

ایس ایچ او کے سوالوں کے جواب میں عارف اللہ نے جو بتایا اس کے مطابق اس نے پہلے سے پلان بنالیا تھا۔ رقعہ وہ گھر سے لکھ کر لایا تھا اور اس نے میرے مسجد کی طرف جاتے ہی پیٹرول پمپ پر ہی جب کہ گاڑی میں ڈیزل ڈالا جا رہا تھا۔ عقبی خانے کا لاک توڑ کر رقم نکال لی اور جب گاڑی کو سائیڈ میں لگایا تو اگلا والا خانہ بھی کھول کر کاغذات اور چیزیں بکھیر دیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جب میں نماز پڑھ کر واپس آؤں تو اگلا خانہ کھلا دیکھ کر چوکنا ہو جاؤں اور پھر میں لازمی عقبی خانہ بھی دیکھتا اور چوری وہیں سامنے آجاتی۔ دوسری صورت میں وہ گاڑی لے کر چلے جاتے اور چوری ان دونوں کے ہوتے ہوئے سامنے آتی تو ان پر شک کرنا آسان ہو جاتا مگر میرے ہوتے ہوئے ہم تینوں پھنستے اور ایسا ہی ہوا۔ اس طرح عارف نے اپنے اوپر شک کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

مگر اس نے چوری شدہ رقم کے بارے میں نہیں بتایا تو ایس ایچ او نے اپنے خاص بندوں کو بلا کر عارف کو ان کے حوالے کر دیا۔ کیونکہ عارف خود اعتراف کر چکا تھا اس لیے پولیس نے کسی رعایت سے کام نہیں لیا۔ اس کی چیخیں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں اور سچی بات ہے کہ الزام سے بری ہونے کے باوجود ان چیخوں کو سن کر ہم بھی کانپ رہے تھے۔ خان صاحب نے ہمیں تسلی دی۔ ”تم لوگوں پر اب کوئی الزام نہیں ہے۔“

چائے بسکٹ کے ساتھ پین کلر دوا بھی دی گئی تھی اس کے اثر سے ہم کچھ دیر میں بہتر محسوس کرنے لگے تھے مگر عارف کا شور شرابا کم سے کم میرے اعصاب کو متاثر کر رہا تھا میں نے خان صاحب سے کہا۔ ”کیا ہم باہر نہیں جاسکتے؟“

خان صاحب سمجھ گئے۔ انہوں نے کہا۔ ”کیوں نہیں جاسکتے، ایسا کرو تم دونوں میری گاڑی میں بیٹھو میں خود لے کر جاؤں گا۔“

باہر نکل کر میں نے سکون کا سانس لیا اور سب سے پہلے صائقہ کو کال کی۔ آنسوؤں کے ساتھ میں نے اسے خوشخبری سنائی کہ اللہ نے آزمائش دی مگر ساتھ ہی اس سے نکال بھی لیا۔ صائقہ بھی مارے خوشی کے رو دی تھی۔ ”اللہ کا لاتعداد شکر ہے لیکن آپ کب آئیں گے؟“

”بس آج ہی انشاءاللہ۔“ میں نے جواب دیا۔ اس دوران میں موبائل کی بیٹری لو ہوگئی تھی اس لیے میں نے مختصر بات کرکے موبائل بند کر دیا۔ عظیم بھی اپنے گھر والوں کو رہائی کا بتا رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد خان صاحب اور ایس ایچ او اندر سے نکلے۔ ہمارے ساتھ ایک پولیس موبائل تھی۔ خان صاحب نے کہا۔

”ہمیں پہلے عارف کے گھر جانا ہوگا۔ اس نے رقم اپنے چھوٹے بھتیجے کے ہاتھ بھجوائی ہے۔“

ہماری حالت بری تھی مگر میں سمجھ رہا تھا کہ رقم کی برآمدگی لازمی تھی اس کے بغیر کیس عارف پر پکا نہیں ہوگا اور ہم بھی پوری طرح کلیئر نہیں ہوں گے۔ یہ قافلہ میانوالی روانہ ہوا۔ ایک گھنٹے بعد ہم عارف کے گھر پر تھے۔ وہاں پولیس نے تلاشی لی اور عارف کے گھر سے پوری ساڑھے پانچ لاکھ کی رقم برآمد کرلی جو ایک پیک بنڈل کی صورت میں تھی۔ اس کے خاندان والے بھی آگئے تھے اور ان میں سے بعض نے خان صاحب سے کہا۔ ”اب عارف کو چھوڑ دیں آپ کی رقم آپ کو مل گئی ہے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر رقم مل گئی تو سب کو چھوڑ دیں گے۔“

”یہ وعدہ پولیس کے حوالے کرنے سے پہلے کا

تھا۔'' خان صاحب نے رکھائی سے کہا۔ ''وہ وقت اس نے گنوا دیا۔ اب تھانے میں فیصلہ ہوگا۔''

ہم رقم لے کر واپس روانہ ہوئے۔ مگر صرف پولیس جوہرآباد کی طرف گئی۔ خان صاحب ہمیں اپنے فارم پر لے آئے وہاں ڈاکٹر بلوا کر پہلے ہمارا علاج کرایا گیا۔ اوپر سے کوئی زخم نہیں تھا مگر اندر کی چوٹیں بے شمار تھیں اور نس نس دکھ رہی تھی۔ دو انجکشن دینے کے بعد ہم بہت بہتر محسوس کرنے لگے۔ گرم پانی سے نہا کر اور دوسرے صاف کپڑے پہن کر تو اسّی فیصد ٹھیک ہوگئے تھے۔ عظیم کو اس کے گھر بھجوا دیا تھا۔ خان صاحب کا اصرار تھا کہ میں رات رک جاؤں وہ مجھے صبح بھجوا دیں گے مگر میں جانتا تھا کہ صائقہ اور بچیاں کس بے تابی سے میرا انتظار کر رہی ہوں گی اس لیے میں نے عاجزی سے کہا۔ ''خان صاحب مجھے جانا ہے۔ گھر والی اور بچے انتظار کر رہے ہیں۔''

خان صاحب نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''میں تم سے معذرت کر سکتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں تمہارے ساتھ جو ہوا ہے اس کے لیے معذرت کا لفظ چھوٹا ہے۔ ابھی تم جاؤ اللہ نے چاہا تو تم دیکھو گے کہ میں کیسے تلافی کرتا ہوں۔ بس یوں سمجھ لو کہ اب میں جتنا اعتبار اپنے اوپر کرتا ہوں اتنا ہی تم پر بھی ہے۔''

خان صاحب نے مجھے اپنی کار میں ڈرائیور کے ساتھ بھجوایا اور ساتھ میں موسم کی بہت سی سوغاتیں بھی کیں جو فارم پر ہوتی تھیں۔ میں گھر کے سامنے اترا تو صائقہ اور بچے سخت سردی میں بھی دروازے پر موجود تھے۔ وہ مجھ سے کس طرح ملے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے لگا جیسے اللہ نے بچھڑنے کے بعد مجھے ان سے ملایا اور شاید ایسا ہی وہ بھی محسوس کر رہے تھے۔ رواحہ اور عروہ مجھ سے لپٹی جا رہی تھیں اور تکلیف کے باوجود میرا دل نہیں کر رہا تھا کہ میں اپنی بچیوں کو خود سے جدا کروں۔ رواحہ نے روتے روتے مجھے اپنا رزلٹ دکھایا وہ پوری کلاس میں فرسٹ آئی تھی۔ میں نے اسے پیار کیا اور گفٹ کا پوچھا تو اس نے مجھ سے چمٹ کر کہا۔ ''بس آپ اب کہیں نہیں جائیں گے۔ یہ میرا گفٹ ہے۔''

خان صاحب نے مجھے ایک ہفتے کی چھٹی دی تھی۔ ساتھ ہی آتے ہوئے ایک لفافہ میرے حوالے کیا تھا۔ میں نے اسے کھولا تو اس میں سے دس ہزار روپے نکلے تھے۔ میں دو دن میں تقریباً ٹھیک ہوگیا تھا۔ اس دوران میں ملنے اور مبارک باد دینے والے آتے رہے۔ گھر کا سکون اور امن اس عذاب سے گزرنے کے بعد کچھ زیادہ ہی اچھا لگنے لگا تھا۔ ایک ہفتے بعد میں ڈیوٹی پر جا رہا تھا تو صرف صائقہ ہی نہیں میرا دل بھی دھڑک رہا تھا کہ اس عافیت کدے سے باہر نہ جانے کون سی آزمائش منتظر ہو۔ مگر آدمی کو کام تو کرنا ہوتا ہے۔ راؤنڈ کے بعد جب میں گاڑی چھوڑ کر گھر جا رہا تھا تو خان صاحب کی کال آئی۔ انہوں نے کہا۔ ''عارف کے گھر والوں سے تصفیہ ہوگیا ہے وہ جرمانے کی رقم تین لاکھ ایک مہینے میں کرکے دیں گے۔''

''اگر وہ نہ دے سکے تو؟''

''تو عارف کو اس کے کیے کی سزا بھگتنا ہوگی۔ ایس ایچ او کا کہنا ہے کہ چار سال کی سزا تو لازمی ہو گی۔''

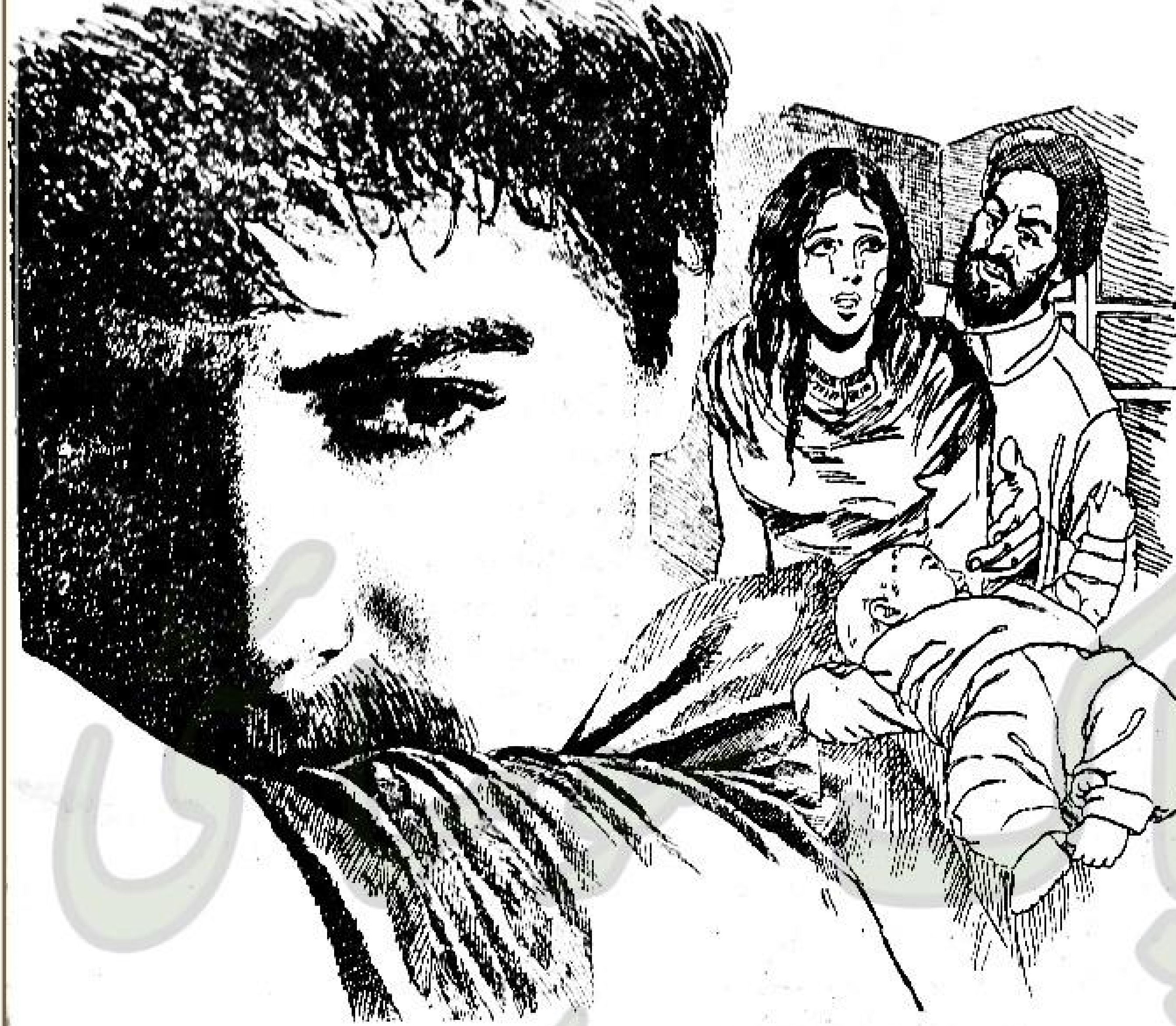
''تب وہ تین لاکھ ادا کر دیں گے۔''

''دیکھتے ہیں۔'' خان صاحب نے کہا۔ ''میں نے یہ بتانے کے لیے کال کی تھی کہ اگلے مہینے سے تمہاری تنخواہ میں بیس فیصد اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر تم چاہو تو گاڑی کے ساتھ جاؤ یا پھر آفس میں مارکیٹنگ آفیسر کے طور پر کام کرو، تمہارا عہدہ اب مارکیٹنگ آفیسر کا ہی ہوگا۔''

''خان صاحب میں آپ کا شکر گزار ہوں۔''

''نہیں میں تمہار مقروض ہوں۔ ابھی قرض ادا نہیں کیا ہے۔''

قرض خان صاحب نے یوں ادا کیا کہ جب عارف کے گھر والوں نے جرمانہ ادا کیا تو خان صاحب نے مجھے ایک لاکھ روپے دیئے تھے۔ شاید عظیم اور تھانے والوں کو بھی کچھ رقم گئی ہوگی۔ مگر اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ ایک بہت بڑی مشکل سے نکل کر اب میں اس مقام پر ہوں کہ خان صاحب آنکھ بند کر کے مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ فرم کے کسی بندے کی وہ اہمیت نہیں ہے جو میری ہے۔ مگر یہ سب اوپر والے کی مہربانی ہے جس نے صرف بے گناہی کی لاج رکھتے ہوئے مجھے اس آزمائش سے نکال دیا۔ مجھے اپنی ہی نظروں میں گرنے سے بچالیا۔



کڑوا گھونٹ

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
عرض یہ ہے کہ اپنی حالاتِ زندگی عام لفظوں میں لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ ہم سب زندہ رہنے کے لیے، چہرے پر تقدس کا ملمع سجائے رکھنے کے لیے کس طرح کڑوا گھونٹ پیتے رہتے ہیں یہ سب میں نے بیان کردیا ہے۔ مجھے لکھنے کا فن نہیں آتا کسی اچھے رائٹر سے دوبارہ لکھوالیں گی۔
نجمہ
(فیصل آباد)

میں چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ بابا زمینداری کرتے تھے۔ انہیں کوئی بڑا جاگیردار یا وڈیرا تو نہیں کہا جاسکتا لیکن ہمارے گھر میں خوش حالی تھی اور گاؤں کے لوگ بابا کی عزت کیا کرتے تھے۔ میرے چاروں بھائیوں میں سے کسی کو بھی پڑھنے کا شوق نہ تھا۔ ان میں سے کوئی بھی چھ سات جماعتوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ البتہ سب سے چھوٹے بھائی فرید نے جیسے تیسے میٹرک کرلیا اور مزید پڑھائی کے لیے لاہور جانے کی ضد کرنے لگا۔ اس کا

ایک دوست پولی ٹیکنیک میں داخلہ لے رہا تھا چنانچہ فرید کو بھی دھن سوار ہوگئی کہ وہ انجینئرنگ میں ڈپلومہ لے گا جبکہ بابا چاہتے تھے کہ وہ گریجویشن کر کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ کوئی ایک بیٹا سول یا فوجی افسر بن جائے۔ ان کی نظر میں ڈپٹی کمشنر ہونا بڑی بات تھی۔ اسے ضلع کا حاکم سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے بابا بھی چاہتے تھے کہ فرید سی ایس ایس کر کے سول سروس میں چلا جائے اور ایک دن اپنے ہی علاقے میں ڈپٹی کمشنر بن کر آئے تو صرف گاؤں میں ہی نہیں بلکہ آس پاس کے دوسرے دیہات میں بھی ان کی دھاک بیٹھ جائے گی لیکن فرید کو ڈپٹی کمشنر بننے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے اپنی من مانی کی اور لاہور جا کر پولی ٹیکنیک میں داخلہ لے لیا۔

میں شروع سے ہی پڑھائی میں تیز تھی۔ بہت چھوٹی عمر میں قرآن شریف ختم کر لیا۔ اسکول میں بھی ہر سال اچھے نمبروں سے پاس ہوتی رہی لیکن ہمارے گاؤں میں لڑکیوں کا اسکول پانچویں جماعت تک تھا۔ گرلز ہائی اسکول سات آٹھ میل دور واقع قصبے میں تھا۔ ہمارے گاؤں کی کچھ لڑکیاں تانگے کے ذریعے وہاں جاتی تھیں۔ میں نے بھی ضد کر کے داخلہ لے لیا حالانکہ امی اور تینوں بھائی مخالف تھے لیکن بابا اور فرید بھائی نے میری حمایت کی اور اس طرح میرا تعلیمی سلسلہ ختم ہونے سے بچ گیا۔

اسکول میں کئی لڑکیوں سے میری دوستی ہوگئی۔ ان میں فریدہ بڑی تیزی سے میرے قریب آئی اور کچھ ہی دنوں میں ہمارے درمیان دوستی کا مضبوط رشتہ قائم ہوگیا۔ وہ بہت ہی مخلص، ذہین اور سمجھدار لڑکی تھی لیکن بعض اوقات اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتی تو مجھے حیرت ہونے لگتی لیکن جلد ہی یہ بھید بھی کھل گیا۔ دراصل اسے فلمیں دیکھنے اور ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ مجھے بھی یہ رسالے دیے۔ ہمارے گھر میں ٹیلی ویژن نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اخبار یا رسالہ آتا تھا اس لیے میرے لیے یہ ایک نئی دنیا تھی۔ پھر مجھے بھی ڈائجسٹ پڑھنے کا چسکا پڑ گیا اور میں بھی فریدہ کی طرح وقت سے پہلے بڑی ہوگئی۔

آٹھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے شادی بیاہ، طلاق، محبت، خاندانی جھگڑوں اور مردوں کے رویوں کے بارے میں بہت کچھ جان گئی تھی۔ عموماً کچی عمر کی لڑکیاں سن بلوغت کو پہنچنے سے پہلے ہی اپنے دل اور ذہن میں رومانی تصورات کو جگہ دے دیتی ہیں اور گلی میں پھرنے والا آوارہ لڑکا بھی انہیں اپنے سپنوں کا شہزادہ دکھائی دیتا ہے لیکن ان ڈائجسٹوں نے وقت سے پہلے مجھے بتا دیا کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی اور جاگتی آنکھوں کے خوابوں کی تعبیر بھی بھی بڑی بھیانک ہوتی ہے۔

دسویں جماعت کے امتحان ہونے میں دو ماہ باقی تھے کہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا جس سے عام طور پر گھر سے نکلنے والی لڑکیوں کو واسطہ پڑتا ہے۔ ایک دن میں اسکول جانے کے لیے نکلی تو دیکھا کہ پڑوسیوں کا لڑکا خالد میرے تانگے سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہے۔ میں اسے نظر انداز کرتی ہوئی تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی کیونکہ اگلی سیٹ پر کوچوان کے ساتھ ہمارا ملازم کرمو بیٹھتا تھا جسے بابا نے ہمارے ساتھ آنے اور جانے پر مامور کیا تھا۔ پھر ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ خالد نے دیوار کے ساتھ لگی سائیکل اٹھائی اور ہمارے تانگے کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ساتھ بیٹھی لڑکیوں نے مجھے غور سے دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ مجھے بڑی خفت محسوس ہوئی۔ نہ جانے وہ لڑکیاں میرے بارے میں کیا سوچ رہی تھیں۔ میں نے گھبراہٹ میں چادر کا کونا پکڑ کر اسے نقاب کی طرح اپنے چہرے کے گرد لپیٹ لیا لیکن اس سے کیا ہونا تھا وہ تو مجھے دیکھ ہی چکا تھا اور نہ جانے اس سے پہلے کتنی بار چوری چھپے مجھے دیکھ چکا ہوگا۔

وہ کچھ فاصلہ رکھ کر سائیکل چلا رہا تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو لیکن کبھی کبھار وہ تانگے سے اتنا قریب آجاتا جیسے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہو یا مجھے کوئی چیز دینا چاہتا ہو۔ مجھ پر شدید گھبراہٹ طاری تھی۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ یہ شیطان جلد از جلد دفع ہوجائے۔ اگر گاؤں کے کسی بندے کی نظر پڑ گئی یا کرمو نے پیچھے مڑ کر دیکھ لیا تو بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ خدا نے میری دعائیں سن لیں اور وہ تقریباً ایک میل تک میرا پیچھا کرنے کے بعد واپس چلا گیا۔

اسکول میں بھی میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ بے دلی سے کلاسیں لیتی رہی۔ فریدہ نے میری اس کیفیت کو بھانپ لیا، اس نے وجہ پوچھی تو میں نے اسے پورا واقعہ سنا دیا۔ میری بات سن کر وہ بولی۔

”تم نے بہت اچھا کیا جو چہرے پر نقاب لے لیا۔ آئندہ اگر وہ تمہارا پیچھا کرے تو کرمو چاچا کو بتا دینا۔ وہ خود ہی اس کی طبیعت صاف کردے گا۔“

فریدہ کے مشورے میں کوئی وزن نہیں تھا۔ کرمو چاچا

کو بتانے سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ وہ بے چارہ ایک معمولی نوکر تھا اور خالد سے الجھنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتا تھا کہ بابا کو بتا دیتا۔ اس کے بعد کا منظر بڑا واضح تھا۔ بابا میرا اسکول جانا بند کردیتے۔ میری تعلیم ادھوری رہ جاتی۔ اس کے بعد میرا رونا دھونا، ضد کرنا، سب بے کار ہوتا۔ گاؤں والوں کے نزدیک عزت سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہے اور اس کی خاطر وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ میری تعلیم تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے خاموشی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ دو مہینے کی تو بات تھی۔ اس کے بعد امتحان ہوجاتے اور میں گھر بیٹھ جاتی۔

دوسرے دن میں گھر سے ہی نقاب لے کر نکلی لیکن خالد نظر نہیں آیا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ اس طرح دو تین روز سکون سے گزر گئے لیکن چوتھے دن وہ پھر آگیا اور پہلے کی طرح اس نے سائیکل پر میرا تعاقب شروع کردیا۔ میں بھی دل پر جبر کیے بیٹھی رہی اور اس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔ کچھ دور تک وہ تانگے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور پھر ہاتھ ہلاتا ہوا واپس چلا گیا۔ میرے دل میں بری طرح خوف بیٹھ گیا تھا۔ خالد میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ بس مجھے اپنی بدنامی کا ڈر تھا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ کئی بار سوچا کہ خالد کے گھر جاؤں اور اس سے براہِ راست بات کروں لیکن اس سے ایک بار مخاطب ہونے کا مطلب اس کی ہمت بڑھانا ہوتا۔ ابھی تو وہ خاموش تھا لیکن پھر وہ کھل جاتا اور راستے بھر مجھ پر فقرے کستا رہتا اس لیے میں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی پھر اچانک ہی یہ سلسلہ بند ہوگیا اور خالد نے میرے راستے میں آنا چھوڑ دیا۔ امتحانوں تک حالات پُرسکون رہے لیکن میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ یہ خاموشی کسی آنے والے بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

امتحانوں کے بعد فراغت ہی فراغت تھی۔ میں نے گھر کے کاموں میں امی کا ہاتھ بٹانا شروع کردیا۔ فریدہ سے میرا رابطہ قائم تھا اور وہ اپنے بھائی کے ہاتھ مجھے ڈائجسٹ بھجوادیا کرتی تھی۔ گھر والوں کو میرے اس شوق کا علم ہوگیا تھا لیکن کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ شاید پڑھی لکھی سمجھ کر مجھے یہ رعایت دے دی گئی تھی۔ فرید بھائی کی لاہور میں ہی جاب لگ گئی تھی۔ وہ مہینے میں ایک بار گاؤں کا چکر ضرور لگاتے اور میرے لیے دو چار ڈائجسٹ ضرور لاتے۔

گھر میں میری شادی کی بات چل رہی تھی۔ دو چار پتھر ضرور آئے لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو نشانے پر لگتا پھر ایک دن وہ بھونچال آہی گیا جس کا مجھے ڈر تھا۔

وہ ایک عام سی سہ پہر تھی۔ میں دوپہر کا کھانا کھانے اور گھر کے کام نمٹانے کے بعد بستر پر لیٹی معمول کے مطابق ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی کہ بڑے کمرے سے کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ میں ہڑبڑا کر بستر سے اٹھی۔ دوپٹا گلے میں ڈالا اور کمرے کی طرف جانے لگی لیکن اپنا نام سن کر دروازے میں ہی رک گئی۔ دروازے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا تو امی اور خالد کی ماں میں زور و شور سے تکرار ہورہی تھی۔

''میں نے کہہ دیا نا کہ ابھی وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ کم ازکم دو سال تک اس کی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''لیکن میں نے تو سنا ہے کہ تم لوگ اس کی شادی کرنا چاہ رہے ہو اور اس کے کچھ رشتے بھی آئے ہیں۔'' خالد کی ماں ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔

''دیکھو بہن! جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر تو ضرور آتے ہیں۔ ہم کسی کو روک تو نہیں سکتے۔ جس طرح تم آئی ہو اسی طرح دوسرے لوگ بھی آتے ہیں۔''

''پڑھائی کا تو ایک بہانہ ہے۔ یہاں تو دور دور تک کوئی کالج نہیں۔ کیا اسے گیارہویں پڑھنے کے لیے لاہور بھیجوگی۔'' خالد کی ماں صوفے سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تمہیں یہ رشتہ قبول نہیں ہے اس لیے کہ ہماری حیثیت تم سے کم ہے۔''

''تم جو چاہو سمجھو۔ میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔'' امی نے بڑے رسان سے جواب دیا۔

خالد کی ماں چلی گئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے اپنے لیے کم حیثیت کا لفظ استعمال کرتے ہوئے خاصی رعایت سے کام لیا تھا ورنہ حقیقت میں وہ کمی لوگ تھے۔ چند سال پہلے تک خالد کا باپ اور چچا ہماری زمینوں پر کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے پھر انہوں نے کچھ رقم جمع کرکے قصبہ میں برتنوں کی دکان کھول لی جو کچھ ہی عرصہ میں چل نکلی۔ اس طرح ان کے گھر میں تھوڑی بہت خوش حالی نظر آنے لگی۔ انہوں نے اپنا مکان بھی پختہ کروالیا اور گھر کے مرد صاف ستھرے کپڑوں میں نظر آنے لگے۔ خالد کا حال بھی انہی لوگوں جیسا تھا جو چار پیسے ہاتھ میں آنے کے بعد اپنے آپ

کو سکندرِ اعظم سمجھنے لگتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کچھ دیر کے لیے دکان پر چلا جاتا اور باقی وقت گاؤں کی گلیوں میں آوارہ گردی کرتا رہتا۔ اسے فلمیں دیکھنے کا چسکا تھا۔ قصبے کے اکلوتے سینما میں ہر ہفتے نئی فلم لگتی تھی اور خالد کے لیے فلم کا پہلا شو دیکھنا باقی دوسرے کاموں کی نسبت زیادہ اہم تھا پھر وہ دوستوں میں بیٹھ کر سلطان راہی اور شان کے انداز میں مکالمے بولتا اور بڑھکیں مارتا۔

ایسی ہی ایک بڑھک اس نے میری طرف بھی اچھال دی۔ میری ماں کے انکار نے اس کی انا کو زبردست ٹھیس پہنچائی تھی۔ یہ انکار اس کی توقع کے برعکس تھا۔ دراصل دوستوں کو فلمی ڈائیلاگ سنا کر وہ اپنے آپ کو بھی فلمی ہیرو سمجھنے لگا تھا اور شاید اس کے خوشامدی دوستوں نے بھی اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ وہ کسی شہزادہ گلفام سے کم نہیں۔ گاؤں کی جس لڑکی کی طرف نگاہ بھر کر دیکھے گا۔ وہ اس کی گود میں پکے ہوئے پھل کی طرح آن گرے گی لیکن اس کی پہلی ہی کوشش رائیگاں گئی۔ میری ماں کے انکار نے اسے اپنی اوقات یاد دلا دی تھی اور اب وہ اوچھی حرکتوں پر اتر آیا۔ اس نے میری سہیلی زرینہ کے ذریعے پیغام بھجوایا کہ مجھے اس انکار کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی اور وہ مجھے زندگی بھر چین سے نہیں رہنے دے گا۔

میں ایک خوش حال زمیں دار کی بیٹی اور چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ ایک چھچھورے اور آوارہ شخص کی دھمکیوں سے کیسے مرعوب ہو سکتی تھی۔ میں نے زرینہ کو بری طرح جھڑک دیا اور سختی سے کہا کہ اگر آیندہ وہ خالد کا کوئی پیغام لے کر آئی تو میں اس سے بھی ملنا چھوڑ دوں گی۔ بظاہر تو میں پرسکون تھی لیکن اندر سے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ خالد جیسے لوگوں سے کسی بھی حرکت کی توقع کی جا سکتی تھی۔ میں نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا اور لمبی تان کر لیٹ گئی۔

کچھ دن سکون سے گزر گئے اور کوئی خاص واقعہ رونما نہ ہوا۔ پھر اچانک ہی گھر میں میرے رشتے کی بات چل نکلی۔ وہ لوگ کسی دوسرے گاؤں میں رہتے تھے اور ہماری ہی طرح کے چھوٹے موٹے زمیں دار تھے۔ شاید ان سے کچھ دور پرے کی رشتے داری بھی تھی۔ لڑکے کی ماں اور بہنیں مجھے دیکھنے آئیں تو انہوں نے میری تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسی وقت مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ امی نے سوچنے کے لیے وقت مانگا تو لڑکے کی ماں بولی۔ ”نہیں جی! جتنا چاہے وقت لے لو، اچھی طرح چھان پھٹک کر لو لیکن میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ آج سے نجمہ میری بیٹی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ میرے امجد کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔“

وہ چلی گئیں تو میں نے امجد کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ امی نے بتایا کہ وہ بارہویں پاس ہے تو مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ وہ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن باپ کی بیماری کی وجہ سے اسے زمینوں کا کام سنبھالنا پڑا۔ گھر میں سبھی لوگ اس رشتے کے حق میں تھے۔ رشتے داری ہونے کے باوجود بابا نے اپنے طور پر چھان بین کر لی تھی اور ہر طرح سے مطمئن ہو جانے کے بعد یہ رشتہ قبول کر لیا گیا۔

دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ بابا دل کھول کر پیسا خرچ کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ اس کی شادی پر اپنے سارے ارمان پورے کروں گا۔ میں بھی خوشی خوشی سب کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹا رہی تھی البتہ خالد کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اس دوران میں زرینہ کئی مرتبہ میرے پاس آئی لیکن اس نے خالد کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ ایک روز میں نے اس سے خود ہی پوچھ لیا تو وہ بولی ”تم نے منع کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے کچھ نہیں بتایا ورنہ وہ تو آئے دن کچھ نہ کچھ کہتا رہتا ہے۔“

”یا اللہ خیر!“ میں نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”کہیں کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔“

”تم فکر مت کرو۔“ وہ مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ”میں نے اس کا دماغ ٹھکانے لگا دیا ہے اور سمجھا دیا ہے کہ اگر اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو تمہارے چاروں بھائی اس کا قیمہ بنا دیں گے۔ ویسے بھی وہ بزدل بندہ ہے اور بڑھکیں مارنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا۔“

برات بڑی دھوم دھام سے آئی۔ بابا نے گاؤں کے سبھی لوگوں کو شادی میں بلایا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خالد اور اس کے گھر والے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس شادی میں شریک ہوئے۔ یہ بات مجھے بعد میں زرینہ نے بتائی کہ خالد تو امجد سے اس طرح گھل مل کر باتیں کر رہا تھا جیسے وہ دونوں بچپن کے یار بیلی ہوں یہ سن کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ خالد کے دل میں اب کوئی کدورت نہیں رہی۔

سسرال میں میرا شاندار استقبال ہوا۔ امجد تو پہلی رات میری صورت دیکھتے ہی فریفتہ ہو گیا۔ اس کا والہانہ

پن اور بے تابی دیکھ کر میں بھی سر سے پاؤں تک پیار کے نشے میں ڈوب گئی۔ واقعی کسی نے سچ کہا ہے کہ انسان کی زندگی میں یہی ایک یادگار رات ہوتی ہے۔ صبح ہوئی تو ساس نندیں مجھ پر صدقے واری ہونے کے لیے تیار تھیں۔ میں نے گھونگٹ کی اوٹ سے ان کے چہرے پڑھنے کی کوشش کی اور ڈائجسٹوں سے ملنے والے شعور نے مجھے پل بھر میں بتادیا کہ ان چہروں پر مصنوعی ماسک چڑھا ہوا ہے اور خوش اخلاقی کا یہ مظاہرہ اس بھاری بھرکم جہیز کا مرہون منت ہے جو میرے باپ نے اپنی جائیداد کے ایک حصہ کے طور پر مجھے دیا تھا۔ ان کے اصل چہروں کی نقاب کشائی تک مجھے صبر سے کام لینا ہوگا۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ امجد مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ کام سے واپس آنے کے بعد وہ سارا وقت میرے ساتھ ہی گزارتا۔ ایک مرتبہ وہ مجھے گھمانے کے لیے لاہور بھی لے گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ہم مری اور سوات بھی جائیں لیکن پیچھے زمینوں کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا اور وہ زیادہ دنوں تک گاؤں سے باہر نہیں رہ سکتا تھا اس لیے دل مسوس کر واپس آنا پڑا۔ امجد کو جب معلوم ہوا کہ مجھے ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق ہے تو اس نے ہر مہینے میرے پسندیدہ رسالے منگوانا شروع کردیے۔ یوں مجھے وقت گزارنے کا ایک ذریعہ میسر آگیا اور میں اپنی چھوٹی سی جنت میں مطمئن زندگی گزارنے لگی۔

چھ ماہ خیریت سے گزر گئے۔ پھر مجھے اپنی ساس کی نظریں کچھ بدلی بدلی محسوس ہونے لگیں۔ یوں لگتا جیسے وہ کچھ جاننا چاہ رہی ہو۔ اس کے کان کوئی خبر سننے کے منتظر ہوں۔ میں بچی نہیں تھی اور جانتی تھی کہ وہ کس خوش خبری کے انتظار میں ہے لیکن میں اسے کیا خبر سناتی جبکہ دور دور تک اس کے کوئی آثار نہ تھے۔ اس لیے میں نے بھی انجان بنے رہنے میں ہی عافیت جانی لیکن میری ساس کو بہت جلدی تھی۔ اس لیے اس سے صبر نہ ہوسکا اور ایک دن وہ بول ہی پڑی۔

"کی گل اے پتر۔ ابھی تک تو نے کوئی چنگی خبر نہیں سنائی۔"

اصولاً تو مجھے اس سوال پر شرمانا یا منہ بسور لینا چاہیے تھا لیکن میں نے شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تڑ سے جواب دیا۔ "رب کی مرضی۔ میں کیا کرسکتی ہوں۔"

ساس کا منہ بن گیا۔ شاید وہ مجھے اس سے بھی زیادہ سخت جواب دیتی لیکن اس نے منافقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک پھیکی مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجائی اور بولی "ہاں! کہتی تو ٹھیک ہی ہے۔ چلو، انتظار کرلیتے ہیں۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔"

یہ انتظار طویل ہوتا گیا۔ سال گزرا، پھر دو سال بیت گئے لیکن میری گود ہری نہ ہوئی۔ ساس نے اٹھتے بیٹھتے طعنے دینا شروع کردیے۔ اس دوران میں، میں نے خالد کی ماں کو اپنے گھر آتے دیکھا۔ وہ بہت دیر تک میری ساس کے پاس بیٹھی کھسر پسر کرتی رہی۔ مجھ سے کہنے لگی کہ اس گاؤں میں اس کے کسی رشتے دار کی فوتگی ہوگئی تھی اور وہ پرسہ کے لیے آئی تھی پھر اسے یاد آیا کہ میں بھی اسی گاؤں میں رہتی ہوں تو وہ مجھ سے ملنے چلی آئی۔ حالانکہ وہ تمام وقت میری ساس کے پاس ہی بیٹھی رہی۔ مجھ سے تو اس نے رسمی سلام دعا ہی کی تھی۔

میرے لیے ساس نندوں کے طعنے ناقابل برداشت ہوگئے تو میں نے امجد سے کہا کہ وہ مجھے لاہور کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے چلے۔ میں اپنا چیک اپ کروانا چاہتی ہوں۔ امجد میں بہت سی خوبیاں تھیں لیکن کہیں آنے جانے سے اس کی جان جاتی تھی۔ لاہور جانے کا سن کر بھی اس نے ٹال مٹول شروع کردی اور کہنے لگا۔ "اگر ہماری قسمت میں اولاد لکھی ہے تو ضرور ہوگی اور اگر نہیں تو پھر لیڈی ڈاکٹر بھی کچھ نہیں کرسکتی۔"

"بہت کچھ کرسکتی ہے۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "ممکن ہے کہ مجھ میں کوئی ایسی خرابی ہو جو دواؤں یا چھوٹے موٹے آپریشن سے دور ہوجائے اور میں بچہ پیدا کرنے کے قابل ہوجاؤں۔"

"جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے تو بانجھ پن ایک لاعلاج مرض ہے اور آج تک کوئی بانجھ عورت بچے پیدا نہیں کرسکی۔"

امجد کی بات سن کر مجھے طیش آگیا اور میں غصے سے بولی۔ "تم۔ تم مجھے بانجھ کہہ رہے ہو؟"

"اور کیا کہوں؟ جس عورت کے یہاں شادی کے دو سال بعد بھی بچہ نہ ہو وہ بانجھ ہی کہلائے گی۔"

وہ اپنی ماں اور بہنوں کی زبان بول رہا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ بات بٹھادی گئی تھی کہ میں بانجھ ہوں، اس کے بعد یہ ترغیب دی جاتی کہ وہ دوسری شادی کرلے لیکن میں اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ میں نے دل کو مضبوط

کرتے ہوئے کہا۔

''اسی لیے تو چیک اپ کروانا چاہ رہی ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ واقعی میں بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوں تاکہ اس کے بعد تمہیں بھی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔''

''کیسا فیصلہ؟ یہ کیا کہہ رہی ہو نجمہ؟'' امجد کچھ بے چین ہوتے ہوئے بولا ''میں تمہارے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ہم بچے کے بغیر بھی زندگی گزار سکتے ہیں۔''

''جذباتی ڈائیلاگ بول کر مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ تمہاری دوسری شادی کا فیصلہ ہو چکا ہے لیکن تم میری محبت میں اس فیصلے کو قبول کرنے سے ہچکچا رہے ہو۔ میں اسی لیے چیک اپ کروانا چاہتی ہوں کہ میرے بانجھ پن کی تصدیق ہو جانے کی صورت میں تمہاری ہچکچاہٹ دور ہو جائے۔''

''یہ تمہارا وہم ہے'' امجد میری بات ختم ہوتے ہی بول اٹھا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کبھی دوسری شادی کے بارے میں سوچا ہے۔''

میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور پل بھر میں جان گئی کہ اس کے الفاظ دلی جذبات کی عکاسی نہیں کر رہے ہیں۔ آسان لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا لہٰذا میں نے بحث کو سمیٹنے کی خاطر کہا۔ ''بہر حال کچھ بھی ہو۔ ہم کل ہی لاہور جائیں گے اور اگر تمہیں کوئی مسئلہ ہے تو میں اپنے بھائی کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔''

امجد جلدی سے بولا۔ ''نہیں نہیں! انہیں تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

گائناکولوجسٹ نے میرا تفصیلی معائنہ کیا۔ کچھ سوالات پوچھے اور بولی۔ ''بظاہر تو سب کچھ نارمل ہے پھر بھی میں مزید کنفرمیشن کے لیے کچھ ٹیسٹ لکھ رہی ہوں۔ ان کی رپورٹ دیکھنے کے بعد ہی فائنلی کچھ کہہ سکوں گی۔''

امجد گھر جانے کے موڈ میں تھا لیکن میں نے اصرار کیا کہ ٹیسٹ بھی ابھی کروالیتے ہیں۔ بار بار آنا مشکل ہوگا۔ امجد نے حسب معمول ٹالنے کی کوشش کی لیکن میرے اصرار پر وہ مجبور ہو گیا اور ہم نے ایک معروف لیبارٹری سے ٹیسٹ بھی کروالیے۔ ایک ہفتہ بعد جب میں اور امجد ان ٹیسٹوں کی رپورٹ لے کر دوبارہ لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئے تو اس نے رپورٹ دیکھنے کے بعد کہا۔

''آپ کی رپورٹس تو کلیئر ہیں۔ اب میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ میں کوئی نقص نہیں اور آپ بالکل ٹھیک ہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب۔ یہ بات ہے تو بچہ کیوں نہیں ہوتا۔''

''خدا کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ میرے سامنے ایسے کئی کیسز آئے ہیں کہ میاں اور بیوی دونوں ہی اولاد پیدا کرنے کے قابل ہیں۔ اس کے باوجود ان کے یہاں اولاد نہیں ہوئی'' پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے مسٹر امجد کہ آپ کو بھی اپنا چیک اپ کروالینا چاہیے تاکہ صورت حال پوری طرح واضح ہو جائے۔''

امجد یہ سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا اور بولا ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں کیوں اپنا چیک اپ کرواؤں۔''

''ہر مرد اپنے بارے میں اسی انداز سے سوچتا ہے۔'' ڈاکٹر طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''لیکن اندر کا حال کوئی نہیں جانتا۔ اگر اولاد نہیں ہو رہی تو ضرور کہیں نہ کہیں کوئی خرابی ہے۔ آپ کی بیگم اپنا معائنہ کروا چکی ہیں۔ اب آپ کو بھی اپنی تسلی کے لیے ٹیسٹ کروالینا چاہیے۔ اس میں آپ کا ہی فائدہ ہے۔''

ڈاکٹر کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی امجد نے میرا ہاتھ پکڑا، اور کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کے مشورے کا شکریہ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اس پر ضرور عمل کروں گا۔''

گھر آکر میں نے اپنی ساس کو ساری بات بتادی۔ میرا خیال تھا کہ وہ امجد کو سمجھا بجھا کر ٹیسٹ کروانے پر آمادہ کرلے گی لیکن وہ تو بیٹے سے بھی دو ہاتھ آگے نکلی اور اس نے الٹا مجھ کو ہی برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ''چار جماعتیں کیا پڑھ لیں۔ اپنے آپ کو بڑی علامہ سمجھنے لگی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ وہ ڈاکٹر بھی اس سے ملی ہوئی ہے جبھی تو سارا الزام میرے بیٹے پر ڈال دیا۔ واقعی مجھ سے بڑی بھول ہوئی کسی چٹی ان پڑھ کو لے کر آتی تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتے۔''

کمرے میں آکر امجد نے مجھ پر غصہ کرنا شروع کر دیا۔ کہنے لگا۔ ''ماں کو یہ سب باتیں بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ پرانے خیالات کی عورت ہیں اور ان باتوں کو نہیں سمجھتیں لیکن تمہیں تو بقراط بننے کا بڑا شوق ہے۔ اب بھگتو۔''

میں بھی بھنائی ہوئی تھی۔ جل کر بولی۔ ''ہاں! میں ہی رہ گئی ہوں، سب کچھ بھگتنے کے لیے۔ تم کچھ نہ کرنا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ٹیسٹ کروانے سے کیوں انکار کر رہے ہو۔ دیکھو نا۔ اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے اگر کوئی چھوٹی موٹی خرابی ہوئی تو وہ علاج سے دور ہو جائے گی اور ہماری گود میں ایک پیارا سا بچہ آجائے گا۔''

''ڈائجسٹ پڑھ پڑھ کر تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اور تم اپنے آپ کو افلاطون سمجھنے لگی ہو۔ بس مجھے اطمینان ہو گیا کہ تمہارے اندر کوئی خرابی نہیں ہے۔ اب اللہ نے چاہا تو بچہ بھی ہو جائے گا۔''

میرے لیے حالات دن بہ دن خراب ہوتے جا رہے تھے۔ ساس نندیں ہر وقت بچے بچے کی تکرار کرتی رہتیں اور امجد نے اس روز کے بعد مجھ سے نظریں چرانا شروع کر دی تھیں۔ پہلے وہ سر شام گھر آجاتا اور بقیہ سارا وقت میرے ساتھ ہی گزارتا لیکن اب اس نے نیا وتیرہ اختیار کیا تھا۔ وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد ٹہلنے کے لیے چلا جاتا اور اس کی واپسی گیارہ بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بستر پر منہ پھیر کر لیٹ جاتا اور تھوڑی ہی دیر میں اسے گہری نیند آجاتی۔ میں تو اس سے بات کرنے کو بھی ترس گئی تھی۔ اس ماحول میں میرا دم گھٹنے لگا تو ایک دن میں نے امجد سے کہا کہ وہ مجھے کچھ دنوں کے لیے میکے چھوڑ دے۔ حیرت انگیز طور پر وہ میری بات مان گیا اور میں اس کے ساتھ دوسرے ہی روز میکے آگئی۔

میں نے اپنی ماں کو بھی تمام حالات سے آگاہ کر دیا جسے سن کر اس کا پریشان ہونا فطری امر تھا۔ لیکن وہ جھوٹی تسلی دینے کے علاوہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ کم از کم داماد سے تو بالکل نہیں کہہ سکتی تھی کہ اپنا چیک اپ کرواؤ تاکہ معلوم ہو سکے کہ کتنے بڑے سورما ہو۔ مجھے گھر آئے دو دن ہی ہوئے تھے کہ زرینہ آگئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے مجھ سے کہا ''تم نے مجھے منع کیا تھا کہ خالد کا کوئی پیغام تم تک نہ پہنچاؤں لیکن اب حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ میں خاموش نہیں رہ سکتی۔''

اس کی تمہید سن کر میں ڈر گئی اور بولی۔ ''کھل کر بتاؤ کہ بات کیا ہے؟''

زرینہ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور میرے کان کے قریب منہ لاتے ہوئے بولی۔ ''خالد ابھی تک تمہاری یاد اپنے دل میں بسائے بیٹھا ہے اور اسے تمہارے حالات کا بخوبی علم ہے۔ اس نے پیغام بھیجا ہے کہ جیسے ہی امجد دوسری شادی کی بات کرے تو فوراً طلاق لے کر چلی آنا۔ وہ اب بھی تمہارا ہاتھ تھامنے کو تیار ہے۔''

اگر اس وقت خالد میرے سامنے ہوتا تو میں اس کا منہ نوچ لیتی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا اور بولی۔ ''زرینہ! اس سے کہہ دینا کہ میں زہر کھا کر مر جاؤں گی یا ساری عمر یونہی گزار دوں گی لیکن اس جیسے دو نمبر انسان سے کبھی شادی نہیں کروں گی۔''

زرینہ تو کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی لیکن میرے لیے سوچوں کے کئی در کھول گئی۔ ویسے تو مجھے امجد کی محبت پر پورا بھروسا تھا لیکن مرد ذات کا کیا اعتبار۔ ماں بہنوں کے دباؤ میں آکر یا اولاد کی خواہش سے مجبور ہو کر وہ دوسری شادی پر راضی ہو سکتا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے تو دوسری شادی کرنے سے بھی اسے کیا فائدہ ہوگا لیکن وہ تو یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا کہ اس میں کوئی نقص ہے۔ اب میرا گھر صرف اسی صورت میں بچ سکتا تھا کہ امجد ٹیسٹ کروانے پر راضی ہو جائے اور اس کا نتیجہ وہی آئے جو میں سمجھ رہی تھی۔ تبھی وہ دوسری شادی سے باز رہ سکتا تھا۔

میں ایک ہفتہ میکے میں گزار کر اپنے گھر واپس آگئی۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ میری غیر موجودگی میں خالد کی ماں دو تین چکر لگا چکی ہے اور میری ساس کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر کھسر پسر کرتی رہی ہے۔ دراصل میری سب سے چھوٹی نند سلمٰی بہت ہی بے وقوف اور سیدھی لڑکی تھی اور ذرا سی ٹوہ لینے پر ہر بات کھل کر بتا دیا کرتی تھی۔ اسی نے یہ انکشاف بھی کیا کہ میری ساس نے خالد کی ماں کو امجد کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کی ذمے داری سونپی ہے۔ سلمٰی کی زبانی یہ سن کر میں سمجھ گئی کہ وہ عورت مجھ سے پرانا بدلہ چکا رہی ہے اور اس کی پوری کوشش ہے کہ کسی طرح امجد مجھے اپنی زندگی سے نکال دے۔

ایک دن میری ساس کہیں سے گھوم پھر کر واپس آئی تو اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور تیوری چڑھائے ہوئے بولی۔ ''اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ لوگوں کے طعنے سنتے سنتے میرے کان پک گئے ہیں۔ میری مانو تو پیر صاحب کے پاس چلتے ہیں۔ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں اور ان کے دروازے سے کبھی کوئی خالی ہاتھ واپس نہیں گیا۔ ایسا عمل کرتے ہیں کہ دنوں اور گھنٹوں میں من کی مراد پوری

ہو جاتی ہے۔"

وہ اس سے پہلے بھی اس پیر کا تذکرہ کر چکی تھی لیکن میں نے کبھی کوئی توجہ نہیں دی۔ دراصل مجھے موجودہ دور کے پیروں فقیروں پر اعتقاد ہی نہیں تھا اور میں اس عقیدے پر قائم تھی کہ جب بندے اور اس کے رب کے درمیان کوئی پردہ نہیں تو ہمیں اپنی جائز مرادوں کے لیے اسی کے سامنے دست سوال دراز کرنا چاہیے لیکن میری ساس اس پیر کی بڑی معتقد تھی اور بڑی باقاعدگی سے ہر جمعرات کو اس کے آستانے پر حاضری دینے جاتی تھی۔

"اس جمعرات کو تم بھی میرے ساتھ چلنا۔ مجھے یقین ہے کہ پیر صاحب کے عمل کی برکت سے تمہاری گود ضرور ہری ہو جائے گی۔"

میں نے ایک فرماں بردار بہو کی طرح اس کا حکم سنا اور سر جھکا لیا۔ اس مرحلے پر ان لوگوں سے پنگا لینا مناسب نہ تھا۔ پیر کے پاس ایک آدھ مرتبہ جانے میں کوئی حرج نہ تھا۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں اس پیر کی کرامات جو بنجر زمین میں فصل اگا دیتا ہے۔ میں نے امجد کو بھی بتا دیا تھا کہ جمعرات والے دن پیر صاحب کے پاس من کی مراد لینے جا رہی ہوں۔ وہ میرے لہجے کی کاٹ سے گھبرا گیا اور بولا۔"پیر صاحب کے سامنے ادب سے بیٹھنا اور اپنی زبان پر قابو رکھنا۔ اگر پیر صاحب ناراض ہو گئے تو ہمارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔"

"کیا ہوگا؟ یہی نا کہ زیادہ سے زیادہ وہ مجھے جلا کر بھسم کر دیں گے۔ اچھا ہے تمہاری مشکل بھی آسان ہو جائے گی اور تم سکون سے دوسری شادی کر سکو گے۔"

"تمہارے دماغ میں ہر وقت الٹی سیدھی باتیں چلتی رہتی ہیں۔ کس نے کہہ دیا کہ میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔"

"کسی نے نہیں کہا لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اماں جی نے کسی عورت کو تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈنے کا ٹاسک دے دیا ہے۔"

"اگر وہ میری دوسری شادی کر رہی ہوتیں تو تمہیں پیر صاحب کے پاس لے کر نہ جاتیں۔"

"یہ سب تو وہ حجت تمام کرنے کے لیے کر رہی ہیں تاکہ یہ ثابت کر سکیں کہ پیر صاحب کے عمل کے باوجود میں بچہ پیدا کرنے میں ناکام رہی اور تمہاری دوسری شادی کی راہ ہموار ہو جائے۔"

"تم غلط انداز میں سوچ رہی ہو۔ میرا دوسری شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

جمعرات والے دن عصر کی اذان سے کچھ دیر پہلے میری ساس نے مجھے ایک نیا جوڑا دیا اور کہا کہ جلدی سے تیار ہو جاؤ کیونکہ پیر صاحب مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔ میں نے حیرت سے ساس کی طرف دیکھا۔ ہم پیر سے ملنے جا رہے تھے۔ کسی تقریب میں نہیں پھر اس تیاری کی کیا ضرورت تھی لیکن وہ الٹے دماغ کی عورت تھی۔ اس سے الجھنا بے کار تھا۔ لہٰذا خاموشی سے تیار ہو کر اس کے ساتھ چل دی۔ اس پیر کا ٹھکانا آبادی سے باہر تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں کافی رش ہوگا لیکن گنتی کے چند لوگ ہی نظر آئے۔ دو چار عورتیں اور ایک مرد۔ اس لیے ہماری باری جلد ہی آ گئی۔ پیر صاحب کے کمرے میں دروازے کے ساتھ ہی ایک بڑی سی صندوقچی رکھی تھی۔ میری ساس نے اس میں نذرانہ ڈالا اور پیر صاحب کو سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی اور کن اکھیوں سے پیر کا جائزہ لینے لگی۔ میں نے اپنے ذہن میں اس کا جو تصور قائم کیا تھا وہ اس سے بالکل مختلف نکلا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ پیر صاحب کوئی برگزیدہ شخصیت ہوں گے۔ نورانی چہرہ، سفید داڑھی، سفید لباس، لبوں پر تبسم اور ہاتھ میں تسبیح لیکن میرے سامنے سادہ لباس پہنے ایک انتہائی کرخت چہرے والا شخص بیٹھا تھا۔ سرخ سفید چہرہ، سیاہ گھنی داڑھی، لمبے بال، سرخ آنکھیں۔ اس نے میری ساس کو گھورا پھر اس کی نظریں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر وہ گرج دار آواز میں بولا۔"کس لیے آئی ہو؟"

میری ساس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔"سائیں! اس کی شادی کو دو سال ہو گئے پر ابھی تک اولاد سے محروم ہے۔ سائیں۔ اس کے لیے دعا کرو۔ سوہنا رب اس کی گود بھر دے۔"

پیر نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور بولا"لڑکی! کیا نام ہے تیرا؟"

میں نے اپنا نام بتایا تو اس نے آنکھیں بند کر لیں اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ پندرہ منٹ اس طرح گزر گئے۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور بولا"تجھ پر کسی نے جادو کیا ہوا ہے۔ اس کی کاٹ کرنے میں وقت لگے گا۔ چالیس دن کا عمل ہے۔ تجھے روزانہ آنا ہوگا۔ اگر ایک دن بھی ناغہ کر لیا تو نئے سرے سے کرنا ہوگا۔ اگر

ہو جاتی ہے۔"

وہ اس سے پہلے بھی اس پیر کا تذکرہ کر چکی تھی لیکن میں نے کبھی کوئی توجہ نہیں دی۔ دراصل مجھے موجودہ دور کے پیروں فقیروں پر اعتقاد ہی نہیں تھا اور میں اس عقیدے پر قائم تھی کہ جب بندے اور اس کے رب کے درمیان کوئی پردہ نہیں تو ہمیں اپنی جائز مرادوں کے لیے اسی کے سامنے دست سوال دراز کرنا چاہیے لیکن میری ساس اس پیر کی بڑی معتقد تھی اور بڑی باقاعدگی سے ہر جمعرات کو اس کے آستانے پر حاضری دینے جاتی تھی۔

"اس جمعرات کو تم بھی میرے ساتھ چلنا۔ مجھے یقین ہے کہ پیر صاحب کے عمل کی برکت سے تمہاری گود ضرور ہری ہو جائے گی۔"

میں نے ایک فرماں بردار بہو کی طرح اس کا حکم سنا اور سر جھکا لیا۔ اس مرحلے پر ان لوگوں سے پنگا لینا مناسب نہ تھا۔ پیر کے پاس ایک آدھ مرتبہ جانے میں کوئی حرج نہ تھا۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں اس پیر کی کرامات جو بنجر زمین میں فصل اگا دیتا ہے۔ میں نے امجد کو بھی بتا دیا تھا کہ جمعرات والے دن پیر صاحب کے پاس من کی مراد لینے جا رہی ہوں۔ وہ میرے لہجے کی کاٹ سے گھبرا گیا اور بولا۔"پیر صاحب کے سامنے ادب سے بیٹھنا اور اپنی زبان پر قابو رکھنا۔ اگر پیر صاحب ناراض ہو گئے تو ہمارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔"

"کیا ہوگا؟ یہی نا کہ زیادہ سے زیادہ وہ مجھے جلا کر بھسم کر دیں گے۔ اچھا ہے تمہاری مشکل بھی آسان ہو جائے گی اور تم سکون سے دوسری شادی کر سکو گے۔"

"تمہارے دماغ میں ہر وقت الٹی سیدھی باتیں چلتی رہتی ہیں۔ کس نے کہہ دیا کہ میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔"

"کسی نے نہیں کہا لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اماں جی نے کسی عورت کو تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈنے کا ٹاسک دے دیا ہے۔"

"اگر وہ میری دوسری شادی کر رہی ہوتیں تو تمہیں پیر صاحب کے پاس لے کر نہ جاتیں۔"

"یہ سب تو وہ حجت تمام کرنے کے لیے کر رہی ہیں تاکہ یہ ثابت کر سکیں کہ پیر صاحب کے عمل کے باوجود میں بچہ پیدا کرنے میں ناکام رہی اور تمہاری دوسری شادی کی راہ ہموار ہو جائے۔"

"تم غلط انداز میں سوچ رہی ہو۔ میرا دوسری شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

جمعرات والے دن عصر کی اذان سے کچھ دیر پہلے میری ساس نے مجھے ایک نیا جوڑا دیا اور کہا کہ جلدی سے تیار ہو جاؤ کیونکہ پیر صاحب مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔ میں نے حیرت سے ساس کی طرف دیکھا۔ ہم پیر سے ملنے جا رہے تھے۔ کسی تقریب میں نہیں پھر اس تیاری کی کیا ضرورت تھی لیکن وہ الٹے دماغ کی عورت تھی۔ اس سے الجھنا بے کار تھا۔ لہٰذا خاموشی سے تیار ہو کر اس کے ساتھ چل دی۔ اس پیر کا ٹھکانا آبادی سے باہر تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں کافی رش ہوگا لیکن گنتی کے چند لوگ ہی نظر آئے۔ دو چار عورتیں اور ایک مرد۔ اس لیے ہماری باری جلد ہی آ گئی۔ پیر صاحب کے کمرے میں دروازے کے ساتھ ہی ایک بڑی سی صندوقچی رکھی تھی۔ میری ساس نے اس میں نذرانہ ڈالا اور پیر صاحب کو سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی اور کن انکھیوں سے پیر کا جائزہ لینے لگی۔ میں نے اپنے ذہن میں اس کا جو تصور قائم کیا تھا وہ اس سے بالکل مختلف نکلا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ پیر صاحب کوئی برگزیدہ شخصیت ہوں گے۔ نورانی چہرہ، سفید داڑھی، سفید لباس، لبوں پر تبسم اور ہاتھ میں تسبیح لیکن میرے سامنے سادہ لباس پہنے ایک انتہائی کرخت چہرے والا شخص بیٹھا تھا۔ سرخ سفید چہرہ، سیاہ گھنی داڑھی، لمبے بال، سرخ آنکھیں۔ اس نے میری ساس کو گھورا پھر اس کی نظریں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر وہ گرج دار آواز میں بولا۔"کس لیے آئی ہو؟"

میری ساس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔"سائیں! اس کی شادی کو دو سال ہو گئے پر ابھی تک اولاد سے محروم ہے۔ سائیں۔ اس کے لیے دعا کرو۔ سوہنا رب اس کی گود بھر دے۔"

پیر نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور بولا"لڑکی! کیا نام ہے تیرا؟"

میں نے اپنا نام بتایا تو اس نے آنکھیں بند کر لیں اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ پندرہ منٹ اس طرح گزر گئے۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور بولا"تجھ پر کسی نے جادو کیا ہوا ہے۔ اس کی کاٹ کرنے میں وقت لگے گا۔ چالیس دن کا عمل ہے۔ تجھے روزانہ آنا ہوگا۔ اگر ایک دن بھی ناغہ کر لیا تو نئے سرے سے کرنا ہوگا۔ اگر

پابندی سے آسکتی ہے تو میں کل سے ہی عمل شروع کردیتا ہوں۔''

میری ساس جلدی سے بولی۔ ''ہاں جی۔ آئے گی۔ ضرور آئے گی۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر آؤں گی۔''

پیر نے اپنی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''ایک بات کا دھیان رکھنا۔ اس عمل کے دوران میں جو کچھ بھی دیکھو، سنو یا محسوس کرو۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا ورنہ سب کچھ بے کار ہوجائے گا اور اگر عمل کا اثر الٹا ہوجائے تو نقصان بھی ہوسکتا ہے۔''

میری ساس نے ایک بار پھر سر ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ مجھے پیر کے پاس بیٹھے بیٹھے الجھن سی محسوس ہورہی تھی لیکن جب تک وہ نہ کہتا میں وہاں سے نہیں اٹھ سکتی تھی۔ اسی دوران میں مغرب کی اذان ہوگئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ نماز پڑھنے کے لیے اٹھے گا اور اس طرح ہم لوگوں کو بھی وہاں سے جانے کی اجازت مل جائے گی لیکن وہ اسی طرح آلتی پالتی مارے بیٹھا رہا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں بند کرلیں اور زیرلب کچھ پڑھنے لگا۔ پانچ منٹ بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور کہا ''اب تم لوگ جاؤ۔ کل وقت پر آجانا۔''

مجھ پر اس پیر کا کچھ اچھا تاثر قائم نہ ہوا۔ وہ یقیناً کوئی بہروپیا تھا جو گاؤں کے سادہ اور معصوم لوگوں کو بے وقوف بنا کر لوٹ رہا تھا۔ اگر وہ نماز پڑھنے چلا جاتا تو شاید میری نظروں میں اس کا کچھ بھرم رہ جاتا لیکن بے نمازی شخص کی تو میرے دل میں کوئی قدر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نے گھر آنے کے بعد یہی بات اپنی ساس سے کہی تو وہ الٹا مجھ پر ہی برس پڑی۔

''ناشکری کہیں کی! اس نے ہماری خاطر اپنی نماز قضا کردی اور تو اس کے لیے ایسا کہہ رہی ہے۔ تجھے کیا معلوم وہ رات رات بھر عبادت کرتا ہے۔ خبردار اگر آئندہ کوئی ایسی بات کی، بھول گئی کہ پیر صاحب نے کیا کہا تھا جو کچھ بھی دیکھو یا سنو، اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔''

مجھے اس جاہل عورت پر بہت غصہ آیا۔ سب کچھ آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی وہ یہ مکھی نگلنے کو تیار تھی۔ جبکہ مجھے اس پیر کی نیت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے ایسے نام نہاد اور جعلی پیروں کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا جو گاؤں کی معصوم اور بھولی بھالی عورتوں کو اولاد کا جھانسا دے کر ان کی عزت سے کھیلتے ہیں۔ میں دوبارہ اس پیر کے پاس نہیں جانا چاہ رہی تھی لیکن ساس سے کیا کہتی وہ تو اس پیر کی اتنی معتقد تھی کہ اس کے بارے میں ایسی کوئی بات سنتے ہی مجھے چوٹی سے پکڑ کر گھر سے نکال دیتی۔ ویسے بھی یہ سب میرے خدشات تھے۔ جب تک کوئی بات سامنے نہ آجاتی، کچھ کہنا مناسب نہ تھا۔

دوسرے دن ہم لوگ مغرب کے بعد گئے تو وہاں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سب لوگ جاچکے تھے اور وہ پیر اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا تھا۔ میری ساس نے حسب دستور صندوقچی میں نذرانہ ڈالا اور فرش پر بیٹھنے ہی والی تھی کہ پیر نے اسے کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ پیر نے مجھے اپنے پاس بلایا اور سامنے بٹھا کر بولا ''اب میں اپنا عمل شروع کررہا ہوں۔ اس دوران میں تم میری ہر بات مانتی رہوگی اور زبان سے کچھ نہیں کہوگی اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو سب کچھ چوپٹ ہوجائے گا۔''

یہ بہت ہی عجیب وغریب شخص تھا جسے پہنچا ہوا بزرگ ماننے کو دل تیار نہیں تھا لیکن اس وقت مجھے دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل کرنا تھا۔ اس لیے خاموش رہی۔ پھر پیر نے مجھے اپنی چادر اتارنے کو کہا اور تخت پر اپنے قریب بٹھالیا۔ پھر اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑے اور آنکھیں بند کرکے کچھ پڑھنے لگا۔ یہ زندگی میں پہلا موقع تھا جب کسی غیر مرد نے میرے ہاتھ پکڑے تھے لیکن عمل کو پورا کرنے کے لیے مجھے پیر کا ہر حکم ماننا تھا۔ اس لیے خاموش رہی۔ وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک یہی کرتا رہا پھر اس زور سے میرے ہاتھوں کو جھٹکا دیا اور میں بے دھیانی میں اس سے جا ٹکرائی۔ اس نے فوراً ہی مجھے شانوں سے تھام لیا۔ اب میں اس کی آغوش میں تھی اور وہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی سانسیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کیا اور اپنی جگہ آن بیٹھی پھر اس نے مجھے گھر جانے کا اشارہ کیا اور میں حواس باختہ کمرے سے باہر نکل آئی۔

گھر آنے کے بعد ساس سے تو کچھ نہ کہا لیکن پیر کی نیت مجھ پر پوری طرح واضح ہوچکی تھی۔ اب مجھے اپنے تحفظ کے لیے کچھ کرنا تھا۔ وہ پیر میری عزت کے درپے تھا جبکہ میں کسی قیمت پر بھی اس کھیل کا حصہ نہیں بن سکتی تھی۔

دوسرے دن گھر سے نکلتے وقت میں نے سبزی کاٹنے کی تیز دھار چھری اپنے نیفے میں اڑس لی اور مصمم ارادہ کرلیا کہ آج اگر پیر نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو میں یہ چھری اس کے

سینے میں اتار دوں گی۔

تیسرے دن اس نے ایک اور عجیب حرکت کی۔ پہلے تو اپنے سامنے بٹھا کر کچھ پڑھتا رہا پھر مجھے بغلی کمرے میں جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہاں جا کر لیٹ جاؤ اور اپنے دماغ میں بچے کا تصور کر کے ایک گھنٹے تک چھت کو دیکھتی رہو۔ یاد رہے کہ اس دوران میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی تمہاری نظریں اِدھر اُدھر نہیں ہونی چاہئیں۔''

مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق مجھے اس کا یہ حکم بھی ماننا پڑا۔ اتنا تو جان گئی تھی کہ یہ پیر آج ضرور پیش قدمی کرے گا۔ میں نے کمرے میں جا کر نیفے سے چھری نکالی اور اسے تکیے کے نیچے رکھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچ رہی تھی کہ سانپ مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے یعنی میں کوئی خون خرابہ کیے بغیر اس مصیبت سے آزاد ہو جاؤں۔

پیر سے انتظار نہ ہو سکا اور وہ آدھا گھنٹا بعد ہی کمرے میں آ گیا جب اس نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھائی تو مجھے اس کی نیت پر کوئی شک نہ رہا۔ وہ حریصانہ نظروں سے میرے جسم کا جائزہ لیتے ہوئے بولا ''مجھے تم پر ترس آتا ہے واقعی تم بہت دکھی اور مظلوم ہو۔ اگر اولاد نہ ہوئی تو تمہارا شوہر دوسری شادی کرے گا پھر تم کہاں جاؤ گی۔ اپنے گھر کو بچانا چاہتی ہو تو بچہ پیدا کرو۔ یہ بچہ میں تمہیں دوں گا کیونکہ میں تم جیسی خوبصورت لڑکی پر ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے لیے تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔ جس طرح پہلے میری سب باتیں مانتی آئی ہو، اسی طرح آئندہ بھی خاموش رہنا۔''

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور اس نے میرے پیٹ پر سے قمیص ہٹا دی۔ اس سے زیادہ برداشت کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے اسے دھکا دیا۔ بستر سے چھلانگ لگائی اور تکیے کے نیچے سے چھری نکال کر اس کی نوک اپنے سینے پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''اب اگر تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو میں یہ چھری اپنے جسم میں اتار لوں گی اور اس کے بعد تمہارے لیے مشکل ہو جائے گا کہ اس کمرے میں میری لاش کی موجودگی کا کوئی جواز پیش کر سکو۔''

اسے شاید میری جانب سے ایسے شدید ردِعمل کی توقع نہیں تھی وہ بری طرح گھبرا گیا اور بولا۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔ خدا کی قسم میری کوئی بری نیت نہیں تھی۔ میں تو صرف تمہاری مدد کرنا چاہ رہا تھا۔''

تعدیل

علم حدیث و فقہ کی ایک اصطلاح۔ جرح کے معنی ہیں تنقید کرنا، ثابت کرنا۔ علم حدیث کی اصطلاح میں اس کے معنی راویانِ حدیث کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کی تحقیق کرنا۔ فقہ کی اصطلاح میں اس کے معنی گواہوں کے قابلِ اعتبار یا ناقابلِ اعتبار ہونے کی چھان بین کرنا ہے۔ حدیث میں اس فن میں خدمات سرانجام دینے والوں میں حضرت ابن عباسؓ، انس بن مالکؓ، شعبی، ابن سیرین، الاعمش، شعبہ، امام مالک، ابن المبارک، ابن عیینہ، عبدالرحمن بن المہدی اور یحییٰ بن معین۔ امام احمد حنبل کے عہد میں جرح و تعدیل کا فن پورے کمال پر پہنچ چکا تھا۔ جب دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی کے دوران میں بہت سی احادیث گھڑی جانے لگیں تو راویوں کے حالات کی تحقیق و تفتیش کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ ان کے اوصاف کے بارے میں لکھا جانے لگا۔ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی میں تو اس فن پر کتابیں تصنیف کی جانے لگیں۔ ان تصانیف میں عام طور پر راویوں کے اسماء کی فہرست دی جاتی تھی اور ہر ایک کے نام اور تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کا ثقہ و غیر ثقہ ہونا بھی درج کیا جاتا تھا۔ سنن (مجموعہ احادیث) میں جن میں احکام کی احادیث ہیں راویوں کے حالات پر حواشی ملتے ہیں۔ جیسے کہ سنن دارمی وغیرہ میں ہے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمے میں راویوں کی ثقاہت کی چھان بین کو مستحسن اور درست قرار دیا ہے۔ کیوں کہ بہت سے لوگ راویانِ حدیث پر جرح کرنے کو مستحسن خیال نہیں کرتے تھے بعد میں جب علم حدیث پر مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں تو جرح و تعدیل اس علم کا ایک مستقل شعبہ قرار پایا۔

مرسلہ: نوشابہ عدیل۔ کراچی

"اب کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔" میں نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کہا۔ "سیدھی طرح دروازہ کھولو اور مجھے یہاں سے جانے دو ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔"

"پہلے وعدہ کرو کہ جو کچھ ہوا ہے، اس کا ذکر کسی سے نہیں کرو گی۔"

میں بے وقوف نہیں تھی کہ کسی سے یہ بات کہتی ویسے بھی کون یقین کرتا۔ گاؤں میں تو سب لوگ ہی اس پیر کے معتقد تھے لہٰذا میں نے سر ہلا کر ہاں کہہ دی۔ پیر نے دروازہ کھول دیا اور میں چھری کو چادر میں لپیٹ کر وہاں سے چلی آئی۔

اپنی عزت کے بچ جانے پر میں نے دو رکعت شکرانے کے نفل پڑھے اور ساس سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب میں اس پیر کے پاس نہیں جاؤں گی۔ وہ تو یہ سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئی اور اس نے مجھے بے نقط سنا ڈالیں۔ مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے جل کر کہا "اگر وہ اتنا ہی پہنچا ہوا پیر ہے تو کوئی تعویذ دے دے یا گھر پر پڑھنے کے لیے کوئی وظیفہ بتا دے۔ مجھے تنہائی میں کیوں بلاتا ہے۔"

ساس میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو وہ میرا اشارہ سمجھ جاتی لیکن وہ تو پیر کے خلاف کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھی۔ شام کو امجد گھر واپس آیا تو اس کے بھی خوب کان بھرے گئے۔ وہ پیر پٹختا ہوا کمرے میں آیا اور درشت لہجے میں بولا۔ "تم نے پیر صاحب کے پاس جانے سے کیوں انکار کر دیا؟"

"ظاہر ہے کہ کوئی نہ کوئی وجہ تو ہو گی جو میں وہاں نہیں جانا چاہ رہی۔"

"میں وہ وجہ جاننا چاہتا ہوں۔"

اب میرے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اسے اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دوں ورنہ میری ساس کو اسے میرے خلاف بھڑکانے کا ایک اور موقع مل جائے گا۔ میں نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ یہ بات سن کر نہ تو مشتعل ہو گا اور نہ ہی کسی سے اس کا ذکر کرے گا۔ اس کے بعد میں نے اسے ان دو دنوں میں ہونے والے واقعات کی تفصیل بتا دی۔ میری بات سن کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی حالت پر قابو پا لیا اور بولا۔

"جی تو چاہتا ہے کہ اس پیر کے ٹکڑے کر دوں لیکن تم سے وعدہ کر چکا ہوں، اس لیے ضبط کرنا ہی ہو گا۔ اب کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم اولاد کے بغیر ہی ٹھیک ہیں۔"

"لیکن مجھے بچہ چاہیے۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"پھر میں کیا کروں، جس طرح میں نے صبر کر لیا ہے، تم بھی کر لو۔"

"میری بات مان لو امجد۔ ایک بار اپنا چیک اپ کروا لو۔"

"پھر تم نے وہی بکواس شروع کر دی۔" یہ کہہ کر وہ غصے کے عالم میں کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں بھی ہمت ہارنے والی نہیں تھی۔ اٹھتے بیٹھتے اسے رام کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ کہتے ہیں کہ اگر پتھر پر بھی مسلسل پانی پڑتا رہے تو اس میں دراڑ پڑ جاتی ہے وہ تو پھر گوشت پوست کا انسان تھا۔ میں نے تریا چلتر کے ذریعے اسے قابو کیا اور ایک سہانی صبح ہم لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔

ٹیسٹ کی رپورٹ دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے واضح طور پر کہہ دیا کہ امجد باپ بننے کی صلاحیت سے محروم ہے اور اس مرض کا کوئی علاج ممکن نہیں۔ ہماری رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی اور ہم دونوں منہ لٹکائے گھر واپس آ گئے۔ راستے میں امجد نے خاص طور پر مجھ سے التجا کی کہ میں اس بات کا ذکر کسی سے نہ کروں۔ وہ میرا شوہر تھا مجھ سے محبت کرتا تھا لہٰذا اس کی مردانگی کا بھرم رکھنا میرا فرض تھا چنانچہ میں نے بچہ پیدا نہ ہونے کا سارا الزام اپنے سر لے لیا اور دن رات ساس نندوں کے طعنے برداشت کرنے لگی۔

اب میری ساس کھل کر میری مخالفت پر اتر آئی تھی۔ اس نے پورے گاؤں میں یہ بات مشہور کر دی کہ وہ امجد کی دوسری شادی کر رہی ہے۔ خالد کی ماں اس معاملے میں اس کا پورا ساتھ دے رہی تھی اور وہ دونوں مل کر امجد کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اپنی حقیقت جان لینے کے بعد امجد کبھی بھی دوسری شادی پر تیار نہیں ہو گا پھر ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ رضیہ نامی کسی لڑکی کے ساتھ امجد کا رشتہ طے ہو رہا ہے۔ یہ سن کر مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے امجد سے پوچھا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم کبھی باپ نہیں بن سکتے۔ دوسری شادی کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے؟"

"میں مجبور ہوں۔ ماں کے فیصلے کے خلاف نہیں بول سکتا۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے دوسری شادی نہ کی تو وہ مجھے دودھ نہیں بخشے گی اور زہر کھا کر مر جائے گی۔"

''تم نے پہلے میری زندگی برباد کی اور اب ایک اور لڑکی کو محرومی کی آگ میں جلانا چاہتے ہو، اس کا تمہیں کوئی خیال نہیں۔''

''جو قسمت میں لکھا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ بہر حال میں اپنی ماں کی حکم عدولی نہیں کر سکتا۔''

''لیکن میں تمہیں دوسری شادی کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

''تم سے اجازت مانگ کون رہا ہے۔'' وہ بے رخی سے بولا۔ ''اگر تم نے خوشی سے اجازت نہیں دی تو پہلے تمہیں طلاق دوں گا پھر دوسری شادی کرلوں گا۔''

یہ اس شخص کے الفاظ تھے جو صبح وشام میری محبت کا دم بھرتا تھا۔ جس نے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ وہ اتنی جلدی بدل سکتا ہے۔ اس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ میں نے اسی وقت اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا اور دوسرے دن علی الصبح میکے کے لیے روانہ ہوگئی۔ امجد سمیت سسرال کے کسی فرد نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ ساس نے اتنا ضرور کہا ''تم اپنی ذمے داری پر جارہی ہو۔ بعد میں ہمیں قصوروار نہ ٹھہرانا۔ میں تو چاہتی تھی کہ تم اسی گھر میں رہو۔ امجد کی دوسری شادی ہو بھی گئی تو کیا ہوا۔ تم تو ہمیشہ اس کی زندگی میں شامل رہوگی۔''

میں نے اس عورت کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور گھر آکر امی کو سارا ماجرا بیان کر دیا۔ جب باپ اور بھائیوں کو معلوم ہوا تو وہ بھی طیش میں آگئے۔ ممکن تھا کہ وہ کوئی سخت قدم اٹھاتے لیکن امی نے سمجھا بجھا کر انہیں ٹھنڈا کر دیا۔ ویسے بھی امجد کی حقیقت جان لینے کے بعد اس کے ساتھ رہنا بے کار ہی تھا۔ اسی نکتہ کو ذہن میں رکھ کر بابا اور بھائیوں نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ اس واقعہ کے پندرہ دن بعد مجھے امجد کی طرف سے تحریری طلاق نامہ مل گیا گو کہ عام حالات میں کسی عورت کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ ہوتا ہے لیکن میں جس عذاب سے گزر رہی تھی اسے دیکھتے ہوئے میں نے اسے اپنے لیے باعث نجات سمجھا اور صبر شکر کر کے آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگی۔

طلاق ملنے کے دو ہفتے بعد ہی مجھے اطلاع ملی کہ رضیہ اور امجد کی شادی ہوگئی ہے۔ میں عدت میں تھی ورنہ ایک بار رضیہ سے مل کر اسے اس شادی سے باز رکھنے کی کوشش ضرور کرتی۔ ٹھیک ہے۔ میں نے امجد سے وعدہ کیا تھا کہ اس کا راز کسی پر ظاہر نہ کروں گی لیکن جب وہ میرا نہ رہا تو میں بھی ہر وعدے سے آزاد ہوگئی تھی رضیہ اور امجد کی شادی کو چند ہی روز گزرے ہوں گے کہ خالد نے زرینہ کے ہاتھ پیغام بھجوا دیا کہ وہ اب بھی مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔ میں نے زرینہ کو بری طرح جھڑک دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اب اگر خالد نے دوبارہ ایسی بات منہ سے نکالی تو بابا اور بھائیوں سے کہہ کر اتنے جوتے لگواؤں گی کہ اس کا گاؤں میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔

امجد اور رضیہ کی شادی کو تو میں نہ روک سکی لیکن رضیہ کو اس نام نہاد پیر کے شر سے بچانا بہت ضروری تھا۔ کیونکہ امجد تو کچھ کرنے کے قابل تھا ہی نہیں۔ اس لیے اس کی ماں رضیہ کو بھی اس جعلی پیر کے پاس لے جاتی اور عین ممکن تھا کہ رضیہ اپنا گھر بچانے کی خاطر عزت کی قربانی دینے پر مجبور ہو جاتی کیونکہ اس کے سامنے میرا انجام تھا۔ نہ جانے وہ منحوس اور جعلی پیر گاؤں کی کتنی عورتوں کو اولاد دینے کے بہانے اپنی ہوس کا نشانہ بنا چکا ہوگا اور اگر اسے روکا نہ گیا تو آئندہ بھی وہ یہ گھناؤنا کھیل جاری رکھے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس پیر کا کیا علاج کیا جائے۔ میرے ساتھ اس نے جو کچھ کیا تھا۔ وہ کسی کو نہیں بتا سکتی تھی اور نہ ہی کوئی میری بات پر اعتبار کرتا۔ مجبوراً میں نے قانون کی مدد لینے کا فیصلہ کیا۔

ہمارے گاؤں میں تھانا نہیں تھا۔ البتہ ایک پولیس چوکی تھی جہاں دو سپاہی دن بھر بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے تھے۔ میں نے زرینہ کے گھر جانے کا بہانہ بنایا اور سیدھی پولیس چوکی پہنچ گئی جو ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر تھی۔ اس وقت وہاں ایک ہی کانسٹیبل بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کیونکہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گاؤں کی کوئی عورت پولیس چوکی تک بھی آسکتی ہے۔ اس نے ایک بار پھر پلکیں جھپکائیں اور بولا ''بی بی۔ کیا بات ہے تم یہاں کیوں آئی ہو؟''

''مجھے کسی کے خلاف پرچا کٹوانا ہے۔''

''تمہارے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے جو تم تنہا پرچا کٹوانے چلی آئی ہو۔''

''رب میرے باپ اور بھائیوں کو سلامت رکھے لیکن یہ ایسی بات ہے جو میں انہیں نہیں بتا سکتی اسی لیے قانون کی مدد لینے آئی ہوں۔''

''اچھا اچھا۔ سمجھ گیا۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''خیر بتاؤ کس کے خلاف پرچا کٹوانا ہے؟''

"اس جعلی پیر کے خلاف جو گاؤں کے باہر بیٹھا عورتوں کو ورغلاتا اور ان کی عزت سے کھیلتا ہے۔"

"توبہ توبہ۔ خدا کا خوف کرو بی بی۔" وہ اپنے گالوں پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "پیر صاحب تو بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ ان کے عمل سے نہ جانے کتنی عورتوں کی گود ہری ہو چکی ہے اور تم ان کے بارے میں ایسی بات کہہ رہی ہو۔ ضرور تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"غلط فہمی کیسی۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں کھل کر بات کروں تو سنو۔ اس نے میری عزت سے بھی کھیلنے کی کوشش کی تھی۔ بہرحال میں کسی نہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔"

اگر واقعی تمہارے ساتھ ایسا کچھ ہوا ہے تو خدا کا شکر ادا کرو اور اس بات کو یہیں ختم کر دو۔ ویسے گاؤں میں کوئی بھی تمہاری بات کا یقین نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود اگر تم بضد ہو تو اپنا شوق پورا کرلو۔ پرچا کٹوانے کے لیے تمہیں بنفس نفیس تھانے جانا ہوگا۔ ہم لوگ تو یہاں صرف چوکیداری کے لیے بیٹھے ہیں۔

میں مایوسی کے عالم میں واپس آگئی۔ تھانے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور گمنام بن کر ایک خط تھانے دار کے نام لکھ دیا جس میں پیر صاحب کے تمام کرتوت تفصیل سے بیان کیے گئے تھے اور تھانے دار سے استدعا کی تھی کہ اگر وہ پیر کی خفیہ نگرانی کرے تو چند روز میں ہی اسے میری سچائی کا ثبوت مل جائے گا۔ میرا خیال تھا کہ تھانے دار ضرور کوئی کارروائی کرے گا لیکن اس نے میرے خط پر کوئی ایکشن نہیں لیا شاید وہ بھی پیر کے خلاف کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے بھی صبر کا گھونٹ پینا پڑ گیا۔

امجد سے علیحدہ ہونے کے چھ ماہ بعد میرا رشتہ فرید بھائی کے دوست سے طے پا گیا جو ہمارے ہی گاؤں کا رہنے والا تھا لیکن لاہور میں جاب کر رہا تھا۔ اس کی پہلی بیوی شادی کے ایک سال بعد ہی چل بسی تھی اور اس کے گھر والوں کو میرے حالات کا بخوبی علم تھا۔ اس لیے انہوں نے بڑی سادگی سے شادی کی اور میں بیاہ کر لاہور آگئی۔ شادی کے ایک سال بعد ہی اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک چاند سا بیٹا دیا اور اس کے بعد میرے یہاں دو بچے اور پیدا ہوئے۔ جبکہ امجد شادی کے دو سال بعد بھی اولاد سے محروم تھا۔

تیسرے بچے کی پیدائش کے بعد جب گاؤں آئی تو معلوم ہوا کہ رضیہ بھی امید سے ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور سمجھ گئی کہ وہ بے چاری ساس نندوں کے جبر کا مقابلہ نہ کرسکی اور اس نے سہاگ بچانے کی خاطر اپنی عزت کی قربانی دے دی۔ کچھ دنوں بعد اس کے یہاں بھی لڑکا پیدا ہوا تو اس کی ساس نے خوشی کے شادیانے بجائے اور پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹی۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتی پھر رہی تھی اگر مجھ میری بات مان لیتی تو پیر صاحب کے عمل سے وہ بھی ماں بن جاتی اور اس کا گھر اجڑنے سے بچ جاتا۔ اصل حقیقت تو میں جانتی تھی۔ اس لیے مجھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں اپنے گھر میں خوش اور آباد تھی۔ اس سے زیادہ مجھے اور کیا چاہیے تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ میرے بچے بڑے ہو رہے تھے۔ اس لیے میکے جانے کا موقع ذرا کم ہی ملتا تھا۔ پھر خاندان میں ایک شادی ہوئی تو میں ہفتہ بھر کے لیے گاؤں گئی۔ اس شادی میں میرا سامنا امجد سے ہوگیا۔ میں اس سے کترانا چاہ رہی تھی لیکن پچویشن ایسی بن گئی کہ کوشش کے باوجود اس سے دور نہ جاسکی۔ اس نے حسرت بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور میں سمجھ گئی کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے خوش نہیں ہے اس نے آہستہ سے کہا۔ "کیسی ہو مجو؟"

"مالک کا کرم ہے۔ بہت خوش ہوں۔ تم اپنی سناؤ۔"

اس کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ کھسیانا سا ہو کر بولا۔ "بس گزر رہی ہے۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "میں نے تمہیں اس پیر کی اصلیت سے آگاہ کردیا تھا۔ اس کے باوجود تم نے رضیہ کو اس کے پاس بھیج دیا۔"

لمحہ بھر کے لیے اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی پھر اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پالیا اور بولا۔

"جب تمہارے یہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو لوگوں کی نظریں میری جانب اٹھنے لگیں۔ اس لیے جب ماں رضیہ کو لے کر پیر کے پاس گئی تو میں نے جانتے بوجھتے خاموشی اختیار کرلی۔ مجھے اپنی کمزوری کا علم تھا اور بچہ نہ ہونے کی صورت میں سب مجھ کو ہی قصوروار ٹھہراتے لہٰذا مجھے اپنی مردانگی کا بھرم رکھنے کے لیے یہ کڑوا گھونٹ نگلنا پڑا۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں باپ بننے کے قابل نہیں ہوں۔"

میں مسکرا کر رہ گئی کہ بے چارے کو کڑوا گھونٹ پینا پڑ رہا ہے۔

میں نے جیل میں اپنی ملازمت کے دوران عجیب عجیب کردار دیکھے ہیں۔

نہ جانے کیوں مجھے مجرموں سے ہمدردی رہی ہے۔ میرے خیال کے مطابق مجرم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں وقت اور حالات مجرم بنا دیتے ہیں اور دوسرے وہ جن کی فطرت ہی مجرمانہ ہوتی ہے۔

مجھے ان سے کبھی ہمدردی نہیں رہی جن کی فطرت مجرمانہ ہے۔ ایسے مجرم کبھی سدھر نہیں سکتے۔ کیوں کہ ان کا

دوسری موت

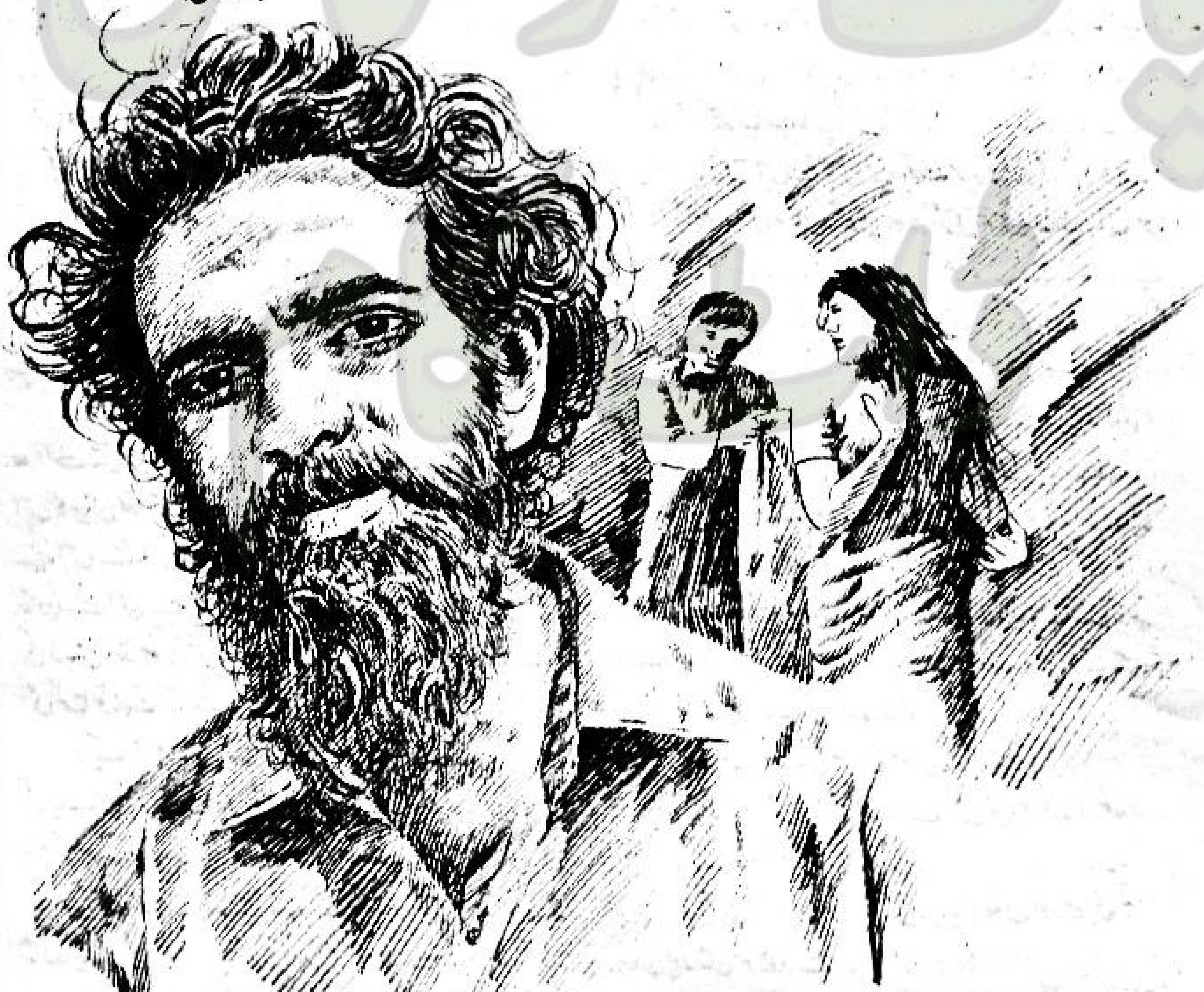
جناب ایڈیٹر سرگزشت

سلام مسنون

میں ایک ریٹائرڈ جیلر ہوں۔ جیل میں ہزارہا قیدیوں سے شناسائی رہی۔ ہر قیدی کی اپنی کہانی ہوتی ہے۔ ان دنوں میرا شوق تھا کہ میں قیدیوں سے ان کی روداد سنا کرتا۔ ایسی سینکڑوں کہانیاں مجھے اب بھی یاد ہیں۔ اگر آپ نے موقع دیا اور عمر نے اجازت دی تو سال میں چھ آٹھ کہانیاں تو بیان کر ہی دوں گا۔ یہ روداد مجھے سب سے زیادہ پسند آئی تھی۔ اس لیے میں نے پہلے بھیجی۔

امتیاز احمد

(ملتان)



نیچر ہی خراب ہوتا ہے لیکن جو وقت اور حالات کے تحت مجرم بنتے ہیں وہ ہمدردی کے قابل ہوتے ہیں۔

رشید بھی ایسا ہی ایک مجرم تھا۔ اس نے دو دو قتل کیے تھے۔ اس جرم میں اسے موت کی سزا ہوئی تھی۔ لیکن اس کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

عمر قید بھی ایک طرح کی موت ہی ہوتی ہے۔ جیل کی سختیاں اور اس کے شب و روز برداشت کر لینے کے بعد کوئی اس قابل نہیں رہتا کہ اس کا شمار زندوں میں کیا جائے۔ وہ چلتی پھرتی لاش بن کر رہ جاتا ہے۔

رشید شروع سے میری دلچسپی کا مرکز رہا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادہ مہذب انسان دکھائی دیتا۔ جیل کے عملے کو بھی اس سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ وہ پڑھا لکھا تھا اور نہ جانے کیوں خونی ہو گیا تھا۔

اس کی بظاہر کہانی یہ تھی کہ اس نے امتیاز خان کے دو بیٹوں کو قتل کر دیا تھا اور خود اپنی گرفتاری دے دی تھی۔

بیٹوں کے قتل کے بعد امتیاز خان صدمے سے مفلوج ہو گیا تھا۔ اس کے جسم کے دائیں حصے پر فالج نے اٹیک کیا اور بستر کا ہو کر رہ گیا۔

امتیاز خان ایک بااثر آدمی تھا۔ بہت سی زمینیں، شوگر کی ایک فیکٹری، نہ جانے کتنے مکانات جو کرائے پر دیے گئے تھے۔ غرض یہ کہ اس کے پاس اچھی خاصی دولت تھی اور اس دولت نے اسے بے پناہ مغرور، خودسر اور بے رحم بنا دیا تھا۔

اس کے دو جوان بیٹے تھے جو رشید کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔

رشید نے اپنے جرم کا اقرار تو کر لیا تھا لیکن اس نے عدالت میں بھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ اس نے یہ قتل کیوں کیے۔ اس کا بیان تھا کہ امتیاز خان سے اس کی ذاتی دشمنی تھی۔ اس لیے اس نے اس کے دونوں بیٹوں کا خون کیا ہے۔ امتیاز خان سے اس لیے پوچھنا مشکل تھا کہ فالج کی وجہ سے اس کی زبان بند ہو گئی تھی۔ وہ بول نہیں پاتا تھا۔ اگر اشارے بھی کرتا تو بہت مبہم، جو سمجھ میں نہیں آتے تھے۔

ایک شام میں نے رشید کو اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔ میں اس وقت اس جیل میں جیلر ہوا کرتا تھا۔ رشید سر جھکا کر میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھ جاؤ رشید۔'' میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ میرا شکریہ ادا کرتا ہوا بیٹھ گیا۔ ''جی سر، حکم۔'' اس نے پوچھا۔

''رشید میں یہ چاہتا ہوں کہ تم قیدیوں کو تعلیم دو۔'' میں نے کہا۔

''تعلیم دوں؟'' اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''یہ تو اچھی بات ہو گی سر۔''

''ہاں! بے کار بیٹھے رہتے ہیں، کچھ سیکھ ہی جائیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''تم ایک پڑھے لکھے انسان ہو۔ اس لیے تمہارے لیے کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔''

''پرابلم کیسی سر، یہ تو میرا شوق بھی ہے۔'' اس نے بتایا۔

اور پہلی دفعہ اس نے اپنے بارے میں یہ بتایا تھا کہ پڑھانا اس کا شوق رہا ہے۔ ورنہ وہ اپنے بارے میں کچھ بتاتا ہی نہیں تھا۔

''کیا تم نے کبھی کسی کو پڑھایا ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یس سر، یہ میری ہابی رہی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کہاں کیا کسی اسکول میں جاب کی تھی۔'' میں نے پوچھا۔

''سمجھ گیا سر، آپ شاید اس طرح میرے بارے میں جان لینا چاہتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''تم واقعی ذہین آدمی ہو۔'' میں ہنس پڑا۔ ''ایسا ہی سمجھ لو۔ مجھے تمہارے کردار سے دلچسپی رہی ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتا دو۔''

''سوچنا پڑے گا سر۔'' اس نے کہا۔

''اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے۔ انسان کو اپنے دل پر بوجھ نہیں رکھنا چاہیے۔ اسے بتا دینا چاہیے۔ کسی کو بھی۔ میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ اس لیے تم سے پوچھ رہا ہوں۔''

وہ سوچتا رہا، بہت دیر تک کشمکش میں تھا۔ بتائے یا نہ بتائے۔ پھر اس نے گردن اٹھائی۔ ''ٹھیک ہے سر۔ میں آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا لیکن اس سے پہلے یہ راز بتا دوں کہ میں مر چکا ہوں۔''

''کیا؟'' میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟''

''سچ کہہ رہا ہوں سر، میں مر چکا ہوں اور میری قبر دیپال پور میں موجود ہے۔''

''وہی دیپال پور نا جہاں کے امتیاز خان۔''

''ہاں وہی دیبال پور۔'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''وہاں میری قبر موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ابھی بھی کچھ لوگ میری قبر پر جاتے ہوں، لیکن اس کی امید نہیں ہے۔ جب لوگ زندگی میں نہیں پوچھتے تھے تو مرنے کے بعد کون پوچھتا ہے۔''

''رشید! تم مجھے الجھا رہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''بہتر یہی ہے کہ سب کچھ بتاتے جاؤ۔ پھر میری الجھن دور ہو گی۔''

''سر میں آپ کو اپنی کہانی سنا رہا ہوں۔ حالانکہ میں نے قسم کھا رکھی تھی کہ اپنی زبان بند رکھوں گا لیکن اب مجھے کسی کا خوف نہیں ہے۔ میں جن کے لیے اپنی زبان بند رکھتا تھا وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔''

''میں نہیں سمجھا رشید۔''

''میں اپنے والدین کی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''پچھلے ہی ہفتے دونوں کی موت ہو گئی ہے۔''

''اوہ۔'' میں نے افسوس کا اظہار کیا۔ ''لیکن تمہیں کیسے پتا چلا۔''

''آپ کو یاد ہوگا کہ ایک دن میں بہت اداس تھا۔ دن بھر اپنی کوٹھری میں بیٹھا روتا رہا تھا۔ آپ اُدھر سے گزرے تو آپ نے پوچھا بھی تھا۔''

''ہاں یاد آگیا۔ کیوں کہ تم تو قیدیوں میں گھل مل جانے والے ہو۔ سب کی خیریت دریافت کرتے ہو۔ دکھ سکھ میں شریک ہونے کی کوشش کرتے ہو۔ اس لیے تمہیں خاموش دیکھ کر میں نے پوچھ لیا تھا۔''

''سر آپ کو یاد ہوگا۔ اس دن ایک ملاقاتی میرے پاس آیا تھا۔''

''ہاں۔'' میں نے تائید کی۔ ''مجھے بھی اس بات پر حیرت ہوئی تھی۔ کیوں کہ پہلی بار تمہاری ملاقات آئی تھی۔''

''وہ میرا دوست ہے سر۔ دیبال پور کا رہنے والا۔ میرے لیے وہی یہ خبر لے کر آیا تھا۔''

رشید کی یہ کہانی اسی نشست میں مکمل نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ کئی دنوں تک بتاتا رہا تھا۔ مجھے جب موقع ملتا میں اسے اپنے روم میں بلا لیا کرتا اور وہ اپنی کہانی کو وہیں سے شروع کرتا جہاں سے اس نے چھوڑا۔

☆☆☆

میں نے دیبال پور میں جنم لیا۔

یہ ایک چھوٹا سا خوب صورت گاؤں ہے جس کے ساتھ راوی بہتا اور کئی داستانیں بیان کرتا ہے۔ ہر شخص کو وہ جگہ اچھی لگتی ہے جہاں اس نے جنم لیا ہو۔ مٹی سے انسان کا رشتہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن دیبال تو واقعی خوب صورت مقام ہے۔ ایک طرف دریا اور دوسری طرف بہت فاصلے پر نظر آنے والے سرسبز پہاڑ اور خود گاؤں کے چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی۔

یہ ہریالی ان کسانوں کی سب شب و روز محنتوں کا نتیجہ تھی جنھوں نے اس گاؤں کو اتنا پُرسکون اور خوب صورت بنا دیا تھا۔

دیبال پور میں لڑکیوں اور لڑکوں کا... ایک اسکول ہے۔ دو ڈاکٹرز بھی ہوا کرتے تھے۔ ایک ایسا بازار بھی ہے جہاں ضرورت کی چیزیں مل جایا کرتی ہیں۔

معاف کیجیے گا میں دیبال پور کی تمہید کچھ زیادہ باندھ رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ اس ماحول سے واقف ہو جائیں۔ جس ماحول نے میری اس کہانی کو تخلیق کیا ہے۔

اس خوب صورت اور پُرسکون گاؤں پر ایک آسیب کا سایہ منڈلایا کرتا تھا اور وہ آسیب تھا امتیاز خان۔ گاؤں کا سب سے طاقت ور اور دولت مند انسان۔

وہ دیکھنے میں تو دبلا پتلا چرخ سا انسان تھا۔ لیکن اصل طاقت اس کی دولت میں تھی جس کی مدد سے وہ پورے گاؤں کو اپنے قبضے میں رکھتا۔

اس کی بدمعاشیوں میں اس کے دونوں بیٹے بھی اس کا ساتھ دیا کرتے۔ وہ پورے گاؤں میں مست سانڈوں کی طرح گھومتے رہتے۔ کسی کی عزت ان سے محفوظ نہ تھی۔ نہ جانے کتنی عورتوں اور لڑکیوں کو ان تینوں نے مل کر پامال کیا ہوگا۔

انتہا یہ تھی کہ تینوں باپ بیٹے ایک ساتھ بیٹھ کر شراب نوشی کیا کرتے تھے۔ اب اس سے زیادہ میں کیا بتاؤں کہ وہ کیسے تھے۔

بہرحال گاؤں میں میری شہرت بہت اچھی تھی۔ کیوں کہ میں ایک پڑھا لکھا اور مہذب نوجوان تھا۔ میں نے شہر جا کر تعلیم حاصل کی تھی۔ میں نے ایک اچھی سی ملازمت بھی کر لی تھی۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ میں گاؤں سے اپنے ماں باپ کو بھی شہر لے آؤں۔ تاکہ وہ بے چارے گاؤں کی گھٹن سے نجات حاصل کر سکیں۔

میں اسی لیے دیبال پور گیا تھا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میرا یہ سفر کتنا بھیانک ثابت ہوگا لیکن انسان کو آنے

والے وقت کی خبر ہی کہاں ہوتی ہے۔

وہ تو آنکھیں بند کر کے روز مرہ کی زندگی جیتا رہتا ہے۔ اس کے شب و روز یہاں ہوتے ہیں جب کہ وہ اس بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ اگلا موڑ کیا ہے اور کیسی آفتیں چھپی ہوئی ہیں۔

دیپال پور کا کوئی ریلوے اسٹیشن نہیں ہے۔ مرزا نگر اتر کر تانگے یا لاری سے جانا پڑتا ہے۔ چھوٹا سا اسٹیشن ہے۔ اترنے والے گنتی کے کچھ مسافر ہوتے ہیں۔

شام کا وقت تھا۔ جب میں اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس لیے مرزا نگر کے اسٹیشن پر اتر گیا۔ میرے ساتھ اترنے والی ایک لڑکی بھی تھی۔

اس کی خوب صورتی کا اندازہ اس کی چال ڈھال اور آواز سے ہو گیا تھا۔ اس نے گرچہ خود کو چادر میں لپیٹ رکھا تھا لیکن اس کی جسامت بتا رہی تھی کہ وہ جوان ہے۔

اسٹیشن سے باہر صرف ایک ہی تانگہ کھڑا ہوا تھا تانگہ بھی دیپال پور ہی کا تھا۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ وہ چھوٹا سا علاقہ ہے۔ اس لیے لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

تانگے والے نے مجھے دیکھتے ہی آواز لگائی۔ ”آؤ رشید بابو آؤ۔“

میں نے تانگے والے کو سلام کیا اور اچک کر تانگے میں بیٹھ گیا۔ اس دوران وہ لڑکی بھی تانگے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ ”کاکا! مجھے موتی نگر جانا ہے۔“ اس نے بتایا۔

واضح ہو کہ موتی نگر بالکل مخالف سمت میں تھا۔

”لیکن تانگہ تو دیپال پور جا رہا ہے۔“ تانگے والے نے کہا۔

”تو کیا ہوا۔ موتی نگر سے دیپال پور چلے جانا۔ تمہارے گھوڑے کے پاؤں تو نہیں تھک جائیں گے۔“ لڑکی نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے چہرے سے چادر ہٹا دی تھی۔

بس ایک چاند سا نکل آیا تھا۔

تانگے والا پس و پیش کر رہا تھا لیکن میں نے اس لڑکی کی حمایت کر دی۔ ”لے چلو چاچا، بے چاری یہاں سے کہاں جائے گی۔ ویسے بھی شام ہوتی جا رہی ہے۔“

”چلو بیٹھ جاؤ۔“ تانگے والے نے بات مان لی۔

لڑکی فوراً پچھلی طرف بیٹھ گئی۔ میری خواہش تھی کہ وہ مجھ سے باتیں کرتی ہوئی چلے۔ کبھی کبھی ایسا دل چاہنے لگتا ہے کہ آپ اس سے بھی بے تکلف ہونے کی خواہش کرنے لگتے ہیں جس کو جانتے بھی نہیں ہیں۔

مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ وہ لڑکی اکیلی کیوں سفر کر رہی تھی۔ ان علاقوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ گھر کا کوئی نہ کوئی فرد ضرور ساتھ ہوتا ہے۔

بہرحال میرا اس سے کیا تعلق تھا۔

کچھ دیر سفر کے بعد اس لڑکی نے خود ہی بولنا شروع کر دیا۔ ”میں تو صبح کی ٹرین سے آنے والی تھی، لیکن وہ ٹرین چھوٹ گئی۔ اس لیے شام کو پہنچی ہوں۔ اچھا ہوا سواری مل گئی۔ ورنہ پیدل ہی جانا پڑتا۔“

”کیا تم موتی نگر میں رہتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لاہور میں پڑھتی ہوں۔ وہاں میری رہائش ہوسٹل میں ہے۔“

اب میں اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہونے لگا تھا۔ ”کیا پڑھ رہی ہو؟“

”اردو ادب۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے شروع ہی سے دلچسپی تھی۔ میں نے سوچا چلو اس میں ماسٹر کر لوں۔“

”حیرت ہے، ان علاقوں کی رہنے والی ایک لڑکی کو اردو ادب سے دلچسپی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ میرے ابو بھی تو اس علاقے کے رہنے والے ہیں اور بہت اچھے شاعر ہیں۔“

”واہ کیا نام ہے تمہارے ابو کا۔“

”سلمان راہی۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ۔“ میں اب پوری طرح متوجہ ہو گیا تھا۔ ”تم راہی صاحب کی بیٹی ہو۔ وہ تو گورنمنٹ کالج میں میرے استاد ہوا کرتے تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔“

”چلیں۔ یہ تو اچھی بات ہوئی کہ آپ ابو کو جانتے ہیں۔“ وہ خوش ہو گئی تھی۔

”تو راہی صاحب آج کل کہاں ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”موتی نگر میں۔“ اس نے بتایا۔ ”ہمارا اپنا آبائی مکان ہے۔ ابو کی عادت ہے کہ سال میں کچھ دنوں کے لیے یہاں ضرور آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنی مٹی سے ملاقات کرنے کے بعد انسان ری چارج ہو جاتا ہے۔ اس میں توانائی آ جاتی ہے۔“

”موتی نگر والے مکان میں کون رہتا ہے۔“ میں

نے پوچھا۔

"کوئی نہیں، خالی پڑا رہتا ہے۔" اس نے بتایا۔

اب یہ کوئی شہر تو ہے نہیں کہ کسی کے خالی مکان یا زمین پر کوئی اور قبضہ کر لے، ابو اور امی سال میں ایک دو مہینوں کے لیے آجاتے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ آجاتی ہوں لیکن مجھے ایک کام سے لاہور میں رکنا پڑ گیا تھا۔

اس نے میرے بارے میں دریافت کیا۔ میں اسے اپنے بارے میں بتاتا رہا۔ تانگے کے اس سفر نے ہم دونوں کو ذہنی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا تھا۔

موتی نگر پہنچ کر اس نے مجھے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ میں انکار نہیں کر سکا۔ ایک تو پروفیسر صاحب سے ملاقات کی خواہش تھی پھر اس لڑکی کی وجہ سے بھی میں کمزور پڑ گیا تھا جس کا نام نازلی تھا۔

پروفیسر صاحب مجھے نازلی کے ساتھ دیکھ کر بہت حیران اور خوش ہوئے تھے۔ ہم نے کھانا وہیں کھایا۔ اس دوران تانگے والا چاچا بھی وہیں موجود رہا تھا۔

بہرحال غیر ضروری باتوں سے الگ۔ مختصر یہ کہ میں اور نازلی بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔

وہ ایک ذہین، بزلہ سنج اور معاملہ فہم لڑکی تھی۔

پروفیسر صاحب کو بھی ہماری ان ملاقاتوں پر اعتراض نہیں ہوا تھا۔ ایک تو وہ مجھے اچھی طرح جانتے تھے اور دوسری بات یہ تھی کہ وہ شاید اپنے مقدر میں ہم دونوں کو ایک ہوتا دیکھ رہے تھے۔

یہی تو ہم سب کی خواہش تھی۔ یعنی میرے ماں باپ کو بھی نازلی بہت اچھی لگی تھی۔ سب کچھ انتہائی ٹھیک جا رہا تھا کہ اچانک وہ سب ہو گیا۔

تقدیر کی مہربانیاں زیادہ دنوں تک ساتھ نہیں رہتیں۔

ایک دن نہ جانے کس طرح امتیاز خان کے ایک بیٹے نے نازلی کو دیکھ لیا۔ وہ ہمارے گاؤں میں اپنی ایک خالہ کے یہاں آئی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بلانے کے لیے کسی کو ہمارے گھر بھیجا تھا لیکن میں اس وقت کہیں گیا ہوا تھا۔

وہ اپنی خالہ کے گھر سے نکل کر ہمارے گھر کی طرف میری والدہ سے ملنے آرہی تھی کہ امتیاز خان کے ایک بیٹے نے اسے دیکھ لیا۔

وہ اس وقت اپنی جیپ میں گزر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دو آدمی بھی تھے۔ جیپ وہ خود ہی چلا رہا تھا اس کی جیپ پہلے تو آگے گئی پھر ریورس ہو کر نازلی کے پاس آکر رک گئی۔

اس نے بھرپور نگاہوں سے نازلی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوہو آج تو میرے گاؤں میں چاند نکل آیا ہے۔"

نازلی برا سامنہ بنا کر آگے چلتی رہی۔

وہ بے حد خوف زدہ ہو گئی تھی لیکن اس نے اپنے خوف کا اظہار نہیں کیا۔

"کیا نام ہے لڑکی۔" اس نے پوچھا۔

"تم سے مطلب۔" نازلی نے غصے سے جواب دیا اور ایک گلی میں مڑ گئی۔

امتیاز خان کا بیٹا تلملا کر رہ گیا۔ کس میں اتنی ہمت ہو سکتی تھی کہ اسے اس طرح نظر انداز کرے۔ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے آدمیوں سے نازلی کے بارے میں دریافت کیا۔

ان میں سے ایک جانتا تھا کہ نازلی کون ہے۔ اس نے بتا دیا کہ وہ برابر کے گاؤں میں رہنے والے ایک پروفیسر کی بیٹی ہے۔

خیر تو دوسرے دن ہی اس کا رشتہ نازلی کے لیے آگیا۔ اس نے اپنے باپ سے نہ جانے کیا الٹی سیدھی بات کی ہو گی۔ بہرحال پروفیسر صاحب نے بڑی نرمی سے انکار کر دیا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ وہ کس مزاج کے لوگ ہیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کی بیٹی کس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

امتیاز خان اور اس کے دونوں بیٹوں کو تو آگ ہی لگ گئی تھی۔ وہ یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ ان کی طرف سے رشتہ آئے اور انکار کر دیا جائے۔

انہوں نے پروفیسر صاحب کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ جب مجھے پتا چلا تو میں پروفیسر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بے چارے بہت گھبرائے ہوئے تھے۔

میں نے انہیں دلاسہ دیا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہاں جنگل کا قانون نہیں ہے۔"

"یہی ہماری تو بدقسمتی ہے بیٹا کہ یہاں جنگل کا قانون ہے۔" پروفیسر صاحب نے کہا۔ "وہ وحشی اور خون خوار قسم کے لوگ ہیں۔ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"تو پھر آپ ہی مشورہ دیں کہ ہم کیا کریں۔"

"اب اس کا ایک ہی حل ہے کہ فوری طور پر تم دونوں کی شادی ہو جائے۔" پروفیسر صاحب نے کہا۔ "جتنی جلدی ہو اگر ممکن ہو تو کل ہی۔"

"مجھے کیا اعتراض ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں تیاری کیا کرنی ہے۔ آپ بندوبست کریں۔ میں کل اپنے گھر والوں کو لے کر آجاتا ہوں۔"

بہت ہی ہنگامی طور پر دیپال پور کی ایک مسجد میں نکاح کا انتظام کر دیا گیا۔ دوسرے دن ہم سب اس مسجد میں جمع ہو گئے اور نکاح سے کچھ دیر پہلے ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔

"ڈاکوؤں نے۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ ڈاکو کہاں سے آگئے۔"

"آپ کو تو معلوم ہی ہوگا جیلر صاحب کہ یہ لوگ ڈاکوؤں کو پال کر رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ان کی سرپرستی کی جاتی ہے اور ڈاکو ان کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔"

"ہاں۔" میں نے اعتراف کیا۔ "ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔"

"تو صاحب وہ ڈاکو بھی امتیاز خان کے پالے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں پر حملہ کر دیا جو اس نکاح میں شریک تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ زخمی ہو گئے۔ وہ دراصل مجھے اغوا کرنے آئے تھے اور میں ان کے ہاتھ آگیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس وقت تک یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ امتیاز خان اور اس کے بیٹوں کے بھیجے ہوئے لوگ ہیں۔"

"وہ مجھے اپنے ساتھ ایک بہت دور افتادہ علاقے میں لے گئے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ پروفیسر صاحب اور نازلی کے ساتھ کیا گزری ہوگی۔ اس وقت ایسی بے بسی اور بے چارگی محسوس کر رہا تھا کہ میں بتا نہیں سکتا۔"

راستے میں انہوں نے مجھ پر تشدد بھی کیا تھا۔ بہر حال بہت دیر سفر کے بعد وہ جیپ رک گئی جس میں مجھے لے جایا گیا تھا۔ میری آنکھ پر بندھی پٹی کھول دی گئی اور پیدل چلنے پر مجبور کر دیا گیا۔ وہ جنگل تھا صاحب، اس وقت تک رات ہو چکی تھی۔ سوچیں میرا کیا حال ہو رہا ہوگا۔ بے رحم لوگ، اجنبی اور ویران جنگل اور رات کا گہرا اندھیرا۔

میں ان کے اشارے پر چلتا رہا۔ آپ یقین کریں۔ اس وقت بھی مجھے اپنی نہیں بلکہ نازلی اور پروفیسر صاحب کی فکر تھی۔

بہت دور پیدل چلنے کے بعد وہ مجھے اپنے اڈے پر لے آئے۔ یہاں اور بھی کئی ڈاکو موجود تھے اور ان سب کے درمیان امتیاز خان کا وہ بیٹا بھی تھا جس نے نازلی سے شادی کی خواہش کی تھی۔

اس وقت میں سمجھا کہ یہ سب کیوں اور کس کے اشارے پر ہوا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگا۔ "کیوں بھائی عاشق ہو گیا تیرا نکاح۔" اس نے کہا۔ "تجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آئی کہ جس لڑکی کو میں پسند کرلوں اس سے نکاح کرنے کی کوشش کرے۔"

"میں نہیں جانتا تھا کہ گاؤں کی ساری لڑکیاں تیری بہنیں ہوتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں نکاح کا پیغام تیرے پاس لے کر آتا۔"

اس نے ایک زوردار تھپڑ مجھے رسید کر دیا۔ "ابھی تک تیری اکڑ نہیں گئی۔ اب تیرا نکاح موت سے ہونے والا ہے۔"

"بہادر انسان تو ذرا میرے ہاتھ کھلوا دے اور اپنے پالتو کتوں کو دور کر۔ پھر دیکھتا ہوں کس کا نکاح موت سے ہوتا ہے۔"

وہ تو آگ بگولا ہو گیا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ میں روتے ہوئے اس کے پیروں پر گر پڑوں گا اس سے رحم کی بھیک مانگنے لگوں گا۔ اس کے برعکس میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے جواب دیے جا رہا تھا۔

اس نے مجھے مارنا شروع کر دیا اور اس وقت ان ڈاکوؤں کے سردار نے اچانک اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "نہیں رئیس یہ مت کرو اس پر ہاتھ مت اٹھاؤ۔"

"کیوں؟" وہ اس ڈاکو پر پھٹ پڑا۔

"اس کی بہادری کی قدر کرو رئیس۔ مجبور ہونے کے بعد بھی کس شان سے باتیں کر رہا ہے۔ ورنہ کوئی اور ہوتا تو اس کی ٹانگیں کانپنے لگتیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو۔"

"اس کو مارنا ہو تو ڈائریکٹ مار دو۔" ڈاکو نے کہا۔

"اس پر ہاتھ اٹھا کر اس کی توہین نہ کرو۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ مجبوراً دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "مار ہی دینا اس کو، میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کی لاش گاؤں والوں کو مل جائے تاکہ سب کو معلوم ہو کہ امتیاز خان اور اس کے بیٹوں سے دشمنی کا کیا انجام ہوتا ہے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" ڈاکو نے کہا۔ "تم آرام سے گھر جاؤ۔ کل صبح اس کو مار کر اس کی لاش تمہارے گاؤں میں پھینک دی جائے گی۔"

"وہ خوں خوں کرتا ہوا چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے

ایک کوٹھری میں لے جا کر بند کر دیا گیا تھا۔ جیلر صاحب! وہ بہت ہی کڑی رات تھی۔ میں موت کے انتظار کا مزہ چکھ چکا ہوں۔ جب مجھے آنے والی ہو تو ایک رات پہلے کیا کیفیت ہو سکتی ہے۔ آپ نے بھی یہ کیفیت نہ جانے کتنوں کے چہروں پر دیکھی ہوگی۔"

میں بالکل اندھیرے میں تھا۔ مجھے بس ایک جرم کی سزا دی جا رہی تھی اور وہ جرم تھا محبت۔ میں نے محبت کی تھی اور اس کی سزا موت تجویز کر دی گئی تھی۔

ایسا لگتا تھا جیسے کہ غریب اور عام آدمیوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔ ہر چیز پر طاقت ور لوگوں کا اختیار ہوتا ہے۔ ہم جیسے تو کیڑے مکوڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ چاہے ہم کتنے ہی پڑھے لکھے اور روشن خیال کیوں نہ ہوں۔

اس طاقت میں پیسا ہی اہم ہے۔ سارے نظریات، سارے آدرش سب غلط ہیں۔ آپ لاکھ تقریریں کرتے رہیں، انسان کو نیکی اور بھلائی کے راستوں پر چلنے کے منصوبے بناتے رہیں۔ ہوتا وہی ہے جو صاحب اقتدار چاہتے ہیں۔

بہت ہی بھیانک رات تھی جیلر صاحب، میں اس رات کا کرب برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ رینگ رینگ کر آنے والی موت زیادہ بھیانک ہوا کرتی ہے۔ میں ایک پل کے لیے بھی سو نہیں پایا تھا۔ ظاہر ہے۔ ایسی صورت میں نیند کہاں آتی۔ صبح کا انتظار تھا جب موت میرے پاس آنے والی تھی۔

صبح ہو ہی گئی اور وہی سردار اپنے ایک آدمی کے ساتھ میری کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ میں اس وقت کوٹھڑی کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کو دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

"اچھا ہوا تم جلدی آ گئے۔" میں نے کہا۔ "انتظار میں بہت کوفت ہوتی ہے۔ چاہے وہ زندگی کا ہو یا موت کا۔"

"شاباش۔" اس نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ "جوان میں تمہارے لیے زندگی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔" اس نے کہا۔ "ہماری مجبوری یہ ہوتی ہے کہ ہم ان لوگوں کے ہاتھوں میں بندھے ہوتے ہیں۔ یہ ہم سے کہیں زیادہ کمینے لوگ ہیں۔ اب تم جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ۔"

"نکل جاؤں؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں یہ دینو تمہیں جنگل سے باہر لے جائے گا۔" اس نے کہا۔ "لیکن اپنے علاقے کی طرف مت جانا۔ کہیں اور نکل جانا۔"

"اور تم سے میرے بارے میں جو پوچھا جائے گا۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہم نے تمہیں مار کر دلدل میں پھینک دیا ہے اور دلدل میں نہ جانے کتنی لاشیں دفن ہو چکی ہیں تم بس نکل جاؤ۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ۔"

"تم نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔" اس نے کہا۔ "ان کمینوں کے خلاف کوئی تو آیا۔ اب جاؤ اور ہاں......!" اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ "لو یہ اپنے پاس رکھ لو۔ یہ پیسے تمہارے کام آئیں گے۔"

"تم مجھ پر اتنا احسان کیوں کر رہے ہو۔" میں حیران ہوا جا رہا تھا۔

"بس کبھی کبھی ہمارے اندر کا سویا ہوا انسان بھی جاگ جاتا ہے۔" اس نے کہا۔ پھر اس نے دینو کی طرف دیکھا۔ "دینو اس کو حفاظت کے ساتھ جنگل سے باہر نکال دینا۔"

"ہاں سردار۔" دینو نے گردن ہلا دی۔

میں اس سردار سے لپٹ گیا۔ وہ کتنا بڑا انسان ثابت ہوا تھا۔ انسان واقعی کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے۔ نہ جانے کس وقت اس کے وجود میں چنگاری دہک اٹھے۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔

دینو مجھے لے کر ایک طرف چل پڑا۔ اس نے مجھے اپنی جیپ میں بٹھا لیا تھا۔

وہ ایک خونخوار صورت، قد آور انسان تھا۔ لیکن اس وقت تو وہ میرے لیے رحمت کا فرشتہ تھا جو مجھے اس جنگل سے نکالے جا رہا تھا۔

میں نے ایک جگہ دلدلی زمین بھی دیکھی۔ یہ دلدل بہت بڑے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ دینو یہاں پہنچ کر رک گیا۔ جیپ روک کر نیچے اتر آیا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارا سردار ایک بے وقوف آدمی ہے۔"

میں نے سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ "رئیس امتیاز کے خلاف جا کر اسے کیا ملے گا۔ کچھ بھی نہیں۔ تو کون سا اس کا

رشتے دار لگتا ہے اگر تو زندہ رہا تو کیا فائدہ اور اگر مر گیا تو رئیس امتیاز سے لاکھوں مل جائیں گے۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ اپنے سردار کے حکم کے خلاف رئیس امتیاز کا ساتھ دینا چاہتا تھا۔ مجھے مار کر وہ بڑے فخر کے ساتھ میری لاش اس کے سامنے کر دیتا۔ جس پر امتیاز خان اسے لاکھوں دے دیتا۔

بہت ممکن ہے کہ وہ شروع سے امتیاز ہی کا آدمی رہا ہو۔ یا ہو سکتا ہے کہ آج کی سچویشن کے بعد اس کی نیت بدل گئی ہو۔

بہرحال اس نے اپنی رائفل کندھے سے اتار کر سیدھی کر لی۔ اس وقت میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب انسان کی موت سامنے ہو تو اس وقت اس کی خفیہ صلاحیتیں بھی بیدار ہو جاتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

اس نے اپنی رائفل پوری طرح سیدھی بھی نہیں کی تھی کہ میں نے اس پر حملہ کر دیا۔ بجلی کی تیزی سے اس پر جھپٹا اور رائفل اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ اس کے بعد اس رائفل کے کندھے سے مارتا چلا گیا۔

میں نے رائفل سے گولی نہیں چلائی۔ بلکہ اس رائفل سے اس کو مارتا رہا۔ ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ۔ میں نے اس کے چہرے کا بھرتا بنا دیا تھا۔

یہ میرے ہاتھ سے پہلا قتل تھا جو میں نے اپنی جان بچانے کے لیے کیا تھا اور ہر شخص کو اس کا قانونی اور اخلاقی حق حاصل ہے۔

میں نے اس کو مار دیا۔ اس کی لاش میرے سامنے تھی اور سامنے ہی دلدل تھی۔ وہ دلدل جس میں وہ خود مجھے مار کر پھینکنے کی پلاننگ کر چکا تھا۔ میں نے اس کی لاش کو دلدل کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔

اور اس وقت ایک خیال میرے ذہن میں آ گیا۔

کیوں نہ میں خود مر جاؤں۔ امتیاز خان اور اس کے بیٹوں نے گویا مجھے مار ہی دیا تھا۔

یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ کوئی طاقت ور جب چاہے کسی کمزور کو برباد کر کے رکھ دے اور کمزور اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

''نہیں، امتیاز خان اور میرے معاملے میں تو ایسا نہیں ہوگا۔ پھر...... پھر کیا کیا جائے۔ میں نے اس مرے ہوئے ڈاکو کی طرف دیکھا۔ وہ جسامت میں مجھ ہی جیسا تھا اور اب تو اس کا چہرہ بھی پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ سمجھ گئے جیلر صاحب کہ میں نے پھر کیا کیا ہوگا۔''

''ہاں سمجھ گیا۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''تم نے اس کو اپنا روپ دے دیا ہوگا۔''

''ہاں، میں نے اپنے کپڑے اسے پہنا دیے اور خود اس کے کپڑے پہن لیے اور اس کی لاش کو اٹھا کر اپنی گاڑی کی طرف روانہ ہوگیا۔''

''میں نہیں سمجھا۔ تم اس کی لاش کو اتنی دور تک کیسے اٹھا کر لے گئے ہو گے۔'' میں نے پوچھا۔

''جیلر صاحب، ہم وہاں پیدل تو نہیں آئے تھے۔ جیپ میں آئے تھے۔ میں اس کی لاش اس جیپ پر رکھ کر اپنے گاؤں کی طرف لے آیا اور ایسی جگہ ڈال دی جہاں سے بہ آسانی دیکھی جا سکے۔''

اس وقت اس راستے پر سناٹا تھا۔ جہاں میں نے وہ لاش ڈالی تھی۔ دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ میں اپنے گھر چلا جاؤں۔ جا کر دیکھوں اپنے ماں باپ، نازلی اور پروفیسر صاحب کی خیریت معلوم کروں، لیکن ایسا کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ کیوں کہ میں تو خود کو ایک لاش میں تبدیل کر چکا تھا۔

ان کی خیریت بعد میں بھی معلوم ہو سکتی تھی۔

بہرحال جیلر صاحب! وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ اس ڈاکو کی لاش کو میری لاش سمجھ لیا گیا۔ پورے گاؤں میں واویلا مچ گیا۔ ہاں میری لاش پر رونے کے لیے میری والدین نہیں رہے تھے۔

''کیوں؟ تمہارے ماں باپ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔'' میں نے پوچھا۔

''ان بے چاروں کو ڈاکوؤں نے مار دیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ وہ ڈاکو کون ہو سکتے ہیں۔ ہاں امتیاز خان اور اس کے ظالم بیٹوں نے میرے باپ کا خون کر دیا تھا۔ نازلی کو غائب کر دیا گیا تھا اور بے چارے پروفیسر صاحب اس صدمے کی تاب نہ لا کر ہارٹ فیل میں انتقال کر گئے تھے۔''

رشید اتنا کہہ کر رونے لگا تھا۔

میرے کمرے کی فضا اچانک سوگوار ہوتی چلی گئی۔ واقعی اس بے چارے کے ساتھ بہت ظلم ہوا تھا۔ لیکن کیا کیا جائے۔ بدقسمتی سے اس ملک میں برسوں سے یہی سسٹم چل رہا ہے۔ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام نے نہ جانے کتنوں کو خاک میں ملا دیا۔

میرا ایمان ہے کہ اگر کوئی ظلم و جبر کے خلاف آواز نہ بلند کرے تو وہ خود بھی اس ظلم و جبر کے نظام کا ایک جز بن جاتا ہے۔ وہ اس کے فروغ میں معاونت کرتا رہتا ہے۔

مجموعی طور پر ہم سب مجرم ہیں۔ کیوں کہ ہم آواز نہیں اٹھاتے۔ ہم کمزوریوں اور مصلحتوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔

''رشید یہ بتاؤ تمہیں ان کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔'' میں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

''اس وقت تو کچھ نہیں معلوم ہو سکا تھا سر، لیکن بعد میں آہستہ آہستہ سب کچھ معلوم ہوتا چلا گیا۔'' اس نے بتایا۔

''یہ سب معلوم ہونے کے بعد میری جو حالت ہوئی تھی، وہ صرف میں جانتا ہوں۔ دل میں آتا تھا کہ پورے علاقے کو آگ لگا دوں۔ پورے معاشرے کو آگ لگا دوں۔ امتیاز خان اور اس کے طاقت ور بیٹے دندناتے پھر رہے تھے اور کمزور منوں مٹی کے نیچے جا کر سو گئے تھے۔ ایک نازلی تھی۔ اس کا کوئی پتا نہیں تھا اور ایک میں تھا جو ان کی نگاہوں میں ان کی مرضی سے مار دیا گیا تھا۔''

میں سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔'' پھر مجھے اپنے گاؤں میں اپنا ایک دوست یاد آ گیا۔ وہ صرف جان پہچان والا تھا صاحب۔ لیکن اس شخص نے میرا اتنا ساتھ دیا ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ ورنہ یہ قانون اس کو پکڑ لے گا۔ وہ قانون جو امتیاز خان اور اس کے بیٹوں کا کچھ نہیں بگاڑ پایا تھا۔ وہ میرے اس دوست کا یقیناً گلا دبا دے گا۔ کیوں کہ وہ ایک غریب اور کمزور انسان ہے۔''

صاحب میں کئی دنوں تک آس پاس بھٹکتا رہا۔ اس دوران میری اچھی خاصی داڑھی نکل آئی تھی۔ کپڑے میلے اور تار تار ہو گئے تھے۔ ایک نظر دیکھنے والا مجھے پہچان نہیں سکتا تھا اور کئی دنوں کے بعد ایک رات میں اپنے گاؤں میں داخل ہوا اور اپنے اس دوست کے گھر پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی تو حالت ہی غیر ہو گئی تھی۔ سکتے میں آ گیا تھا۔ بہت مشکل سے میں نے اسے یقین دلایا کہ میں مرا نہیں زندہ ہوں۔

''پھر وہ سب کیا تھا؟'' اس نے کہا۔ ''ہم تو تمہاری لاش کو دفن بھی کر چکے ہیں۔ گاؤں کے بہت سے لوگ اس جنازے میں شریک تھے۔''

''اشفاق میں تمہیں سب بتا دوں گا۔ پہلے مجھے کہیں بٹھانے کا اور چھپانے کا بندوبست کرو۔''

''ہاں ہاں آؤ، اندر آ جاؤ۔''

وہ مجھے ایسے کمرے میں لے آیا جو مکان کی پچھلی طرف تھا اور یہاں کسی کا آنا جانا نہیں تھا۔ اس کے گھر والے اس وقت سو رہے تھے۔ وہ میرے لیے کھانا اور چائے لے کر آ گیا۔

''جب کھا پی کر کچھ سکون ہوا تو میں نے اسے اب تک گزرنے والی ساری کہانی سنا دی۔''

''خدا غارت کرے ان کم بختوں کو۔'' اس نے میری داستان سننے کے بعد کہا۔ ''تینوں باپ بیٹے بہت ظالم اور بے رحم ہیں۔''

اشفاق ہی سے معلوم ہوا کہ میرے ماں باپ اور نازلی اور پروفیسر صاحب کے ساتھ کیا گزری ہے۔ یہ سب سن کر میں بہت دیر تک روتا رہا تھا۔

بے چارہ اشفاق مجھے تسلیاں دیتا رہا۔ چپ کراتا رہا۔ جب مجھے کچھ ہوش آیا تو اس نے پوچھا۔ ''ہاں اب بتاؤ، اب تم کیا کرو گے۔ اس گاؤں میں تو رہ نہیں سکتے۔''

''نہیں، اب میرے دو کام ہیں اشفاق۔'' میں نے کہا۔ ''دیکھو میں پوری طرح بھروسا کر کے تمہارے پاس آیا ہوں۔ اگر تم نے مایوس کر دیا تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ پھر جو میرا مقدر ہو۔''

''نہیں...... نہیں بتاؤ۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

''میں نے بتایا تھا کہ دو کام ہیں۔ پہلا کام ہے بے چاری نازلی کا کھوج لگانا۔ کہاں ہے۔ کس حال میں ہے۔ ان کم بختوں نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے اور دوسرا کام ہے امتیاز خان اور اس کے بیٹوں سے انتقام لینا۔''

''یہ بہت مشکل ہے رشید۔''

''پہلے مشکل تھا لیکن اب آسان ہو گیا ہے۔ کیونکہ میں مر چکا ہوں اور ایک مرا ہوا آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

''تم بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کروں۔'' اس نے پوچھا۔

''اب اصل کام تمہارا ہے میرے دوست۔'' میں نے کہا۔ ''تم ان تینوں کے موبائل نمبر کسی طرح حاصل کرو۔''

''یہ تو کوئی مشکل نہیں ہے۔ گاؤں کے بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ جن سے ان لوگوں کے کام پڑتے رہتے ہیں۔'' اشفاق نے بتایا۔

''اور دوسرا کام یہ ہے کہ تم مجھے چھپائے رکھو گے۔'' میں نے بتایا۔ ''میرے یہاں ہونے کی خبر کسی کو نہیں دو گے اور کوشش کرو کہ نازلی کا پتا چل جائے۔''

''یہ بھی کوئی مشکل نہیں ہے۔ اس گاؤں کی بہت سی عورتیں حویلی میں کام کرنے جاتی ہیں۔''

''تم ان کو لالچ دے کر اس کام کے لیے آمادہ کر سکتے ہو کہ وہ نازلی کا کھوج لگا کر بتائیں۔'' میں نے کچھ نوٹ اشفاق کی طرف بڑھا دیے۔ ''یہ لو، یہ رکھ لو تمہارے کام آئیں گے۔'' واضح رہے کہ یہ وہی نوٹ تھے جو اس نیک دل ڈاکو نے مجھے دیے تھے۔ اشفاق پیسے لینا نہیں چاہ رہا تھا۔ پہلے میں نے اسے سمجھایا۔ ''بے وقوف بہت سے کام کرنے ہیں۔ تم دوسرے شہر جا کر میرے لیے کچھ سامان لاؤ گے۔ جو میں تمہیں لکھ کر دوں گا۔ میں یہاں بھیس بدل کر رہوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم کسی آفت میں پھنس جاؤ۔ اس کے علاوہ حویلی میں کام کرنے والی عورتوں کو دینے کے لیے تمہارے پاس کچھ ہونا چاہیے۔ لو رکھ لو۔ تم مجھ پر بہت بڑا احسان کر رہے ہو۔ میں تمہیں بہت زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتا۔''

میرے اصرار پر اشفاق نے پیسے لے لیے تھے۔ میں نے اسے کچھ چیزیں لکھ کر دے دیں کہ دوسرے قصبے سے جا کر لے آئے۔ ان میں شیو کا سامان، کپڑے، ایک کمبل اور اسی قسم کی دیگر چیزوں کے علاوہ ایک موبائل فون بھی تھا۔

اس فون میں مجھے اپنی سم استعمال کرنی تھی۔ میں نے شاید یہ نہیں بتایا کہ میرے پاس ایک فون تھا جو اس مہربان ڈاکو نے مجھے واپس کر دیا تھا۔

اس تمام بھاگ دوڑ کے دوران وہ موبائل گر کر ٹوٹ چکا تھا۔ البتہ اس کی سم قابلِ استعمال تھی۔ اس لیے مجھے ایک فون کی ضرورت تھی۔

میں یہ بھی بتا دوں کہ میرے پاس ریوالور موجود تھا۔ جیلر صاحب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ ریوالور کس کا ہو سکتا تھا۔ میں نے اس ڈاکو کو مار کر دلدل میں اس کی لاش پھینکنے سے پہلے اس کا ریوالور اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ مجھے اس سے بہت سے کام لینے تھے۔

''بہرحال اشفاق نے میری بہت مدد کی۔ ہاں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ اشفاق ایک فرضی نام ہے۔''

''وہ کیوں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''اس لیے کہ میں یہ پہلے بتا چکا ہوں کہ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے وہ دوست پھنس جائے جس نے میری مدد کی تھی۔ آپ گاؤں میں تلاش کرنے جائیں گے تو آپ کو اشفاق نام کا کوئی بندہ نہیں ملے گا۔''

''تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔'' میں مسکرا دیا۔ ''مجھے بھی اسے تلاش کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیوں کہ میں امتیاز خان اور اس کے بیٹوں جیسے کرداروں کا ہمدرد نہیں ہوں۔''

''میں نے اندازہ لگا لیا تھا جیلر صاحب اس لیے آپ کو اپنی کہانی سنا رہا ہوں۔'' رشید نے کہا۔ ''تو اس بے چارے اشفاق نے دو دنوں کے اندر میرے سارے کام کر دیے۔ موبائل بھی آ گیا۔ کپڑے بھی آ گئے۔ ان تینوں کے نمبر بھی معلوم ہو گئے۔ نمبرز معلوم ہو جانے کے بعد میرا اصل کام شروع ہو گیا تھا۔''

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر کہیں ٹوٹ پھوٹ ہو گئی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں اس نے آگے بتانا شروع کیا۔ ''جیلر صاحب! پانچ چھ دنوں کے بعد کھیتوں سے نازلی کی لاش برآمد ہوئی تھی۔''

''اوہ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اوہ تو یہ انجام ہوا اس لڑکی کا۔''

''یس سر لیکن کسی کے خلاف کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا۔ جانتے تو سب تھے لیکن کون پیروی کرتا۔ کون طاقت ور لوگوں کے خلاف آواز اٹھاتا، کس میں اتنی ہمت تھی۔ کسی میں نہیں۔ سب خاموش تھے سوائے میرے۔ نہیں جیلر صاحب میں بالکل نہیں رویا۔ میں نے کوئی واویلا نہیں کیا لیکن اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ کھولتا رہا۔ چنگاریاں اب آتش فشاں بننے جا رہی تھیں۔''

دو چار دنوں کے بعد میں نے امتیاز کے موبائل نمبر پر فون کیا۔ دوسری طرف سے اس نے فون ریسیو کیا تھا۔ اس نے پوچھا کون؟ میں نے کہا تمہاری موت۔ پھر میں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ کوشش کی تھی کہ میرا قہقہہ سنسنی خیز اور بھیانک ہو جائے۔''

وہ دوسری طرف سے نہ جانے کیا کیا بولتا رہا لیکن میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اس کو پریشان کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

میں نے دوسرا فون اس کو کیا۔ جو نازلی سے شادی

کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جب اس سے کہا کہ میں تیری موت ہوں تو اس نے فون پر گالیاں دینی شروع کر دیں۔

میں تو چاہتا ہی یہی تھا کہ ان کم بختوں کو زیادہ سے زیادہ بھڑکایا جائے۔ خوف زدہ کیا جائے اور میں اپنے مقصد میں کامیاب تھا۔

دو دنوں کے بعد میں نے پھر امتیاز کو فون کیا۔ اس دفعہ وہ بری طرح بپھرا ہوا تھا۔ ''کون ہے کتا۔''

''امتیاز خان میں اگر تیرے سامنے آگیا نا تو تیری جان نکل جائے گی۔ محسوس کر مجھے میں تیرے آس پاس ہی ہوں۔ میں وہی ہوں جس سے تو نے اس کی محبت چھین لی تھی۔ میں روح بن کر بھٹک رہا ہوں۔ امتیاز خان مارنا چاہتا ہوں تجھے اپنے ہاتھوں سے۔''

''کیا بکواس ہے۔ آخر تو ہے کون؟''

''میں رشید کی روح ہوں امتیاز خان۔ اس رشید کی جس کو تو نے ڈاکوؤں کے حوالے کر دیا تھا۔ ڈاکوؤں نے میرے جسم کو تو مار دیا ہے امتیاز خان لیکن میری روح کو نہیں مار سکے ہیں اور وہ مار بھی نہیں سکتے لیکن میں تجھے اور تیرے بیٹوں کو ضرور مار سکتا ہوں۔'' میں نے ایک بھیانک قہقہہ لگاتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

اشفاق نے بتایا کہ میرے فون نے ان لوگوں کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔ وہ تینوں بری طرح گھبرائے ہوئے ہیں۔ یہ بات ان ملازماؤں نے بتائی تھیں جو حویلی میں کام کرنے جاتی تھیں۔

میں یہی تو چاہتا تھا کہ پہلے ان کو خوب ڈرایا جائے۔ اس کے بعد اپنی کارروائی کی جائے۔ میں دو چار دن خاموش رہا۔ اس کے بعد ایک شام مجھے موقع مل گیا۔

میں رات کے وقت کھیتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا کہ میں نے کچی سڑک پر کسی جیپ کے انجن کی آواز سنی۔ شاید کسی کی جیپ خراب ہو گئی تھی اور اس علاقے میں گاڑی ان ہی تینوں کے پاس ہوا کرتی تھی۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا کچی سڑک پر آگیا۔

میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ وہ چاندرات تھی۔ آس پاس کے مناظر دیکھے جا سکتے تھے اور امتیاز خان کا بڑا بیٹا اپنی جیپ سے الجھا ہوا تھا۔

نہ جانے وہ کم بخت اس وقت کہاں سے آرہا ہوگا۔ لیکن مجھے تو قدرت نے ایک شاندار موقع فراہم کر دیا تھا۔ میں نے اپنے جسم پر ایک کمبل لپیٹ رکھا تھا۔ ویسے بھی وہ

رات کو چمکنے والے گدھے...

حادثات صرف گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کے ہی آپس میں ٹکرانے سے نہیں ہوتے بلکہ چلنے والوں اور آوارہ جانوروں کے اچانک سامنے آجانے سے بھی خطرناک حادثات ہوتے ہیں۔ جن علاقوں میں کتوں، بھینسوں اور گدھوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ وہاں زیادہ تر حادثات ان کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ افریقا کے شہر بوٹسوانا میں گدھے رات کو سڑکوں پر آجاتے ہیں جس کے نتیجے میں گاڑیاں ان گدھوں سے ٹکرا جاتی ہیں، سروے کے مطابق یہاں دس حادثات میں سے ایک حادثہ گدھوں کے سڑک پر آجانے سے ہوتا ہے۔ اس مشکل سے چھٹکارا پانے کے لیے بوٹسوانا کے کسانوں نے پانچ سو گدھوں کے کانوں میں رات کو چمکنے والے ''ٹیگ'' لگادیتے ہیں، جن کا مقصد کار سواروں کو گدھوں کے متعلق آگاہ کرنا ہے۔ بوٹسوانا میں غریب زیادہ ہونے کے باعث کسان اپنے گدھوں کو خوراک کی تلاش کے لیے رات کو کھلے میدانوں میں کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔

احسان سحر، میانوالی

سردی کی رات تھی۔

میں نے اس کے پاس جانے سے پہلے اپنے موبائل پر اس کا نمبر ملایا۔ جب اس کی جیب میں رکھے ہوئے موبائل کی گھنٹی اس ویرانے میں گونجی تو وہ اچھل پڑا۔

اس نے جلدی سے موبائل نکال کر اپنے کان سے لگا لیا۔ ''ہیلو، کون۔''

میں نے جواب دینے کی بجائے ہنسنا شروع کر دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ بری طرح کانپنے لگا ہے۔ اس نے موبائل آف کر دیا اور اسی وقت میں اندھیرے سے نکل کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔

وہ بری طرح بدک گیا تھا۔ ''ک ک...... کون ہو تم۔''

میں نے اپنا کمبل اتار دیا۔ ''رشید کی روح۔''

''اس پر جیسے سکتا سا ہو گیا تھا۔ وہ شاید اپنا ریوالور

نکالنے کے لیے جیب کی طرف جھپٹا تھا کہ میں نے یکے بعد دیگرے دو گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں۔''
گولیوں کی آوازیں دور تک گونجتی چلی گئی تھیں۔
جیپ کے پاس اس کی لاش پڑی تھی۔ وہ مغرور اور بے رحم شخص جو اپنے باپ کی دولت اور طاقت کے ساتھ مل کر ظلم کرتا پھرتا تھا۔ جو اس علاقے کا فرعون بنا ہوا تھا۔ اس کی لاش بے کسی کی تصویر بنی ہوئی پڑی تھی۔
موت کے وقت وہ بے انتہا خوف زدہ تھا۔ اس کے منحوس چہرے پر خوف جم کر رہ گیا تھا۔ میں نے اس کی لاش کے پاس کھڑے ہو کر اس کے باپ امتیاز خان کا نمبر ملایا۔
اس نے میرا نمبر پہچان لیا تھا۔ اس نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ ''خاک میں ملا دوں گا تجھے، میں جانتا ہوں تو زندہ ہے۔''
''میری بات چھوڑ امتیاز خان، تیرا بڑا بیٹا اب زندہ نہیں رہا۔ اس کی لاش ٹیوب ویل والے کھیت کے پاس پڑی ہوئی ہے۔ آ کر لے جا۔''
میں موبائل آف کر کے بڑے اطمینان کے ساتھ اشفاق کے گھر واپس آ گیا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں کیا کر آیا ہوں۔ وہ بے چارہ بری طرح سہا ہوا تھا۔
''یار رشید! اب تو پورے علاقے میں آگ سی لگ جائے گی۔ ایسا نہ ہو کہ پولیس گھر گھر تلاشی لے۔''
''میں سمجھ گیا یار۔ تو پریشان نہ ہو۔ میں تجھ پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے ایک چھپنے کی جگہ ڈھونڈ لی ہے۔ میں وہیں جا رہا ہوں اور اپنے کمرے سے میرا ہر نشان مٹا دینا۔''
''لیکن تو وہاں کیسے چھپا رہے گا۔ کب تک چھپا رہے گا۔'' اشفاق نے پوچھا۔ ''تیرے کھانے پینے کا کیا ہو گا۔''
''اس کی فکر مت کر۔ جب دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہو تو اس وقت کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں چل رہا ہوں میری چیزیں سمیٹ کر دے دے۔''
کھیتوں میں گھومنے پھرنے کے دوران میں میں نے واقعی ایک ایسی جگہ دیکھ لی تھی۔ جہاں میں بڑی آسانی سے ہفتوں رہ سکتا تھا اور کسی کا دھیان بھی نہیں جاتا۔
اشفاق کو کچھ باتیں سمجھا کر اور اپنا سامان لے کر میں اس جگہ آ کر چھپ گیا۔

اس رات امتیاز خان کے بیٹے کی لاش دریافت ہو گئی تھی۔ بعد میں اشفاق نے بتایا کہ پورے گاؤں پر کیسی مصیبت نازل ہوئی تھی۔
ہمارے اندازے درست نکلے تھے۔ گھر گھر کی تلاشی لی گئی تھی۔ پولیس اشفاق کے گھر بھی آئی تھی لیکن میرا کہیں سے کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔
اشفاق نے بتایا کہ امتیاز خان اور اس کے دوسرے بیٹے کا خوف سے برا حال تھا۔ وہ جتنے بڑے ظالم تھے اتنے ہی زیادہ بزدل بھی تھے۔
''یہ ایک عام سی بات ہے۔ ظالم عام طور پر بزدل ہی ہوا کرتا ہے۔ وہ بھی ظالم اور بزدل تھے۔ اب مجھے ان دونوں کی فکر تھی۔''
''اور تم نے ان دونوں کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔'' میں نے پوچھا۔
''جی ہاں جیلر! موقع پا کر اس کے بیٹے کو مار دیا۔ رشید نے اپنی بات مختصر کرتے ہوئے بتایا۔ اس کا سیدھا اثر امتیاز خان پر پڑا۔ وہ تو پہلے ہی خوفزدہ تھا۔ بلڈ پریشر حد سے زیادہ بڑھ گیا جس کا نتیجہ فالج کی صورت میں نکلا۔ اس کے بعد میرے سامنے کوئی ٹارگٹ نہیں تھا۔ میرا مشن پورا ہو چکا تھا۔ انسان کی زندگی کسی مقصد کے لیے ہوتی ہے اور جب مقصد پورا ہو جائے تو پھر اس کے زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا اور پھر اس آدمی کے لیے موت کی کیا اہمیت ہے۔ جو ایک بار پہلے مر چکا ہو یقین نہ آئے تو میرے گاؤں جا کر میری قبر دیکھ لیں۔ آپ کو پتا چل جائے گا۔ بس یہ ہے میری کہانی۔''
یہ تھی اس شخص کی کہانی جو ایک بار پہلے مر چکا تھا۔ اور جس کو ان لوگوں نے مارا تھا۔ جو بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں بہت معزز سمجھے جاتے ہیں۔ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق طبقہ اشرافیہ سے ہے۔
خدا جانے یہ اشرافیہ کیا ہے۔ میں تو آج تک نہیں سمجھ سکا۔ رشید کو موت کی سزا تو نہیں دی گئی۔ بلکہ اس کی سزا عمر قید میں بدل دی گئی تھی اور جب تک میں اس جیل میں رہا۔ وہ مجھ سے ایک ہی سوال کرتا تھا۔ ''جیلر صاحب آپ یہ بتائیں کیا میں زندہ ہوں۔''
میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کیا آپ کے پاس ہے!!

احتیاط

محترمہ عذرا رسول
سلام تہنیت
میں خود پر گزرا ایک واقعہ کے ساتھ حاضر ہورہی ہوں۔ ہم ہر بات کو معمولی سی بات سمجھ کر احتیاط کا دامن چھوڑ دیتے ہیں جس کا نتیجہ بھیانک نکلتا ہے۔
بلقیس
(کراچی)



بات کچھ بھی نہیں تھی۔ لیکن ذرا سی بات بھی جی کا جنجال بن جاتی ہے۔ جیسے کہانی میں ہیں۔

حسینہ ایک جفاکش لڑکی تھی۔ وہ پچھلے چار مہینوں سے میرے یہاں کام کررہی تھی۔ اس سے پہلے جو ملازمہ تھی وہ کچھ دنوں کی چھٹی لے کر گئی تھی۔ پھر اس کی واپسی ہی نہیں ہوئی۔

نہ جانے اس بے چاری کے ساتھ کیا ہوا۔ پھر میری ایک جاننے والی نے حسینہ کو میرے گھر بھیج دیا۔ پہلی ہی نظر

میں ایک اچھی لڑکی لگی تھی۔ دبلی پتلی، معقول صورت اور مہذب انداز کی۔ اس نے دو کام کے ہزار روپے بتائے تھے۔ جو ہر لحاظ سے مناسب تھے۔

ہم نے اسے اپنے یہاں رکھ لیا۔ اس نے بہت پابندی اور خاموشی کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا۔ میرے شوہر انور بھی اس سے مطمئن تھے۔

انور ایک کاروباری انسان تھے۔ یہ صرف دو ہی بھائی تھے۔ انور اور اکبر۔ اکبر بڑے تھے۔ پولیس کے محکمے میں اعلیٰ عہدے پر تھے لیکن انتہائی نرم دل اور سلیقے سے بات کرنے والے۔

اکبر کی حیثیت میرے لیے ایسی تھی جیسی ایک باپ کی ہوتی ہے۔ وہ انور سے آٹھ سال بڑے تھے۔ یہ سمجھ لیں کہ انہوں نے ہی میرے شوہر کی پرورش کی تھی۔

اکبر کی شادی ہوئی تھی لیکن بیوی کے انتقال کے بعد انہوں نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ ان کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔

اکبر ہم سے کچھ فاصلے پر ایک فلیٹ میں تنہا رہا کرتے تھے۔ ہم دونوں نے کئی بار کوشش کی تھی کہ وہ ہمارے یہاں منتقل ہو جائیں لیکن ان کا ایک جواب ہوتا۔ ''تم لوگ نہیں جانتے کہ میرا تعلق جس محکمے سے ہے وہاں کتنے خطرات ہیں۔''

''لیکن آپ کے الگ رہنے سے یہ خطرات کم تو نہیں ہو سکتے۔'' میں کہا کرتی۔

''بالکل درست۔ لیکن کم از کم اتنا ضرور ہو سکتا ہے کہ تم لوگ لپیٹ میں آنے سے بچ جاؤ۔'' بہر حال زندگی اسی طرح چل رہی تھی۔

اکبر بھائی ہفتے میں دو یا تین دن ہمارے یہاں ضرور آتے لیکن انہوں نے کوئی دن یا وقت مقرر نہیں کیا تھا۔ وہ کسی بھی وقت آ سکتے تھے۔

ان کا یہ کہنا تھا کہ ان کی ریکی ہو سکتی ہے۔ اس لیے وہ دن اور وقت بدل بدل کر آتے ہیں اور آتے بھی سادہ لباس میں تھے۔

وہ ہمارے یہاں کبھی اپنی یونیفارم میں نہیں آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے حوالے سے ہمارے مکان کو ٹارگٹ نہ کیا جائے۔

عجیب زمانہ آ گیا تھا۔ اپنے سائے سے بھی وحشت ہونے لگی تھی۔

لیکن ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود ایک دن پتا چلا کہ اکبر بھائی ایک حملے میں زخمی ہو گئے ہیں۔ وہ ڈیوٹی پر جا رہے تھے کہ دہشت گردوں نے ان کی گاڑی پر گولیاں برسا دیں۔

ان کی قسمت اچھی تھی کہ کوئی بھی گولی ان کی جان نہیں لے سکی تھی۔ البتہ وہ بری طرح زخمی ضرور ہو گئے تھے۔

اپنے بھائی کی وجہ سے بے چارے انور کی تو حالت غیر ہو رہی تھی۔ ایک ہی بھائی تھا ان کا۔ دونوں بھائیوں میں محبت بھی ایسی ہی تھی۔

ایک صبح میں لاؤنج میں بیٹھی اکبر بھائی کے لیے تسبیح پر کوئی وظیفہ پڑھ رہی تھی کہ حسینہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے بھی بتا دیا گیا تھا کہ اکبر بھائی پر حملہ ہوا ہے۔ اکبر بھائی جب آتے اور حسینہ موجود ہوتی تو اکبر بھائی اسے کچھ نہ کچھ ضرور دے دیتے تھے۔

''بی بی جی! اب کیسی طبیعت ہے صاحب کی۔'' اس نے پوچھا۔

''خدا کا شکر ہے اکبر جان کی زندگی محفوظ رہ گئی۔'' میں نے بتایا۔ ''وہ اسپتال میں ہیں۔''

''بہت خیر ہو گئی بی بی۔''

''ہاں جی بس دعا کرو۔''

''بی بی اگر آپ کہیں تو میں حضرت سے دعا کے لیے کہوں۔''

''حضرت! کون حضرت؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت بڑے انسان ہیں جی۔ اللہ والے۔ ان کی دعاؤں میں بہت اثر ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اگر آپ کسی اللہ والے کو دیکھنا چاہتی ہیں تو حضرت صاحب کو ہی دیکھ لیں۔ آپ کا ایمان تازہ ہو جائے گا۔''

''اگر ایسا ہے تو ان سے دعا کے لیے کہہ دو۔''

''ان کے پاس جانا پڑے گا بی بی۔'' اس نے بتایا۔

''بہت دور رہتے ہیں۔''

''تو پھر چلی جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''وہ کچھ پیسے بھی لیتے ہوں تو وہ بھی دے دینا۔''

''کیسی بات کرتی ہیں بی بی جی۔ ان کو پیسوں سے کیا لینا دینا ہے۔ صرف دعاؤں کے پیسے کون لیتا ہے۔ وہ صرف کچھ پڑھنے کو بتا دیتے ہیں اور کام ہو جاتا ہے۔''

''تو ان سے بات کرو۔ ان کو بتاؤ کہ ہمارے یہاں کیا ہوا ہے۔''

''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنے منگیتر سے بات کرلوں۔'' اس نے پوچھا۔

''کیوں منگیتر سے کیا تعلق ہے۔''

''وہ ان کے پاس جاتا رہتا ہے۔'' حسینہ نے بتایا۔

''اب میں خود تو حضرت صاحب سے بات نہیں کرسکتی۔ میرا منگیتر ان کے پاس چلا جائے گا۔''

''چلو ٹھیک ہے بات کرلو۔ منگیتر سے کب ملوگی۔''

''ملنے کی کیا ضرورت ہے بی بی۔ اس سے موبائل پر بات کرلیتی ہوں۔'' حسینہ نے کہا۔ پھر ہنس پڑی۔ ''وہ تو اتنا فرمانبردار ہے جی کہ میرا فون سنتے ہی دوڑتا ہوا جائے گا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' اس کی بات سن کر میں بھی مسکرا دی تھی۔ ''یہ لو موبائل۔'' میں نے اپنے پاس رکھا ہوا موبائل اس کو دے دیا۔

وہ اپنے منگیتر سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے اپنے پاس رکھی ہوئی وہ کتاب اٹھالی۔ جس میں بے شمار وظائف درج تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دعا اپنوں ہی کی زیادہ قبول ہوتی ہے۔

اس کے باوجود کچھ لوگوں کی دعائیں ہر ایک کے کام آجاتی ہیں۔ یہ خدا کے نیک بندے ہوتے ہیں۔ جن کے لیے ہر شخص کی اہمیت ہوتی ہے۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

ہوسکتا ہے کہ حسینہ کے حضرت صاحب ان ہی بندوں میں سے ہوں۔ دعا کرانے میں کیا حرج تھا۔ ممکن تھا کہ ان کی دعائیں ہمارے کام آجائیں۔

حسینہ نے منگیتر کو فون کرکے موبائل واپس کرتے ہوئے بتایا۔ ''یہ لیں بی بی۔ بات ہوگئی ہے۔ وہ کچھ دیر بعد چلا جائے گا حضرت صاحب کے پاس۔ میں نے کہا تھا ناکہ مجال ہے جو میں کسی کا کہوں اور وہ انکار کردے۔''

حسینہ کے لہجے میں اپنے منگیتر کے لیے جو فخر تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اپنے منگیتر پر کتنا مان ہے۔ حسینہ کے جانے کے بعد دفتر سے انور کا فون آگیا۔ وہ یہ بتا رہے تھے کہ آج وہ دفتر سے جلدی آجائیں گے۔ دفتر میں ان کا دل نہیں لگ رہا۔ وہ لنچ میرے ساتھ ہی لیں گے۔ اس کے بعد ہم دونوں اکبر بھائی کو دیکھنے اسپتال چلے جائیں گے۔

ویسے رپورٹ تو یہی تھی کہ وہ بہت تیزی سے ری کور ہو رہے ہیں۔ ویسے بھی وہ آہنی ارادے اور حوصلے کے انسان تھے۔ انھوں نے نہ جانے کیسے کیسے خطرناک مجرموں

کو پکڑا تھا۔ ایک بار کچھ آدمی انہیں اپنے ساتھ اغوا کر کے لے گئے تھے لیکن وہ ان کے درمیان سے بھی نکل آئے تھے۔

دوپہر تک انور بھی آگئے۔

کھانے کے درمیان میں نے ان سے کہا۔ ''انور میرا خیال ہے کہ ہم اکبر بھائی کو اب یہیں رکھ لیں۔''

''یہ تو میں خود بھی کئی بار کہہ چکا ہوں۔''

''پہلے کی بات اور تھی لیکن اب اسپتال سے نکلنے کے بعد ان کے لیے کسی کا ساتھ بہت ضروری ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''انہیں کسی طرح بھی تنہا نہیں رہنا چاہیے۔''

''ہاں میں تو خود بھی یہی چاہتا ہوں۔ تم ان سے خود بات کر لینا۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہاری بات نہیں ٹالیں گے۔''

ابھی ہم یہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ سامنے ٹی وی کی اسکرین پر ایک خبر چلنے لگی۔ وہ خبر یہ تھی۔ ''دہشت گردوں نے ایک اسپتال پر حملہ کر دیا ہے۔''

میں اور انور چونکنا اور خوف زدہ ہو کر ٹی وی دیکھنے لگے۔ جس اسپتال پر حملہ ہوا یہ وہی تھا جہاں اکبر بھائی کو رکھا گیا تھا۔

اور مزید تفصیل یہ تھی کہ یہ حملہ اکبر بھائی ہی پر ہوا تھا اور ایک بار پھر قسمت اور خدا نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ وہ بچ گئے تھے۔ ان کے کمرے کے باہر کھڑے ہوئے محافظوں کی فائرنگ سے ایک دہشت گرد ہلاک ہو گیا تھا۔ جب کہ دوسرا گولیاں چلاتے ہوئے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اس بھیانک خبر کو سن کر ہم دونوں کے ہوش اڑ گئے تھے۔ ''یا خدا رحم۔'' میں نے کہا۔

''تم گھر پر رہو میں اسپتال جا رہا ہوں۔'' انور بہت جلدی میں گھر سے نکل گئے۔

میں نے ایک بار پھر وظیفے پڑھنے شروع کر دیے۔ وہ دہشت گرد اکبر بھائی کے پیچھے ہی پڑ گئے تھے۔ انور کو جب اسپتال گئے بہت دیر ہو گئی تو مجھے تشویش ہونے لگی۔

میں نے موبائل پر فون کیا۔ دوسری طرف بیل تو جا رہی تھی لیکن وہ اٹینڈ نہیں کر رہے تھے۔ میں نے کچھ دیر بعد پھر فون کیا۔ اس بار فون کاٹ دیا گیا تھا۔

پتا نہیں کیا ہو رہا تھا۔ یا کیا ہونے والا تھا۔ میری گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ بہت دیر کے بعد باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی انور واپس آگئے تھے۔

دروازے پر دستک ہوئی تو انور کھڑے تھے لیکن وہ اکیلے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ دو تین پولیس والے بھی تھے۔ انور کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے اتنا پریشان انہیں کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

''کیا ہوا انور۔ بتائیں۔ اکبر بھائی تو ٹھیک ہیں نا؟''

''ہاں۔'' انور دھیرے سے بولے۔ ''اکبر بھائی تو ٹھیک ہیں لیکن......''

''لیکن کیا۔''

''لیکن یہ کہ تم اس وقت مصیبت میں پھنس گئی ہو۔'' انور نے کہا۔

''میں مصیبت میں پھنس گئی ہوں، وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ اکبر صاحب پر اسپتال میں حملے کی پلاننگ آپ نے کی تھی۔'' انور کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک پولیس والے نے بتایا۔

''کیا...... میں نے پلاننگ کی تھی؟'' مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

اس دوران ہم اندر لاؤنج میں آچکے تھے۔

''جی میڈم! اسپتال پر حملہ کرنے والے جس دہشت گرد کو مارا گیا ہے اس کے موبائل پر آخری کال آپ کے نمبر سے آئی تھی۔'' دوسرے پولیس والے نے بتایا۔ ''اور آپ نے دہشت گردوں کو یہ خبر دی کہ اکبر صاحب قاتلانہ حملے میں بچ گئے ہیں اور اسپتال میں ہیں۔ یہ سن کر ان پر حملہ ہو گیا۔''

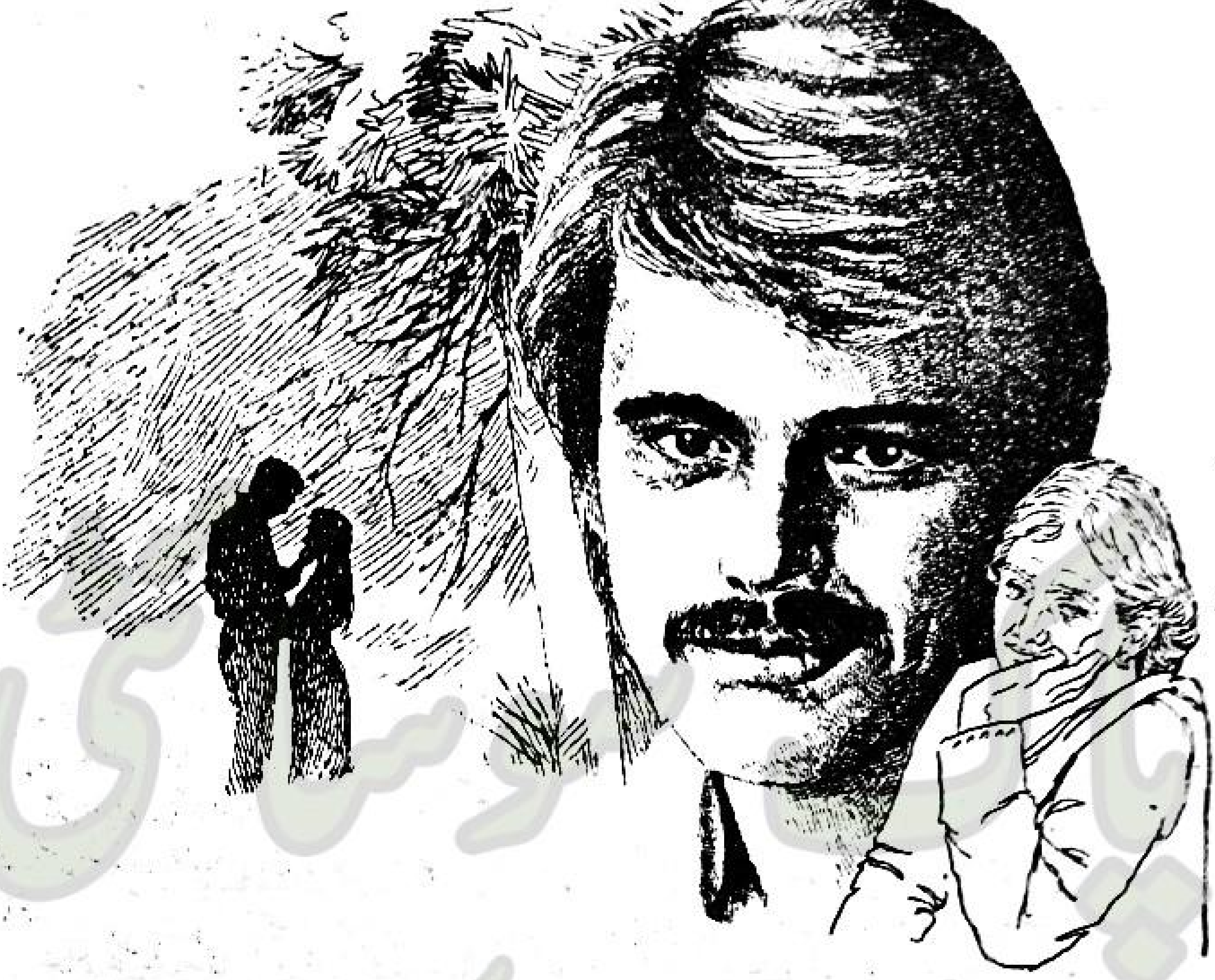
میں ایک طرف چکرا کر گر پڑی۔

سارا معاملہ سمجھ میں آچکا تھا۔ یہ فون صفیہ نے کیا تھا۔ اس نے کسی حضرت صاحب کو فون کرنے کے لیے مجھ سے میرا موبائل لیا اور کسی کو اکبر بھائی کی اطلاع دے دی۔

یہ ٹھیک ہے کہ صفیہ گرفتار ہو گئی۔ میری جان چھوٹ گئی تھی لیکن ان دو چار دنوں میں جس کرب کا تجربہ میں نے کیا ہے وہ بتایا نہیں جا سکتا۔

میں جیسے سولی پر لٹک کر رہ گئی تھی۔

میں نے بتایا تھا کہ یہ ایک مختصر سی کہانی ہے۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن ایک بہت بڑی بات اور ایک بہت بڑا سبق یہ ہے کہ خدا کے لیے کبھی بھی اپنا موبائل فون کسی اور کو استعمال کرنے نہ دیں۔ آپ کو کیا اندازہ کہ وہ کس سے کیا باتیں کر گیا ہے۔



تہی داماں

محترمہ عذرا رسول
سلام مسنون
یہ سرگزشت میری ایک جاننے والی کی ہے جسے میں نے کہانی کے انداز میں تحریر کیا ہے۔ سبق آموز ہے اس لیے سرگزشت کے لیے بھیج رہی ہوں۔ اُمید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

ڈاکٹر نرگس وقار
(کراچی)

کالج سے گھر آئی تو دیکھا کہ حیدرآباد سے خالہ اماں، خالو صاحب اور عمیر آئے ہوئے تھے۔ خالہ اماں نے مجھ سے لپٹ کر ڈھیروں دعائیں دیں۔ خالو صاحب بھی حسبِ معمول بزرگانہ شفقت سے ملے۔ سلام دعا سے فارغ ہو کر میں کچن میں آگئی۔ امی کھانا تیار کر چکی تھیں۔ میں نے سلاد اور رائتہ بنایا۔ امی کباب فرائی کرتے ہوئے بولیں۔
”نورتم جلدی سے کھانے کی ٹیبل سیٹ کرو۔“
میں کھانے کی ٹیبل پر برتن لگا رہی تھی کہ بھیا اور عمیر

بھی آگئے۔ تبھی امی نے بھیا کو آواز دی تو وہ کچن کی طرف چلے گئے موقع ملتے ہی عمیر میرے قریب آگئے۔

''نور، بہت پیاری لگ رہی ہو۔ نکھری نکھری چاندنی کی طرح۔''

ابھی وہ کچھ اور بولتے کہ بھیا سالن کا ڈونگا اٹھائے آن پہنچے۔

''ہاں بھئی کھانا شروع کرو۔'' امی نے حکم صادر کیا اور سب ٹیبل پر آگئے۔

سب کھانے میں مصروف تھے لیکن عمیر کی نگاہوں کی تپش مجھے اپنے ٹھنڈے وجود پر محسوس ہو رہی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر سب لاؤنج میں آگئے۔ امی نے مجھ سے چائے لانے کو کہا۔ میں کچن کی طرف چلی گئی۔

کچھ ہی دیر بعد چائے دم کر کے میں لاؤنج میں آگئی۔

چائے پینے کے دوران خالو صاحب مجھ سے میری اسٹڈی کے بارے میں پوچھتے رہے۔ باتوں کے دوران ایک دو بار میری نگاہ اٹھی تو عمیر کو اپنی جانب متوجہ پا کر میں نروس ہو گئی۔

میں نے چائے کے برتن سمیٹ کر کچن میں رکھے اور اپنے کمرے میں آگئی۔ عمیر اور بھیا بھی میرے کمرے میں آگئے۔ عمیر آتے ہی بولے۔ ''نور یہ کیسی میزبانی ہے۔ تمھارے مہمان بیٹھے ہیں اور میزبان اپنے کمرے میں دراز ہیں۔''

تبھی امی کی آواز گونجی اور بھیا اٹھ کر چلے گئے۔ عمیر موقع ملتے ہی میرے قریب چلے آئے۔ ان کی آنکھوں میں محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور لبوں پر دلکش مسکراہٹ تھی۔

''نور میں...... میں خاص طور پر تم سے ملنے آیا ہوں۔ کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

میں نے جواباً مسکراتے ہوئے عمیر کو دیکھا۔ ''عمیر اتنا تکلف آپ تو خاصے ویل مینرڈ ہو گئے ہیں۔''

عمیر ہنستے ہوئے بولے۔ ''نور میں تو ہمیشہ سے ویل مینرڈ رہا ہوں البتہ تم......'' پھر جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور شرارت سے مجھے دیکھنے لگے۔ ''اچھا چھوڑو۔ میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ نور میں تم سے یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں......''

ابھی عمیر کا جملہ مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ بھیا واپس آگئے اور عمیر کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ ''عمیر بھائی جلدی آیئے، بوم بوم اتنے زبردست چوکے چھکے مار رہا ہے۔ کچھ دیر قبل یوں لگ رہا تھا کہ پاکستان میچ ہار جائے گا لیکن کمال کر دیا ہمارے بوم بوم نے۔'' بھیا، عمیر کو کھینچتے ہوئے ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھ گئے۔ عمیر کی بات ادھوری رہ گئی۔

جانے عمیر کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ کچھ نہ کہنے پر بھی ان کی گہری مسکراہٹ اور بولتی آنکھیں بہت کچھ کہہ گئی تھیں۔

میرے گرد خوب صورت سوچوں کا میلہ تھا۔ میں سوچوں کے حصار میں مقید تھی اور حصار توڑنا نہیں چاہتی تھی لیکن امی کی اچانک آمد نے خوب صورت حصار توڑ دیا۔ میں نے جلدی سے پاؤں سمیٹ کر امی کو اپنے برابر میں جگہ دی۔

امی میرے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ''نور! تمھاری خالہ اماں صرف ملنے نہیں آئی ہیں بلکہ اس دفعہ ان کے آنے کا مقصد کچھ اور ہے۔ انھوں نے بڑی اپنائیت اور خلوص سے تمھیں عمیر کے لیے مانگا ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟''

''امی آپ خود جو بہتر سمجھیں کریں۔''

''نور! مجھے اور تمھارے ابو کو تو عمیر پسند ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ عمیر جیسا لڑکا بطور داماد ملے۔ لیکن بیٹی تمھارے ابو چاہتے ہیں کہ تمھاری مرضی معلوم کی جائے اور تمھاری پسند کو اولین ترجیح دی جائے۔''

میں نے محبت سے امی کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''امی ہر ماں باپ اولاد کی خوشی چاہتے ہیں اور اپنے تجربات کی روشنی میں اولاد کے لیے بہترین فیصلے کرتے ہیں۔ آپ کا اور ابو کا جو بھی فیصلہ ہوگا۔ وہ میں خوشی خوشی قبول کروں گی۔''

امی محبت سے مجھے گلے لگاتے ہوئے بولیں۔ ''جیتی رہو بیٹی مجھے تم سے یہی امید تھی۔''

امی کمرے سے چلی گئیں تو میں نے ایک بار پھر خیالوں کی بستی میں پناہ لے لی۔ ہمیشہ جب بھی سب کزنز ایک ساتھ جمع ہوتے تو خوب شور ہنگامہ رہتا۔ کبھی کیرم کھیلتے، کبھی اونو تو کبھی لوڈو۔ اس دوران چائے، کولڈ ڈرنک اور آئس کریم کا دور بھی چلتا رہتا۔ اکثر میں اور عمیر پارٹنر ہوتے لیکن یہ تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن عمیر لائف پارٹنر بننے کی پیشکش کر دیں گے۔

''نور امی بلا رہی ہیں۔'' بھیا کی آواز نے خیالوں کی اس حسین وادی سے کھینچ لیا۔

میں نے پاؤں میں سلیپر ڈالے، دوپٹا لیا اور امی کے

کمرے کی طرف آ گئی۔

امی کے کمرے میں خالہ اماں بھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی خالہ اماں نے محبت سے بانہیں پھیلائیں تو میں بھی خلوص سے ان میں سما گئی۔

دو چار دن بعد خالہ اماں نے واپسی کے لیے رختِ سفر باندھا۔ عمیر مزید رکنا چاہ رہے تھے لیکن ماں باپ کے سامنے بے بس تھے پھر بھی موقع پاتے ہی عمیر میرے کمرے میں چلے آئے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ وہ دھیرے سے بولے۔

"نورا تم خوش تو ہو؟"

کچھ پل خاموشی میں کٹ گئے۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ "جانتی ہو خاموشی رضامندی کی علامت ہے۔ تمہارے بارے میں فی الحال تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے اپنی ذات سے بڑھ کر تم پر یقین ہے۔ میں دل کی تمام تر سچائیوں اور گہرائیوں سے تمہیں چاہتا ہوں۔ بس ایک بات یاد رکھنا حساس دل آبگینوں کی طرح نازک ہوتا ہے۔ ذرا سی ٹھیس پر ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔" وہ کچھ اور بولتے مگر بھیا کی آواز پر وہ جانے کے لیے اٹھ گئے۔

"اچھا نور میں چلتا ہوں۔ اللہ حافظ نہیں کہو گی؟"

عمیر کے لہجے میں زمانے بھر کی محبت تھی۔

میں نے مسکراتے ہوئے اللہ حافظ کہا تو وہ بولے۔

"نورا تمہاری یہ مسکراہٹ مجھے جینے کی نوید دیتی ہے۔ تمہیں شاید خبر بھی نہ ہو کہ تم اس مسکراہٹ کے سنگ میرے دل کی بستی میں آباد ہو۔" پھر وہ تیزی سے پلٹ کر کمرے سے نکل گئے۔

خالہ اماں اور امی جان کا فون پر رابطہ رہتا تھا۔ امی کی زبانی خبریں ملتی رہتی تھیں کہ خالہ اماں کی خواہش ہے کہ عمیر سے پہلے بہنوں کے ہاتھ پیلے ہو جائیں۔

میرے گھر والوں کو بھی اس بات پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ کیوں کہ بقول امی جان ابھی ہمیں بھی شادی کی تیاری کے لیے کافی وقت چاہیے۔ گو کہ ہمارے معاشرے میں بیٹی کے پیدا ہوتے ہی ماں باپ جہیز کی فکر میں لگ جاتے ہیں لیکن پھر بھی بیٹی کی رخصتی تک کچھ نہ کچھ چلتا رہتا ہے۔

وقت کا پہیا گھومتا رہا۔ ماہ و سال بھی آنکھ میچے گزر رہے تھے۔

عمیر اکثر فون پر بات کرتے رہتے۔ ان کی محبتوں کی خوشبو میرے چار سو تھی۔ کبھی میں ان سے نہ ملنے کا شکوہ کرتی تو بہت پیار سے کہتے۔ "نور دل تو چاہتا ہے ایک پل بھی تمہیں آنکھوں سے اوجھل نہ کروں لیکن کیا کروں۔ گھر کی ذمے داری پلس جاب کی ذمے داری چکی کے دو پاٹ کی طرح ہے اور میری چاہت، میری محبت ان دو کے درمیان پس رہی ہے۔"

جوں جوں وقت گزر رہا تھا عمیر کی مصروفیت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ خالہ اماں کا کبھی کبھار چکر لگتا تو وہ امی جان کو جلد شادی کی نوید سنا جاتیں۔

ایک آدھ بار امی نے خالہ سے پوچھا۔ "آپا! ماشاء اللہ آپ کی بچیاں اتنی پیاری ہیں، خاندان اچھا ہے۔ بچیاں جاب بھی کر رہی ہیں۔ اس دور میں گورنمنٹ کی جاب تو سونے کی کان کی طرح ہے۔"

تب خالہ کے چہرے پر مایوسی کے رنگ گہرے ہو جاتے اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ وہ ٹوٹے حوصلوں کو مجتمع کر کے کہتیں۔ "بہن! کیا بتاؤں، مجھے تو کبھی کبھار ایسا لگتا ہے کہ اس موئی جاب کی وجہ سے ہی ربیعہ اور رفیعہ کو بر نہیں مل رہے۔ ٹیچنگ کی وجہ سے چہروں پر سختی اور آواز میں کرختگی پیدا ہو گئی ہے اور پھر رہی سہی کسر بالوں سے جھلکتی چاندی نے پوری کر دی ہے۔ شاید آنے والے ان چاندی کے تاروں سے الجھ کر لوٹ جاتے ہیں۔"

وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ وقت کی رفتار کو دیکھتے ہوئے خالہ اماں نے "پہلے بڑی بیٹی کی شادی ہو" اس فارمولے کو بھی بالائے طاق رکھ چھوڑا تھا۔

اب تو خالہ اور خالو دونوں چاہتے تھے کہ جس کا بھی رشتہ پہلے آ جائے اسی کے ہاتھ پیلے کر کے اپنے ناتواں کندھوں سے ذمے داریوں کا بوجھ کم کریں۔

لیکن شومئی قسمت ہر آنے والے کو جب بڑی بہن کا پتا چلتا تو وہ اس سوال کے ساتھ کہ بڑی کی شادی کیوں نہ ہوئی۔ پیچھے ہٹ جاتا۔

مسلسل ڈپریشن میں رہنے کی وجہ سے خالو کی طبیعت خاصی خراب رہنے لگی تھی۔ بیٹیوں کے دکھ میں وہ دیمک زدہ لکڑی کی طرح کھوکھلے ہو رہے تھے۔

سورج کی روشن کرنیں آہستہ آہستہ شام کی سیاہی میں ڈھل رہی تھیں۔ ہر شے تاریکی کے غلاف میں لپٹ کر شام کے سناٹوں میں گم ہو رہی تھی۔

جانے کیوں آج کی شام بہت اداس اور بوجھل لگ رہی تھی۔ پچھلی رات خالہ اماں کے فون سے پتا چلا تھا کہ خالو

کی طبیعت کافی خراب ہے۔ شاید اس وجہ سے میرے چار سو اداسی کے رنگ پھیلے ہوئے تھے۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر میں دیر تک جائے نماز پر بیٹھی دعائیں پڑھتی رہی۔ خالو صاحب کی صحت کے لیے اپنے رب سے گڑگڑا کر دعا کرتی رہی لیکن شاید ہر دعا عرشِ معلیٰ سے ٹکرا ٹکرا کر واپس میرے دامن میں گرتی رہی کہ اچانک فون کی گھنٹی نے شام کے سناٹوں میں ہلچل مچا دی۔ ابو نے فون اٹھا لیا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ جائے نماز تہ کی، لاؤنج میں پہنچی تو امی، ابو اور بھیا پہلے سے موجود تھے۔

امی جان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور ابو کی خاموشی میں بھی دکھ بول رہے تھے۔ بھیا نے مجھے آگے بڑھ کر یہ دلخراش خبر سنائی کہ خالو کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ فوراً ہی ہم سب حیدر آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔

جب ہم پہنچے تو گھر میں کہرام مچا ہوا تھا، ہر آنکھ اشکبار تھی۔ عمیر کا چہرہ بھی حزن و ملال کی تصویر تھا۔ آنکھوں میں تیرتی نمی سے جھلکتے دکھ محبت پدری کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

ابو نے واپسی کے لیے سامان باندھنا شروع کر دیا تھا۔ گھر والے سوم کی رسومات سے فارغ ہو کر نڈھال نڈھال سے اپنے اپنے کمروں میں منہ سر لپیٹے پڑے تھے۔ اس سے سورج بھی اپنی تھکی ہاری ماند پڑتی کرنوں کو سمیٹ رہا تھا۔ گھر میں اترتی گہری شام میں کربناک سناٹے تھے اور فضاؤں میں سوگ رچا ہوا تھا۔ میں خود سوچوں کے حصار میں تھی۔ دل و دماغ میں عجب کشمکش تھی۔ بوجھل طبیعت کے ساتھ میں خاموشی سے لان میں آ گئی اور ایزی چیئر پہ آنکھیں بند کر کے نیم دراز ہو گئی۔

آہٹ پر آنکھیں کھولیں تو سامنے عمیر تھے۔ میں جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

عمیر کی گولڈن براؤن آنکھوں سے جھلکتی سرخی اور خوب صورت سراپے پر رینگتی تاریکیاں مجھے اور بھی نڈھال کر گئیں۔

میں نے کرب سے نگاہیں جھکا لیں۔ کچھ پل خاموشی کی نذر ہو گئے۔ پھر میں نے ہی ہمت کر کے اس جامد خاموشی کو توڑا۔ ”پلیز عمیر خود کو سنبھالیں۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ اگر آپ یوں حوصلہ ہار دیں گے تو خالہ اماں اور بہنوں کا کیا ہو گا؟“

”نورا! میں تم سے یہی کہنا چاہ رہا ہوں کہ میری ذمہ داریاں بہت ہیں۔ نہ جانے ان کو نبھانے سمیٹنے میں کتنا وقت لگے تم تو جانتی ہو میں سب کی آس ہوں، ماں کی بوڑھی آنکھوں میں بہنوں کے بجھے ہوئے چہروں میں، صرف ایک اُمید چمک رہی ہے کہ میں سب کو سمیٹ لوں گا۔ اس گھر کو بکھرنے نہیں دوں گا لیکن نورا میں تنہا یہ سب کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ ہاں اگر تمہاری چاہت میرے سنگ ہو گی تو میں ذمے داریوں کے اس سمندر کو پاٹ لوں گا۔ مجھ سے وعدہ کرو میرا انتظار کرو گی مجھے تنہا نہیں چھوڑو گی؟“

”آپ مجھ پر یقین رکھیے۔ میری زندگی میں صرف آپ ہیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔“

”مجھے تم پر خود سے بڑھ کر یقین ہے لیکن میرے دل میں وسوسوں کا میلہ بھی ہے۔ اندیشوں کی سرسراہٹ میرے وجود کو لرزا رہی ہے۔ یہ وقت مناسب نہیں لیکن میں اپنے اندر کا خوف تم سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ کچھ دیر کے لیے رکے پھر سانس لے کر بولے۔ ”نورا! مجھے تمہارے خلوص پر بھروسا ہے لیکن نہ جانے کیوں مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم میرے گردشِ حالات سے گھبرا کر میری مشکلات سے تنگ آ کر مجھ سے ناتا توڑ نہ لو۔“

”میں پھر یہی کہوں گی کہ ایسے وسوسے اپنے دل سے نکال دو جو ہماری محبت میں دراڑ ڈال دیں۔“

چند دنوں بعد ہم لوگ واپس کراچی آ گئے۔

خالہ اماں اپنی عدت کے دن کاٹ رہی تھیں۔ عمیر آفس کے جھمیلوں میں مصروف ہو گئے۔ بس فون پر ہیلو ہائے رہتی۔ خالہ اماں کے فون سے پتا چلا کہ عمیر جاب کے لیے دبئی کی کوشش کر رہے ہیں۔

چند روز بعد عمیر آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں اٹیچی دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ دبئی میں جاب کا بندوبست ہو گیا۔

اگلی صبح عمیر کی فلائٹ تھی۔ دبئی میں انہیں جاب مل گئی تھی۔ عمیر چہرے پر خوشی اور دکھ کے جذبات سجائے ہم سب سے مل کر رخصت ہو گئے۔

وقت دبے پاؤں سرک رہا تھا۔ میں عجب کشمکش میں تھی۔ گھر میں آنے جانے والا ہر شخص امی سے ایک سوال کرتا کہ بیٹی کی رخصتی کب کرو گی۔ امی ہر ایک کو ایک ہی جواب دیتی رہتیں کہ جب رب چاہے گا۔

سردیوں کی ایک ٹھٹھرتی شام میں اپنے کمرے میں تھی کہ سیل کی گھنٹی بجنے لگی۔ میرے دل سے آواز آئی۔ عمیر ہوں گے۔ آج تو ان کی اچھی طرح خبر لوں گی۔ اتنے دنوں بعد فون کیا، یہ سوچتے ہوئے میں نے جلدی سے سائیڈ ٹیبل

سے فون اٹھا لیا۔ ”آج آپ کا کوئی بہانہ نہیں چلے گا اتنے دن بعد فون کیا۔ میں آپ سے ناراض ہوں فون بند کر رہی ہوں۔“

”پلیز...... پلیز مجھے بولنے کا موقع تو دیں اور یہ غصہ کس پر کر رہی ہیں جانتی ہیں غصہ حرام ہوتا ہے۔“

کچھ پل کے لیے میں اس آواز کے سحر میں ڈوب گئی۔ جانے کون تھا اور کیا کہہ رہا تھا۔ مجھے کچھ نہ سوجھا تو میں نے جلدی سے فون سوئچ آف کر دیا۔ اگلے دن پھر اسی ٹائم فون کی گھنٹی بجی تو میں نے غیر ارادی طور پر فون ریسیو کر لیا۔ دوسری طرف سے وہی دلکش آواز ابھری۔ ”پلیز موبائل آف نہیں کیجیے گا۔ میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“

”آپ ہیں کون؟ اور کیوں فون کر رہے ہیں؟“

”میں آپ کا دوست ہوں اور فون اس لیے کر رہا ہوں کہ کچھ آپ کی سنوں اور کچھ اپنی سناؤں۔ مجھے شاہ زین کہتے ہیں اور آپ کا نام؟“

میں نے کوئی جواب نہ دیا تو دوبارہ اس کی دلکش آواز ابھری۔ ”چلیے میں آپ کو دوست کہہ کر......“ میں اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”آپ خوامخواہ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ پلیز مجھے تنگ نہ کریں۔“

”نو۔ نو دوست میں آپ کو تنگ بالکل نہیں کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ دراصل میں بہت تنہا ہوں۔ تنہائیوں سے گھبرا کر دوستوں کی تلاش میں نکل پڑا ہوں۔“

میں نے محسوس کیا کہ خوب صورت لب و لہجے میں اداسیاں رچی ہوئی تھیں۔ میں نے خود کو نارمل کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تنہا مطلب؟“

وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ”مطلب یہ کہ میں جب صرف چار برس کا تھا تو ماما کا ساتھ چھوٹ گیا۔ عمر کے کچھ ماہ و سال بیتے تو بوا کی باتوں سے یہ پتا چلا کہ میری ماما کو بلڈ کینسر تھا۔ بقول بوا وہ کافی عرصہ میری خاطر اپنی بیماری سے جنگ کرتی رہیں لیکن ایک تاریک رات ماما نے بیماری سے لڑتے لڑتے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔ بہن بھائی کوئی نہیں تھا۔ رہ گئے بابا۔ بابا سال کے بارہ مہینوں میں سے بمشکل ایک ماہ میرے ساتھ گزارتے ہیں۔ ان کا زیادہ وقت پاکستان سے باہر گزرتا ہے لیکن دوست وہ میرے آرام و آسائش کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ جانتی ہو صرف ایک شاہ زین کے لیے گھر میں نوکروں کی فوج ہے لیکن کیا کروں یہ سب میرے دوست نہیں۔ جن سے میں اپنی ذات

ایک تقریب میں امیر الامرا کا یہ شعر میرے سامنے پڑھا گیا۔

بگذر مسیح از عیر ما کشتگان عشق
یک زندہ کردن تو بصد خون برابر است

چونکہ میری طبیعت موزوں ہے۔ کبھی آورد سے اور کبھی بے ساختہ مصرع رباعی یا شعر موزوں کر لیتا ہوں۔ اس وقت بے اختیار یہ شعر زبان پر آ گیا:

از من متاب رُخ کہ نہ یم بے تو یک نفس
یک دل شکستن تو بصد خون برابر است

جب یہ شعر دربار میں پڑھا گیا تو حاضرین میں سے بعضوں نے جن کی طبیعت موزوں تھی اسی زمین میں شعر کہہ کر پیش کیے۔ ملا علی احمد مہر کن نے بھی اسی زمین میں یہ شعر کہا اور اچھا کہا

اے محتسب از گریہ پیر مغان مترس
یک خم شکستن تو بصد خون برابر است

اقتباس: تزک جہانگیری
مرسلہ: شاہد جہانگیر شاہد۔ پشاور

شیئر کر سکوں۔ اچھا چھوڑو، میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ چلیے اب دوستی پکی۔ بوا آواز دے رہی ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے لائن ڈسکنیکٹ کر دی۔

میں دیر تک شاہ زین کی زندگی کے بارے میں سوچتی رہی۔ مجھے اس کی ذات سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

پھر شاہ زین باقاعدگی سے فون کرنے لگا۔ میں بھی اس سے ڈھیروں باتیں کرتی۔ زندگی کے ہر موضوع پر ہم دونوں دل کھول کر بولتے۔

امی بھیا وغیرہ یہی سمجھتے کہ عمیر کا فون ہوگا اس لیے کسی قسم کی مداخلت بھی نہ ہوتی اور دوستی کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ عمیر کا فون آتا لیکن انتہائی مختصر۔ وہ اپنی جانب میں مصروف تھے۔ ایک روز موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہوا کے سنگ بادل انجان مسافر کی طرح اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ سورج بھی بادلوں کی اوڑھنی میں چھپا بیٹھا تھا۔ گھر کے لان میں امی، بھیا اور میں چائے اور سموسوں کے ساتھ موسم کو انجوائے کر رہے تھے کہ میرے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ امی نے موبائل کی طرف ہاتھ

بڑھایا تو چائے کا کپ میرے ہاتھ میں لرز گیا لیکن شکر خدا کا امی نے اخلاق کا مظاہرہ کیا اور یہ کہتے ہوئے فون مجھے پکڑا دیا کہ ”اگر عمیر کا فون ہو تو میری طرف سے خیریت پوچھ لینا۔“

میں ہیلو کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دوسری طرف حسب معمول شاہ زین تھا۔ شاہ زین اب بڑی بے تکلفی سے میرا نام لیتا تھا۔ حسب عادت وہ بولا۔ ”نور اتنے اچھے موسم میں گھر میں بند بیٹھی ہو۔ جلدی سے آجاؤ کہیں گھومنے چلتے ہیں۔“

”میں کیسے آسکتی ہوں؟“

”ارے بے وقوف لڑکی کسی دوست کے ہاں جانے کا کہہ کر آجاؤ۔ اپنے گھر سے قریب تر کوئی پوائنٹ بتا دو میں تمہیں پک کرلوں گا۔“

”شاہ زین یوں اس طرح تم سے ملنا بہت مشکل ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرا امگیتر بہت نیرو مائنڈ میرا مطلب ہے بہت کنزرویٹو ہے اور پھر ہمارے گھرانے میں اور پلس معاشرے میں بھی لڑکی اور لڑکے کی دوستی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔“

”نور! میری بات کا برا نہیں منانا۔ دیکھو تمہارا امگیتر ہی نہیں تم خود بھی بہت دقیانوسی خیالات رکھتی ہو۔ اچھی لڑکی یاد رکھو دوست دوست ہوتا ہے۔ لڑکی لڑکا کچھ نہیں ہوتا۔“

میں ایک بار پھر شاہ زین کی آواز کے سحر میں کھو کر سب کچھ بھول گئی۔ میں امی سے اپنی دوست مائرہ کے ہاں جانے کا کہہ کر گھر سے نکل گئی۔

شاہ زین کی فرمائش پر میں نے بلیک کلر کا سوٹ پہنا تھا۔ میں جب مخصوص پوائنٹ پر پہنچی تو ایک خوبرو نوجوان اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ بلیک کلر کے سوٹ میں بلیک لینڈ کروزر سے ٹیک لگائے میرا منتظر تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی اور جھیل کے پانی کی طرح گہری نیلی آنکھوں میں شوخیاں رقص کررہی تھیں۔ اس نے میرے لیے فرنٹ ڈور کھولا اور خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔

میں بار بار ٹشو میں ماتھے پر آئے پسینے کے قطرے جذب کررہی تھی۔ ایئر کنڈیشن گاڑی میں میرا چہرہ پسینے میں شرابور دیکھ کر وہ ہولے سے مسکرایا اور تھوڑا جھک کر میرے چہرے کے قریب آکر بولا۔ ”نور! تم بہت نروس ہورہی ہو۔ لگتا ہے۔ اکیلے پہلی بار گھر سے باہر نکلی ہو۔ ڈرو نہیں ایسی سہمی بیٹھی رہو گی تو انجوائے کیا خاک کریں گے۔ پلیز خود کو نارمل رکھو۔“

اس ملاقات کے بعد تو ایک سلسلہ چل نکلا۔ میں نے گھر سے نکلنے کی خاطر ایک کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن لے لیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ میں اور شاہ زین دوستی کے سرکل سے نکل کر محبت کے سرکل میں آگئے۔

ہم دونوں پہروں باتیں کرتے لیکن اگر کبھی میں عمیر کا ذکر کردیتی تو شاہ زین کا موڈ آف ہوجاتا۔ حسب معمول میں اپنے کمرے میں شاہ زین سے گپ شپ کررہی تھی کہ بھیا کی تیز آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

میں نے جلدی سے فون سوئچ آف کرکے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ ”نورا! عمیر بھائی بہت دیر سے تمہیں فون کررہے ہیں لیکن تمہارا فون مسلسل انگیج مل رہا ہے۔“

”نہیں بھیا! میرا فون تو قطعی انگیج نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے عمیر نے رانگ نمبر ملا لیا ہو۔“ میں نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے نظریں جھکالیں۔

بھیا دوبارہ بولے۔ ”کل عمیر بھائی آرہے ہیں۔“

اگلے دن بھیا نے مجھے ایئرپورٹ چلنے کے لیے کہا لیکن میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے انہیں ٹال دیا۔

عمیر بھی ایئرپورٹ سے سیدھے حیدرآباد چلے گئے لیکن اگلے ہی دن وہ خالہ کے ساتھ آگئے۔ دونوں بہت خوش تھے۔

عمیر کی دونوں بہنوں کی شادی تھی اور خالہ اماں کی یہ خواہش تھی کہ بیٹے کے ولیمے میں وہ دونوں بیٹیوں کو رخصت کردیں۔ اسی سلسلے میں وہ امی اور ابو سے بات کرنے آئی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں آگئی۔ کچھ ہی دیر بعد عمیر بھی آگئے۔ وہ مجھ سے بہت اپنائیت اور محبت سے باتیں کررہے تھے لیکن مجھے ان کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شاید میں فزیکلی تو ان کے قریب تھی لیکن مینٹلی میری ذات، میرا وجود، میری سوچیں شاہ زین کے گرد گھوم رہی تھیں۔ عمیر جلد ہی میرے سرد رویے کو محسوس کرتے ہوئے بولے۔

”نور کیا بات ہے؟ مجھ سے ناراض ہو۔ جانتا ہوں تمہیں انتظار کی کڑی مسافت طے کرنی پڑی لیکن اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔ تم سے دور رہ کر میں خود بھی جدائی کی دھوپ میں جلتا رہا ہوں لیکن میری زندگی کے ہر پل میں تم میری ہمسفر رہی ہو۔ انشاء اللہ بہت جلد تمہیں دلہن بنا کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ پلیز اب تو مسکرادو۔“

تبھی بھیا نے انہیں پکارا۔ وہ ان کی آواز پر اٹھ کر

چلے گئے، تو میں نے بھی شکر ادا کیا۔

ان دنوں میں عجب کشمکش میں تھی کہ عمیر کو کیسے بتاؤں کہ میری ذات منقسم ہو چکی ہے اور جب میں شاہ زین اور عمیر کا موازنہ کرتی ہوں تو شاہ زین کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے۔

میں سوچوں کی ڈور میں الجھی ہوئی تھی کہ شاہ زین کا فون آ گیا۔ میں نے جلدی سے کمرا اندر سے لاک کیا۔ ''ہیلو زین۔''

''کیا ہوا دوست۔ آج تمہارے لب و لہجے میں اداسیاں رچی ہوئی ہیں۔ جلدی بتاؤ کیا بات ہے۔ دیکھو دوست اتنا تو میں سمجھ گیا ہوں کہ آج تم کسی مسئلے میں الجھی ہوئی ہو۔''

''نہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''اچھا اگر کوئی مسئلہ نہیں ہے تو جلدی سے اپنے مخصوص پوائنٹ پر پہنچو۔''

''نہیں آج مشکل ہے۔''

''نور یہ لفظ مشکل اپنی زندگی سے نکال دو۔ کچھ مشکل نہیں۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔ جلدی سے آؤ۔''

''کہا ناں آج میں نہیں آ سکتی۔''

''کیوں؟''

''وہ دراصل عمیر اور خالہ آئے ہوئے ہیں۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے عمیر کی گھنٹی کیوں گلے میں باندھ رکھی ہے۔ دیکھو یہ عمیر تمہارے راستے کا پتھر ہے اور اسے تم ہی ہٹا سکتی ہو۔''

''شاہ زین میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کیا کروں۔ عمیر کو کیسے منع کروں۔ اگر یہ رشتہ میں خود ختم کرتی ہوں تو امی ابو بہت دکھی ہوں گے اور شاید مجھے کبھی معاف نہ کریں۔''

''تم ہمت کر کے گھر سے نکلو پھر کہیں بیٹھ کر اس مسئلے کا حل ڈھونڈتے ہیں۔''

''او کے زین! امی آواز دے رہی ہیں۔'' میں سیل آف کر کے کچن میں آ گئی۔

''بیٹی! تم کہاں مصروف ہو۔ تمہاری خالہ تمہیں کئی بار پوچھ چکی ہیں۔''

''او کے امی میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ آپ خالہ اماں کو کمپنی دیجیے۔''

''نور چائے صرف دو کپ نکالنا، میری اور خالہ اماں کے لیے۔ عمیر اور عدنان کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔'' امی

جمال الدین آق سرای

(791ھ/1289ء)

ایک ترکی فلسفہ داں اور متکلم۔ آق سرای کے مقام پر پیدا ہوا اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ امام فخر الدین رازی کا پڑپوتا تھا اور جمالی کے نام سے مشہور تھا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آق سرای کے مدرسہ زنجرل میں مدرس مقرر ہوا۔ اس نے اپنے شاگردوں کو جو ایک کثیر تعداد میں تھے تین گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلی جماعت اور گروہ کو ''مشائیون'' کہا جاتا تھا۔ یہ شاگرد اس کے گھر کے دروازے پر جمع ہو جاتے اور اس کے ساتھ مدرسے تک جاتے اور جمال الدین انہیں چلتے چلتے درس دیتا تھا۔ دوسری جماعت ''رواقون'' کی تھی جو مدرسے کے ستونوں کے نیچے اس کا انتظار کرتے تھے۔ جہاں ان کا استاد انہیں کھڑے کھڑے سبق دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ تیسرے گروہ کے پاس جاتا تھا جو مدرسے کے بڑے کمرے میں موجود ہوتے تھے۔ حسام الدین نے اپنی کتاب ''اماسہ تاریخی'' میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ حاجی شادگلدی کے ہاں قاضی عسکرے کے عہدے پر فائز تھا جب موخر الذکر کو میواس کے امیر قاضی برہان الدین کے ہاتھوں شکست ہوئی تو 783ھ/1381ء میں جمال الدین آق سرای چلا گیا۔ جمال الدین کی وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ براکلمان نے 778ھ۔1377ء طاہر بروسلی نے 792ھ/1389ء اور عدنان ادوار نے 790ھ/1388ء بیان کی ہے۔ اس کے شاگردوں میں علامہ ملا فناری جیسے صاحب علم لوگ تھے۔ جمال الدین کی تصانیف اخلاق جمالی، شرح الغایۃ القصوی، شرح الایضاح شرح مشکلات القرآن الکریم، حال، الموجز، حاشیہ، المتلقی شرح اللباب المسمی بکشف الاعراب وغیرہ ہیں۔

مرسلہ: نور محمد کوہستانی۔ دولت پور

مجھے ہدایات دے کر جانے کے لیے پلٹیں تو میں نے اپنے وجود کی ساری ہمتیں مجتمع کر کے کہا۔ ''امی میں خالہ اماں کے پاس تھوڑی دیر ہی بیٹھ پاؤں گی۔''

''کیوں؟''

''امی دراصل آج کمپیوٹر کا ٹیسٹ ہے۔''

امی مجھے گھورتے ہوئے بولیں۔ ''بہت ضروری ہے کیا؟''

''جی امی۔''

''اسی دن کے لیے میں داخلے کو منع کر رہی تھی۔'' امی شاکی لہجے میں بولتے ہوئے لاؤنج کی طرف بڑھ گئیں۔

میں چائے دم کر کے لاؤنج میں آئی تو امی خالہ اماں کو کمپیوٹر میں داخلے کی داستان سنا رہی تھیں۔ خالہ اماں مجھے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''اچھا کیا بیٹی تم نے کمپیوٹر سیکھ لیا۔ اس موئے کے بغیر تو اب گزارہ مشکل ہے۔ تم جاؤ جا کے اپنا ٹیسٹ دو۔ میں اور تمہاری امی بھی ابھی دو چار لوگوں سے ملنے جائیں گے۔ رات کو انشاء اللہ گپ شپ کریں گے۔''

میں نے چائے کے خالی برتن سمیٹ کر کچن میں رکھے۔ کمرے میں آکر ڈریس چینج کیا۔ کپڑے کا ہم رنگ شولڈر بیگ کندھے پر ڈالا اور گھر سے نکل آئی۔ مخصوص جگہ پر شاہ زین میرا منتظر تھا۔

میں دل ہی دل میں بہت خوش تھی۔ شاہ زین جیسا محبت کرنے والا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

شاہ زین نے کبھی مجھے انتظار کی سولی پر نہیں چڑھایا۔ بلکہ ہمیشہ جب میں پہنچتی تو وہ ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ سجائے آنکھوں میں محبت کی شمعیں جلائے انتظار کے موسم میں بھیگ رہا ہوتا۔ میں سوچوں کے صحرا میں بھٹک رہی تھی کہ شاہ زین کی آواز پہ چونک گئی۔

''نور اتنی پریشان کیوں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں۔''

شاہ زین کی ہمدردی پا کر آنسو ضبط کے سارے بند توڑ کر بہہ نکلے۔

''دیکھو نورا ایسے نہیں چلے گا۔ یہ رونا دھونا بند کرو۔ پلیز...... تمہارے آنسو میرے دل پہ بھاری پتھر کی طرح گر رہے ہیں۔'' شاہ زین کی خوب صورت باتوں اور اس کی آواز کے سحر میں ایک بار پھر میں گم ہو گئی۔

ہاکس بے پر خوب صورت ہٹ کے سامنے گاڑی روک کر شاہ زین نے مجھے اترنے کے لیے کہا۔

''شاہ زین یہ آپ اتنی دور کہاں آگئے۔''

''نور یہ میرا گھر بلکہ ہمارا گھر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب خود میں تنہائیوں سے گھبرا جاتا ہوں تو یہاں آکے ٹھہر جاتا ہوں، مجھے بہت سکون ملتا ہے۔ جانتی ہو سمندر کی یہ لہریں جب میرے وجود سے ٹکراتی ہیں تو میں سب کچھ بھول کر ان لہروں میں گم ہو جاتا ہوں۔''

کچھ دیر میں اور شاہ زین ساحل سے سر پٹختی لہروں میں گم رہے۔ پھر زین میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ ''نورا میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے جس سے تم عمیر سے اپنی جان چھڑا سکتی ہو۔''

''کیا؟ کیسے؟''

''دیکھو نور تم عمیر کی محبت کا امتحان لے ڈالو۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تم موصوف سے کہنا کہ اگر وہ واقعی تم سے پیار کرتے ہیں تو یہ پیار کی آزمائش ہے کہ وہ خود اس رشتے سے انکار کر دے یہ منگنی توڑ دے۔ تم کسی بھی طرح اسے اس بات پر آمادہ کرلو کہ وہ خود ہی منگنی توڑنے کا اعلان کر دے۔ اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔ تمہارے سر کوئی بات نہیں آئے گی۔ بلکہ سب کی ہمدردیاں تمہاری جھولی میں آئیں گی۔''

''شاہ زین! عمیر کو اس بات کے لیے تیار کرنا بہت مشکل ہے۔ کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔''

''کوشش کرنا انسان کا کام ہے، آگے قسمت۔''

''شاہ زین میرا دل گھبرا رہا ہے۔ واپس چلتے ہیں۔''

''نور تم بہت ڈرپوک لڑکی ہو۔''

زین نے ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے گھر کے قریب ڈراپ کر دیا۔ میں تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی گھر آگئی۔

بیگ سے اپنی چابی نکال کر مین گیٹ کھولا۔ گھر میں خاموشی تھی۔ شاید امی اور خالہ اماں ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے میں آگئی۔

وارڈ روب سے ہلکا سا کاٹن کا سوٹ نکالا۔ شاور لیا اور بیڈ پر آگئی۔

فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ دیکھا تو شاہ زین کا فون تھا۔ ''نور تمہاری خیریت کے لیے فون کیا تھا۔ طبیعت

کیسی ہے۔"

"شاہ زین میرے کمرے کی طرف کوئی آرہا ہے۔ اس لیے فون بند کررہی ہوں۔ رات میں بات کروں گی۔"

"اوکے بائے۔"

ہلکی سی دستک پہ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے عمیر کھڑے تھے۔

"نورا تم کہاں چلی گئیں تھیں۔"

"کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"اچھا! میں اور عدنان تو گئے تھے۔ پتا چلا کہ آج تم انسٹی ٹیوٹ گئی ہی نہیں۔"

"کیا مطلب! آپ مجھ پہ شک کررہے ہیں۔"

"نہیں نورا ایسا کچھ نہیں۔ بس مجھے وہم سا ہورہا ہے کہ تم کچھ کھنچی کھنچی سی ہو۔ کیا ناراض ہو۔"

"نہیں عمیر، وہ دراصل مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"بولو نور، کیا بات ہے۔"

"عمیر بقول آپ کے میں آپ کی محبت ہوں۔ زندگی ہوں پیار ہوں وغیرہ وغیرہ۔"

"نور جو کہنا ہے۔ صاف صاف کہہ دو۔ میں بھول بھلیوں میں بھٹکنے کا عادی نہیں ہوں۔"

"صاف صاف بات یہ ہے کہ عمیر میں آپ کے ساتھ شادی کے بندھن میں نہیں بندھ سکتی۔ میرے اور آپ کے لیے اچھا یہ ہوگا کہ آپ خود یہ رشتہ ختم کردیں۔"

"نورا دبئی سے واپس آکر تم سے مل کر مجھے اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ شاید اب میں اور تم ایک پگڈنڈی کے مسافر نہیں رہے۔ نورا! میں جانتا ہوں تم نے رستہ بدل لیا ہے۔ میں جان چکا ہوں کہ اب میں اور تم ایک ہی منزل کے راہی نہیں ہیں کیوں کہ تمہاری غیر موجودگی میں تمہاری یادوں کے سنگ تمہارے کمرے میں آیا تھا۔ میری حرکت غیر اخلاقی تھی لیکن وہ بہت سی الجھی گتھیوں کو سلجھا گئی۔ تمہارے وارڈ روب میں ان گنت وش کارڈز، سوکھے پھول، قیمتی پرفیومز اور بہت سے قیمتی تحائف اور سب سے بڑھ کر تمہاری پرسنل ڈائری۔ ان سب سے مجھے تمہاری منزل کا نشان مل گیا۔ خدا کرے تم شاہ زین کے ساتھ خوش رہو۔ بس اتنا یاد رکھنا رستے میں جو ملے اسے ہمسفر نہیں کہتے۔ میں اتنا جانتا ہوں، محبت جب رستے بدلتی ہے تو روح تک گھائل ہو جاتی ہے۔ بہت سے رشتے ایسے ہوتے ہیں، جنہیں انسان کبھی کسی لمحے کسی پل بھلا نہیں پاتا۔ شاید میں تمہیں کبھی نہ بھلا سکوں۔ ہاں، یہ سوچ کر اپنے ٹوٹے دل کی کرچیاں سمیٹ لوں گا کہ میرے خواب میری خوشیاں میری لازوال محبت، میری آرزوئیں اور تمنا میں سب کچھ میرے بابا کی طرح مجھے تنہا کرکے منوں مٹی تلے دفن ہوگئے ہیں۔"

میں نے نگاہ اٹھا کر عمیر کو دیکھا تو اس کے خوب صورت سراپے پر تاریک سائے رینگ رہے تھے۔

اگلی صبح سب کے لیے درد سمیٹ لائی۔ عمیر نے ناشتے پہ ہی خالہ اماں سے کہہ دیا کہ وہ یہ رشتہ ختم کررہے ہیں۔

"آخر کیوں؟" خالہ اماں عمیر پہ برس پڑیں۔

"اماں کیوں کا جواب میں آپ کو بعد میں دوں گا۔ فی الحال آپ یہ رشتہ ختم کریں اور فوراً واپس حیدرآباد چلیں۔"

"بیٹے تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ اتنے خوش خوش تم نور سے ملنے آئے۔ شادی کی تاریخ طے ہورہی ہے اور تم رشتہ ختم کررہے ہو۔ کیا نور نے کچھ کہہ دیا۔"

"اماں پلیز! آپ اس بحث میں نہ پڑیں۔"

امی اور بھیا دونوں ماں بیٹے کی تکرار سن کر پریشان کھڑے تھے۔

عمیر پلٹ کر قریب کھڑے بھیا کو گلے لگاتے ہوئے بولے۔ "عدنان نہ جانے اب ملاقات کب ہو۔ ہو سکے تو آپ لوگ مجھے معاف کردیجیے گا۔ صرف یہ سوچ کر کبھی کبھی انسان کو ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنا پڑتی ہے۔"

خالہ اماں امی سے لپٹ کر رونے لگیں۔ ابو نے دونوں کو حوصلہ دیا۔ نصیب کا لکھا سمجھ کر صبر کی تلقین کی۔ یوں یہ رشتہ ختم ہوگیا۔ شاہ زین کو میں نے فون پر سب بتا دیا۔

امی نے شروع شروع میں مجھ سے پوچھا کہ یہ سب کیوں ہوا؟ کہیں اس کی وجہ میں تو نہیں؟ لیکن میں نے بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بول کر امی کو مطمئن کردیا۔

شاہ زین کے فون آتے رہے، زیادہ تر ہم دونوں رات کو بات کرتے۔ کچھ دن بعد میں نے دوبارہ سے انسٹی ٹیوٹ جوائن کرلیا۔ میری اور شاہ زین کی ملاقات بھی تسلسل سے جاری تھی۔ امی ابو کو میری شادی کی فکر تھی۔ امی جلد از جلد میرے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں تھیں۔

ایک خوب صورت شام میں اور شاہ زین حسب معمول ساحل کی گیلی ریت پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ رہے تھے۔ چلتے چلتے شاہ زین نے میرا ہاتھ تھاما تو میں نے

برجستہ کہا۔ ''شاہ زین ہمیشہ کے لیے یہ ہاتھ کب تھامو گے؟ آج کل گھر میں میری شادی کی باتیں ہورہی ہیں۔ ایک رشتہ آیا ہوا ہے۔ امی اس پر غور بھی کررہی ہیں۔''

''اچھا یہ تو اچھی خبر ہے۔''

میں نے حیرانگی سے شاہ زین کو دیکھا۔ ''زین کیا مطلب ہے۔ اچھی خبر!''

''ارے بھئی! یہ اچھی خبر تو ہے کہ تم دلہن بن جاؤ گی۔''

''زین! میں مذاق کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔''

''نور میں بھی مذاق نہیں کررہا۔''

''وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے۔ تم اپنے بابا سے شادی کی بات کرو۔''

''نور! میں تمہیں دکھ دینا نہیں چاہتا۔ میرا ابھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مائنڈ نہیں کرنا۔ شاید مڈل کلاس کے لوگ نہیں جانتے کہ اپر کلاس میں شادی بھی ایک بزنس ڈیل ہوتی ہے۔ میں بابا کے ساتھ اسٹیٹ جارہا ہوں۔ بابا کا اسٹیٹ میں ہی سیٹل ہونے کا ارادہ ہے۔ بابا بھی اس شادی کے لیے تیار نہیں ہوں گے کیوں کہ میرے اور تمہارے طبقات میں واضح فرق ہے۔ اس لیے میں تمہیں مشورہ دے رہا ہوں کہ اب تمہارا جو بھی رشتہ آئے اسے قبول کرلینا۔ ہاں نور ایک اچھی دوست کے ناطے میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔''

شاہ زین کی باتیں سن کر میرے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک رہی تھی۔ میں نے اپنے ٹوٹے حوصلوں کو یکجا کر کے کہا۔

''زین تم وعدہ خلافی کررہے ہو۔''

''نور میں نے تم سے کبھی شادی کا وعدہ نہیں کیا۔ ہاں تم میری اچھی دوست ضرور ہو۔ تم واقعی بہت معصوم ہو۔ تمہیں خبر نہیں کہ بڑے لوگوں کا یہ بھی اسٹیٹس سمبل ہے کہ ان کی گرل فرینڈز کتنی ہیں۔ تمہارے ساتھ میں نے بہت وقت گزارا۔ ورنہ میں تو ہر روز نئی گرل فرینڈ کے ساتھ زندگی شروع کرتا تھا۔'' شاہ زین بول رہا تھا اور میرا وجود بکھر رہا تھا۔ رگ رگ میں درد اتر رہا تھا۔ اس کی باتیں میری نس نس کو چھید رہی تھیں۔ جی چاہ رہا تھا آج اپنے تمام تر دکھوں کے ساتھ اس گہرے سمندر میں پناہ لے لوں لیکن امی ابو اور بہت پیارے بھیا کا خیال مجھے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ یہ دکھ تو میرے اپنے ہیں۔ انہیں مجھے اپنے ہی دامن میں سمیٹنا ہوگا۔

میں خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ آج خلاف معمول شاہ زین بھی چپ تھا۔ شاید اسے میرے کرب کا اندازہ تھا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر اس نے گاڑی روکی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''نور! میں جلد ہی پاکستان چھوڑ دوں گا۔ تم میرا انتظار مت کرنا۔ میرا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔''

میں نے آنسوؤں کو دوپٹے کے پلو میں جذب کرتے ہوئے کہا۔ ''شاہ زین! تم نے اتنی جلد سب رشتے سب ناطے توڑ دیے؟ شاید تم صرف میرے تن کے تمنائی تھے۔ کاش میں اکیلے کمرے میں تم سے نہ ملا کرتی۔'' شاہ زین خاموش تھا۔ میں نے امیدوں کی ٹوٹی ڈور کو تھامتے ہوئے کہا۔ ''شاہ زین پاکستان میں تمہارے بابا کا بزنس ہے۔ تم رک بھی تو سکتے ہو۔ یہاں کا بزنس تم سنبھال لو۔''

''نور! پاکستان کے حالات جس تیزی سے خراب ہورہے ہیں۔ بزنس بالکل ٹھپ ہوگئے ہیں۔ پاپا اب کسی طور پاکستان میں رکنا نہیں چاہ رہے اور نہ مجھے پاکستان میں رہنا ہے۔ سو اس لیے اب تم اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہو۔''

جب اُمید کی آخری شمع بھی جل کر راکھ ہوگئی تو میں لٹی لٹی سی گاڑی سے اُتر کر گھر کی طرف چل دی۔

آج میں کس قدر تہی داماں تھی۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں وقت کے تھال سے دکھ کرب اور اشک کے موتی سمیٹ کر زندگی کی لڑی میں پرو لیے تھے۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کو بہت زیادہ آزادی کیوں نہیں دی جاتی۔ اس لیے کہ نا تجربے کاری ان کے لیے پھندا بن جاتی ہے۔ زندگی تباہ ہوجاتی ہے۔ کاش میں نے بڑوں کے تجربے سے فائدہ اٹھایا ہوتا خود اپنی منزل کو تلاش کرنے کی غلطی نہ کرتی اس لیے تو لہولہو ہوگئی ہوں مگر نہیں، حقیقت کچھ اور ہے۔ ٹھوکر لگنے کے بعد سنبھلنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور اپنوں کی پہچان ہوتی ہے۔ کئی دن تک اپنے کمرے میں بند ہوکر سوگ مناتی رہی۔ اسی دوران میں ایک دن یوں ہی موبائل سے کھیلتے ہوئے عمیر کا نمبر دب گیا۔ عمیر نے مس کال سمجھی اور پہلے کال کی پھر حیدرآباد سے دوڑے چلے آئے۔ آتے ہی بولے۔ ''مجھے یقین تھا میری محبت سچی ہے!!''



کہانی صرف اتنی تھی کہ مجھے نزلہ ہو گیا تھا اور ہلکی ہلکی کھانسی بھی تھی۔
بس اتنی سی بات تھی اور قسمت مجھے گھیر کر ڈاکٹر قریشی کے پاس لے گئی۔
ڈاکٹر قریشی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔
''کیا زبردست ڈاکٹر ہے، کیسی شفا ہے اس کے ہاتھ میں۔ ارے جناب وہ تو بستر پر لیٹے ہوئے مایوس مریضوں تک کو کھڑا کر دیتا ہے۔''

بتنگڑ

محترم مدیر سرگزشت
السلام علیکم!
میں اسی شہر کراچی کا رہنے والا ہوں اور یہ میری اپنی سرگزشت ہے۔ کچھ ایسی مجبوری ہے جس کی وجہ سے میں نے اپنے نام کی جگہ ایک فرضی نام دیا ہے۔ یہ روداد صرف میری نہیں، بغور اپنے آس پاس دیکھیں تو یہ کہانی جابجا نظر آئے گی۔

اشرف علی
(کراچی)

اور محلے والوں کو اس بات کی خوشی تھی کہ ڈاکٹر قریشی جیسے مشہور ڈاکٹر نے اس محلے میں اپنا شاندار کلینک قائم کرلیا تھا۔

اس محلے میں اور بھی ڈاکٹرز تھے لیکن ڈاکٹر قریشی کی آمد نے ان کے چراغ گل کردیے تھے۔ ایک تو ڈاکٹر قریشی کا کلینک بہت شاندار تھا۔ بہترین فرنیچر، ڈیجیٹل نمبرنگ، شاندار کاؤنٹر اور اس کے پیچھے بیٹھی ہوئی شاندار سی خاتون اور شان دار سی فیس۔

پھر ڈاکٹر قریشی کی گاڑی بھی بہت شاندار تھی۔ چم چماتی ہوئی۔ جس کو ایک باوردی ڈرائیور چلایا کرتا۔ اس کے علاوہ خود ڈاکٹر قریشی کی شخصیت بھی شاندار تھی۔

وہ ہمیشہ سوٹ میں ملبوس نظر آتا۔

پہلے ہی دن سے اس کے کلینک میں مریضوں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔ جب کہ آس پاس کے دوسرے ڈاکٹرز یقینی طور پر اس کو برا بھلا کہہ رہے ہوں گے۔

بہرحال مجھے صرف نزلہ ہوگیا تھا اور میں نزلے کا علاج کرانے ڈاکٹر قریشی کے کلینک پہنچ گیا۔ پہلی ملاقات اس شاندار خاتون سے ہوئی جو کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی تھی۔

''پلیز پانچ سو روپے دے دیں۔'' اس نے میرا کارڈ بناتے ہوئے کہا۔

''پانچ سو روپے۔'' میرے تو ہوش اڑ گئے تھے۔

''دیکھیں مجھے صرف نزلہ ہے اور میں ڈاکٹر صاحب سے نزلے کا علاج کرانے آیا ہوں۔''

''یہ تو آپ کا قصور ہے نا کہ آپ صرف نزلہ لے کر آئے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کینسر بھی لے آئے ہوتے تو بھی ڈاکٹر صاحب پانچ سو روپے ہی لیتے۔ ڈاکٹر صاحب ان ڈاکٹرز میں سے نہیں ہیں جو سستی فیس لے کر مریضوں کو برباد کردیں۔ جلدی کریں۔''

اس وقت اور بھی دو چار آدمی کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ واپس جانے میں سبکی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے خاموشی سے پانچ سو روپے نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیے۔

خاتون نے میرا نام دریافت کرکے کارڈ بنا کر ایک ٹوکن میرے حوالے کردیا۔ ''یہ لیں آپ کا نمبر ففٹی ون ہے۔ یعنی اکیاون۔''

میں اپنا کارڈ لے کر ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔ میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب ڈاکٹر قریشی کے پاس آنے کا خیال آیا تھا۔

مجھے نزلہ ہوا تھا۔ صرف دس روپے کے جوشاندے میں بھی یہ تکلیف ختم ہوسکتی تھی۔ خواہ مخواہ چلا آیا تھا۔

لیکن اب تو کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ فیس میں دے چکا تھا۔ لہٰذا اب دکھانا ہی تھا۔

مریضوں میں ہر سائز اور ہر عمر کی عورتیں، بچے مرد حضرات موجود تھے۔ اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر قریشی ہمارے محلے میں کتنا پاپولر ہوگیا ہے۔

میری نظر حکیم پر نہیں پڑی۔ وہ بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ حکیم صاحب کو دیکھ کر میں واقعی حیران رہ گیا تھا۔ وہ تو خود ایک مشہور حکیم تھے وہ ڈاکٹر کے پاس کیا لینے آئے تھے۔

میں نے ان کے پاس جا کر سلام کیا۔ وہ بے چارے مجھے دیکھ کر سٹپٹا گئے تھے۔

''خیریت تو ہے حکیم صاحب۔'' میں نے پوچھا۔ ''آپ یہاں کیسے دکھائی دے رہے ہیں۔''

''ارے میاں، اوٹلنگو کا علاج حکمت میں نہیں ہے اس لیے میں یہاں چلا آیا ہوں۔ بہت موذی مرض ہے یہ اوٹلنگو۔''

''لیکن یہ آخر ہوتا کیا ہے۔ میں تو پہلی دفعہ سن رہا ہوں۔''

''میں نے بھی پہلی ہی بار اس ڈاکٹر قریشی سے اس مرض کے بارے میں سنا تھا۔''

پھر حکیم صاحب نے جو تفصیل بتائی وہ کچھ یوں تھی:

''ہمارے محلے میں ایک صاحب ہوتے ہیں افتخار صاحب، ان کے یہاں کسی بات کی دعوت تھی۔ انہوں نے اس دعوت میں محلے کے ملازمین کو مدعو کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر قریشی اور حکیم دونوں بھی مدعو تھے۔ اتفاق سے کھانے کے دوران میں حکیم صاحب کو اپنی کمر میں شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ ڈاکٹر قریشی ان کے پاس ہی موجود تھے۔ انہوں نے فوراً ہی حکیم صاحب کی آنکھیں، زبان، ناک اور کان وغیرہ چیک کر کے یہ اعلان کردیا کہ حکیم صاحب کو اوٹلنگو ہے۔ اس کے بعد سے اب تک حکیم صاحب ڈاکٹر قریشی کے مریض چلے آرہے تھے۔''

''اوہو۔'' میں نے تشویش کا اظہار کیا۔ ''کوئی فائدہ ہو رہا ہے؟''

''ہاں۔ اوٹلنگو ایسی بیماری نہیں ہے کہ چار پانچ دنوں میں اس کا علاج ہو جائے۔'' حکیم صاحب نے کہا۔ ''ہفتوں تک چلتا رہے گا۔''

"خدا آپ کو صحت دے حکیم صاحب۔"

میں اپنی کرسی پر آ گیا۔ اتنی دیر میں حکیم صاحب کا نمبر آ چکا تھا۔ وہ کمرے میں چلے گئے۔ بہت دیر بعد میری باری بھی آ ہی گئی۔

میں ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس شخص کو میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا لیکن اس سے ملنے کا اتفاق پہلی بار ہو رہا تھا۔

"جی فرمایئے۔" ڈاکٹر نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"ارے صاحب بس یوں ہی معمولی سا نزلہ ہو گیا ہے۔" میں نے بتایا۔

"کیا! آپ نزلے کو معمولی سمجھ رہے ہیں۔" ڈاکٹر اچھل پڑا۔ "ایک منٹ۔" اس نے ایک پینسل ٹارچ روشن کر کے میری ناک کے نتھنوں کا معائنہ کیا۔ "اوہ مائی گاڈ۔ یہ تو Athmoid کی خرابی ہے۔" اس نے بتایا۔

"اتھمائڈ" میرے بھی ہوش اڑ گئے۔ "ڈاکٹر صاحب یہ Athmoid کیا ہے؟"

"ٹھہریں میں آپ کو اردو میں سمجھاتا ہوں۔ اس کا مطلب ہے غربالی ہڈی ناک کی بائیں دیواریں اور استخوانی ناک کے پردے کا بالائی حصہ بنانے والی Athmoid کا جو چھلنی کی مانند کاغذی ہوتی ہے اور کھوپڑی کی تلی کا حصہ بناتی ہے خرابی اس میں ہو گئی ہے۔ میں تو آپ کا چہرہ دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔"

"ڈاکٹر صاحب مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ صورت حال ایسی خراب ہو گی۔ میں تو اسے عام سا نزلہ زکام سمجھا تھا۔"

"یہی تو پرابلم ہے کہ ہم اپنی صحت کو سیریس نہیں لیتے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اور بعد میں جب مرض بڑھ جائے تو واویلا کرتے ہیں۔"

"یہ اچانک کیسے ہو گیا؟" میں نے پوچھا۔

"اچانک نہیں ہوا اصل خرابی کہیں اور ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

"کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔" میں بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ "کوئی اور خرابی بھی ہے۔"

"جی ہاں، یہ تو ابتدائی علامت ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اصل میں آپ کے Histamine کی تیزابیت بڑھ گئی ہے۔"

"او خدا، اب یہ کیا بلا ہے ڈاکٹر صاحب۔"

"ٹھہریں، میں سمجھاتا ہوں۔ جسمانی بافتوں میں قدرتی طور پر پایا جانے والا کیمیائی مادہ، جس کا نقطہ پگھلاؤ 86 سینٹی گریڈ ہوتا ہے۔ یہ ایک سفید قلمی مرکب ہے۔ معدے میں نمک کے تیزاب کے اخراج کو تحریک دیتا ہے لیکن آپ کے معدے سے اس کا اخراج ہی نہیں ہو رہا۔"

اب تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرے آنے لگے تھے۔ "ڈاکٹر صاحب اب کیا ہو گا۔" میں نے روتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"پریشان نہ ہوں۔ میں کس لیے بیٹھا ہوں۔ علاج کروں گا آپ کا۔ میں آپ کو دو ٹیسٹ لکھ کر دے رہا ہوں۔ فراز ماں سینٹر سے کروا لیں۔ ان کی رپورٹ قابلِ بھروسا ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر نے ایک پرچی پر دونوں ٹیسٹ لکھ کر دے دیے۔ اب تو جان کے لالے پڑنے لگے تھے۔ اس لیے میں گھر جانے کی بجائے سیدھا فراز ماں سینٹر آ گیا۔

دونوں ٹیسٹ میں اٹھارہ سو روپے خرچ ہو گئے تھے لیکن چلو جان ہے تو جہان ہے۔ صحت ہی چوپٹ ہو جائے تو پھر کیا زندگی کہاں کی زندگی۔

چار دنوں کے بعد دونوں رپورٹس لے کر ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا۔ پہلا واسطہ اس خاتون سے ہوا تھا جو کاؤنٹر پر بیٹھی تھی۔ میں نے کارڈ نکال کر ان کے سامنے کر دیا۔ "یہ میرا دوسرا وزٹ ہے۔ میں رپورٹ دکھانے آیا ہوں۔"

"لائیں پانچ سو روپے۔"

"پانچ سو لیکن یہ تو میرا دوسرا وزٹ ہے۔ دوسرے وزٹ میں تو کم لیتے ہیں۔"

"لیکن ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔" اس نے کہا۔

مجبوراً پانچ سو روپے دینے پڑ گئے اور اپنی باری کے انتظار میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ میرا نمبر آیا تو میں کمرے میں چلا گیا۔

میں نے دونوں رپورٹس ڈاکٹر کے سامنے رکھ دیں۔

"یہ لیں ڈاکٹر صاحب فراز ماں سینٹر کی رپورٹ۔"

رپورٹس دیکھتے دیکھتے ڈاکٹر کے بدن پر لرزاں طاری ہونے لگا۔ "اوہ خدا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "یہ آپ نے اپنی صحت کے ساتھ کیا کر دیا ہے۔"

"کیا ہو گیا ڈاکٹر صاحب؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"آپ کے تو Cerebrum میں خرابیاں شروع

ہو چکی ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''کیا فرمایا۔ سریبرم میں خرابی۔'' میں اچھل پڑا۔ ''ڈاکٹر صاحب اب یہ کیا مصیبت ہو گئی میرے ساتھ۔''

''دیکھیں میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ ایک لاطینی لفظ ہے۔ دماغ کا سب سے بڑا اور بالائی ترین حصہ۔ جو دو نصف حصوں میں منقسم ہے۔ یہ فرنٹل لوب، پیرائٹل لوب، ٹمپورل لوب اور آکس پٹل لوب پر مشتمل ہوتا ہے۔ سریبرم کے اندر وہائٹ میٹر ہوتا ہے۔ اس میں دو فلا لیسٹرول وینٹر لیک ہوتے ہیں۔ جن کے درمیان ایک پتلا پردہ ہوتا ہے۔ خرابی اس پردے میں ہو گئی ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب خدا کے لیے کچھ کریں۔ میں نے تو اپنی زندگی میں ابھی کچھ نہیں دیکھا۔''

''اس لیے تو حیران ہوں کہ آپ نے یہ مصیبتیں کہاں سے پالی ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''بہر حال پریشان نہ ہوں۔ فوری طور پر کچھ دوائیں دے رہا ہوں لیکن کچھ ٹیسٹ اور ہیں وہ بھی کرانے ہوں گے۔''

''خدایا، کیا اور بھی ٹیسٹ رہ گئے ہیں ڈاکٹر صاحب۔''

''ظاہر ہے مرض کی تہہ تک پہنچنا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''وقتی دوائی دے دوں تو آرام تو آجائے گا لیکن اس کے بعد جو ہو گا وہ پھر اتنا بھیانک ہو گا کہ آپ جس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''نہیں ڈاکٹر صاحب پلیز میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔''

''اس لیے تو آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کیوں کہ میں اپنے فرض سے مجبور ہوں۔''

''تو پھر ٹیسٹ لکھ کر دے دیں۔ فرزاماں ہی سے کروانا ہے نا؟''

''ہاں، وہیں سے ان کی رپورٹس پورے شہر میں قابلِ بھروسا ہوتی ہیں۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

اس بار پورے تین ہزار کے ٹیسٹ ہوئے تھے۔ نزلے وغیرہ کو تو بھول ہی چکا تھا اب تو میں اور نہ جانے کتنی موذی اور خطرناک بیماریوں کا شکار ہونے جا رہا تھا۔

اس وقت اندازہ ہو رہا تھا کہ انسان اگر بیمار پڑے تو اِدھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے اچھے ڈاکٹر کے پاس چلا جائے۔ جو اس کی بیماریوں کو جڑ سے اکھاڑ سکے۔

چار دنوں کے بعد جب میں ٹیسٹ کی رپورٹس لے کر اور کاؤنٹر پر مزید پانچ سو روپے فیس ادا کر کے ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو ڈاکٹر نے رپورٹس دیکھنے کے بعد اپنا سر تھام لیا۔ وہ بے چارہ اس طرح پریشان ہو گیا تھا جیسے اس کے کسی قریبی عزیز کے ساتھ یہ معاملات ہو رہے ہوں۔

''کیا ہو گیا ڈاکٹر صاحب، خیریت تو ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، میرے ساتھ تو خیریت ہے۔ لیکن آپ کی خیریت خطرے میں ہے۔''

''کیوں؟ کیا ہوا؟ رپورٹس کیا بتا رہی ہیں۔''

''ایک تو آپ کو کرانی ڈوکیٹ سنڈروم ہے۔ اس کے علاوہ بلینو تھلمیا Blenno Phthylmla بھی ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ڈپھتیریا بھی ہونے والا ہے۔''

''میرے خدا۔'' میرے تو ہوش اڑ گئے تھے۔ ''یعنی میرے ساتھ ایسی بیماریاں لگی ہوئی ہیں۔''

''جی ہاں۔''

''ڈاکٹر صاحب میں تو سمجھا تھا کہ معمولی سا نزلہ ہے۔ دو چار دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا لیکن یہ معمولی سا نزلہ تو میری جان کو آگیا ہے۔''

''اس بات کا تو رونا ہے کہ لوگ مرض کو سیریس نہیں لیتے اور جب بڑھ جائے تو پھر واویلا کرتے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب اس خطرناک موقع پر ایک شعر یاد آرہا ہے

میں یہ سمجھا تھا کہ ہوں گے کوئی دو چار زخم
میرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

''شاعروں کے ساتھ یہی پرابلم ہے کہ وہ بغیر سوچے سمجھے ہوئے شعر کہہ دیتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''رفو کا بہت سا کام اچانک کہیں نکل آتا۔ بلکہ برسوں تک بدن کے اندر پرورش پاتا رہتا ہے۔ بے پروائی اور لاعلمی کی وجہ سے آتش فشاں کی طرح کسی دن اچانک پھٹ پڑتا ہے۔ جیسے آپ کے ساتھ ہو رہا ہے۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحب میرے ساتھ تو یہ ہو رہا ہے کہ جب یہ سمجھتا ہوں کہ اس مرض کا علاج کروا چکا ہوں اب اس سے جان چھوٹ جائے گی تو پھر کوئی دوسرا مرض سامنے آجاتا ہے۔''

''یہی تو آپ کی خوش قسمتی ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''کیا مطلب، اس میں کون سی خوش قسمتی ہو گئی۔''

''خوش قسمتی یہ ہے بھائی کہ آپ کے سارے امراض ایک ایک کر کے سامنے آتے جا رہے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ورنہ آپ ان کو اپنے بدن میں پالتے رہتے اور برسوں آپ کو پتا ہی نہیں چلتا۔ پھر اچانک سارے امراض ایک ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ اس وقت تو کیس کو سنبھال بھی نہیں سکتے تھے۔''

''تو پھر ڈاکٹر صاحب بتائیں میں کیا کروں۔''

''کرنا کیا ہے۔ دوائیں کھاتے رہیں اور ٹیسٹ کرواتے رہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ایک نہ ایک دن تو آپ کی جان چھوٹ ہی جائے گی۔''

''چھوٹ جائے گی یا نکل جائے گی۔''

''اب یہ مریض کی قوت برداشت پر ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ویسے مایوس نہ ہوں۔ میں آپ کو دوائی لکھ کر دے رہا ہوں۔ وہ کھاتے رہیں اور دو ہفتوں کے بعد پھر دو ٹیسٹ کروا لیجیے گا۔''

مرتا کیا نہ کرتا۔ تقریباً چھ مہینوں تک تو وہی کرتا رہا جو ڈاکٹر بتایا کرتا۔ دوائی اور ٹیسٹ اور اس دوران میں مجھے پتا چلا کہ مجھ میں تو اتنی بیماریاں ہیں کہ چلتا پھرتا اسپتال بن کر رہ گیا ہوں۔

مثال کے طور پر اساکی انوتنک، ایچی نی سیس، تامبیر ومائی اوما وغیرہ۔

خدا جانے یہ سلسلہ کب تک جاری رہتا کہ ایک دن مارکیٹ میں اپنے ایک پرانے دوست سے ملاقات ہوگئی۔ وہ میری حالت دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ ''ارے کیا ہوا ہے تمہیں؟''

''بھائی مجھے اساکی انوتنک، ایچی نی سیس اور فامبیر ومائی اوما ہوگیا ہے۔'' میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

''او گاڈ، یہ کیسی سمجھ میں نہ آنے والی بیماریاں لگ گئی ہیں تمہیں۔''

''اس سے پہلے کرائی ڈوکیٹ سنڈروم اور ہلیئو فائی تھیلیا بھی رہ چکا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''کب سے ایسی بیماریاں لگی ہیں تمہیں۔''

''سری جیرم میں خرابی کے بعد ہوئی تھیں۔'' میں نے بتایا۔ ''جب کہ اس سے پہلے ایتھومائڈ بھی تھا۔''

''آخر کیا ہیں یہ سب۔'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''مت پوچھ میرے دوست۔ یہ وہ بیماریاں ہیں جن کو میں نے برسوں سے پال رکھا تھا اور ان کی طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ڈاکٹر قریشی کا جن کی وجہ سے یہ بیماریاں سامنے آسکی ہیں۔''

''کون ڈاکٹر قریشی وہی تو نہیں جو گنجا سا ہے اور جس کے چہرے پر بڑا سا مسہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں ہاں وہی، تم جانتے ہو اس کو؟''

''ارے وہ تو ایک نمبر کا فراڈ ہے۔ وہ اور اس کا سالا، دونوں مل کر لوگوں کو بیوقوف بنا رہے ہیں۔''

''اور اس کا سالا کیا کرتا ہے۔''

''اس نے فراز ماں سینٹر کے نام سے ایک لیب کھول رکھا ہے۔'' دوست نے بتایا۔ ''جہاں ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر قریشی ہر مریض کو ٹیسٹ کے لیے وہیں بھیجتا ہے۔ چاہے نزلہ ہی کیوں نہ ہو۔''

''ہاں ہاں یار۔ میرے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا۔ مجھے بھی تو صرف نزلہ تھا۔'' میں نے کہا۔

''اور اس نے کوئی موٹی سی بیماری بتا دی ہوگی۔ تمہیں ٹیسٹ کے لیے بھیج دیا ہوگا اور جب تم رپورٹس لے کر گئے ہوگے تو اس نے مزید بیماریاں بتا دی ہوں گی۔''

''ہاں ہاں۔ بالکل ایسا ہی ہوا تھا میرے ساتھ۔''

''یہ اس کی پرانی تکنیک ہے۔ وہ اس طرح بے وقوف بناتا ہے۔ یہ بتاؤ اس نے تمہارے نزلے کا علاج کیا یا نہیں۔''

''اس کی تو نوبت ہی نہیں آئی۔ نزلہ تو خود ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔''

''اور تم اس کے بعد بھی بے وقوف بنتے رہے۔''

''کیا کرتا یار۔ مجھے تو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔''

''چلو اب تو میں نے بتا دیا نا۔ اب اس کے پاس مت چلے جانا۔ لعنت بھیجو اس پر۔''

میرے دوست نے تو کہہ دیا تھا کہ میں اس چکر میں نہ پڑوں۔ دوبارہ نہ جاؤں اس کے پاس۔ چھوڑ دوں اس کو لیکن اب میں اتنی آسانی سے اسے نہیں چھوڑنے والا تھا۔

کچھ نہ کچھ تو ضرور کرنا تھا۔ اس نے انتہا کر دی تھی۔ خدا کی پناہ۔ نزلے کے چکر میں اس نے کون کون سی بیماریاں میرے گلے ڈال دی تھیں۔ ان سب کا حساب لینا تھا۔

اور حساب لینے کے لیے میرے پاس صرف ایک بندہ تھا۔ رحیما۔ جو بہت خطرناک قسم کا غنڈا تھا لیکن میرا بہت

احترام کیا کرتا۔ کیوں کہ میں نے ایک بار اس کی جان بچائی تھی اور وہ خدا کا بندہ اب تک میرا احسان مند چلا آرہا تھا۔

میں پوری پلاننگ بنا کر استاد رحیما کے اڈے پر پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ ''ارے بھیا تم، مجھے حکم دیا ہوتا۔ میں حاضر ہو جاتا اوئے جلدی سے بھیا کے لیے ٹھنڈی بوتل لے کر آ۔'' یہ بات اس نے اپنے کارندے سے کہی تھی۔

''رحیما! میں تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔'' میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''حکم کرو بھائی۔''

''ایک بندے کو اٹھانا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''اٹھانا ہے یا ٹپکانا ہے۔''

''نہیں رحیما اٹھانا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور وہ بھی اس طرح کہ اسے کوئی نقصان نہ ہو۔ پھر اس سے قسطوں میں پیسے لینے ہیں۔''

''قسطوں میں کیوں۔''

''ہے ایک کہانی۔ پہلی بار پچیس ہزار روپے۔ دوسری بار تیس ہزار روپے۔''

''کیوں مذاق کر رہے ہو۔ کسی کو اٹھانا بھی ہے اور صرف پچیس ہزار، تیس ہزار۔''

''ہاں بھائی، یہ کھیل ہی کچھ ایسا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس بندے کو صرف ایک سبق سکھانا ہے۔''

''چلو بھائی۔ جیسی تمہاری مرضی۔'' رحیما نے گہری سانس لی۔ ''لیکن وہ ہے کون؟''

میں نے اسے ڈاکٹر قریشی کا نام اور پتا بتاتے ہوئے کہا۔ ''ایک بات اور، تم مجھ کو بھی اس کمرے میں بند رکھو گے جس میں وہ بندہ ہو گا۔ یعنی ایسا لگے جیسے تم نے اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اٹھایا ہے۔''

''اگرچہ یہ ڈراما میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ پھر بھی تمہارا حکم ہے تو ماننا پڑے گا۔ کب کرنا ہے یہ کام۔''

''جتنی جلدی ہو جائے۔''

''تو پھر کل ہی کرلو۔''

اور دوسرے ہی دن میں اور ڈاکٹر قریشی دونوں کڈنیپ ہو گئے۔

اس سلسلے میں باقاعدہ ایک ڈراما رچایا گیا تھا۔

میں ڈاکٹر قریشی کے پاس اپنا معائنہ کروانے پہنچا۔ فیس دے کر اور جب میں اس سے باتیں کر رہا تھا تو اس وقت رحیما کے دو آدمی کمرے میں گھس آئے۔

''اے کون ہو تم لوگ۔ کیا ہو رہا ہے یہ سب۔''

''خاموش۔'' دونوں نے پستول نکال لیا۔ ''آواز نہیں نکالنا۔ ہمارے دو آدمی تیری کاؤنٹر والی کے پاس بھی کھڑے ہیں چل اٹھ جا۔''

''لیکن کیوں۔ تم لوگ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو۔'' میں نے بھی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

''خاموش، تو بھی ہمارے ساتھ چلے گا۔'' ایک نے میری کنپٹی پر پستول رکھ دیا۔

اس طرح ہم دونوں ہی کڈنیپ ہو گئے۔ یعنی میں اور ڈاکٹر قریشی۔ پلاننگ کے مطابق ہمیں ایک ہی کمرے میں رکھا گیا تھا۔ پلاننگ کے مطابق ہم دونوں کے موبائل فون بھی لے لیے گئے تھے۔

''یہ کیا ہو گیا ڈاکٹر صاحب۔'' میں نے پریشان ہونے کی ایکٹنگ کی۔ ''آپ کے چکر میں، میں کیوں پھنس گیا۔''

''مجھے خود نہیں معلوم۔ کون ہیں یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب، کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے علاج سے کوئی مریض ٹھکانے لگ گیا ہو اور اس کے رشتے دار آپ سے بدلہ لینے کے چکر میں ہوں۔''

''خدا جانے۔ اب میں مرنے والوں کا حساب تو نہیں رکھتا۔ لیکن یہ سب خطرناک لوگ معلوم ہوتے ہیں۔''

''میں تو غریب آدمی ہوں ڈاکٹر صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''اگر انہوں نے مجھ سے کوئی مطالبہ کیا تو میں کہاں سے پورا کروں گا۔''

ڈاکٹر کوئی جواب دینے والا تھا کہ رحیما داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر بلا کی سختی تھی۔ ایک بار تو خود میں بھی کانپ گیا ایسے لوگوں کا کیا بھروسا۔

''کیا حال ہیں ڈاکٹر؟'' رحیما نے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔ ''کیسی لگی یہ جگہ؟''

''تم...... تم کون ہو؟'' ڈاکٹر نے خوف زدہ ہو کر سوال کیا۔ ''کیا چاہتے ہو مجھ سے۔''

''ڈاکٹر ہم اوروں کی طرح بے رحم نہیں ہیں۔'' رحیما نے کہا۔ ''ہمارے یہاں کسی کا جھٹکا نہیں کیا جاتا۔ اگر تم اپنی جان چھڑانا چاہتے ہو تو اپنا موبائل فون ہمیں دے دو۔''

''ارے وہ موبائل فون تو تمہارے آدمی پہلے ہی لے

چکے ہیں۔'' ڈاکٹر نے خوش ہو کر کہا۔
''لے تو چکے ہیں لیکن ہمارا یہ دستور نہیں ہے۔ تمہیں اپنی زبان سے کہنا ہوگا کہ تم نے اپنا موبائل فون ہمیں دے دیا۔''
''ہاں ہاں میں کہہ رہا ہوں۔ رکھ لو اس کو، رکھ لو۔''
''ٹھیک ہے۔ اب میں اپنے سینٹر والوں سے پوچھ کر آتا ہوں اس کے بعد تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔''
رحیما کمرے سے باہر چلا گیا۔ ڈاکٹر بہت پُرجوش ہو رہا تھا۔''بھائی یہ تو بہت سستے میں جان چھوٹ رہی ہے۔ کمال ہے۔ صرف موبائل فون کے لیے انہوں نے ایسا قدم اٹھایا۔ رکھ لیں موبائل فون، واہ! یہ تو کمال ہے۔''
رحیما پھر اندر آ گیا۔
ڈاکٹر اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔''تو میں جا سکتا ہوں بھائی صاحب۔'' اس نے پوچھا۔
''ڈاکٹر تمہارا موبائل فون قبول کر لیا گیا ہے لیکن جو لوگ تم کو اٹھا کر لائے ہیں وہ خرچہ پانی مانگ رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کم از کم پچیس ہزار تو مل جائیں۔''
''پچیس ہزار۔'' ڈاکٹر کی خوشی دیکھنے والی تھی۔
''ارے یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ یہ تو حق ہے بے چاروں کا۔ اتنے پیسے تو اس وقت بھی میری جیب میں ہیں۔''
''تو لاؤ دے دو۔'' رحیما نے ہاتھ بڑھا دیا۔
ڈاکٹر نے اسی وقت اپنی جیب سے پچیس ہزار نکال کر رحیما کو دے دیے۔''بھائی صاحب۔'' میں نے رحیما کو مخاطب کیا۔''یہ تو سارا حساب کتاب ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہو رہا ہے۔ میرا کیا ہوگا؟''
''تمہارے ساتھ تو بعد میں نمٹنا ہے۔'' رحیما نے کہا۔''تمہارا معاملہ الگ ہے۔'' رحیما کے کہنے کے بعد ڈاکٹر خوشی سے بے حال ہونے لگا تھا۔''پاگل معلوم ہوتے ہیں، بتاؤ صرف ایک موبائل سیٹ اور پچیس ہزار روپوں کے لیے اغوا کر کے لے آئے۔''
''ڈاکٹر صاحب آپ تو چلے جائیں گے میرا کیا ہوگا۔''
''تم فکر مت کرو، تمہاری بھی سفارش کر دوں گا۔'' ڈاکٹر نے گردن اکڑائی۔
کچھ دیر میں رحیما داخل ہو گیا۔
''اب تو کوئی بات نہیں ہے نا۔'' ڈاکٹر نے پوچھا۔
''میں جا سکتا ہوں نا؟''
''ہاں جا سکتے تھے لیکن ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔'' رحیما نے کہا۔

''ایک اور مسئلہ رہ گیا۔''
''ہمارے ساتھیوں میں دو گروپ ہو گئے ہیں۔ ایک گروپ کا کہنا ہے کہ اس کو بھی اپنا حساب کتاب چاہیے ایک لاکھ روپے۔''
''ایک لاکھ؟'' ڈاکٹر اس بار ذرا پریشان ہو گیا تھا۔
''ایک لاکھ تو اس وقت میرے پاس نہیں ہیں۔''
''گھر والوں سے کہہ دو۔'' رحیما نے مشورہ دیا۔
''بہت ظالم لوگ ہیں۔ اس کے بغیر جانے نہیں دیں گے۔''
''بھائی صاحب ایک لاکھ کے بعد تو جان چھوٹ جائے گی نا؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔
''ہاں اس کے بعد تمہیں کون روکے گا۔''
''میں اپنے چھوٹے بھائی سے بات کر لیتا ہوں وہ دے دے گا ایک لاکھ۔''
ڈاکٹر کا موبائل اسے واپس دے دیا گیا۔ اس نے نمبر ملا کر اپنے بھائی سے بات کی۔ نہ جانے اس نے اپنے بھائی سے کیا بہانا بنایا ہوگا۔ بہرحال اس کے بھائی نے ایک مقررہ مقام پر ایک لاکھ روپے رحیما کے ایک بندے کے حوالے کر دیے تھے۔
اس کارروائی میں صبح ہو گئی تھی۔
بے چارے ڈاکٹر نے وہ رات کس کرب میں گزاری ہوگی۔ اس کا اندازہ وہ خود ہی کر سکتا ہے۔ میں تو اس کی حالت دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔
رحیما بالکل پرفیکٹ کام کر رہا تھا۔ جس طرح میں نے اسے سمجھایا تھا۔ صبح کے وقت ہمارے لیے پُرتکلف ناشتے کا بندوبست بھی کر دیا گیا تھا۔
بے چارے ڈاکٹر سے تو کھایا ہی نہیں جا رہا تھا۔ جب کہ میں نے خوب ڈٹ کر کھایا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ رحیما یہ خبر لے کر آ گیا کہ ڈاکٹر کے چھوٹے بھائی سے ایک لاکھ روپے مل گئے ہیں۔
ڈاکٹر کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔''اب تو میں جا سکتا ہوں نا۔'' اس نے پوچھا۔
''ہاں ہاں تم جا سکتے تھے لیکن باس کے چھوٹے بھائی نے پنگا ڈال دیا ہے۔'' رحیما نے کہا۔
''کون چھوٹا بھائی؟'' ڈاکٹر کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔''وہ کیا کہہ رہا ہے۔''
''ڈاکٹر ہمارا باس اپنے چھوٹے بھائی سے بہت پیار کرتا ہے۔'' رحیما نے کہا۔''وہ جو کہہ دے وہی ہوتا ہے۔''

''تو کیا کہا ہے اس نے؟''

''اس نے دس لاکھ کی ڈیمانڈ کی ہے۔'' رحیما نے بتایا۔

''دس لاکھ!'' ڈاکٹر نے اپنا سر تھام لیا۔ ''یہ کیا ہے، کیا مذاق ہے۔ پہلے تم لوگوں نے صرف موبائل مانگا۔ پھر پچیس ہزار روپے کی ڈیمانڈ کی۔ اس کے بعد ایک لاکھ اب دس لاکھ۔ یہ تم لوگ کس طرح آگے ہی آگے بڑھتے جارہے ہو۔'' پھر ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا۔ ''تم نے دیکھا، دیکھا تم نے، کیا ہورہا ہے میرے ساتھ۔ کتنی معمولی بات تھی اور اب کہاں تک آگئی ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب، آپ کو یاد ہے میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب۔ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''وہی جو آپ کے ساتھ ہورہا ہے، میں صرف نزلے کے علاج کے لیے آپ کے پاس گیا تھا۔ پانچ سو روپے آپ کی فیس دی تھی۔ اس کے بعد تو کہانی پھیلتی چلی گئی۔ کیا کیا نہیں ہوا۔ دنیا بھر کی بیماریاں لگ گئیں۔ پچاسوں ٹیسٹ کروادیے آپ نے۔ میں نے آپ کو ایک شعر بھی سنایا تھا کہ میں یہ سمجھا تھا کہ ہوں گے کوئی دو چار زخم۔ میرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا تھا۔ آپ نے شعر سن کر میرا مذاق اڑایا تھا۔ کہہ رہے تھے یہ شاعر لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی معمولی سی بات پھیلتی چلی جائے۔ تو میرے ڈاکٹر صاحب آپ کے ساتھ بھی تو یہی کہانی ہورہی ہے۔ آپ یہ سمجھے تھے کہ بس موبائل جانے کا معمولی سا زخم ہوگا۔ لیکن آپ کے لیے رفو کا کام تو نکلتا جارہا ہے۔ اب بھگتیں۔''

''تو یہ...... یہ سب تم نے کیا ہے؟'' ڈاکٹر سے بولا نہیں جارہا تھا۔

''نہیں...... میں نے نہیں کیا۔ بلکہ میری طرف سے قدرت آپ کو سزا دے رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

اچانک رحیما بول پڑا۔ ''یہ تم لوگ کن باتوں میں لگ گئے۔ ہاں بھائی ڈاکٹر دس لاکھ دے رہے ہو یا نہیں۔ یا میں دوسرا کھیل شروع کروں۔''

''لے...... لے لیں دس لاکھ۔'' ڈاکٹر اب رو دینے والا تھا۔

''تو چلو گھر والوں کو فون کرو۔'' رحیما نے ڈاکٹر کا موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔

ڈاکٹر نے رو رو کر گھر والوں کو فون کر کے ساری پچویشن بتادی۔ مجھے اغوا کرلیا گیا ہے اور اغوا کرنے والوں نے دس لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔ ان کو روپے دے دیے جائیں۔ ورنہ میں نہیں نکل سکوں گا۔

رحیما نے موبائل واپس لے لیا اور مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس شام کو دس لاکھ روپے کے عوض ڈاکٹر کی رہائی عمل میں آگئی تھی۔ اس کے گھر والوں نے دس لاکھ ادا کر دیے تھے۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد رحیما میرے پاس آگیا۔ وہ اپنی اس کامیاب کارروائی سے بہت خوش اور مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔

''یار رحیما تم نے تو کمال ہی کردیا۔'' میں نے کہا۔

''اب مجھے بھی جانے دو۔''

''کیوں تم کہاں جاؤ گے؟''

''ارے بھائی جا کر اپنا کام دیکھنا ہے۔''

''کون سا کام! تمہارا پہلا کام تو یہی ہے کہ اپنے تاوان کے پیسے تو دیتے جاؤ۔'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب؟ یعنی کے میں اپنے تاوان کے پیسے......!''

''اور کیا۔'' رحیما مسکرادیا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ آپ کے مجھ پر احسانات ہیں لیکن خود سوچیں گھوڑا اگر گھاس سے یاری کرے گا تو کھائے گا کیا۔''

''ٹھیک کہتے ہو بھائی۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ کہو کہ میں اپنے کھودے ہوئے گڑھے میں خود ہی گر پڑا ہوں۔''

''اب جو سمجھ لیں لیکن کہانی یہی ہے۔'' رحیما نے کہا۔ ''صرف پچیس ہزار دے کر اپنی جان چھڑا لیں۔''

''اور اس کے بعد کیا ہوگا۔ وہی جو ڈاکٹر کے ساتھ ہوا تھا۔''

''نہیں آپ سے اتنا رشتہ تو ہے کہ آپ کو قسطوں میں نہیں مارا جائے گا۔ ایک ساتھ پچیس کا جھٹکا ہے اس کے بعد چلے جایئے گا۔''

مرتا کیا نہ کرتا۔ میں رحیما کو پچیس ہزار دے کر گھر واپس آگیا ہوں۔ اب اگر مجھے نزلہ کھانسی ہوجائے تو میں کسی اسپیشلسٹ کے پاس نہیں جاتا۔ گھریلو ٹوٹکوں سے علاج کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ کے لیے بھی یہی مشورہ ہے۔

کرب

محترم معراج رسول

سلام تہنیت

دسمبر کا مہینا میرے لیے رنج ومحن کا مہینا ہے۔ اس مہینے کی 16 تاریخ کو پینتالیس سال قبل ہمارا ایک بازو جدا ہوا تھا۔ یہ ایک ایسا زخم ہے جس کی ٹیس ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔ اپنے درد کو میں نے کاغذ پر منتقل کیا ہے۔ امید ہے قارئین ضرور پسند کریں گے۔

انعام انصاری

(کراچی)

بانگلہ دیش بیمان کی سیٹ سے ٹیک لگائے میں سوچ میں گم تھا۔ میرے برابر میں وہ لڑکی تھی جو مجھ سے کم سے کم پچیس سال چھوٹی ہوگی۔ اس کے چہرے پر خوشی کی بارش ہورہی تھی اور میں غم کی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ وہ دلہن کے لباس میں کھلی جارہی تھی۔ پاکستان پہنچنے کی خوشی میں باؤلی ہوئی جارہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اپنے بچوں کو میں کیسے سمجھا پاؤں گا۔ وہ کیا سوچیں گے۔ صرف پندرہ دن پہلے میں جب اسی ائرلائین سے جارہا تھا تو وہ کتنا خوش تھے۔ مگر اب...... کیا وہ خوش ہو پائیں گے؟ کہیں میری بنی بنائی عزت خاک میں تو نہیں مل جائے گی؟ وہ میری بات مان لیں گے؟ انہیں یقین آجائے گا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے؟ میں تو اسے ساتھ لاتا بھی نہیں مگر میں مجبور ہو گیا تھا...... میری نظر میں پندرہ دن پہلے کا وقت تازہ ہوگیا۔

میں پورے بیس سال بعد اس سرزمین پر لوٹا تھا۔ یہ سرزمین کبھی میری تھی مگر اب میں اس سرزمین کے لیے اجنبی تھا۔ یہیں میں نے جنم لیا تھا۔ یہیں گھٹنیوں چلنا سیکھا تھا۔ میٹرک اور انٹر میں نے یہیں سے کیا تھا۔ اب اتنے دنوں بعد لوٹا تو سب کچھ بدلا بدلا سا محسوس ہوا۔ اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ سنا تھا کہ ابا جب یہاں آئے تھے تو بالکل خالی ہاتھ تھے۔ ان کا سب کچھ لٹ گیا تھا۔ پاکستان کی آزادی کا انتقام ان کے گھروالوں سے بھی بھرپور انداز میں لیا گیا تھا۔ گھر کا ہر فرد ہندو بلوائیوں کے ظلم کا شکار ہوگیا تھا۔ صرف ایک چھوٹا بھائی بچا تھا جسے وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

نئے ملک کی نئی سرزمین پر دونوں بھائی مل کر زندگی کی جنگ لڑنے لگے۔ ان کا اکیلا پن دیکھ کر لوگوں نے گھر بسا لینے کا مشورہ دیا تاکہ دو وقت کی روٹی گھر میں مل جایا کرے۔ ابا کو بھائی کی بھی فکر تھی اس لیے انہوں نے اپنے ہی جیسی ایک دکھوں کی ماری سے شادی کرلی جس کا پورا خاندان ہندو بلوائیوں کا شکار ہو چکا تھا۔ مگر قسمت نے انہیں بچا لیا تھا اور وہ ایک قافلے کے ساتھ مشرقی پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔ اس وقت وہ کیمپ میں زندگی گزار رہی تھیں کہ ابا نے انہیں اپنی زندگی میں شامل کرلیا۔ اب وہ دونوں مل کر چھوٹے بھائی کی پرورش کرنے لگے۔

شادی کے چوتھے سال میں پیدا ہوا۔ اب چچا بھی کچھ اور بڑے ہوچکے تھے۔ اس دور میں لڑکے اور لڑکیوں کی شادیاں جلد کردینے کا رواج تھا۔ چچا سولہ سال کے ہوچکے تھے اس لیے زور زبردستی کرکے امی نے چچا کی شادی کرا دی۔ اس وقت تک میں تین سال کا ہوچکا تھا۔

سنا تھا کہ میرے گھرانے کی رسم تھی، نئی دلہن صبح جب کمرے سے باہر آتی ہے تو اس کی گود میں کسی کا بچہ دیا جاتا ہے کہ اس کی گود جلدی بھر جائے۔ دلہن چچی کی گود میں مجھے بٹھا کر امی نے کہا تھا "اے دلہنیا۔ ہمری بات گور سے سنیو...... آج سے ہموا کی سب جمیداری تو ہار ہوئی... اب اس کی دیکھ بھال سب تمہی کریو۔"

امی کا یہ حکم چچی نے احسن طریقے پر ادا کیا۔ صبح سے شام تک میں انہی کے پاس رہتا۔ ابا مونگیر ضلع میں بہت بڑی زمین چھوڑ کر آئے تھے۔ یہاں آکر دوسروں کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی کلیم بھر دیا اور کلیم میں ان کو اور چچا کو دو گھر مل گئے۔ ایوب خان کی مہربانی سے اور کرنل اعظم خان کی کوششوں سے بنے میرپور کے سیکشن نمبر ۲ میں کوارٹرل



گئے۔ دونوں کوارٹر برابر برابر میں تھے۔ ان میں سے ایک چچا کے پاس تھا، میرا زیادہ وقت اسی گھر میں گزرتا تھا۔

پھر ان کے یہاں سنجیدہ پیدا ہوئی تو میری دلچسپی اس گھر میں اور بڑھ گئی۔ روئی کے گالے جیسی، پھولے پھولے گالوں والی میدے کے پیڑے جیسی سنجیدہ میرے لیے کھلونے جیسی تھی۔ میں صبح سے شام تک اسی کے ساتھ کھیلتا۔ سنجیدہ میں میری دلچسپی دیکھ میری امی نے چچی سے کہا ”اے دلہنیا...... ای مردوا تو تمری بٹیا پہ عاسک ہوئی گوا ہے...... ہمرا کہا مانو اور اسی کے ساتھ سادی کرا دو۔“

میرے کچے ذہن میں وہ جملہ بیٹھ سا گیا اور میں سنجیدہ کو اپنی ملکیت سمجھنے لگا تھا۔ وہ کچھ بڑی ہوئی تو یہی بات اس کے کانوں میں بھی پڑی اور وہ بات اس کے بھی ذہن کی گرہ بن گئی۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے غیر محسوس انداز میں محسوس کرلیا کہ اسے اب میرے ہی ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ شاید اسی لیے اس نے میری چیزوں کی حفاظت اور میری خدمت کی ذمے داری اپنے سر لے لی۔ میرے تمام کام وہی کرتی تھی۔

ہم دونوں غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے تھے کہ اب ایک پل کی دوری بھی گراں گزرتی تھی۔ وہ اسم بامسمی تھی۔ سنجیدگی اس کا جز لاینفک تھی مگر میرے لیے شگفتگی کا پرتو تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر گلاب کی تازگی اور لالی خود بخود آ جاتی۔ جب میں کوئی شوخ جملہ کس دیتا تو وہ بھی ایک نہ ایک جملہ اچھال دیتی۔

اس وقت کے وہ تمام منظر ذہن میں تازہ ہونے لگے تھے جنہیں حالات نے تحت الشعور کی گہرائی میں دفن کر دیا تھا۔ جسے زندگی کے کارزار نے وقت کی گرد میں چھپا دیا تھا۔ وہ سارے منظر ایک ایک کر کے ذہن کے کینوس پر رنگ بکھیرنے لگے تھے۔ نوعمری کی ایک ایک بات یاد آنے لگی تھی۔ ان دنوں میری عادت بن گئی تھی کہ جیسے ہی پنسل یا قلم ہاتھ میں آتا میرے ہاتھ خود بخود چلنے لگتے۔ پیڑ ہو یا دیوار ہر جگہ بس ایک ہی نام میں لکھنے لگتا۔ سنجیدہ انعام۔ اور جیسے

ہی سنجیدہ کی نظر اس پر پڑتی وہ گلال ہو جاتی اور اپنی گوری ہتھیلی کو اس پر گھس گھس کر سرخ کر لیتی۔ اور تب میں ہنس کر کہتا ''کب تک مٹاؤ گی؟''

وہ نظریں جھکا کر کہتی ''اسے تو میں خود مٹانا نہیں چاہتی مگر ڈر لگتا ہے۔''

''کس سے؟'' میں انجان بن کر پوچھتا۔

''لوگوں سے......''

''کیوں؟''

''وہ کہیں نظر نہ لگا دیں۔''

''کسی کو تم سے کیا دشمنی ہے؟''

''جب تک دنیا اجازت نہیں دیتی تب تک اسے سب سے مخفی رکھنا ضروری ہے ورنہ نظر لگنے کا خدشہ ہوتا ہے۔''

اس کی بات سن کر میرے دل میں شرارت کا مور چھل بلنے لگتا اور میں مسکراہٹ دبا کر اپنی انگشت شہادت اس کی پیشانی پر رکھ کر کہتا ''اور یہ جو یہاں لکھ گیا ہے اسے کیسے مٹاؤ گی؟''

''کبھی نہیں....اسے کیوں مٹاؤں؟ وہ تو میری دعائے نیم شب ہے۔''

''اچھا۔'' میں لفظ کو کھینچ کر ادا کرتا اور میری انگلی پیشانی سے پھسلتی، ناک کی اٹھان اور ہونٹوں کی مسکان کو سنبھالتے ہوئے چاہ غبغب میں اتر جاتی۔ وہ شجر الحیا بن کر سکڑ سمٹ جاتی۔ تب میں مزید شریر بن جاتا اور وہ گل مریم کی طرح یکا یک کھلتی اور ''آپ بڑے وہ ہیں۔'' کی سند دے کر مٹھی میں بند ریت کی طرح پھسل جاتی۔ کمرے سے ہی نکل جاتی۔ چچی کے پاس بھاگ جاتی۔

اسی طرح کی نہ جانے کتنی باتیں ذہن کے دریچے پر مسلسل دستک دے رہی تھیں۔ اور میں خود کو چھوٹا بہت چھوٹا محسوس کر رہا تھا۔ اپنی ہی نظروں میں خود کا مجرم محسوس کرنے لگا تھا۔ خود پر لعنت کناں تھا کہ زندگی کی دوڑ میں اسے کیوں فراموش کر بیٹھا تھا۔

ضمیر کی کرکراہٹ پر ملامت پر دماغ نے تاویل دی ''یہ ضروری تھا۔ زندگی بچانے کے لیے بہت ضروری تھا۔ زندگی تو سب کو پیاری ہے۔ وہ دور ہی ایسا تھا کہ کسی کو کسی کی جان محفوظ نہیں لگ رہی تھی۔ سب اپنی باری کے منتظر تھے۔ کس کی باری کب آجائے کسی کو پتا نہیں تھا اسی لیے سب اپنی جان بچانے کے لیے تگ و دو کر رہے تھے۔ میں نے بھی وہی کیا تھا۔ خاندان کا شیرازہ بکھیرنے والا سفر اختیار کر لیا تھا۔ ایک انجان سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔

☆......☆

میں ضیاالرحمان انٹرنیشنل ائرپورٹ پر کھڑا ایک ایک چیز کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ وقت کتنی تیزی سے گزر گیا اور مجھے احساس تک نہ ہوا۔ میں جب یہاں سے گیا تھا تو تیج گاؤں کا چھوٹا سا ائرپورٹ تھا مگر اب یہ ائرپورٹ تو بہت بڑا اور جدید انداز کا تھا۔ اس پر یورپی ائرپورٹ کا دھوکا ہو رہا تھا۔ ابھی میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا کہ ایک نوجوان نے اپنی جانب متوجہ کیا ''سر کین آئی ہیلپ یو؟''

میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے گلے میں بیج کی ڈوری تھی۔ سرخ ربن میں ایک کارڈ آویزاں تھا۔ کارڈ سے پتا لگ گیا کہ وہ ٹورسٹ ڈیپارٹمنٹ کا ملازم ہے۔

میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا پھر ٹوٹی پھوٹی بنگلہ میں کہا ''میرپور جانے کے لیے ٹیکسی کہاں سے ملتی ہے۔''

''گیٹ سے نکلتے ہی سامنے ٹیکسی اسٹینڈ ہے۔'' اس نے جواب دیا اور میں سوٹ کیس کھینچتا ہوا باہر کی جانب چل پڑا۔ اس وقت بھی مجھے اپنی کوتاہی یاد آ رہی تھی۔ ساتھ میں وہ چہرے بھی جن کو میں نے کبھی خود سے بہت قریب پایا تھا۔ ان سے میں سامنا کیسے کروں گا۔ یہی کچھ سوچتا ہوا باہر آیا۔ سامنے ہی قطار سے کھڑے ڈرائیور نظر آ گئے۔ سب کے آگے کھڑے شخص سے میں نے پوچھا ''میرپور؟''

اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر کہا ''آپ کے لیے انتظام کر دیتا ہوں۔'' پھر اس نے مڑ کر پیچھے کھڑے ایک شخص سے کہا ''میرا نمبر تم لے لو۔ میں بعد میں چلا جاؤں گا...تمہارے علاقے کا پسنجر ہے۔''

وہ نوجوان آگے آیا اور میرے سوٹ کیس کو اٹھاتے ہوئے بولا ''میرپور جائیں گے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے ڈکی میں میرا سامان رکھا پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا ''آجائیں۔''

میں نے پیچھے کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی چل پڑی۔ میں کھڑکی سے باہر کا نظارہ دیکھنے لگا۔ شہر پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا۔ دماغ پر زور دیا تو یاد آیا کہ کبھی یہاں کھلا

میدان تھا۔ آبادی کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ اور تبھی ذہن کے پردے پر ایک تصویر ابھر آئی۔ برسوں پرانی تصویر۔ اس کی کہی باتیں یاد آنے لگیں۔ کبھی میں یہاں اس کے ساتھ آیا تھا بلکہ گزرا تھا۔ یہ تیج گاؤں کا علاقہ کہلاتا تھا۔ یہیں پرانا ائر پورٹ تھا۔ میں نے تصدیق کے لیے ڈرائیور سے پوچھا "یہ کون سا علاقہ ہے؟"

"تیج گاؤں۔" اس نے جواب دیا پھر بولا "صاحب جی آپ اردو بول سکتے ہیں..... میری مادری زبان اردو ہے۔"

"اچھا۔" میں نے اس بار ٹوٹی پھوٹی بنگلہ کی جگہ اردو کا استعمال کیا۔

"جی صاحب میں بہاری ہوں۔" اس نے لفظ بہاری ایسے ادا کیا جیسے اپنے کسی جرم کا اقرار کر رہا ہو۔

"اب تو تمہیں یہاں کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہو گی۔" میں نے پوچھا۔

"صاحب جی ہم لوگوں کا درد..... نہ پوچھیں تو بہتر ہے..... ہم نہ ادھر کے ہیں اور نہ ادھر کے..... بس زندہ ہیں یہی بات بہت بڑی بات ہے..... آپ کہاں سے آ رہے ہیں۔"

میں اس کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا مگر مجھے شہر دیکھنا تھا اس لیے اسے کریدا نہیں کہ اب آیا ہوں تو بہت کچھ خود ہی معلوم ہو جائے گا مگر اس کے سوال کا جواب بھی دینا تھا سو بولنا پڑا۔ "پاکستان سے۔"

"پاکستان سے۔" اس کی آواز میں حسرت تھی۔ جیسے وہ پاکستان کو مکہ سمجھ رہا ہو۔

میں کھڑکی سے لگا باہر دیکھ رہا تھا۔ میری نظر اس سینما ہال پر پڑی جہاں کبھی میں نے ایک فلم دیکھی تھی۔ اس فلم کا گانا میں اسے دیکھ کر گایا کرتا تھا۔ ذہن میں گانے کے بول کے ساتھ اس کی تصویر بھی جاگ اٹھی جیسے وہ سامنے کھڑی ہو۔ میرے اندر درد کا ایک سمندر ہلکورے لینے لگا۔ اس کی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔

تبھی میری نظر بیک ویو مرر پر پڑی۔ وہ شیشے میں مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں کی نظر ملی تو اس نے کہا "آپ..... آپ..... انعام ہیں نا؟"

اپنا نام سن کر میں چونک اٹھا۔ حیرت بھرے لہجے میں پوچھا "تم.. تم کون ہو..... مجھے کیسے پہچانا؟"

"میں انور ہوں..... یاد آیا؟ آپ کے ساتھ نیشنل ہائی اسکول ۲ نمبر سیکشن میں پڑھتا تھا۔" مجھے یاد آ گیا۔ تب وہ ایک دبلا پتلا سا لڑکا ہوا کرتا تھا۔

"انور.. تم تو بہت بدل گئے ہو..... پہچانا ہی نہیں جا رہا۔"

"واقعی تم..... آپ مجھے کیسے پہچانیں گے۔ حالات نے میرے اندر ہی نہیں باہر بھی بڑی تبدیلیاں کر دی ہیں۔ وقت سے پہلے بالوں میں سفیدی بھر دی ہے اور جسم کو ہڈیوں کا ڈھانچا بنا دیا ہے۔" اس کے لہجے میں کرب ہی کرب تھا۔

"ہاں واقعی تم سو بڈھوں کے ایک بڈھے لگ رہے ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"آپ بھی تو بہت بدل گئے... وقت بھی تو کتنا گزر گیا۔"

"ہاں وقت تو بہت گزر گیا۔" میں نے اپنے درد کو چھپا کر ہنستے ہوئے کہا۔

اب ہم اس علاقے سے گزر رہے تھے جہاں کبھی میں خاص طور سے آیا کرتا تھا کیوں کہ یہ علاقہ، مجھے خاص طور سے پسند تھا۔ کبھی یہاں ایک بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا "فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی طرف سے مشرقی پاکستانیوں کو تحفہ۔" سرخ اینٹوں سے بنی گول گول عمارتوں کی قطار... ایک انوکھے انداز کی کنسٹرکشن۔ یہ علاقہ ایوب نگر کہلاتا تھا مگر اب ایک دوسرا بورڈ نظر آ رہا تھا "سہروردی نگر..... گو تو پر جاتنتر بانگلہ دیش سرکار" دل دکھ سے بھر اٹھا۔

"مگر ہمارے کیمپ میں وقت ٹھہر گیا ہے..... آپ خود دیکھ لیں گے۔"

"یہ کیا آپ آپ لگا رکھی ہے..... مجھے تم کہو..... عرصہ ہو گیا کسی نے تم نہیں کہا۔" میں نے مسکرا کر اسے ہدایت دی۔ وہ بھی ہنس پڑا۔

"یعنی آپ بہت بڑے آدمی بن چکے ہیں۔ سب آپ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔"

"بڑا تو نہیں مگر....." میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اور ایک نیا سوال کیا "اب تک تم نے اپنے بارے میں بتایا ہی نہیں کہ کیسی گزر رہی ہے۔ کہاں رہ رہے ہو۔ کتنے بچے ہیں۔"

"رہائش اسی کیمپ میں ہے۔"

"کیوں..... آمدنی تو معقول ہوتی ہو گی پھر کیمپ میں کیوں پڑے ہو؟"

’’آمدنی سے کیا ہوتا ہے۔اس طرح اپنوں کے درمیان تو ہوں۔آس پاس اردو زبان تو سننے کو ملتی ہے‘ پھر ایک اُمید بھی ہے کہ جب حکومتِ پاکستان یہاں والوں کو بلوائے گی تو سب سے پہلے کیمپ والوں کا نمبر آئے گا۔‘‘

’’چچا وغیرہ کی کوئی خبر؟‘‘ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

’’وہیں کیمپ میں مل جائیں گے۔انہیں تمہارا انتظار تھا۔اُمید تھی کہ تم جب بھی آؤ گے وہیں آؤ گے اس لیے وہاں سے ہٹے نہیں۔‘‘

’’میرا انتظار تھا؟‘‘ میرے لہجے میں حیرت تھی اور درد بھی۔

’’ہاں جب تک وہ ٹھیک تھے تمہارا ہی ذکر کرتے رہتے تھے۔‘‘

’’ٹھیک تھے؟ کیا مطلب؟‘‘

’’وہ تمہارا انتظار کرتے کرتے پاگل ہوگئے ہیں۔‘‘

’’کیا...چچا پاگل ہوگئے..کیسے؟‘‘ مجھے ایسا لگا جیسے میرے کان کے قریب ایٹم بم پھٹا ہو۔میرا دماغ ہیروشیما ناگا ساکی بن گیا ہے۔مجھے اپنا وجود ریزہ ریزہ ہوتا محسوس ہوا کچھ دیر کے لیے تو مجھ پر سکتا سا چھا گیا۔میں وہاں عیش کرتا رہا اور یہاں قیامت آگئی۔اس آگہی کا اثر کچھ کم ہوا تو پوچھا۔’’یہ ہوا کیسے؟‘‘

’’یاد نہیں۔‘‘ اس کی آواز میں درد کی چبھن سمائی ہوئی تھی۔’’سنجیدہ سب بتادے گی۔‘‘

’’سنجیدہ۔‘‘ میں نے زیرِ لب وہ نام دہرایا جو کبھی میری زندگی کا حاصل تھا۔میرے لیے سب سے اہم تھا۔

’’سنجیدہ اب کیسی ہے؟‘‘

’’زندگی کی گاڑی کو کھینچنے کے لیے کیمپ کے اسکول میں پڑھاتی ہے۔‘‘

’’اوہ......‘‘ میری زبان سے خود بخود ایک لایعنی سا لفظ ادا ہوگیا۔کچھ دیر کے لیے ٹیکسی میں خاموشی سی چھا گئی.پھر میں نے ہی پوچھا ’’اس کا شوہر کیا کرتا ہے؟‘‘

’’اس نے شادی نہیں کی۔‘‘ انور نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔

’’کیوں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’یہ آپ سنجیدہ سے ہی پوچھ لیجیے گا۔‘‘

میں نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ سائین بورڈ سے پتا لگ گیا تھا کہ میں میرپور کے علاقے میں آچکا ہوں۔پھر ٹیکسی جس راستے پر چل رہی تھی وہ بھی پہچانا ہوا تھا۔ہم ٹیکنیکل کے علاقے میں آچکے تھے۔یہ وہی علاقہ تھا جہاں سب سے زیادہ اردو بولنے والوں کا شکار کیا گیا تھا۔یہی ایک راستہ تھا جہاں سے ہوکر میرپور میں داخل ہوا جاتا تھا۔ڈھاکا شہر سے آنے والوں کو یہیں روک کر ختم کر دیا جاتا تھا۔اس دور کی یاد آتے ہی یادوں کا ایک میلہ سا خیالوں میں در آیا۔ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ایسا لگنے لگا جیسے وہ مناظر پھر سے نظروں کے آگے رقصاں ہیں۔

☆......☆

ٹھائیں ٹھائیں......دھم دھماک......رہ رہ کر ایسی ہی آوازیں گونج رہی تھیں۔تین دن سے یہی ہو رہا تھا۔میرپور کے گرد جگہ جگہ خندقیں کھود کر پہرے داروں کو بیٹھا دیا گیا تھا۔ہر محلے کے جوان اور بوڑھے باری باری ڈیوٹی دیتے تھے۔ہر لمحہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ بنگالی حملہ کردیں گے۔مکتی باہنی کے لوگ حملہ آور ہو جائیں گے۔گورو ہاٹ۔فرسٹ کالونی۔سیکنڈ کالونی۔لالمٹیا مزار شریف۔ایک نمبر۔پلاٹ ایریا۔دو نمبر۔چھ نمبر۔خالی ہو چکا تھا۔لوگ اپنی اپنی جان بچا کر دس نمبر۔گیارہ نمبر۔بارہ اور تیرہ نمبر میں پناہ لے چکے تھے۔پولیس اور بی ڈی آر نے زبردستی ان علاقوں کو خالی کرایا تھا اور ان مکانوں میں بنگالیوں کو داخل کرا دیا گیا تھا۔علاقہ خالی ہونے لگا تو ہم بھی گیارہ نمبر میں آگئے تھے اور اللہ سے دعا کر رہے تھے کہ کسی طرح پاکستان پہنچ جائیں۔ہمیں پوری اُمید تھی کہ حکومتِ پاکستان ہمیں بلوائے گی۔ہم نے پاکستان کے نام پر ہجرت کی تھی تو ہمارا اصل وطن پاکستان ہی ہوا ناں۔پھر ہم تمام اردو بولنے والوں نے پاکستان کی بقا کے لیے بھرپور قربانیاں دی تھیں۔فوج کے شانہ بشانہ لڑے تھے۔اب اگر شکست ہوگئی تھی تو فوج کی طرح ہمیں بھی وہاں بلایا جائے گا۔ہم ہی کیا پورا اردو داں طبقہ اسی خوش فہمی میں تھا مگر پاکستان سے بلاوا آ نہیں رہا تھا اس لیے ابا نے تجویز دی کہ بہت سے لوگ بروکر کے ذریعہ پاکستان جا رہے ہیں۔ہم لوگوں کو بھی بروکر کا سہارا لینا چاہیے۔مگر اماں راضی نہ تھیں کیونکہ راہ پُرخار تھی۔ہر طرف لٹیرے تھے۔خون کے پیاسے تھے۔گویا سفر انتہائی پُرخطر تھا۔مگر نوید زندگی تو تھا۔یوں بھی خطرات سے ہی زندگی نمو پاتی ہے۔اس لیے ابا نے کہا‘ یہ ضروری ہے۔اماں نے بھی مجبوراً ہامی بھرلی اور میں نے بروکر کی تلاش شروع کردی۔

یہ کام بروکر ہی کرسکتا تھا۔وہی لوگ یہاں سے لوگوں

کوانڈیا لے جاتے اور پھر وہاں سے بارڈر پار کرا دیتے۔ ہم بھی اپنی سرزمین کو سجدہ کرنا چاہتے تھے، پاکستان کی پاک سرزمین کو۔ اس لیے فوراً راضی ہو گئے۔ بروکر کا مطالبہ تھا دس ہزار روپے فی کس۔ گویا ہمیں تیس ہزار ادا کرنے تھے۔ جائیداد کے نام پر ہمارے پاس دو گھر تھے جس پر بنگالیوں نے زبردستی قبضہ کرلیا تھا۔ اس وقت ہم لوگ کیمپ میں باحال پریشاں مقیم تھے۔ اتنی بڑی رقم لاتے کہاں سے اس لیے ابا اور چچا سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

جب بنگالیوں نے ہمارے علاقے پر حملہ کیا تھا اس وقت جس کے ہاتھ جو لگا تھا وہ اسے اٹھا کر زندگی کی بقا کی خاطر محفوظ علاقے کی طرف بھاگا تھا۔ ہم لوگ بھی سیکشن نمبر ۶ سے بھاگ کر گیارہ نمبر آگئے تھے۔ آتے وقت اماں اور چچی نے صرف نقد رقم اور زیورات اٹھائے تھے۔ اب وہی اثاثہ تھا۔ ابا کے پاس کل سولہ ہزار تھے۔ چچا کے پاس گیارہ ہزار۔ گویا ایک بڑی رقم ہمارے پاس تھی مگر اتنی نہ تھی کہ ہم بروکر کا مطالبہ پورا کرسکتے اس لیے پھر ایک بار میٹنگ بیٹھی۔ دونوں بھائی سر جوڑ کر مشورہ کرنے لگے۔ اماں اور چچی نے اپنے زیورات پیش کیے۔ ان کی مالیت کا حساب لگایا گیا۔ اس دور میں سونے کی قیمت گرگئی تھی۔ مگر یہ صرف اردو بولنے والوں کے لیے تھا۔ یعنی ان کے زیورات کی قیمت کم لگائی جارہی تھی۔ لوگ مجبور تھے اور مجبوری ہر کام کرا دیتی ہے۔ وہ لوگ بھی اپنے زیورات کم قیمت پر بیچنے پر مجبور تھے۔ اسلام پورہ کے ایک صراف سے سودہ کیا گیا۔ اس نے پچپن ہزار کے زیورات کی قیمت پچیس ہزار لگائی۔ کوئی اور راستہ نہ تھا اس لیے اس کا کہا مان لیا۔ اب باون ہزار کی رقم پاس تھی۔ اگر سب ایک ساتھ جاتے تو صرف بروکر کو پچاس ہزار دینا پڑتا۔ نئی جگہ پر جا کر سیٹ ہونے کے لیے پاس کچھ بھی نہ ہوتا اس لیے فیصلہ ہوا کہ دو گروپ میں ہم سب جائیں گے۔ پہلے گروپ میں امی ابا اور میں رہوں گا۔ ہم سب وہاں پہنچ کر کرنسی بھیج کر چچا چچی کو بلالیں گے۔ یوں بھی راستہ پُرخطر تھا۔ اس لیے ایک خاندان کو خطرہ اٹھانا چاہیے۔ اس بات پر متفق ہو کر ہم سب نکل پڑے۔ کیا خبر تھی کہ جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کرنا اتنا کٹھن ہوگا۔ اتنے سال لگ جائیں گے۔

بروکر کا وعدہ تھا کہ وہ ہم سب کو باحفاظت منزل تک پہنچا دے گا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اس راستے سے اب تک بہت ساری فیملی کو پہنچا چکا ہے۔ ہم نے اس کی بات پر یقین کر کے اسے رقم دی تھی۔ اس نے ہمیں بخیروعافیت کلکتے تک پہنچا دیا۔ جیسور سے کلکتہ صرف سو کلومیٹر دور ہے مگر یہ دوری یہ فاصلہ ہم نے کیسے طے کیا یہ ہم ہی جانتے ہیں۔ ہر لمحہ وسوسوں بھرا۔ ہر قدم اندیشوں کی یلغار، ہر طرف خوف کا حصار۔ ہر شخص دشمنِ جاں، ہر کوئی لٹیرا نظر آتا تھا۔ جتنی دیر گاڑی چلتی رہی تھی ہم سب کی جان سولی پر لٹکی رہی تھی۔ سیالدہ اسٹیشن پر اتر کر جب کلکتہ کی بھیڑ کا حصہ بنے تب کچھ راحت ملی تھی۔ کچھ سکون حاصل ہوا تھا۔ دل کی دھڑکنوں کو ترتیب ملی تھی۔

سیالدہ اسٹیشن سے ہم سب ذکریا اسٹریٹ پہنچے۔ بروکر نے ہمیں سیٹھ موسیٰ کے مسافر خانے میں ٹھہرایا تھا۔ دو دن آرام کرنے کے بعد ہم سب نئے سفر پر نکل پڑے۔ اب ہماری منزل دہلی تھی۔ مغلوں کا دارالسلطنت دہلی۔ مسلمانوں کی شکوہ کی گواہ دہلی۔ دہلی جانے کے لیے ہم سب ہاوڑا اسٹیشن پہنچے۔ وہاں سے کالکا میل پر سوار ہو کر بڑے آرام اور اطمینان سے دہلی پہنچے۔ گویا آدھا معرکہ سر ہوگیا۔ سب نے اطمینان کی سانس لی۔ مگر ہم بھول گئے تھے کہ قسمت کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ جیسے ہی ہم سب نئی دہلی کے اسٹیشن سے باہر نکلے کہ ایک عجیب افتاد نے ہمیں گھیر لیا۔ خوف تو زندگی کا حصہ ہے۔ یوں بھی ہم خوف کو شکست دیتے ہوئے اب تک چل رہے تھے لیکن اندازہ نہیں تھا کہ افتاد یوں آئے گی۔ بروکر نے کہا تھا کہ اس نے ہر جگہ لائین بنا رکھی ہے مگر یہاں آکر معاملہ بگڑ گیا تھا اور بروکر بھی موقع پا کر فرار ہوگیا تھا۔ شاید مخبری ہوئی تھی اور ہم لوگوں کو پولیس نے گھیر لیا تھا۔ ہمیں اپنے گھیرے میں لے کر پولیس اسٹیشن لے جانے کے لیے گاڑیوں میں بٹھایا جانے لگا۔

''تو تم لوگ پاکستانی ہو؟'' موٹے آفیسر نے گاڑی میں ابا سے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''بغیر پاسپورٹ ویزا کے یہاں آئے۔ اب تو ان لیگل انٹری پر سب کو دس دس سال کے لیے اندر کرنا ہی پڑے گا۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا اور پھر سب کی تلاشی لی گئی۔ کل ملا کر تقریباً ساٹھ ہزار انڈین کرنسی نکلی۔ یہ ایک بڑی رقم تھی۔ 1972ء میں تو بہت بڑی رقم تھی۔ آفیسر کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ پھر عورتوں کے پاس سے زیورات بھی نکلے تھے۔ وہ بھی اتنے ہی کے ہوتے۔ ابھی گاڑی زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ کچھ لوگ سامنے آگئے۔ ان کے

اشارہ کرنے پر ڈرائیور نے گاڑی روک لی۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ سب مسلمان ہیں کیونکہ ان میں سے دو کے چہرے پر داڑھی بھی تھی اور وہ جناح کیپ میں تھے۔ انہیں دیکھ کر آفیسر نے ناخوشگوار لہجے میں پوچھا "کیا بات ہے بھائی جی؟"

"اگر آپ رحم کریں تو...... یہ سب خود پریشانی میں ہیں...... اپنی جان بچا کر مشرقی پاکستان سے نکلے ہیں...... یہ لوگ یہاں رہیں گے بھی نہیں...... اگر ہمارے ملک سے نکلنا ہی چاہتے ہیں تو ہم انہیں کیوں روکیں...... انہیں جانے دیں۔" وہی جناح کیپ والے نے کہا۔

"ارے بھائی کیسے جانے دیں... ہمارے اوپر بھی تو لوگ ہیں...... اگر کسی کو پتا لگ گیا۔" آفیسر کچھ نرم پڑ رہا تھا۔ "آپ اس سے پہلے بھی دس آدمیوں کو چھڑا لے گئے تھے۔"

"بس اتنا ہی کر دیا کریں..." وہ کچھ اور قریب آ گیا تھا پھر اس نے ایک لفافہ آفیسر کی طرف بڑھایا تھا۔

"ارے بھائی جی آپ کا کہا ہم ٹال بھی تو نہیں سکتے...... ٹھیک ہے انہیں ہم اتارے دیتے ہیں مگر ان کو خاموشی سے یہاں سے نکال دیں ورنہ میری نوکری کا سوال ہے۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں.... آپ اور آپ کے ساتھیوں کا نام کہیں نہیں آئے گا۔" ان صاحب نے کہا اور ہم سب کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔

یہ ایک غیبی امداد تھی اس لیے ہم سب نے خدا کا شکر ادا کیا اور نیچے اتر آئے پھر ان صاحب کے ساتھ ایک گلی میں مڑ گئے۔ ہم میں سے کسی نے بھی اپنی رقم یا زیورات کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا۔ جان چھوٹ جانے کی سب کو خوشی تھی۔

ہم سب ان صاحب کی رہنمائی میں ایک گلی سے دوسری گلی میں آئے اور پھر ہمیں ایک بڑے سے ہال میں ٹھہرا دیا گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ صاحب ایک رفاحی ادارے سے وابستہ ہیں اور ہم جیسے لوگوں کی امداد کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کوشش سے رہائی تو مل گئی تھی مگر ایک بڑی پریشانی اپنا منہ کھولے سامنے کھڑی تھی۔ ہم میں سے کسی کے پاس اب اتنا پیسا نہیں تھا کہ آگے جا سکتے۔ اب سوال یہ تھا کہ ہم لوگ کریں گے کیا۔ ان صاحب سے مشورہ کیا تو وہ بولے "بھائی میں خود یہاں ایجنسیوں کی نظر میں ہوں۔ سب کو خبر ہے کہ میں آفت زدہ لوگوں کی مدد کر رہا ہوں پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں اور اتنی رقم جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ آپ سب کو کسی طرح آپ کی منزل تک پہنچا سکوں۔"

پتا نہیں انہوں نے کس کس طرح ایک بڑی رقم کا انتظام کیا اور ہم سب کو ایک دوسرے بروکر کے ساتھ روانہ کر دیا۔ دراصل انہیں کچھ اور مسلمان ساتھیوں کی مدد حاصل تھی۔ وہ لوگ چندہ دیتے تھے۔ حکومت اس لیے ان کے خلاف کارروائی نہیں کرتی تھی کہ وہ دہلی آنے والے غیر قانونی لوگوں کو آگے بھیج دیتے تھے۔ ہمیں تو اپنی منزل پر پہنچنے سے مطلب تھا۔ ان کی کوشش سے ایک دوسرے بروکر کا انتظام ہوا۔ اس بروکر کی پیش بندی درست تھی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر ہم سب بخیر و عافیت لاہور پہنچ گئے۔

لاہور کیا آیا مجھے ایسا لگا جیسے ہم نے نئی زندگی پالی ہے۔ اپنی سرزمین پر پہنچ کر امی اور ابا سربسجود ہو گئے خود میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اپنی مٹی کو چومتے خوشی سے جھومتے ہم کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔

کراچی پہنچ کر ہم نے سوچا تھا کہ ہمیں منزل مل گئی مگر کچھ ہی دنوں میں ہمیں احساس ہو گیا کہ ہم نے غلطی کی ہے۔ بغیر اجازت آئے تھے اس لیے تارکین وطن کہلا رہے تھے۔ اپنے ہی وطن میں ہم تارکین وطن بن گئے تھے، یہ ایک المیہ تھا اور اس کا دکھ اظہار سے ماورا تھا۔ قانون سے بچنے کے لیے ہم نے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کیے، کتنی محنت کی یہ میں ہی جانتا ہوں۔

ابا نے یہ دکھ دل پر لے لیا تھا۔ وہ کسی سے کچھ نہیں بولتے مگر ان کو یہ روگ بن کر چمٹ گیا تھا۔ بالآخر یہ روگ ٹی بی کی شکل میں ظاہر ہوا اور اس کا پتا ہمیں تب چلا جب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ وہ اس اسٹیج پر پہنچ چکے تھے جب علاج کی نہیں۔ دوا کی بھی نہیں بس دعا کی امید رہ جاتی ہے۔ پھر ایک دن وہ ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر مٹی کی چادر اوڑھ کر قبرستان میں جا سوئے۔

میں نے ڈھاکا سے انٹر کیا تھا جو یہاں کے لیے بے معنی تھا۔ اگر میں سرٹیفکیٹ شو بھی کرتا تو کسی کام نہ آتا اس لیے جاہلوں والا کام کرنے لگا۔ ایک ٹیلر ماسٹر کی دکان میں ناپ لیا کرتا اور خالی وقت میں ٹیلرنگ سیکھا کرتا تھا۔ ایک امید تھی کہ کبھی اچھا ٹیلر بن جاؤں گا۔ میں ٹیلر ماسٹر تو نہ بن

سکا ہاں یتیم ضرور بن گیا۔

یہ ایک سانحہ تھا۔ امی کو چپ لگ گئی اور ایسی چپ کہ موت کی گود میں سوجانے تک انہوں نے ایک لفظ نہ کہا۔

امی کے بعد تو میں بالکل اکیلا ہوگیا تھا۔ جہاں میں نوکری کررہا تھا ان لوگوں نے دس دن کی چھٹی کا بہانہ بنا کر مجھے نوکری سے نکال دیا۔ یوں بھی اب میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ ایسے وقت میں میرے ساتھ کام کرنے والا اشفاق جس نے اپنی دکان کھول لی تھی مہربان بن کر سامنے آیا اس نے مجھے سنبھالا۔ زبردستی اپنی دکان میں بٹھانے لگا۔ ایک دو ماہ بعد ہی احساس ہوگیا کہ دنیا کا ہر آدمی مطلبی ہے۔ وہ بھی اپنے مطلب سے مجھے اپنے پاس بٹھا رہا تھا۔ بات کچھ یوں تھی کہ اس کی ایک بہن تھی۔ اللہ نے اسے بس قبول صورت بنایا تھا مگر وہ زبان کی بہت تیز تھی۔ اس کی وجہ سے اس کا گھر ہمہ وقت ایک اکھاڑا بنا رہتا تھا۔ اپنے بوجھ کو اس نے نہایت خوبصورتی سے میرے کندھے پر ڈالا اور مجھے شادی کے بندھن میں باندھ کر خود لاہور شفٹ ہو گیا۔

میں تو پہلے ہی حالات کا ستایا ہوا تھا۔ نکہت کی بدزبانی سے لہولہو ہوتا رہا۔ اس میں ایک نہیں بہت ساری برائیاں تھیں مگر ایک اچھائی بھی تھی کہ وہ آج کے ساتھ آنے والے کل کے بارے میں بھی سوچتی تھی۔ اس نے پہلے انجم پھر سرفراز کا تحفہ دیا۔ پھر طعنوں کا پہاڑ کھڑا کردیا کہ اپنے لیے تو اب تک کچھ کرنہ سکے کم سے کم ان بچوں کے لیے ہی کچھ کر دکھاؤ۔ اس کے زور دینے پر ہی میں نے محنت کے ساتھ عقل کا استعمال بھی کرنا شروع کردیا۔ اسی نے راستہ بتایا تھا، رقم کا انتظام بھی اسی نے کیا تھا کہ میں دکان کی آمدنی پر اکتفا نہ کروں، کچھ اور بھی کروں۔ اسی نے پانچ ہزار روپے دے کر کہا تھا کہ خالی وقت میں، جب کسی کسٹمر کا کام نہ رہے تو بچوں کے کپڑے تیار کرو اور انہیں دکان دکان جاکر سپلائی کرو۔ اگر یہ کام جم گیا تو اس دکان سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔ مشورہ برا نہیں تھا۔ میں نے اس کے زور دینے پر یہ کام شروع کردیا۔ میرے ہاتھ میں صفائی تھی یا پھر میری قسمت اچھی تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے میرے بہت سے گاہک تیار ہوگئے۔ تقریباً پچاس دکان کے لیے میں مال تیار کرنے لگا تھا۔ اتنا ڈھیر سارا کام میں اکیلا تو کر نہیں سکتا تھا اس لیے نکہت بھی ہاتھ بٹاتی تھی پھر میں نے محلے کی کئی اور عورتوں کو بھی ملازمت دے دی۔ ایک کمرے میں پانچ پانچ مشینوں پر کام ہونے لگا تھا۔ اسی درمیان وقت نے ایک اور موقع دیا۔ میرا ایک کسٹمر جرمنی آتا جاتا رہتا تھا۔ اس نے وہاں کی سے بات کی اور معاہدہ بھی کرا آیا۔ کچھ اس نے پیسے دیئے کچھ میرے پاس تھے اور کچھ نکہت نے اپنے زیورات بیچ کر دیئے جس سے میں نے مارکیٹ سے کپڑا خریدا اور پورے تین لاکھ کا مال جرمنی بھیج دیا۔ جب وہاں سے پیمنٹ آئی تو میں لکھ پتی بن چکا تھا۔ پھر تو راستے بنتے چلے گئے۔ جرمنی فرانس اور برطانیہ کے کئی گاہک مل گئے۔ اب میں ایک بڑی گارمنٹس فیکٹری کا مالک تھا۔ پھر تو جیسے دولت برسنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں نیو کراچی سے اٹھ کر ڈیفنس کے ایک بنگلے میں آگیا۔ زندگی نہایت خوشگوار ہوگئی تھی کہ گزشتہ سال ایک سانحہ رونما ہوگیا۔ نکہت جس نے مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ اپنی بدمزاجی کی وجہ سے ایک نوکرانی کے عتاب کا شکار ہوگئی۔ کسی بات پر اس نے ماسی کو نوکری سے نکال دیا تھا۔ اس پر کچھ الزامات بھی لگائے تھے۔ اس کا بدلہ اس کے کسی چاہنے والے نے ایسا لیا کہ میری دنیا تاریک ہو گئی۔ وہ گھر سے نکلی تھی کہ ایک اندھی گولی اسے چاٹ گئی۔ فائر کرنے والے کو کچھ لوگوں نے دیکھا تھا۔ انہوں نے ہی پولیس کو حلیہ بتایا تھا اور پولیس نے اس شخص کو گرفتار کرلیا تب راز کھلا کہ اسے نوکرانی نے اکسایا تھا کہ وہ بے عزتی کا بدلہ لے۔

نکہت کی موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بند ہوکر رہ گیا تھا۔ میری کیفیت دیکھ کر میرے بچوں نے مجھے سنبھالنے کی کوشش شروع کی۔ گو کہ وہ ابھی اتنے بڑے نہیں تھے کہ میرا کاروبار سنبھال لیتے۔ دونوں ہی پڑھ رہے تھے مگر ان میں ماں کی سوجھ بوجھ تھی۔ بیٹا اٹھارہ سال کا تھا اور بیٹی سولہ کی۔ دونوں نے مجھے مشورہ دینا شروع کردیا کہ میں کچھ دنوں کے لیے یورپ ٹور پر چلا جاؤں۔ وہاں کی ہماہمی میں میرا غم کم ہوجائے گا۔ انہی کے مشوروں نے مجھے ماضی کی کوتاہی یاد دلادی اور میں اس سفر پر آمادہ ہوگیا...... بنگلہ دیش یہاں کا ٹکٹ لیا اور یہاں آگیا۔

☆......☆

”لو بھئی ہم تو منزل پر پہنچ گئے گیارہ نمبر آگیا۔“ انور نے کہا تو میں چونک گیا۔ ماضی سے پھر حال میں لوٹ آیا۔ لوگ ادھر ادھر بیٹھے تھے۔ سب کے لباس سے عسرت عیاں تھی۔

”یار انور یہاں کی حالت تو بہت دگرگوں ہے۔“

"ہاں..... یہاں رہنے والے سب انتظار کی سولی پر لٹکے ہوئے ہیں، یہ انتظار کا خنجر تو اسی وقت سے ہر گلے پر چل رہا ہے جب سے سقوط کا المیہ ہوا ہے۔ جو نہ مرنے دیتا ہے اور نہ صحیح طور پر جینے دیتا ہے۔ تڑپنا ہی مقدر بنا ہوا ہے۔ ہر ایک کو انتظار ہے کہ کب پاکستان سے اس کا بلاوا آئے گا۔ اس انتظار نے پوری ایک نسل کو تباہ کر دیا ہے۔ اسی لیے تو لوگ کہہ رہے ہیں کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے ساتھ ہماری قسمت کا بھی سقوط ہو گیا ہے۔ لوگوں نے بچوں کو اسکول بھیجنا پسند نہیں کیا کہ بنگلہ پڑھ کر کیا ہوگا ہمیں تو پاکستان جانا ہے۔ اس انتظار نے پوری ایک نسل کو تباہ کر دیا۔ ایک نسل پیدا ہو کر جوان ہو گئی مگر پڑھ لکھ نہ سکی۔ نتیجہ کہ انہیں پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے رکشا کھینچنا پڑ رہا ہے یا پھر چوری چکاری سے پیسے کما رہے ہیں۔ جن کے پاس رقم تھی وہ سولہ ہزار لگا خرچ کر کے انڈیا یا نیپال نکل گئے۔ اس سے زیادہ رقم تھی تو وہ پاکستان غیر قانونی راستے سے پہنچ گئے۔"

"اف یہ تو بہت برا ہوا۔"

"تمہارے چچا بھی اسی انتظار کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے پاگل ہو گئے۔ ہر روز صبح صبح کیمپ سے نکل کر بازار کے باہر ایک مخصوص جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہیں سے سڑک مڑتی ہے۔ وہ آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھتے رہتے ہیں اور بڑبڑاتے رہتے ہیں "بس اب وہ گاڑی آتی ہوگی جو ہمیں کلو کیمپ لے جائے گی پھر وہاں سے ائرپورٹ۔ دیکھنا سب سے پہلے میرا انعام آئے گا۔ پاکستان میں میرا بھتیجا ہے۔ وہ کلیرنس بھیجے گا پھر ہم وہاں سے کلو کیمپ جائیں گے اور پھر پاکستان...... آخر میری بیٹی اس کی منگیتر ہے۔ میرے بھتیجے کی منگیتر۔ وہ اپنی منگیتر کو درندوں کے بیچ کیسے چھوڑ جائے گا۔" کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔

یہ دکھ اس کا بھی تو تھا۔ وہ بھی تو انتظار کی سولی پر لٹکا ہوا ہے۔ وہ چچا کے نام پر اپنا دکھ بھی تو بول رہا تھا۔ اس دکھ کا آسیب تو ہر ذہن کو جکڑے ہوئے تھا۔

اتنی دیر میں ہم سیکشن نمبر گیارہ کے بازار میں پہنچ گئے۔ وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ بالکل ویسا ہی تھا۔ میں نے ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا "چچا کیا آج بھی وہاں ہوں گے؟"

"ہاں...... بارش آئے، آندھی آئے یا طوفان۔ وہ وہیں مل جاتے ہیں۔ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے۔ کہتے ہیں اگر میرا بھتیجا آ گیا تو اسے میرا گھر کوئی نہیں بتائے گا۔ وہ پھر واپس چلا جائے گا۔" پھر اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا "وہ دیکھو، وہ ادھر....."

میں نے اس طرف دیکھا۔ ایک بند دکان کے تھڑے پر ایک مدقوق سا بوڑھا، ہڈیوں کا پنجر بیٹھا ہوا تھا۔ کپڑے میلے اور مسلے ہوئے۔ میں نے ٹیکسی روکنے کو کہا اور اتر کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا چچا کے نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا۔ انور بھی ساتھ آ گیا تھا۔ میں نے چچا کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے۔ زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں لال مٹی کا ایک ڈھیلا تھا جس سے لکیر کھینچ رہے تھے۔

"اتنے غور سے ان لکیروں میں کیا دیکھ رہے ہو چاچا؟" انور نے پوچھا۔

"پاگل کہیں کا' میں دیکھ نہیں' ڈھونڈ رہا ہوں۔" چچا جان نے ہنس کر کہا۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟"

"ڈھونڈا اسے جاتا ہے جو کھو گیا ہو۔ میں بھی وہی کر رہا ہوں۔"

"کیا کھو گیا ہے ذرا میں بھی تو سنوں؟"

"پاکستان پہنچنے کا راستہ' یہ دیکھو' یہاں تک تو صحیح ہے مگر آگے پہنچ کر پتا نہیں کیسے الجھ گیا؟ سرا ہی نہیں رہا۔ اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔"

میرا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ آنکھیں نہ چاہتے ہوئے بھی گیلی ہو گئیں اور میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ انہیں کیسے سمجھاتا کہ یہ راستہ الجھا نہیں الجھایا گیا ہے۔ سیاست گردی کا شکار ہوا ہے۔ اسے تعصب کی گرد سے ڈھک دیا گیا ہے۔

"آؤ چلیں....." انور نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا، میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"کیمپ پہنچ کر نہا دھو کر فریش ہو جاؤ پھر ان کو لے جانے کی ترکیب سوچتے ہیں۔ ابھی یہ کسی طور نہیں اٹھیں گے، اگر ضد کرو گے تو کہیں گے کہ اگر میں چلا گیا اور میرے پیچھے ریڈ کراس والے آ گئے تو مجھے کہاں ڈھونڈیں گے۔"

"میں کوشش کرتا ہوں شاید مان جائیں" کہہ کر میں ان کے برابر میں بیٹھ گیا۔ "چچا جان مجھے پہچانتے ہیں نا...... میں انعام ہوں انعام... آپ کا بھتیجا۔ کراچی سے آیا ہوں۔"

انہوں نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس وقت بھی ان کی آنکھیں خالی خالی تھیں۔ انہوں ایک نظر ڈال کر کہا "چل چھوٹا... میرا انعام کلیرنس لے کر آئے گا.. کلیرنس

کیا ہے جانتے ہو نا؟ پاکستان جانے کا اجازت نامہ۔ یہ ایسے نہیں ملتا۔ پاکستانی کو پاکستانی ہونے کا ثبوت فراہم کرنا پڑتا ہے تب ملتا ہے...... چل ہٹ.. مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ یہ شام سے پہلے گھر نہیں جانے والے۔ اپنی انرجی ضائع نہ کرو۔ یہ اپنے حواس میں کب ہیں۔"

میں بھاری قدموں سے ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ بند کرنے تک میری نظریں ان ہی پر ٹکی ہوئی تھیں۔

انور نے ٹیکسی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سب ہماری قسمت میں لکھا گیا ہے۔ ہمیں وطن سے محبت کی یہ سزا دی گئی ہے" اس کی آواز میں زمانے بھر کا درد سمٹ آیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے ڈرائیو کر رہا تھا۔ کیمپ نزدیک آ چکا تھا۔

کیمپ کا نقشہ اب تک ویسا ہی تھا جیسا میں دیکھ کر گیا تھا۔ لمبے لمبے ریل کے ڈبے جیسے بیڑا (بانس کی چٹائی) سے بنے جھونپڑے جن کو اندر سے اسی طرح کی چٹائی لگا کر چھوٹے چھوٹے کمروں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ایک ایک کمرے میں کئی کئی مرد عورتیں زندگی گزار رہی تھیں۔ ایک خاندان کو ایک کمرا ہمارے رہتے الاٹ ہوا تھا۔ جواب یقیناً ان کے لیے چھوٹا ہی نہیں بہت چھوٹا پڑ رہا ہوگا کیونکہ اس وقت جو بچے تھے اب وہ بچے والے بن چکے ہوں گے۔ سامنے وہی پرانا منظر تھا۔ کیمپ کی کھلی جگہ پر شیتل (بید پاٹی کی چٹائی) پر بیٹھے لوگ تھے جو کیرم، تاش یا لوڈو سے دل بہلا رہے تھے، گپیں لگا رہے تھے۔ ٹیکسی کے رکتے ہی وہاں بیٹھے لوگوں کی نظریں ہماری طرف اٹھ گئیں۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے انور نے کہا "ابول چاچا دیکھو میں کسے لے کر آیا ہوں۔"

وہاں بیٹھے لوگوں میں ابول چاچا کون ہے مجھے نہیں پتا، پھر بھی میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک بزرگ صورت شخص نے پوچھا "کون ہے۔ پہلے کچھ بتائے گا بھی۔"

"یہ انعام ہے...... سیدھے کراچی سے آ رہا ہے۔"

"انعام۔" کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

"میاں یہاں تو آؤ۔" اسی شخص نے نرم لہجے میں کہا۔

میں ان کی طرف بڑھ گیا۔ انہوں نے میرے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے پوچھا "سہیل بھائی اور بھابی کیسی ہیں؟"

"ابا اور امی کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"اوہ....." ان کے لہجے میں دکھ تھا۔

"تم شاید ابھی تک مجھے پہچان نہیں پائے ہو...... میں ابولبشر انصاری ہوں...... سہیل بھائی کے ساتھ کام کرتا تھا۔"

اب مجھے بھی یاد آ گیا تھا۔ تب وہ خوب قد آور ہوا کرتے تھے مگر اب ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئے تھے۔

"پاکستان کے حالات کیسے ہیں، سنتے ہیں وہاں بہوت مارا ماری ہو رہی ہے۔" ایک شخص نے پوچھا۔

"مارا ماری ہوتی ہے تو ہوتی رہے، یہ بتاؤ ہماری گورنمنٹ ہم کو کب بلائے گی؟"

"شاید اگلے الیکشن کے بعد نئی حکومت بلا لے۔" میں نے ان کا خواب نہیں توڑا۔ وہ خوش فہمی میں تھے۔ اس لیے میں نے بہلاوے کا جھنجھنا تھما دیا۔

"اے لو...... یہ کیا بات ہوئی...... اتنے الیکشن ہو گئے اور کسی کو ہمارا خیال نہیں...... کیا ہم پاکستانی نہیں ہیں۔" ایک شخص نے جھنجلا کر کہا۔

"اور کیا...... وہ لوگ ہمیں پاکستانی سمجھ ہی نہیں رہے...... وہ لوگ ہمیں سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ تم لوگوں نے مشرقی پاکستان بچانے کی غلطی کی تھی اس کی سزا بھگت لو۔" ایک تیسرے شخص نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔

"اے بشیر... تو چپ نئی رہ سکتا۔" ابول چاچا نے اسے ڈانٹا پھر مجھ سے مخاطب ہوئے "جا بیٹا جا کر نہا دھو کر تیار ہو جا۔ اتنی دور سے آیا ہے تھک گیا ہوگا۔"

"جی اچھا" کہہ کر میں کھڑا ہو گیا اور اس طرف بڑھنے لگا جدھر انور جا رہا تھا۔ اس نے میرا سوٹ کیس اور ائر بیگ اٹھا لیا تھا۔ جھونپڑوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے یاد آتا گیا کہ کون کس حصے میں رہتا تھا۔ تبھی میری نظر ایک دروازے پر ٹک گئی۔ یقیناً وہ حصہ چچا جان کا تھا وہاں سرخ بارڈر کی سفید ساڑی میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ وہ بھی مجھے بغور دیکھ رہی تھی دودھیا رنگت پر سرخ کناری والا بلاؤز اس پر خوب کھل رہا تھا مگر میں نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر انور کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا پھر مجھ سے بولی "آیئے انعام بھائی۔"

"تم... تم؟" میں نے سوال کیا۔

اس نے بنگال کی ملکوتی مسکراہٹ کو ہونٹوں پر سجاتے ہوئے جواب دیا "میں ابوالبشر انصاری کی بیٹی رضیہ ہوں۔"

"تم تو بہت چھوٹی تھیں جب میں یہاں سے گیا تھا۔ پھر تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟" میں نے سوال کیا۔

"یہاں۔ اس کیمپ میں باتیں طوفانی رفتار سے پھیلتی ہیں.... آپ جب ابا سے باتیں کر رہے تھے تبھی ہم تک یہ بات پہنچ گئی تھی کہ آپ آئے ہیں۔ اسی لیے سنجیدہ باجی کو کنگھی چوٹی کرنے بھیج دیا۔"

"او۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ نیم اندھیرے کمرے میں پہنچ کر عجیب سا احساس ہوا جیسے میں کسی قبر میں آ گیا ہوں۔ عجیب سی خاموشی تھی۔ رضیہ بھی سوٹ کیس اندر رکھ کر جا چکی تھی۔ اس ڈربے نما کمرے میں آ کر میں نے نظریں گھمائیں، ایک اندھیرے گوشے میں کھڑے ہیولے پر میری نظر جا ٹھہری۔ وہ ہیولہ اپنی جگہ سے ہلا اور چلتا ہوا میرے قریب آ کر ٹھہر گیا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے۔ ان حلقوں سے اوپر دو کشادہ آنکھیں جن میں درد کا دریا موجزن۔ وہاں ایک دلکش خوشی ایک معصوم غرور اور تمنا کے تکمیل کا چاند اپنی پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو آخر کار میں نے تمہیں بلوا لیا نا۔ جب کہ کرب کی کھیتی لہلہا کر کہہ رہی تھی آ تو گئے ہو مگر دیکھو میں عمر کی کس منزل پر کھڑی ہوں۔

وہ پینتیس سال کی تھی مگر پینتالیس سے زیادہ کی لگ رہی تھی۔ حالات کے تھپیڑوں نے اسے اس مقام پر پہنچا دیا تھا کہ اب وہ پہچانی بھی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے داہنے ہاتھ کو پیشانی پر لے جا کر ہولے سے کہا "آداب۔ کیسے ہیں آپ؟"

غم والم میں ہلکورے لیتی آواز نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میں نے اسے بغور دیکھا۔ بالوں میں چاندی کے تار جھلملا اٹھے تھے جو چھپائے نہیں چھپ رہے تھے۔ دھنسی ہوئی آنکھوں میں دبا دبا سا کرب چل چل کر شکوہ کناں تھا۔

میں نے جلدی سے اپنی نظریں جھکا لیں۔ پھر دل میں اٹھتے کرب کے مدوجزر پر بند باندھتے ہوئے پوچھا "اور تم کیسی ہو؟"

"وقت نے جیسا رکھا رہ لی۔ تھپیڑوں کے نشانات تم بھی دیکھ رہے ہو گے۔" اس کا لہجہ اب بھی درد سے بھرا ہوا تھا۔ وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہی تھی اور اس کی نظریں اپنے ہی پیروں کا طواف کر رہی تھیں۔

"باجی۔" رضیہ کی آواز ابھری پھر وہ اندر آ گئی اور سنجیدہ کے قریب جا کر بولی "اب یہ رونا دھونا بند کرو، یہ سب نہیں چلے گا۔ ہنسو...... بہت رو لی...... دیکھو آخر کار انعام بھائی کو تمہاری یاد آ گئی...... وہ آ تو گئے نا۔"

رضیہ کی شوخ آواز نے غم والم کے تالاب میں گرے پتھر کا کام کیا جس کی گونج موسیقیت سے لبریز تھی۔ ماحول کی یاسیت بہت حد تک کم ہوتی محسوس ہوئی۔ سنجیدہ نے بھی زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجا لی۔

"ہاں یہ صحیح ہے۔ آپ لوگ بیٹھ کر باتیں کریں۔ میں شمسو کے ہوٹل سے ٹکیہ کباب۔ نمک پارے اور چائے لے آتی ہوں، سنگھاڑے (سموسے) بھی لاؤں گی پھر آرام سے کھاتے ہوئے باتیں کروں گی۔ اپنے پاکستان کی باتیں۔"

"نہیں نہیں...... کچھ لانے کی ضرورت نہیں ہے...... میں نے فلائٹ میں ہی لنچ لے لیا تھا۔ بیگ میں کچھ بسکٹ بھی ہوں گے۔ ڈبے میں مٹھائی ہے...... محلے والوں میں تقسیم کر دو۔" میں نے اسے روکنے کے لیے کہا کہ کہیں وہ پھر باہر نہ نکل جائے......اب مجھے سنجیدہ سے خوف آنے لگا تھا۔ ضمیر کی عدالت مجھے ہی ملزم گردان رہی تھی۔ میرے اندر کا خوف سوا ہو گیا تھا۔ اسے دھوکا دینے کا خوف۔ انتظار کی سولی پر لٹکانے کا خوف۔ خوف کی ان تمام قسموں میں سب سے زیادہ اپنے ہرجائی ہو جانے کا خوف جس نے مجھے آکٹوپس کی طرح جکڑنا شروع کر دیا تھا۔ میری نگاہیں زمین سے چپک کر رہ گئی تھیں۔

"سنیں انعام بھائی۔" رضیہ نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا "پڑوسی سوکھی مٹھائی پر کب مانیں گے۔ ان سب کی دعوت کرنی ہو گی ہاں.... آپ کے آنے سے کچھ پہلے عقیلہ خالہ تقاضا کر گئی ہیں۔ آپ اتنی جلدی بھول گئے کہ گھر میں مہمان آنے پر پڑوسی کو بھی دسترخوان پر بلانا ضروری ہے۔ کیا پاکستان میں ایسا نہیں ہوتا؟"

میں کٹ کر رہ گیا۔ کراچی میں میرے بنگلے کے برابر میں بٹ صاحب کا بنگلا ہے۔ وہ دس سال سے ہمارے پڑوس میں ہیں مگر مجھے اب تک معلوم نہیں کہ ان کا پورا نام کیا ہے۔ ان کے کتنے بچے ہیں۔ وہ کرتے کیا ہیں۔ ایک

دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کا ماحول تو میں یہیں کہیں کسی کونے کھدرے میں بھول کر چلا گیا تھا۔ اب اتنے دنوں بعد یاد آیا کہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا تو مذہبی فریضہ ہے۔

سنجیدہ گم صم سی بیٹھی تھی کہ باہر سے کسی نے آواز دی ''سنجیدہ۔''

''جی خالہ۔'' سنجیدہ نے دروازے کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تو نے ابھی تک بتایا نہیں کہ ہم ''توا'' چڑھائیں یا نہیں؟''

''ارے واہ خالہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے..... میرے یہاں مہمان آیا ہے اور تم روٹی پکانے کا کہہ رہی ہو..... شبراتن اور جمن کو بھیج دو میرا ہاتھ بٹا دے گی۔''

''ارے وہ تو کب سے انتظار میں بیٹھی ہیں..... ٹھہر میں ابھی بھیجتی ہوں۔''

اس کا جملہ ابھی مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ دو لڑکیاں اندر آگئیں۔ اندر آتے ہی بولیں ''سنجیدہ باجی آٹے کا کنستر کہاں ہے بتا دو..... ہم سب کر لیں گے۔''

''سب کچھ اسی کونے میں دھرا ہے..... روشنی کے لیے لالٹین جلا لیو۔'' سنجیدہ بولتے ہوئے اٹھ رہی تھی کہ وہ لڑکی تڑ سے بولی:

''نہ نہ باجی آپ وہیں بیٹھی رہیں..... ہم سب کام کر لیں گی۔'' اس لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا ''آپ انعام بھائی سے باتیں کریں..... اتنا کہتی تھیں نا..... کتنا یاد کرتی تھیں۔''

رضیہ بھی اٹھ کر اس کے پاس ہاتھ بٹانے کے بہانے چلی گئی۔ اب ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور درمیان میں خاموشی کی چادر تنی ہوئی تھی۔ اس رکاوٹ کو میں نے ہی توڑا ''کیوں سنجیدہ..... تمہیں میرے آنے کی خوشی نہیں ہے کیا؟''

میرے اس سوال پر اس کے کانچ چہرے پر دراڑوں کا جال ابھر آیا۔ وہ مزید دکھی مزید ٹوٹی ہوئی لگی۔ اس نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا ''جب جب تمہاری یاد آتی تھی تمہاری طرح ہاتھوں پر سنجیدہ انعام لکھ کر اسے چوم لیتی تھی۔ بس جینے کا حوصلہ مل جاتا تھا۔ جب کہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا میرے مستقبل کی کھڑی فصل میں اسی دن آگ لگ گئی تھی جس دن تم نے یہاں سے جانے کا قصد کیا تھا۔ پھر بھی انتظار کی سولی پر لٹکی دن گزار رہی تھی کہ شاید تمہیں میری یاد آجائے اور تم لوٹ آؤ۔''

''اب تو میں آگیا ہوں پھر اتنی پژمردہ کیوں ہو؟''

''حالات نے مسکراہٹ جو چھین لی ہے۔ تمہیں کیا پتا کہ تمہارے بعد ہم پر کیا گزری، کیسے ہم نے وقت کاٹا۔ کتنے فاقے کیے۔ فاقوں نے ہی وقت سے پہلے اماں کو قبرستان پہنچا دیا۔ کاش تم آج سے چھ سال پہلے آجاتے تو ابا پاگل نہ ہوتے۔''

ایسا کون سا دماغی دھچکا پہنچا کہ چچا جان کا دماغ الٹ گیا؟

''بس قسمت میں یہی لکھا تھا بھوکے پیٹ رہ کر دن دن بھر سائیکل رکشا کھینچتے۔ ٹکا ٹکا جوڑ کر پاکستان جانے کا کرایہ جمع کر رہے تھے، پچیس ہزار ٹکا جمع ہو گیا تھا کہ پولیس والے لے گئے۔''

''پولیس والے..... کیوں..... وہ کیوں لے گئے؟''

''ابا قصور وار جو تھے۔ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے بی بی سی سیربین کے پروگرام میزان میں سچ بول دیا تھا۔ جب دل کو ٹھیس پہنچتی ہے تو اعتماد مجروح ہوتا ہے۔ انہوں نے نمائندے کے سامنے پاکستانی حکمرانوں پر عدم اعتماد کا اظہار کر دیا تھا۔ بس پورا کیمپ ان کا دشمن بن گیا کہ یہ غدار ہے۔ ان کی پٹائی بھی کی گئی۔ پھر تھانے میں کسی نے رپورٹ لکھا دی کہ ابا نے زینول کے یہاں چوری کی ہے۔ پولیس آئی۔ گھر کی تلاشی لی تو بکس سے پچیس ہزار ٹکا نکلا جو وہ لوگ لے گئے کہ یہ چوری کے پیسے ہیں۔ ابا یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے۔ پاکستان پہنچنے کی جو امید تھی اس کے ٹوٹنے کا یہ اثر ہوا کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھے۔''

میں پور پور پچھتاوے کی آگ میں جھلس گیا تھا۔ اپنے لہجے کو اعتدال میں رکھ کر بولا ''یقین کرو سنجیدہ میں خود بھی مجبوری کی زنجیروں میں جکڑ گیا تھا۔ وہاں مجھ پر کیا گزری میں بتاؤں گا تو یہاں والوں کو یقین نہیں آئے گا۔ یہاں والے تو یہی سمجھتے ہیں نا کہ وہاں جنت ہے جو پہنچ گیا وہ سنور گیا، خیر جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب میں آگیا ہوں نا..... سب کچھ سنبھال لوں گا۔''

''نہیں انعام نہیں..... ہر چیز ہاتھ سے نکل کر لوٹ سکتی ہے مگر عمر اور اس کی خواہشیں، اس کی حرارتیں، اس کے جذبے نہیں پلٹتے۔'' اس نے آنکھوں پر ہتھیلی پھیرتے ہوئے کہا۔

☆......☆

میں نے لالٹین کی یرقان زدہ روشنی میں بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔اس کی پیشانی بول رہی تھی۔ابرو پوچھ رہے تھے۔بے تاب ہونٹوں کے گوشوں میں سوالات کی بازگشت تھی۔وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔میں سب کچھ سمجھ رہا تھا لیکن انجان بنا ہوا تھا۔دلاسا دینے آیا تھا سو دے رہا تھا۔مگر جانتا تھا کہ میں بیتے دنوں کے زخموں کے نشان نہیں مٹا سکتا۔

ابھی میں اسی سوچ میں غلطاں تھا کہ رضیہ جو نہ جانے کب باہر نکل گئی تھی اندر آتے ہوئے بولی ”چائے آ گئی ہے۔عقیلن بوا نے بھجوائی ہے کہ مہمان کو پلا دو تھکن اتر جائے گی۔“

میں نے اس کے ہاتھ میں تھامی ہوئی پیالی پر نظر ڈالی۔جھڑے ہوئے کناروں والی بھدی سی پیالی کو میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔وہ سنجیدہ کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولی ”باجی آج تو معجزہ ہو گیا ہے۔تمہارے ابا رات سے پہلے ہی لوٹ آئے۔ابھی میں نے انہیں کیمپ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔“

سنجیدہ میری طرف دیکھ کر بولی ”ابا صبح نماز کے وقت گھر سے نکل جاتے ہیں۔کہتے ہیں کہ میں پاکستان جانے کا راستہ تلاش کرنے جا رہا ہوں۔رات کو واپس آ کر لیٹ جاتے ہیں۔خاموش،چپ چاپ......اگر کچھ بولو تو کہتے ہیں......مجھے حساب کرنے دو،میں حساب لگا رہا ہوں کہ پاکستان کال کرنے کا کتنا روپیا لگے گا۔میں صدر پاکستان سے بات کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہمیں کیوں نہیں بلا رہے ہیں۔“

تبھی ٹاٹ کا پردہ ہٹا اور چچا جان اندر آئے۔اندر آتے ہی انہوں نے سنجیدہ سے پوچھا ”اے سنجیدہ کیا یہ سب صحیح کہہ رہے ہیں۔“

”کیا؟“ سنجیدہ نے پوچھا۔

”پہلے ایک صاحب آئے انہوں نے کہا ہم انعام ہیں۔بھلا بتاؤ ایک پورا مرد آ کر کہے کہ ہم انعام ہیں تو کیا ہم یقین کر لیں گے؟کہاں وہ اٹھارہ انیس سال کا جوان اور کہاں وہ پورا مرد......اس کو بھگا دیا۔وہ ہم کو پاگل بنا رہا تھا نا......پھر ایک کے بعد ایک سب ہی کہنے کو آنے لگے کہ انعام کراچی سے آ گیا ہے۔“ پھر مجھ پر ان کی نظر پڑی تو سیدھا میری طرف آئے اور چیخ کر بولے ”اے تو کون ہے رے......میرے گھر میں کاہے گھسا بیٹھا ہے رے۔“

”میں ہی انعام ہوں۔“ خود مجھے ایسا لگا کہ جیسے میری آواز میں زمانے بھر کا درد سمٹ آیا ہے۔

”چاچا تو کیسے انعام ہو گیا......میرا انعام تو بھرپور جوان ہے اور تو بڈھا......وہ آئے گا تو میرا اکیسٹر لیس لے کر آئے گا پھر ہم سب پاکستان جائیں گے۔“ وہ ہاتھ نچا کر بولے۔

”نہیں ابا یہی انعام ہیں۔“ سنجیدہ نے رو دینے والی آواز میں کہا۔

”اچھا تو کہہ رہی ہے تو مانے لیتا ہوں......اسے چائے پانی پلا دینا۔مہمان کو ایسے نہیں جانے دیتے۔بدشگونی ہوتی ہے۔“ وہ کہہ کر دروازے سے باہر نکل گئے۔

میرے اندر ہاہاکار سی مچ گئی تھی۔ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی میرے دل کو مٹھی میں لے کر مسل رہا ہے۔

”کاش ابا ٹھیک ہو جاتے۔“ سنجیدہ کی آواز میں دکھ کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔

اسی وقت باہر سے کسی نے آواز دی ”اری او سنجیدہ......ذرا انعام کو باہر بھیج دیجیو......سب لوگ اس سے باتیں کرنے کو بے چین ہیں۔“

سنجیدہ کی آنکھوں میں چھپے درد کو میں سہہ نہیں پا رہا تھا۔یہ فرار کا موقع تھا۔میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔”ابھی آیا“ اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

باہر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑا تھا۔میں اس کے ساتھ چل پڑا۔لمبے لمبے چٹائیوں کے جھونپڑے نما گھروں کی پتلی پتلی گلیوں سے ہوتا ہوا میں چلتا رہا۔ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ چند بچوں نے روک دیا۔”نہیں نہیں آگے راستہ بند ہے......ادھر سے جائیں۔“

”آؤ اس راستے سے چلتے ہیں۔“ وہ شخص بولا۔

”مگر میں ابھی تو ادھر سے ہی آیا ہوں۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”بات یہ ہے کہ یہ پانی آنے کا وقت ہے......ایک ہی نل ہے۔اندر اتنی جگہ نہیں ہے کہ عورتیں گھر کے اندر نہا سکیں اس لیے باری باری سب عورتیں اسی نل پر آ کر نہاتی ہیں۔نل بالکل کھلے ہوئے حصے میں ہے اس لیے چھوٹے بچوں کی ڈیوٹی ہے کہ وہ ادھر آنے والوں کو روکیں۔دیکھ لو......یہ ہے ہماری زندگی......پاکستان کی محبت میں گھربار نہ لٹاتے تو آج اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھے ہوتے۔“

بڑے میاں کی بات نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔" کیوں ......ریڈکراس والے اب کوئی مدد نہیں کرتے؟"

"ریڈکراس نے کئی سال تک مدد کی۔ دس سال تک راشن دیا۔ اب اور کتنا دیتے پھر ان لوگوں کا مقصد بھی پورا ہو گیا تھا۔ یعنی بہت سے لوگ کرسچن بن گئے۔ اب وہ لوگ تو عیش سے زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کو یورپ والے بھی خصوصی مدد بھیجتے ہیں اور اب ان کے بچے امریکا لندن میں سیٹل ہو چکے ہیں۔ کچھ کینیڈا اور آسٹریلیا چلے گئے ہیں۔ ہم سب اپنے مذہب کو، اپنے پاکستان کی محبت کو دل میں بسائے زندگی کو گھسیٹ رہے ہیں۔"

میرا دل ہولنے لگا تھا۔ یہ سب مجھ سے اور سہا نہیں جا رہا تھا۔ یہ تو غم والم کا ایک سمندر تھا جس کا کنارا مجھے بالکل نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں تھم کر کھڑا ہو گیا۔ مجھ میں حوصلہ نہیں تھا کہ میں اور آگے جاؤں۔ مگر جانا ضروری تھا جب اتنے خلوص سے بلایا گیا تھا تو جانا فرض تھا۔ اسی خیال کے تحت میں چل پڑا۔ دو تین گلیوں کے بعد ایک کھلی ہوئی جگہ تھی وہاں ایک قطار میں کئی چٹائیاں بچھی تھیں جسے وہاں کی زبان میں سیتل پاٹی یعنی ٹھنڈی چٹائی کہتے ہیں۔ بید کے چھلکوں سے بنی اس چٹائی پر کئی افراد بیٹھے تھے۔ تقریباً بیس بائیس تو ہوں گے ہی۔ میں نے قریب پہنچتے ہی سلام کیا۔ سب نے ایک ساتھ جواب دیا۔ ایک صاحب نے اپنے برابر میں بیٹھنے کا اشارہ دیا۔ ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ چائے والا پیالیوں میں چائے لے کر آ گیا۔ ایک ایک کپ ہر ایک کو دیتا جا رہا تھا۔ میں نے پیالی تھامتے ہوئے پوچھا" کیا ہر روز اسی طرح چائے کی محفل جمتی ہے؟"

"نہیں بیٹا...... یہ تو تمہارے اعزاز میں عیدو بھائی نے سب کی دعوت کی ہے۔" ایک بزرگ صورت شخص نے جواب دیا۔

"اچھا... یہ عیدو صاحب کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے برابر ہی تو بیٹھے ہیں۔" انہوں نے اسی شخص کی طرف اشارہ کیا جس نے مجھے بیٹھنے کے لیے جگہ دی تھی۔

"اچھا آپ ہی عیدو ہیں... آپ کرتے کیا ہیں؟"

"یہ بول نہیں سکتے۔" وہی صاحب پھر بولے" ان کی زبان پاکستان کی محبت میں تراش دی گئی ہے۔"

"ارے۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا

جوچی

(580ھ/1184ء۔624ھ/1227ء)

چنگیز خان کا سب سے بڑا لڑکا اور آلتون اردو، قریم، تیومن، بخارا اور خیوہ کے قوانین کا جد امجد۔ اس کے حالاتِ زندگی بہت کم معلوم ہیں اور یہ بات باعثِ حیرت ہے کہ ایک ایسا شخص جو بہت سے شاہی خانوادوں کا بانی تھا لیکن اس کے حالات زندگی اتنے کم دستیاب ہیں کہ اس کی ولدیت تک غیر یقینی ہے۔ جوچی کا ذکر سب سے پہلے 1277ء میں ملتا ہے۔ جب وہ اویرت کے مغربی سواحل پر جنگلوں میں رہنے والے دوسرے قبائل کے خلاف ایک مہم کے ساتھ بھیجا گیا۔ چنانچہ ان لوگوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد وہ مغرب کی جانب بڑھا۔ یہاں پر قبیلہ قیرغیز نے جو بالائی ینسی کے علاقے میں آباد تھا۔ اس کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ 1218ء/1219ء میں اس نے قبیلے کی ایک بغاوت کو بھی فرو کیا تھا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ ان حملوں میں بھی شریک تھا جو اس نے شمالی چین پر کیے تھے۔ اس نے اپنے بھائیوں چغتائی اور اوکتائی کے ساتھ مل کر نان شان سی، چیہ لی، نان اور ہو کی لڑائیوں میں بھی حصہ لیا۔

جمع بین الصلاتین

دو وقتوں کی نماز ملا کر ایک وقت میں پڑھنا۔ مثلاً ظہر اور عصر کی نماز ظہر کے وقت ہی میں پڑھ لی جائے۔ حج کے دوران میں حاجی لوگ عرفات میں 9 ذوالحجہ کے وقت ہی میں ظہر اور عصر کی نماز ملا کر پڑھ لیتے ہیں اور پھر مزدلفہ میں پہنچ کر عشاء کے وقت مغرب اور عشاء کی نماز ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک جمع بین الصلاتین حج کے علاوہ بھی ہر سفر میں جائز ہے اس کی ایک شکل جمع صوری بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک نماز کو موخر کر کے اس وقت پڑھا جائے جب اس کا وقت ختم ہونے کے قریب ہو اور دوسرے وقت کی نماز کو وقت شروع ہوتے ہی پڑھ لیا جائے۔ اس طرح بظاہر تو یہ معلوم ہوگا کہ دونوں نمازیں ایک ساتھ ایک ہی وقت میں پڑھی گئی ہیں لیکن حقیقت میں دونوں نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھی گئیں۔ فقہائے احناف کے نزدیک سفر حج کے علاوہ دوسرے سفروں میں صرف صوری ہی جائز ہے۔

مرسلہ: عفان احمد ثوری۔ چنیوٹ

تو عیدو نے منہ کھول دیا۔اس کی زبان آدھی کٹی ہوئی تھی۔
''ارے ... یہ حادثہ کب ہوا تھا؟''میں نے تجسس کے تحت پوچھا۔
''تمہیں یاد ہے خالص پور کھلنا کی جوٹ مل میں بہت بڑا قتل عام ہوا تھا؟''
''جی ہاں ... مجھے یاد ہے تقریباً ڈیڑھ دو سو افراد کو عوامی لیگی غنڈوں نے ذبح کر دیا تھا۔ پاک فوج جب پہنچی تو ان کے جوتے خون میں ڈوب گئے تھے۔''
''یہ بھی اسی جوٹ مل میں شفٹ انچارج تھے۔اپنی عادت کی وجہ سے سب کی مدد کرتے تھے۔یہاں تک کہ اگر کسی کو قرض چاہیے ہوتا تو وہ سیدھا ان ہی سے مانگتا۔یہ ادھار دے کر بہت کم تقاضہ کرتے تھے۔ان کی اسی خصوصیت نے ان کی جان بچالی۔جب جوٹ مل پر حملہ ہوا تو یہ آن ڈیوٹی تھے۔غنڈوں نے اندر گھستے ہی مار کاٹ شروع کر دی۔زیادہ تر ورکر نہتے تھے اس لیے مقابلہ نہ کر سکے۔وہ لوگ تعداد میں بھی زیادہ تھے۔''
''جی ہاں یہ میں نے بھی روزنامہ پاسبان میں پڑھا تھا۔''میں نے ماضی کو یاد کرتے ہوئے بتایا۔
''ہاں اس ایک ہی سیکشن میں ستر لوگوں کو قتل کیا گیا۔عیدو پر بھی تلوار چلائی گئی مگر زخم لگنے سے پہلے ہی یہ گر کر بے ہوش ہو گئے۔کافی دیر بعد جب غنڈے چلے گئے تو گاؤں والے لوٹ مار کے لیے اندر آ گئے۔وہ لاشوں کی جیبیں خالی کرنے لگے۔گھڑیاں اتارنے لگے۔لاشوں کے ڈھیر کے نیچے سے جب ان کو کھینچ کر نکالا گیا تو یہ کراہ اٹھے۔اتفاق کی بات ہے کہ وہاں موجود زیادہ تر وہ لوگ تھے جو کسی نہ کسی طرح عیدو کے احسان مند تھے۔وہ لوگ انہیں اٹھا کر گاؤں لے گئے اور ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگے۔''وہ سانس لینے کے لیے رکا تو میں نے پوچھا۔
''جب ان لوگوں نے ان کی زندگی بچالی تھی تو پھر ان کی زبان کس نے کاٹی؟''
''وہی تو بتا رہا ہوں''اس نے سلسلہ کلام جوڑا''گاؤں پہنچ کر عیدو کو ہوش آیا ہی تھا کہ غنڈوں کو خبر ہو گئی اور وہ گاؤں والوں پر چڑھ دوڑے۔گاؤں والے عیدو کو ان کے حوالے کرنے پر تیار نہ تھے۔ان کا کہنا تھا کہ یہ بہاری ضرور ہے مگر جے بانگلہ کا حامی ہے۔بالآخر ان لوگوں نے کہا کہ اگر عیدو ان کے سامنے ایک بار جے بانگلہ کا نعرہ لگا دے تو وہ اسے چھوڑ دیں گے۔''

گاؤں والے عیدو سے بولے کہ تم ایک بار جے بانگلہ کا نعرہ لگا دو۔اس پر عیدو نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر نعرہ لگایا پاکستان زندہ باد.....بس وہ غنڈے آپے سے باہر ہو گئے۔گاؤں والوں نے بڑی مشکل سے انہیں رام کیا کہ اس نے اتنے لوگوں کو قتل ہوتے دیکھا ہے۔اس کا دماغ پھر گیا ہے۔ہم سب جب بول رہے ہیں کہ یہ بنگالیوں کا ہمدرد ہے تو پھر یقین کیوں نہیں کرتے۔اس پر ان لوگوں نے کہا کہ ہم نے آپ کی بات پر یقین کر لیا مگر اس نے ہمارے سامنے پاکستان زندہ باد کہا ہے۔اس کی وہ زبان ہم کاٹ دیں گے۔گاؤں والوں نے زندگی بچانے کے لیے یہ شرط قبول کر لی۔
''اس دور میں انسان مر گیا تھا......یہ بے چارہ زندگی بھر کا گونگا بن گیا......واقعی بہت بڑا ظلم ہوا۔''میں نے کہا۔
''ظلم تو ان کے ساتھ ہوا۔''وہی بڑے میاں ایک داڑھی والے کی جانب اشارہ کر کے بولے۔''یہ جمال پور میں رہتے تھے۔میمن سنگھ والے جمال پور......ان کی پانچ بیٹیاں تھیں۔جب ان کے محلے پر حملہ ہوا تو رات کا وقت تھا سوتے سے اٹھ کر سب دوڑے تھے'حملہ کرنے والے رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر ان کی لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے۔عرصے تک خبر نہ ملی کہ کہاں ہیں......دس سال بعد ایک آدمی سے پتا چلا کہ وہ پانچوں کلکتہ کے سونا گاچھی میں ہیں۔سونا گاچھی ایشیا کا سب سے بڑا قحبہ خانہ ہے۔کئی ہزار طوائف وہاں رہتی ہیں......ان کے درمیان سے کس مشکل سے یہ اپنی بیٹیوں کو نکال لائے یہی جانتے ہیں۔اب وہ یہیں آرام سے ہیں۔یہاں کی تنظیم نے ان کی شادی کرا دی ... سب سکون سے ہیں۔''
''برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟''میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔
''بولو'برا کیوں مانوں گا۔''
''یہ حادثہ اگر پاکستان میں ہوتا تو وہاں ان لڑکیوں کو محلے والے ہی خودکشی پر مجبور کر دیتے۔اتنی باتیں بنتیں کہ وہ مر جانا ہی اچھا سمجھتیں۔''
''مگر اس میں ان لڑکیوں کا قصور کیا تھا......خیر اپنا اپنا مزاج ہے۔''
''اسی لیے میرا مشورہ ہے کہ آپ لوگ پاکستان جانے کا خواب بھلا دیں اور نئے سرے سے زندگی گزاریں......وہاں کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ بہاریوں

کو بلایا جا سکے۔ معاشی پریشانیاں ہیں۔ سیاسی مصلحت ہے۔''

''لو یہ کیا بات ہوئی...... ہم پاکستانی ہیں ہم اپنے ملک نہیں جائیں گے تو کہاں جائیں گے؟''

''تو پھر وقت آنے کا انتظار کریں۔''

''اتنے سال سے تو کر رہے ہیں... کچھ دن اور کرلیں گے مگر جائیں گے پاکستان... اس لیے کہ ہم نے ہندوستان چھوڑا تھا پاکستان کے نام پر۔'' بڑے میاں جذباتی ہو رہے تھے اور میں فرار کا راستہ دیکھ رہا تھا کہ رضیہ آگئی۔ اس نے کچھ دوری پر کھڑے ہو کر کہا۔

''انعام بھائی! کھانا تیار ہو گیا...... سنجیدہ باجی پوچھ رہی ہیں کہ آپ کو اگر بھوک ہے تو آکر کھالیں۔''

''ہاں بیٹا جاؤ...... وہ کتنے سال سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔'' وہی بڑے میاں بولے۔ اور میں اٹھ گیا...... مجھے فرار کا راستہ مل گیا تھا۔

رضیہ کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے پوچھا ''رضیہ تمہارے ابا کیا کرتے ہیں؟''

''پہلے کورٹ میں آپ کے ابا کے ساتھ نوکری کرتے تھے پھر جب پاکستان بن گیا اور تمام بہاریوں کو نوکری سے نکال دیا گیا تو یہ عرصہ تک بیکار رہے پھر انہوں نے ٹھیلا لگانا شروع کر دیا۔ یہاں سب کے سب ٹھیلا لگاتے ہیں یا پھر رکشا کھینچتے ہیں۔''

''تم کبھی پاکستان گئی ہو؟''

''نہیں پتا نہیں اللہ کب ہمیں لے جائے گا۔''

''یہ میرا وعدہ ہے۔ حکومت دوسروں کو بلائے یا نہ بلائے مگر میں تمہیں ضرور بلالوں گا۔''

''سچ انعام بھائی! سچی نا؟''

''ہاں یہ میرا وعدہ ہے۔'' یہ میں نے خلوص دل سے کہا۔ اس لیے کہ میں نے سوچ لیا تھا...... ایک خاص فیصلہ کر لیا تھا۔ ابھی اس نے خوشی دیکھی نہیں ہے۔ میں اسے خوشیوں بھری زندگی دوں گا۔

''انعام بھائی آپ اکیلے اندر جائیں۔ میں یہیں سے واپس جا رہی ہوں۔''

''کیوں بھئی تم کھانے میں شریک نہیں ہو گی؟''

''ہم نے عقیلہ بوا اور دوسروں نے کھانا کھالیا۔ اب صرف آپ اور باجی رہ گئیں۔ آپ دونوں آرام سے کھل کر باتیں کریں اسی لیے اماں نے کہہ دیا ہے کہ آپ کو پہنچا کر میں واپس آجاؤں۔''

میں اس کی بات پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اس لیے بھی کہ میں اب عمر کی اس منزل پر پہنچ چکا ہوں کہ ایسی کسی بات کا سوچ بھی نہیں سکتا پھر اندر کا زخم الگ ٹیس دے رہا ہے۔ اڑتے پنچھی کبھی لوٹ کر نہیں آتے اور گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ میں نے جو وقت گنوا دیا یا قسمت نے کھو دینے پر مجبور کر دیا تھا اسے اب یاد ہی تو کر سکتا ہوں اور یاد کرنے پر صرف کچوکے ہی ملیں گے۔ اس لیے میں سنجیدہ کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہا تھا مگر اس کے سامنے جانا بھی ضروری تھا۔ میں دھڑکتے دل اور عرق آلود جبیں کے ساتھ پشیمانی کا طوق گردن میں ڈالے سر جھکائے کمرے نما ڈربے میں داخل ہوا۔

سنجیدہ سنجیدگی کا پرتو بنی محو انتظار تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی ''دسترخوان بچھا دوں؟''

''بچھا دو۔'' میں نے بھی دھیمی آواز میں کہا۔

''آجائیں۔'' یہ کہہ کر اس نے دسترخوان بچھا دیا۔ عرصہ بعد زمین پر بیٹھ کر کھانے کا موقع مل رہا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے بیٹھتے طعام کا ادب آداب تک بھول چکا تھا۔ میں نے دسترخوان پر نظر ڈالی۔ اردو بنگال سے رخصت ہو چکی تھی مگر اس دسترخوان پر اردو میں لکھا تھا ''کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا ضروری ہے۔ کھانا خدا کا انعام ہے۔ ہاتھ دھونا سنت نبوی ہے۔ کھانا ختم کرنے کے بعد شکر ادا کرنا ضروری ہے۔'' چار کونے پر چار باتیں، کتنی اہم اور ضروری ہیں۔ بار بار نظر پڑے تو ازبر ہو جاتی ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ فورک اسپون سے کھانے والے میرے بچے ان کو کتنا سمجھانا پڑتا تھا کہ بائٹ بائٹ نہ کھاؤ۔ آرام سے کھا کر شکر خدا ادا کرو۔

''کیا سوچنے لگے...... کھاؤ نا۔'' سنجیدہ کی آواز پر میں چونک گیا اور سامنے دیکھا۔ چاول اور مچھلی کا شوربہ۔ کتنا عرصہ گزر گیا اس قسم کی شوربے والی مچھلی کھائے۔ میں نے سوچا چمچہ مانگوں پھر یاد آیا کہ کھانا ہاتھ سے کھانا چاہیے تاکہ پانچوں انگلیاں اپنا کام کریں اور نظام ہضم ٹھیک رہے۔ میں نے ہاتھ سے کھانا شروع کر دیا۔ کھاتے ہوئے خیال آیا کہ سنجیدہ تو پنکھا جھلنے میں مشغول ہے۔ وہ تو کچھ لے ہی نہیں رہی تب میں نے اسے ٹوکا ''تم کیوں نہیں کھا رہی ہیں؟''

''میں بعد میں کھا لوں گی۔''

''نہیں تم اگر ساتھ نہیں دو گی تو میں اٹھ جاؤں گا۔''

میری ضد سے مجبور ہو کر اس نے ایک پلیٹ میں چاول نکال لیے۔ اگر اس وقت میرے بچے مجھے دیکھ لیتے کہ میں کس قسم کے برتن میں اور کس طرح کھا رہا ہوں تو وہ حیرت سے گنگ رہ جاتے۔ کھاتے کھاتے میں نے پوچھا" چچا جان کب لوٹیں گے؟"

"رات گہری ہو رہی ہے نا...... اب وہ بھی آتے ہوں گے...... دو چار نوالہ کھا کر لیٹ جائیں گے اور پاکستان پہنچنے کا خواب دیکھتے دیکھتے سو جائیں گے۔"

"فکر نہ کرو میں ان کا علاج کراؤں گا۔ پاکستان میں بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ بس تم چلنے کی تیاری کرو۔"

"انعام صاحب میں نپٹ جاہل نہیں ہوں.. اخبارات پڑھتی ہوں۔ تم لاکھ تسلی دو مگر میں سمجھ رہی ہوں کہ اب میرا پاکستان جانا ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں' کیوں؟" میں نے ہاتھ روک کر پوچھا۔

"اس لیے کہ وہاں والوں نے ہماری حب الوطنی کو ٹھوکر مار دی ہے۔ ہمیں حرف غلط سمجھ لیا ہے۔ ہمیں بھول چکے ہیں۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے...... بس کچھ سیاست داں آڑے آ رہے ہیں۔ اس مسئلے کا بھی جلد حل نکل آئے گا۔"

"دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے...... میں لولی پوپ سے بہلنے والی نہیں ہوں...... کھلونے دے کر ہمیں بہلایا نہیں جا سکتا...... لیگل وے سے ہم وہاں جا نہیں سکتے...... اپنے ہی ملک میں ہمیں تارکین وطن کا خطاب حاصل کرنا پسند نہیں...... تیسری دنیا کے اس ملک میں تیسرے درجے کا شہری بن کر رہنا مجھے منظور نہیں...... جب قسمت میں ہوگا اور حکومت خود بلوائے گی تو میں چلی جاؤں گی۔"

"ضد نہ کرو چچا جان کو میں لے کر چلا جاؤں گا تو تم کس کے ساتھ رہو گی...... اکیلے رہ لوگی؟"

"اول تو وہ اکیلے جائیں گے نہیں دوسری بات یہ ہے کہ میں اب خود پاکستان جانا نہیں چاہتی۔ تم منہ سے کچھ نہ بولو مگر حقیقت کھل ہی جاتی ہے۔ تمہارے بیگ سے پرچا نکلا ہے جس پر لکھا ہے" ڈیڈ وقت پر کھانا کھا لیا کریں اور دوا وقت پر لیتے رہیں۔" یعنی تمہارے بچے اتنے بڑے ہیں کہ وہ تمہارا خیال رکھ رہے ہیں۔"

"ہاں میری ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔"

"ان کے درمیان میرے لیے کیسے جگہ نکالو گے پھر میری وجہ سے تمہارے گھر کا ماحول بھی بگڑ جائے گا۔"

"یہ سب مجھ پر چھوڑ دو ... میں سب سنبھال لوں گا' پلیز چچا جان کی خاطر تم میرے ساتھ چلو۔"

"مجھے معلوم ہے اب ان کا مرض صحیح نہیں ہوگا۔"

"پھر بھی... تم یہاں رہ کر کیا کرو گی؟"

"جیسے اب تک رہتی رہی ہوں اسی طرح رہ لوں گی...... انتظار کا مزہ چھن گیا تو کیا ہوا۔ پھر بھی جی لوں گی۔ اگر میرے لیے کچھ کر سکتے ہو تو ایک احسان کر دو۔"

"کیا... حکم کرو۔"

"میں حکم نہیں کر سکتی...... ایک التجا کر رہی ہوں...... میں نے اپنے حصے کا دکھ جھیل لیا مگر رضیہ ابھی ارمانوں کی سیج سجا رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہزاروں سپنے ہوں گے، اچھی زندگی کے سپنے. اس کے ارمان ابھی زندہ ہیں وہ ہماری نئی نسل ہے اسے بچا لو۔ اسے اس جہنم سے نکال لے جاؤ...... میں خود اس کا نکاح تمہارے ساتھ پڑھوا دوں گی...... ابھی ابول چچا سے بات کرتی ہوں۔"

کھانا ختم کرتے ہی وہ گھر سے نکل گئی اور جب لوٹی تو اس کے ساتھ رضیہ کے والدین تھے۔ خوشی سے کھلے پڑ رہے تھے۔

"یہ تو ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ رضیہ کراچی جا سکے گی۔"

"مگر چچا آپ خود دیکھیں اس کی اور میری عمر میں کتنا فرق ہے...... نہیں میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔"

"بیٹا مرد کی عمر نہیں دیکھی جاتی۔" اور اگلے دن ہی میں واپسی کے لیے بانگلہ دیش بیمان میں سوار ہو گیا' رضیہ میرے ساتھ تھی۔